

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْرِكٍ

شرح

تفسير السجدة

مترجم و شرح

ابو عمر الکتور محمد رضوان رضا قادری

نشراتی:

ابوالاحمد محمد نعیم قادری رضوی

الکبریٰ پبلشرز

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

شرح تفسیر البیضاوی	----	نام کتاب
ابو عمر الدکتور محمد رضوان رضا قادری	----	مترجم و شارح
فاضل و مدرس جامعہ قادریہ عالیہ نیک آباد مراڑیاں شریف گجرات		
علامہ فخر الزمان قادری	----	پروف ریڈنگ
ابو احمد محمد نعیم قادری رضوی	----	نظر ثانی
۶۰۰	----	تعداد
۶۸۸	----	صفحات
محمد اکبر قادری	----	ناشر
روپے 700/-	----	قیمت

الانتساب

الحقت ذالك المختصر الى اشرف الانبياء صلى الله عليه وسلم

احقر اس قابل تو نہیں لیکن برادرِ مکرم، والدین، اساتذہ کرام (جامعہ قادریہ عالمیہ نیک آباد گجرات، پاکستان) اور صوفی بزرگ الحاج محمد لطیف قادری مدظلہ العالی کی نگاہِ شفقت اور دعاؤں سے اتنا کچھ کر سکا۔ میں اپنی اس کاوش کو دلوں کی جان بلکہ تمام جہانوں کی جان حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں بصد ہدیہ و عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ کریم اس حقیر سی خدمت کو قبول فرمائے اور امت محمدیہ کے لئے ذریعہ بخشش و مغفرت بنائے۔

آمین بجاہ النبی الامین۔

احقر

ابو عمر الدکتور محمد رضوان رضا قادری عفی عنہ

فاضل جامعہ قادریہ عالمیہ نیک آباد گجرات

حمد باری تعالیٰ

اے خداوند جہاں! اے خالق لیل و نہار
تو دو عالم کا حقیقی مالک و مختار ہے
تو نے بخشی ہے فلک کے چاند تاروں کو چمک
رحمت عالم کے دامان کرم کا واسطہ!
ہو نہیں سکتی تری حمد و ثنا ہے بے شمار
ذرے ذرے پر ترا چلتا ہے حکم و اقتدار
تیری قدرت سے گل و غنچہ پہ آتا ہے نکھار
بخشن دے میرے گناہوں کو ہوں نادم شرمسار
عرض کرتا ہوں ترے آگے بچشم اشکبار
کھول دے میری دعاؤں کے لئے باب قبول

نعت شریف

اے شافعِ اُمم شہِ ذی جاہ لے خبر
دریا کا جوش ، ناؤ نہ بیڑا نہ
منزل کڑی ہے رات ، اندھیری میں نابلد
پہنچے پہنچنے والے تو منزل مگر شہا
جنگل درندوں کا ہے میں بے یار شبِ قریب
منزل نئی عزیز جدا لوگ ناشناس
مجرم کو بارگاہِ عدالت میں لائے ہیں
اہلِ عمل کو ان کے عمل کام آئیں گے
وہ سختیاں سوال کی وہ صورتیں مُہیب
پُر خار راہ برہنہ پا تشنہ آبِ دُور
باہر زبانیں پیاس سے ہیں آفتابِ گرم

اللہ لے خبر مری اللہ لے خبر
نا خدا میں ڈوبا تو کہاں ہے مرے شاہ لے خبر
اے حضر لے خبر ، مری اے ماہ لے خبر
ان کی جو تھک کے بیٹھے سر راہ لے خبر
گھیرے ہی چار سمت سے بد خواہ لے خبر
ٹوٹا ہے کوہِ غم میں پرکاہ لے خبر
تکتا ہے بے کسی میں تری راہ لے خبر
میرا ہے کون تیرے سوا آہ لے خبر
اے غمزدوں کے حال سے آگاہ لے خبر
موٹی پڑی ہے آفتِ جانکاہ لے خبر
کوڑ کے شاہِ کجگوئے اللہ لے خبر

مانا کہ سخت مجرم و ناکارہ ہے رضا

تیرا ہی تو ہے بندہ درگاہ لے خبر

ترتیب

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۳۶	لفظ عطن کی تحقیق	۲۱	تفسیر قرآن کی تاریخ
۳۶	لفظ رحم کی تحقیق و معانی	۲۲	دور اول
۳۷	لفظ اسم کی تحقیق و اقوال	۲۲	دور ثانی
۳۷	اسم کی اقسام	۲۳	دور ثالث
۳۹	رحم کی لفظی تحقیق	۲۳	مشہور مفسرین کے اسمائے گرامی
۵۰	[سورة الفاتحة (1): آية 2]	۲۴	دور چہارم
۵۲	لفظ حمد کی تحقیق اور حمد و شکر میں فرق	۲۴	مشہور عربی تفاسیر کے نام
۵۵	لفظ رب کی عمدہ تحقیق	۲۵	تفسیر اور تاویل کی تعریف
۵۶	اس امت کا عالم ربانی	۲۵	تفسیر اور تاویل کا شرعی حکم
۵۷	رابعہ کا معنی	۲۵	مفسر کے لئے ضروری علوم
۵۸	الرباب کا معنی	۲۶	حضرت حسن بصری کا قول
۵۸	العالم کا معنی و مفہوم	۲۶	درجات تفسیر
۵۹	عالم کی اقسام	۲۷	قرآن مجید کا اصلی ماخذ
۶۰	[سورة الفاتحة (1): الآيات 3 الى 4]	۲۸	ضرورت و اہمیت تفسیر
۶۲	لفظ رحمن اور رحیم میں فرق	۲۹	قرآن نہی
۶۳	تحقیق لفظ مالک	۲۹	تعارف مفسر بیضاوی
۶۳	یوم کی تعریف	۳۰	خطبۃ الکتاب
۶۴	تکویر الیومین سے مراد	۳۱	ترجمہ خطبہ
۶۴	[سورة الفاتحة (1): آية 5]		
۷۰	العودیۃ کا مفہوم	۳۲	[سورة الفاتحة (1): آية 1]
۷۰	عبادت کی اقسام	۳۲	لفظ عوذ کی تحقیق
۷۰	الاستعانة	۳۲	لفظ السور لفظ اللہ کی مفصل تحقیق

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۱۲۸	تحقیق اقامت	۷۱	[سورة الفاتحة (1): آية 6]
۱۲۹	المقام:	۷۴	الهداية كما معنى ومفهوم
۱۳۰	صلوة کے معانی	۷۵	[سورة الفاتحة (1): آية 7]
۱۳۱	رزق کی تعریف	۷۷	تحقیق لفظ صراط
۱۳۱	انفاق کے معانی	۷۷	صراط اور صراط میں فرق
۱۳۱	[سورة البقرة (2): آية 4]	۷۸	قول ابوتام
۱۳۶	لفظ "ما" کی تحقیق مع اقسام	۷۸	مفہوم استقامت
۱۳۸	ماحرنی کی اقسام	۸۱	نعمت کا معنی
۱۴۰	نزول کے معنی اور انزال و تنزیل میں فرق	۸۱	لفظ غیر کا معنی
۱۴۱	لفظ آخر کا مفہوم اور اس کا ترجمہ مقابل	۸۲	لفظ غضب کا معنی
۱۴۱	معرفت یقین	۸۵	ضالین کے معانی
۱۴۲	[سورة البقرة (2): آية 5]	۸۵	اقسام ضلالت
۱۴۷	تشبیہ		سُورَةُ الْبَقَرَةِ
۱۴۷	متقین کو ان انعامات کے ساتھ خاص کرنے کی وجوہات	۸۷	[سورة البقرة (2): آية 1]
۱۴۷	ہدایت کی چار اقسام	۱۰۲	[سورة البقرة (2): آية 2]
۱۴۸	نوٹ	۱۱۰	ذالک کی تحقیق
۱۴۸	فلاح کے معنی	۱۱۱	ذاک اور ذالک میں فرق
۱۴۹	اقسام فلاح	۱۱۱	کتاب کا معنی
۱۵۰	[سورة البقرة (2): آية 6]	۱۱۱	حرف لا کے معانی و اقسام
۱۵۷	سوال عدول	۱۱۳	غروب سے پہلے افطار
۱۵۷	جواب	۱۱۴	ریب کی حقیقت
۱۵۹	امام بیضاوی اور تکلیف مالا یطاق کا جواز	۱۱۴	ہدایت کیا ہے؟
۱۶۰	کفار کو ڈرانے کا حکم کیوں؟	۱۱۵	چار طرف سے ہدایت
۱۶۱	مفہوم کفر	۱۱۵	تقویٰ کی تعریف اور اصل معنی
۱۶۱	سب سے بڑا کفر	۱۱۷	[سورة البقرة (2): آية 3]
۱۶۱	مساواة کی تحقیق	۱۲۷	ایمان کی تعریف
۱۶۲	تحقیق الانذار اور انذار و نذیر میں فرق	۱۲۷	لفظ غیب کا معنی

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۱۸۰	تیسرا احتمال	۱۶۲	اللذیر کا معنی
۱۸۰	اس کا مادہ اشتقاق	۱۶۲	ام کا استعمال
۱۸۲	اعتراض	۱۶۲	ایمان کے معانی
۱۸۳	باکو دو بارہ ذکر کرنے کی وجہ	۱۶۳	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 7]
۱۸۳	لفظ یوم کی تحقیق	۱۶۳	مفرد کلمات کے معانی
۱۸۳	لفظ الناس کی اصل	۱۶۶	مختم اور عشاۃ کو اللہ کی طرف منسوب کرنے میں اختلاف
۱۸۳	تحقیق لفظ قول	۱۶۶	اصحاب ظاہر کا نظریہ
۱۸۵	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 9]	۱۶۷	معتزلہ کا نظریہ
۱۸۸	لفظ خدع کی مفصل تحقیق	۱۷۲	انتم کا مفہوم
۱۸۹	گواہ اور بچھو	۱۷۳	قول جباتی
۱۹۰	حرف الا کا استعمال	۱۷۳	یسک کی مہر
۱۹۰	مفہوم نفس	۱۷۳	معنی قلب
۱۹۱	معرفت شعور	۱۷۵	معنی سماعت
۱۹۱	یشعرون اور یعقلون میں فرق	۱۷۵	معنی بصارت
۱۹۱	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 10]	۱۷۶	بصرہ اور بصیرت
۱۹۵	معنی قلب	۱۷۶	لفظ عشاۃ کا معنی
۱۹۵	لفظ مرض کی تحقیق	۱۷۶	عذاب کا مفہوم
۱۹۶	زیادۃ کی تعریف	۱۷۶	عظیم کا لغوی و اصطلاحی معنی
۱۹۶	عذاب کا معنی	۱۷۷	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 8]
۱۹۷	لفظ عذاب کے معنی میں اختلاف	۱۷۸	معنوی تعلق
۱۹۷	لفظ الم کا مفہوم	۱۷۹	پہلا گروہ مومنین
۱۹۷	استعمال کذب	۱۷۹	دوسرا گروہ کافرین
۱۹۸	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 11]	۱۷۹	تیسرا گروہ منافقین
۱۹۹	فساد کی تحقیق	۱۷۹	اعرابی تعلق
۲۰۰	حرف اذا کا معنی	۱۸۰	الناس کی لغوی تحقیق
۲۰۰	اذا کی مختلف صورتیں	۱۸۰	پہلا احتمال
۲۰۱	فساد کا معنی	۱۸۰	دوسرا احتمال

صفحہ	ایجاب	صفحہ	ایجاب
۲۳۵	وقود کا معنی	۲۰۱	ارض کا صیغہ
۲۳۶	نار کا معنی	۲۰۱	صلح کا مفہوم
۲۳۶	لنا کا معنی اور استعمال	۲۰۱	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 12]
۲۳۶	ضیاء ہے کیا؟	۲۰۲	حرف الّا
۲۳۷	لفظ حول کا معنی	۲۰۳	نوٹ
۲۳۷	لفظ ذہب کا معنی	۲۰۳	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 13]
۲۳۸	نور کا مفہوم	۲۰۵	توبہ زندقہ
۲۳۸	لفظ ترک کا معنی	۲۰۵	سفاہت کا مفہوم
۲۳۸	لفظ ظلم کی تحقیق	۲۰۶	علم کا معنی
۲۳۹	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 18]	۲۰۷	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 14]
۲۴۲	لصم کا معنی	۲۱۱	لفظ لتوا کی تحقیق
۲۴۳	صم کا معنی	۲۱۲	تحقیق لفظ خلا
۲۴۳	بکم کا معنی	۲۱۳	الی حرف جار کی تحقیق
۲۴۳	عمی کا معنی	۲۱۴	مفہوم استہزاء
۲۴۴	رجوع کا اصل معنی	۲۱۴	استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسا؟
۲۴۴	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 19]	۲۱۵	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 15]
۲۵۰	مفہوم ساء	۲۱۹	نکا معنی اور استعمال
۲۵۱	مفہوم ظلم	۲۲۱	مفہوم طغیان
۲۵۱	رعد کا معنی	۲۲۱	یعمہون کا معنی
۲۵۲	رعد فرشتے کا نام	۲۲۲	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 16]
۲۵۲	برق کا مفہوم	۲۲۳	بیع اور شراء کا مفہوم
۲۵۲	جعل کا معنی	۲۲۵	لفظ تجارت کی تحقیق
۲۵۲	اصح کیا ہے؟	۲۲۵	تحقیق لفظ ریح
۲۵۲	اذن کا معنی	۲۲۶	احداء کی تحقیق
۲۵۳	تحقیق لفظ صاعقہ	۲۲۸	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 17]
۲۵۳	صاعقہ کی اقسام	۲۲۹	مثل کی تحقیق
۲۵۳	حذر کا معنی	۲۳۵	مثل کی تعریف

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۲۹۳	لفظ معنی کی تحقیق	۲۵۴	خوف کا معنی
۲۹۳	شرک کا اصل معنی	۲۵۴	موت کا معنی
۲۹۳	مفہوم نزول	۲۵۴	موت کی اقسام
۲۹۵	ماء کی اصل	۲۵۶	الجانظ کا مطلب
۲۹۵	خرج کا معنی	۲۵۶	کفر کے معانی
۲۹۵	انعداد کا معنی	۲۵۶	کفر کا اصطلاحی معنی
۲۹۶	علم کا معنی	۲۵۶	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 20]
۲۹۶	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 23]	۲۶۲	قاد اور قدیر میں فرق
۳۰۴	تحقیق لفظ عبد	۲۶۶	تنبیہ
۳۰۶	ایتان کی عمدہ تحقیق بالتفصیل	۲۶۷	کاد کی تحقیق
۳۰۸	لفظ سورۃ سے کیا مراد ہے؟	۲۶۸	خطف کی تحقیق
۳۰۹	لفظ دعا کا معنی	۲۶۸	تنبیہ
۳۰۹	تحقیق لفظ شہید	۲۶۸	مفہوم ضواء
۳۱۲	صدق کا معنی	۲۶۹	مشی کا معنی
۳۱۲	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 24]	۲۷۰	نوٹ
۳۱۵	حرف لہن کی تحقیق	۲۷۰	شی کی عمدہ تحقیق
۳۱۷	حرف لم کا استعمال	۲۷۱	تنبیہ
۳۱۸	فعل کا معنی	۲۷۱	ان اور ان کی تحقیق
۳۱۸	لفظ وقی کا مفہوم	۲۷۳	شی کی بعض کے نزدیک تعریف
۳۱۹	نار کی تعریف	۲۷۳	قدیر کے کہتے ہیں؟
۳۱۹	حجر کے کہتے ہیں؟	۲۷۴	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 21]
۳۱۹	تحقیق لفظ عدد	۲۸۰	خلق کا معنی
۳۲۰	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 25]	۲۸۰	تحقیق لعل
۳۳۰	بشر کی مفصل تحقیق	۲۸۲	[سورۃ البقرہ (2): آیہ 22]
۳۳۱	بشارۃ اور بشری	۲۹۱	تنبیہ
۳۳۱	عمل کا معنی	۲۹۲	لفظ فرش کی تحقیق عمیق
۳۳۲	لفظ صالح کا استعمال	۲۹۳	معنی سماء

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۳۵۸	تحقیق نسن	۳۳۲	جنت کا معنی
۳۵۸	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 27]	۳۳۲	اقسام جنت اور ان کے نام
۳۶۲	لفظ نقض کی تحقیق	۳۳۲	تحقیق جرئی یجری
۳۶۳	لفظ عہد کی تحقیق	۳۳۳	لفظ تحت کا مفہوم
۳۶۳	بیثاق کا معنی	۳۳۴	تحت اور اسفل میں فرق
۳۶۳	المیثاق کی تحقیق	۳۳۴	نہر کی تعریف
۳۶۳	الموثق کا معنی	۳۳۴	تشبیہ کا مفہوم
۳۶۳	لفظ قطع کی تعریف	۳۳۵	لفظ زوج کی تحقیق عمیق
۳۶۳	تحقیق امر	۳۳۷	لفظ طہارت کا معنی اور اقسام
۳۶۵	اتصال کا معنی	۳۳۷	مفہوم خلود
۳۶۵	فسد کا معنی	۳۳۸	نوٹ
۳۶۵	تحقیق خسارہ	۳۳۸	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 26]
۳۶۶	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 28]	۳۵۰	گناہ کبیرہ کے درجات
۳۷۱	اشکال اور اس کا جواب	۳۵۱	معنی حیا
۳۷۱	کیف کی کیفیات	۳۵۱	ضرب المثل کی تعریف
۳۷۲	مفہوم رجوع	۳۵۲	بعوضۃ
۳۷۲	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 29]	۳۵۲	تحقیق فوق
۳۷۷	جمع کی تعریف	۳۵۳	حرف انا کا استعمال
۳۷۷	استواء کا معنی	۳۵۳	علم کا مفہوم
۳۷۸	آسمان کے کہتے ہیں؟	۳۵۳	علم کی اقسام
۳۷۸	مساواة اور تسویہ کا معنی	۳۵۵	تحقیق حق
۳۷۸	تحقیق سبع	۳۵۶	القول اور القیل کا معنی
۳۷۹	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 30]	۳۵۶	مفہوم ارادہ
۳۸۳	اقسام ملائکہ	۳۵۶	اسم اشارہ ذاکا کا استعمال
۳۸۳	خليفة	۳۵۷	تعریف مثل
۳۸۳	خليفة سے کون ہستی مراد ہے؟	۳۵۷	مجاورہ
۳۸۳	خليفة کہنے کی وجہ	۳۵۷	معنی کثرت

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۳۰۷	دوران نماز منہ اور ناک چھپانا	۳۸۵	خلیفہ بنانے کی ضرورت
۳۰۸	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 34]	۳۹۰	لفظ ملائکہ کا اصل معنی
۳۰۹	سجدہ کا معنی اور اس کی اقسام	۳۹۰	تحقیق لفظ خلیفہ
۳۱۲	سجدہ کی فضیلت میں تین احادیث مبارکہ	۳۹۰	سفک کا معنی
۳۱۲	سجدے میں قُرب الہی	۳۹۱	دم کا اصل معنی
۳۱۲	اقسام سجدہ	۳۹۱	تحقیق لفظ سج
۳۱۶	حرف لام کی مفصل تحقیق	۳۹۲	تقدیس کا معنی
۳۱۶	(1) لام للتعدیہ	۳۹۲	مخطفۃ القدس
۳۱۶	(2) لام بمعنی ملک اور استحقاق	۳۹۳	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 31]
۳۱۸	(3) لام ابتداء	۳۹۳	لفظ آدم عربی ہے یا عجمی؟
۳۱۸	(4) لام جو ان کے بعد آتا ہے	۳۹۶	لفظ تعلیم کی تحقیق
۳۱۹	(5) لام مخففہ	۳۹۷	لفظ آدم کی تحقیق اعظم
۳۱۹	(6) لام قسم	۳۹۸	عرض کا معنی
۳۱۹	(7) لو کی خبر پر داخل ہونے والا لام	۳۹۸	لفظ نباء کا مفہوم
۳۲۰	(8) وہ لام جو مدعا کے لئے استعمال ہو	۳۹۹	صدق کا مفہوم
۳۲۰	(9) لام امر	۳۹۹	سج کی فضیلت
۳۲۰	سجدہ کا معنی	۳۹۹	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 32]
۳۲۱	سجدہ اختیاری	۴۰۱	سجان کی تعریف
۳۲۱	سجدہ تنخیری	۴۰۱	حکمت کیا ہے؟
۳۲۱	لفظ ابلیس کا معنی	۴۰۲	حکمت ودانائی کی باتیں
۳۲۲	لفظ ابی کا مفہوم	۴۰۳	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 33]
۳۲۲	مفہوم کبیر	۴۰۵	بدا کا اصل معنی
۳۲۲	مفہوم استکبار	۴۰۶	تحقیق لفظ کتم
۳۲۳	کان کی مفصل تحقیق	۴۰۶	قول ابن عباس رضی اللہ عنہ
۳۲۵	تکبر کرنے والا پکڑا گیا	۴۰۷	قول حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ
۳۲۵	تکبر کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا	۴۰۷	تشدت چھپانا
۳۲۵	بؤیس اور طیبۃ النہال	۴۰۷	علم دین کو چھپانا گناہ ہے

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۴۴۳	اسطر کا معنی و مفہوم:-	۴۲۵	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 35]
۴۴۳	تحقیق لفظ متاع	۴۲۸	سکون کی تعریف
۴۴۳	صین کا مطلب	۴۲۹	زوج کا معنی
۴۴۴	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 37]	۴۳۱	اکل کا لغوی و مجازی معنی
۴۴۶	تحقیق حلقی	۴۳۱	تحقیق لفظ رغد
۴۴۶	کلم کی تعریف	۴۳۲	مرغاد کے کہتے ہیں؟
۴۴۶	توبہ کا معنی	۴۳۲	حیث کا استعمال
۴۴۷	ابن سینا کی توبہ	۴۳۲	لفظ قرب کی تحقیق
۴۴۷	توبہ کرنے والے سے اللہ عزوجل خوش ہوتا ہے	۴۳۳	شجر کی تعریف
۴۴۷	اعتذار کی صورتیں	۴۳۴	شجر کے کہتے ہیں؟
۴۴۷	پہلی صورت	۴۳۴	ایک عجیب و غریب درخت
۴۴۷	دوسری صورت	۴۳۴	مبارک درخت
۴۴۸	تیسری صورت	۴۳۴	ظلم کا لغوی معنی
۴۴۸	شرعاً توبہ	۴۳۴	ظلم کی اقسام
۴۴۸	تواب کا معنی	۴۳۵	(1) پہلی قسم
۴۴۹	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 38]	۴۳۵	(2) دوسری قسم
۴۵۲	جمع کا معنی	۴۳۵	(3) تیسری قسم
۴۵۲	تحقیق لفظ تبع	۴۳۵	حکایت
۴۵۳	خوف کی تعریف اور اس کا استعمال	۴۳۶	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 36]
۴۵۳	حزن کی تعریف	۴۳۹	الزلزلہ کی تحقیق
۴۵۳	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 39]	۴۴۰	حدیث پاک
۴۶۱	لفظ آیت کا معنی	۴۴۰	الزلزل کا معنی
۴۶۱	لفظ صاحب کی تحقیق و معنی	۴۴۱	لفظ خرج کا مفہوم
۴۶۳	نار کی تعریف	۴۴۱	لفظ ہبوط کی مفصل تحقیق
۴۶۳	خلد کیا ہے؟	۴۴۲	محاورہ
۴۶۳	شعر	۴۴۲	لفظ بعض کا معنی
۴۶۳	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 40]	۴۴۲	عدو کی تعریف

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۴۸۳	لفظ القام کا معنی	۴۶۸	ذکر کی تحقیق
۴۸۳	الصلوة کا معنی	۴۶۸	پانچ باتوں کی وحی
۴۸۳	الصلوة فی اللغۃ	۴۶۹	ذکر کی فضیلت
۴۸۵	باجاماعت نماز کی فضیلت	۴۶۹	رفیق اعلیٰ میں بندے کا ذکر
۴۸۵	لفظ زکوٰۃ کی تحقیق	۴۶۹	نعت کے کہتے ہیں؟
۴۸۷	میاں مٹھو	۴۶۹	لفظ اوفوا تحقیق
۴۸۸	گرم سہ	۴۷۰	عہد کا مفہوم
۴۸۸	لفظ رکوع کا مفہوم	۴۷۰	ایفای عہد کی بہترین مثال
۴۸۹	شعر	۴۷۰	عہد شکنی کی وعید
۴۸۹	صحابہ کرام اور رکوع	۴۷۱	عہد توڑنے والے پر لعنت
۴۸۹	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 44]	۴۷۱	تحقیق لفظ رعب
۴۹۱	تحقیق حرف الف بالتحلف	۴۷۱	دلچسپ حکایت
۴۹۱	پہلی قسم	۴۷۲	رعب کا معنی
۴۹۳	دوسری قسم	۴۷۲	رعبانیہ کی تعریف
۴۹۳	تیسری قسم	۴۷۲	الارحاب کا معنی
۴۹۳	چوتھی قسم	۴۷۲	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 41]
۴۹۳	پانچویں قسم	۴۷۵	ثمن کی تعریف
۴۹۴	امر کا معنی	۴۷۶	معنی قلت
۴۹۴	لفظ بز کا مفہوم	۴۷۶	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 42]
۴۹۶	بررۃ اور البریر	۴۷۷	لیس کا معنی
۴۹۶	بلی اور چوہا	۴۷۸	تحقیق لفظ حق
۴۹۶	لفظ نسیان کی تحقیق	۴۷۸	لفظ حق کا استعمال
۴۹۷	حدیث پاک	۴۷۹	تحقیق باطل
۴۹۸	لفظ تلا (تلاوت) کا معنی	۴۷۹	لفظ کتم کا معنی بالتحقیق
۴۹۸	تلاوت قرآن کی فضیلت	۴۸۰	حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول
۴۹۸	تلاوت نہ کرنے والے کا انجام	۴۸۱	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 43]
۴۹۹	قرآن اور دوست کا بیج	۴۸۲	تحقیق لفظ اقامت

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۵۱۴	تحقیق عمیق لفظ العدل	۴۹۹	موسیقی کے ساتھ قرآن کی تلاوت
۵۱۵	عدل مطلق	۴۹۹	عقل کی تعریف
۵۱۵	عدل شرعی	۴۹۹	عقل کے معانی
۵۱۷	نصرت کا معنی	۴۹۹	پہلا معنی
۵۱۷	[سورة البقرة (2): آية 49]	۵۰۰	دوسرا معنی
۵۲۰	نجوم کا مفہوم	۵۰۰	آدمی دنیا سے زیادہ عقل
۵۲۰	لفظ فرعون کا معنی	۵۰۰	[سورة البقرة (2): آية 45]
۵۲۱	لفظ ساء کی عمدہ تحقیق	۵۰۲	استعانتہ
۵۲۳	لفظ ذبح کا اصل معنی	۵۰۲	صبر کی تعریف
۵۲۳	سعد الداع	۵۰۲	حدیث پاک
۵۲۳	تحقیق لفظ الابن	۵۰۳	تحقیق خشوع
۵۲۵	حضرت لوط علیہ السلام کا قوم سے خطاب	۵۰۴	[سورة البقرة (2): آية 46]
۵۲۵	لفظ حياء کا مفہوم	۵۰۵	لفظ ظن کا مفہوم
۵۲۵	بوڑھا مسلمان	۵۰۵	گمان
۵۲۵	لفظ نساء کا مفہوم	۵۰۵	بدگمانی کی حرمت کا سبب
۵۲۶	تحقیق علی	۵۰۵	[سورة البقرة (2): آية 47]
۵۲۶	عظیم کا معنی	۵۰۶	الذکر کی کا معنی
۵۲۷	[سورة البقرة (2): آية 50]	۵۰۷	تحقیق لفظ فضل
۵۳۰	لفظ فرقہ کی تحقیق	۵۰۸	[سورة البقرة (2): آية 48]
۵۳۰	لفظ بحر کی تحقیق	۵۱۰	تعریف لفظ یوم
۵۳۱	غرق کا معنی	۵۱۰	لفظ جزاء کا معنی
۵۳۱	لفظ نظر کا مفہوم	۵۱۱	الجزاء کا معنی
۵۳۲	[سورة البقرة (2): آية 51]	۵۱۱	قبل و قبل کی تحقیق
۵۳۳	تحقیق لفظ وعدہ	۵۱۲	لفظ شفاعت کی عمدہ تحقیق
۵۳۳	لیل کا معنی	۵۱۳	حدیث پاک
۵۳۳	لفظ عجل کا معنی	۵۱۳	بَشَفَعَهُ اور شَفَعَهُ کا معنی
۵۳۳	معجل کے کہتے ہیں؟	۵۱۳	لفظ اخذ کی تحقیق

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۵۵۱	التفصیل الآخر للفظ الاخذ	۵۳۴	[سورة البقرة (2): الآيات 52 الى 53]
۵۵۲	الصاعقة کی تحقیق مع صقع اور صق میں فرق	۵۳۶	لفظ عنقوی تحقیق
۵۵۲	اقسام صاعقة	۵۳۷	المعانی کے کہتے ہیں؟
۵۵۲	اول	۵۳۷	شکر کا معنی
۵۵۲	دوم	۵۳۸	شکر کی قسمیں
۵۵۲	سوم	۵۳۸	الفرقان کی تحقیق
۵۵۳	[سورة البقرة (2): الآيت 56]	۵۳۹	لفظ احداء کی تحقیق بالتفصیل
۵۵۳	تحقیق لفظ بعث	۵۴۰	المبعث کی تعریف
۵۵۳	بعث کی اقسام	۵۴۱	[سورة البقرة (2): آية 54]
۵۵۳	بعث بشری	۵۴۲	لفظ قوم کا معنی
۵۵۳	بعث الہی	۵۴۲	اخذ اور استحاذ کا معنی
۵۵۵	[سورة البقرة (2): الآيت 57]	۵۴۵	توبہ کا معنی اور اقسام
۵۵۷	لفظ ظلل کا مفہوم	۵۴۵	پہلی صورت
۵۵۷	ظلل اور قبی میں فرق	۵۴۵	دوسری صورت
۵۵۷	لفظ غم کی تحقیق	۵۴۵	تیسری صورت
۵۵۸	من وسلوی کیا تھا؟	۵۴۵	شرعاً توبہ
۵۵۸	اکل کا معنی	۵۴۵	لفظ الباری کی تعریف
۵۵۹	مفہوم طاب	۵۴۶	قتل کا معنی
۵۵۹	[سورة البقرة (2): آية 58]	۵۴۶	تحقیق خیر و شر
۵۶۲	دخول کی تحقیق	۵۴۶	خیر مطلق
۵۶۲	قریہ کی تعریف	۵۴۶	خیر و شر مقید
۵۶۳	حیث کا استعمال	۵۴۶	لفظ تواب کس پر بولا جائے گا؟
۵۶۳	تحقیق لفظ باب	۵۴۷	تحقیق لفظ رحم
۵۶۳	تعریف سجده	۵۴۸	[سورة البقرة (2): آية 55]
۵۶۳	اقسام سجود	۵۵۰	تحقیق لفظ الرویۃ
۵۶۳	سجود اختیاری	۵۵۰	اقسام روایت
۵۶۵	سجود تسخیری	۵۵۱	جہر کا معنی

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۵۸۱	فجر کی وجہ تسمیہ	۵۶۵	لفظ حط کا مفہوم
۵۸۱	فجر کی اقسام	۵۶۵	لفظ غفر کا معنی
۵۸۲	تحقیق بالتفصیل للفظ العین	۵۶۵	تحقیق لفظ خطا
۵۸۲	پہلا معنی	۵۶۶	پہلی صورت
۵۸۲	دوسرا معنی	۵۶۶	دوسری صورت
۵۸۳	تیسرا معنی	۵۶۶	تیسری صورت
۵۸۳	چوتھا معنی	۵۶۶	الخطیۃ
۵۸۳	پانچواں معنی	۵۶۷	مفہوم احسان
۵۸۳	شراب کی تعریف	۵۶۸	[سورة البقرة (2): آية 59]
۵۸۵	المشرب کی تعریف	۵۶۹	چوبیس ہزار ہلاک
۵۸۶	فساد کی تعریف	۵۶۹	لفظ بدل کی عمدہ تحقیق
۵۸۶	[سورة البقرة (2): آية 61]	۵۷۱	البادلہ کسے کہتے ہیں؟
۵۹۱	تعریف صبر	۵۷۱	لفظ غیر کی تعریف
۵۹۲	لفظ طعام کی بہترین تحقیق	۵۷۱	تحقیق لفظ رجز
۵۹۳	تحقیق لفظ ثبت	۵۷۱	راجز، رجاز اور رجازۃ
۵۹۳	تعریف لفظ نقل	۵۷۲	رجازۃ کسے کہتے ہیں؟
۵۹۵	المبطلۃ	۵۷۲	لٹی کی تحقیق
۵۹۵	قائمھا کی تعریف	۵۷۲	رجح اور رجوع میں فرق
۵۹۵	فوم کی تعریف	۵۷۳	[سورة البقرة (2): آية 60]
۵۹۵	عدس کی تعریف	۵۷۶	استقاء کا معنی
۵۹۶	بصل کی تعریف	۵۷۶	لفظ ضرب کی عمدہ تحقیق
۵۹۶	حرف الف کی مفصل تحقیق	۵۷۸	ضرب اللین
۵۹۶	اول	۵۷۹	مضاربتہ
۵۹۸	دوم	۵۷۹	اضطراب
۵۹۸	سوم	۵۷۹	لفظ عصا کا معنی
۵۹۸	چہارم	۵۸۰	حجر کی تعریف
۵۹۸	پنجم	۵۸۱	تعریف فجر

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۶۱۷	تحقیق لفظ فوق	۵۹۹	لفظ دنی کا معنی
۶۱۷	پہلی قسم	۶۰۰	مصر کی تعریف
۶۱۸	دوسری قسم	۶۰۱	سوال کا معنی
۶۱۸	تیسری قسم	۶۰۱	ضرب المثل
۶۱۸	چوتھی قسم	۶۰۱	ذلت کیا ہے؟
۶۱۸	پانچویں قسم	۶۰۲	تحقیق سکن
۶۱۹	پانچویں قسم	۶۰۳	البواء کی مفصل تحقیق
۶۱۹	لفظ طور کی تحقیق	۶۰۳	مجاورہ
۶۱۹	الطور سے کون سا پہاڑ مراد ہے؟	۶۰۳	الباء کا معنی
۶۲۰	[سورة البقرة (2): الآيات 64]	۶۰۳	تحقیق لفظ نبی
۶۲۱	لفظ ولی کی تحقیق	۶۰۵	النبوة والنباوة کے معنی
۶۲۲	حرف لولا کا استعمال	۶۰۵	لفظ حق کا معنی
۶۲۲	تحقیق فضل	۶۰۶	لفظ عدد کی تحقیق
۶۲۳	لفظ خسران کا معنی	۶۰۷	[سورة البقرة (2): آية 62]
۶۲۳	[سورة البقرة (2): الآيات 65]	۶۱۰	لفظ یہود کا معنی
۶۲۵	السبت کی تحقیق	۶۱۱	لفظ نصاریٰ کا معنی
۶۲۵	قرودہ کی تحقیق	۶۱۱	تحقیق لفظ صبی
۶۲۶	القراد کا معنی	۶۱۲	الصائبین کا معنی
۶۲۶	لفظ خساء کا مفہوم	۶۱۲	تعریف العمل
۶۲۷	[سورة البقرة (2): الآيات 66]	۶۱۲	تعریف لفظ صالح
۶۲۷	لفظ نکل کا مفہوم	۶۱۳	لفظ اجر کی تحقیق
۶۲۸	حدیث پاک	۶۱۳	مجاورہ
۶۲۸	تحقیق بین	۶۱۳	عند کا استعمال
۶۲۹	خلف کا معنی	۶۱۵	خوف کی تعریف
۶۲۹	لفظ وعظ کی تحقیق	۶۱۵	الخويف کا معنی
۶۳۰	[سورة البقرة (2): آية 67]	۶۱۵	حزن کی تعریف
۶۳۱	مال دار بوڑھا	۶۱۶	[سورة البقرة (2): الآيات 63]

صفحہ	ابواب	صفحہ	ابواب
۲۵۰	[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 72]	۲۳۲	لفظ بقر کی تعریف
۲۵۱	نفس کا معنی	۲۳۳	لفظ استہزاء کی تعریف
۲۵۱	تحقیق لفظ درہ	۲۳۳	جہالت اور اس کی اقسام
۲۵۲	حدیث پاک	۲۳۳	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 68]
۲۵۲	ادار اتم کا معنی	۲۳۵	لفظ بیان کی تحقیق
۲۵۲	لفظ آسمان کی تحقیق	۲۳۷	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 69]
۲۵۳	[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 73]	۲۳۸	تحقیق لون
۲۵۶	لفظ بعض کا معنی	۲۳۹	صفر کیا ہے؟
۲۵۶	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 74]	۲۴۰	نحاس، سفار، صغیر اور پیٹ کا سانپ
۲۵۸	تحقیق قست	۲۴۰	ماہ صفر کی وجہ تسمیہ
۲۵۹	قلب کا معنی	۲۴۰	لفظ فقح کا مفہوم
۲۵۹	حجر کی تعریف	۲۴۰	فقح اور فحاح کا معنی
۲۵۹	شد کا معنی	۲۴۰	پانی کا بلبلہ
۲۵۹	لفظ شق کا معنی	۲۴۰	سرور کیا ہے؟
۲۶۰	خشیت کی تعریف	۲۴۱	السریہ
۲۶۱	غفلت کی تعریف	۲۴۱	سریر المیت
۲۶۱	غفلت شرمندگی	۲۴۲	سجن المومن
۲۶۱	بڑی حسرت	۲۴۲	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 70]
۲۶۱	شعر	۲۴۳	لفظ شہد کی تحقیق
۲۶۱	حکایت	۲۴۳	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 71]
۲۶۲	[سورۃ البقرۃ (2): آیہ 75]	۲۴۷	تیسر کا معنی
۲۶۳	فریق کی تعریف	۲۴۷	ارض کے کہتے ہیں؟
۲۶۳	کلام کا معنی	۲۴۷	لفظ معنی کا مفہوم
۲۶۳	مادورہ	۲۴۸	لفظ حث کی تعریف و تحقیق
۲۶۳	الحرف	۲۴۹	شیہ کا مفہوم اور اس کی اصل
۲۶۳	[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 76]	۲۴۹	لفظ جاء کی تحقیق
۲۶۶	خلاء کی لغوی و اصطلاحی تحقیق	۲۵۰	تعریف الفعل

صفحہ	الباب	صفحہ	الباب
۲۸۵	[سورة البقرة (2): آية 80]	۲۶۷	حدوث کی تعریف
۲۸۷	لفظ مس اور لس کی تحقیق	۲۶۸	لفظ الفتح کی عمدہ تحقیق
۲۸۷	تاریخ کی تعریف	۲۶۸	قسم اول
۲۸۷	آگ سے ڈرو	۲۶۹	قسم دوم
۲۸۷	لفظ عہد کا مفہوم	۲۶۹	الفاظ کے کہتے ہیں؟
۲۸۸	وعدہ خلافی کرنے والا ملعون	۲۷۰	لفظ حاجب کی تحقیق
۲۸۸	خلف کا معنی	۲۷۱	لفظ حج کا معنی
		۲۷۱	عند کا استعمال
		۲۷۲	[سورة البقرة (2): الآيات 77]
		۲۷۲	تحقیق اسرار
		۲۷۳	سارہ کا معنی
		۲۷۳	سرة البطن کا معنی
		۲۷۵	لفظ علانیہ کی تعریف
		۲۷۵	[سورة البقرة (2): الآيات 78]
		۲۷۷	لفظ اتی کی تحقیق
		۲۷۷	فراء کا نظریہ
		۲۷۸	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ
		۲۷۸	التبنی کی تحقیق
		۲۷۹	امنیہ کا معنی
		۲۷۹	قول عثمان غنی رضی اللہ عنہ
		۲۸۰	ظن کا معنی
		۲۸۰	[سورة البقرة (2): الآيات 79]
		۲۸۲	ویل اور ویس کی تحقیق
		۲۸۲	الید کا معنی
		۲۸۳	قلت کا مفہوم
		۲۸۳	لفظ کسب کی تحقیق
		۲۸۳	حدیث پاک

جمع قرآن کی تاریخ

حقیقی طور پر قرآن عظیم کو جمع فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ" (سورۃ قیامہ آیت نمبر ۱۷)

پیشک اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔

حضور سید المرسلین ﷺ نے اپنے مقدس زمانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبریل علیہ السلام کے بیان کے مطابق قرآن مجید کو لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق صحابہ کرام کو بیان فرمایا اور اس کی صورت یہ تھی کہ قرآن مجید 23 سال کے عرصے میں حالات و واقعات کے حساب سے جدا جدا آیتیں ہو کر نازل ہوا، کسی سورت کی کچھ آیتیں نازل ہوتیں پھر دوسری سورت کی کچھ آیتیں اترتیں، پھر پہلی سورت کی آیتیں نازل ہوتیں، حضور پر نور ﷺ ہر بار ارشاد فرماتے کہ یہ آیات فلاں سورت کی ہیں لہذا اسے فلاں آیت کے بعد اور فلاں آیت سے پہلے رکھا جائے، چنانچہ وہ آیات اسی سورت میں اور اسی جگہ پر رکھ دی جاتیں۔ اسی ترتیب کے مطابق حضور اقدس ﷺ اور آپ ﷺ سے سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں اور تلاوت کے دوران قرآن مجید پڑھتے۔

اس دور میں سارا قرآن عظیم کتابی شکل میں ایک جگہ جمع نہیں تھا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں محفوظ تھا اور مُخْفَرِک کاغذوں، پتھر کی تختیوں، بکری دہنے کی کھالوں، اونٹوں کے شانوں اور پسلیوں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا۔ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نبوت کے جھوٹے دعوے دار ملعون مُتَسَلِّمہ کذاب سے جنگ ہوئی تو اس میں بہت سے حفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر گزارش کی کہ اس لڑائی میں بہت سے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے ہیں جن کے سینوں میں قرآن عظیم تھا، اگر اسی طرح جہادوں میں حفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوتے گئے اور قرآن عظیم کو ایک جگہ جمع نہ کیا گیا تو قرآن مجید کا بہت سا حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہنے کا اندیشہ ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اس بات کا حکم دیں کہ قرآن مجید کی سب سورتیں ایک جگہ جمع کر لی جائیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

”جو کام حضور اقدس ﷺ نے نہ کیا وہ ہم کیسے کریں؟“

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اگرچہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ کام نہ کیا لیکن خدا کی قسم! یہ کام بھلائی کا ہے۔ آخر کار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی رائے پسند آگئی اور آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت انصاری

اور دیگر حفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس عظیم اور اہم ترین کام کا حکم دیا اور کچھ ہی عرصے میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سارا قرآن عظیم ایک جگہ جمع ہو گیا، ہر سورت ایک جدا صحیفے میں تھی اور وہ صحیفے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حین حیات آپ رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، ان کے بعد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رہے۔

عرب میں چونکہ بہت سے قبیلے رہتے تھے اور ہر قوم اور قبیلے کی زبان کے بعض الفاظ کا تلفظ اور لہجے مختلف تھے اور حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس زمانے میں قرآن عظیم نیا نیا اترا تھا اور ہر قوم و قبیلہ کو اپنے مادری لہجے اور پرانی عادات کو یک دم بدلنا دشوار تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان پر یہ آسانی فرمادی گئی تھی کہ عرب میں رہنے والی ہر قوم اپنی طرز اور لہجے میں قرآن مجید کی قراءت کرے اگرچہ قرآن مجید "لغت قریش" پر نازل ہوا تھا۔ زمانہ نبوت کے بعد چند مختلف قوموں کے بعض افراد کے ذہنوں میں یہ بات جم گئی کہ جس لہجے اور لغت میں ہم پڑھتے ہیں اسی میں قرآن کریم نازل ہوا ہے، اس طرح کوئی کہنے لگا کہ قرآن اس لہجے میں ہے اور کوئی کہنے لگا نہیں بلکہ دوسرے لہجے میں ہے یہاں تک کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ نوبت آگئی کہ لوگ اس معاملے میں ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بات کی خبر پہنچی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

"ابھی سے تم میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو آئندہ تم سے کیا امید ہے؟"

چنانچہ امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے کے مطابق یہ طے پایا کہ اب ہر قوم کو اس کے لب و لہجے کی اجازت میں مصلحت نہ رہی بلکہ اس سے فتنہ اٹھ رہا ہے لہذا پوری امت کو خاص "لغت قریش" پر جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے جمع کر دینا اور باقی لغتوں سے باز رکھنا چاہئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو صحیفے جمع فرمائے تھے وہ اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے منگوا کر ان کی نقلیں لی جائیں اور تمام سورتیں ایک مصحف میں جمع کر دی جائیں، پھر وہ مصاحف اسلامی شہروں میں بھیج دیئے جائیں اور سب کو حکم دیا جائے کہ وہ اسی لہجے کی پیروی کریں اور اس کے خلاف اپنے اپنے طرز ادا کے مطابق جو صحائف یا مصاحف بعض لوگوں نے لکھے ہیں فتنہ ختم کرنے کے لئے وہ تلف کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اسی درست رائے کی بناء پر امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے وہ صحائف منگوائے اور ان کی نقلیں تیار کر کے تمام شہروں میں بھیج دی گئیں۔ اسی عظیم کام کی وجہ سے امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو "جامع القرآن" کہا جاتا ہے۔ (فتاویٰ رضویہ، ۲۶/۲۷-۲۳۹-۲۵۲، ملخصاً)

تفسیر قرآن کی تاریخ:

تفسیر قرآن کی تاریخ تقریباً چار ادوار پر مشتمل ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

دورِ اوّل:

قرآن مجید روشن عربی زبان میں اور لغت عرب کے اسلوب اور بیان کے مطابق نازل ہوا، اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس عظیم کلام کو سمجھ لیتے اور انہیں اس کے اغراض و مقاصد معلوم ہو جاتے لیکن چونکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علمی اور عقلی اعتبار سے ایک جیسے نہ تھے بلکہ علم و فہم کے لحاظ سے ان کے مراتب میں فرق تھا اس لئے جب کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو قرآن مجید کے کسی لفظ کے معنی سمجھنے میں دشواری ہوتی تو وہ بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کر دیتے اور نبی کریم ﷺ اس کے معنی بیان فرما کر ان کی تشنگی فرما دیتے، اسی طرح بعض اوقات نبی کریم ﷺ خود ہی قرآنی آیات کے معنی بیان فرما دیتے اور یہی وہ دور ہے جس میں قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے کی ابتداء ہوئی۔

اس مرحلے میں سب سے پہلے قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے معانی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے بیان فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی مراد کو سب سے زیادہ جانتا ہے اور اس کے بعد تاجدار رسالت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے قرآن عظیم کی تفسیر بیان فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے اس منصب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" (سورۃ نحل آیت نمبر 44)

اور اے حبیب! ہم نے تمہاری طرف یہ قرآن نازل فرمایا تاکہ تم لوگوں سے وہ بیان کر دو جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔

اور ارشاد فرماتا ہے:

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ. وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ" (سورۃ جمعہ آیت نمبر 2)

وہی (اللہ) ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتا ہے اور پیشک وہ اس سے پہلے ضلالت و گمراہی میں تھے۔

دورِ ثانی:

جب سرکارِ دو عالم ﷺ نے وصال فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقدس زمانہ آیا اور یہ وہ مبارک ہستیاں ہیں جنہوں نے براہِ راست سید المرسلین ﷺ سے قرآن عظیم کی تعلیم حاصل کی، ان میں سے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے تھے جنہوں نے اس کام کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ انہوں نے اہل زبان ہونے اور نزول قرآن کے ماحول سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود اپنی زبانِ دانی پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ رسول اللہ ﷺ سے قرآن مجید سیکھا اور اس کے

اسرار و رموز کی معلومات حاصل کیں۔ مشہور تابعی عالم حضرت ابو عبد الرحمن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جو حضرات ہمیں قرآن عظیم کی تعلیم دیا کرتے تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سکھتے اور اس وقت تک ان سے آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ہم ان آیات کی تمام علمی اور عملی باتوں کا علم حاصل نہ کر لیں۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب فضائل القرآن، فی تعلیم القرآن کم آية، ۱۵۲/۷، الحدیث: ۱)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جب کوئی شخص (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے) سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا تو وہ ہماری نظروں میں بہت قابل احترام ہو جاتا تھا۔“ (شرح السنہ، کتاب الفضائل، باب علامات النبوة، ۷/۷۶، الحدیث: ۳۶۱۹)

دورِ مثالث:

اس دور میں جب لوگوں کو قرآنی آیات کے معنی سمجھنے میں مشکل ہوئی تو انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بارگاہ میں حاضری دی اور چشمہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضیاب ہونے والی ان ہستیوں سے مطالبہ مفسر تالبعین: مشہور مفسرین کے اسمائے گرامی:

تالبعین میں سے چند مشہور مفسرین کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

- (1) حضرت ابن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (2) حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (3) حضرت سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (4) حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (5) حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (6) حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (7) حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (8) حضرت ابن شہاب زہری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (9) حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (10) حضرت مجاہد بن جہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (11) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (12) حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (13) حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- (14) حضرت امام ابن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(15) حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(16) حضرت امام شعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

دور چہارم:

تابعین کے بعد اموی اور عباسی خلفاء کے دور میں تفسیر قرآن پر بہت کام ہوا اور اس وقت سے لے کر اب تک مختلف زبانوں میں اور مختلف اقسام میں کثیر تفاسیر لکھی گئی ہیں۔

مشہور عربی تفاسیر کے نام:

عربی کی شہرہ آفاق تفاسیر میں سے بیضاوی شریف کے علاوہ چند مشہور تفاسیر یہ ہیں:

مصنف کا نام

نمبر شمار تفسیر کا نام

- 1 جَامِعُ الْبَيَانِ فِي تَأْوِيلِ الْقُرْآنِ ابو جعفر محمد بن جریر طبری رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 2 بَحْرُ الْعُلُومِ فِيهِ ابُولَيْثِ نصر بن محمد سمرقندی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى
- 3 تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ حافظ عبد الرحمن بن محمد ابن ابی حاتم رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 4 تَأْوِيلَاتُ أَهْلِ السُّنَّةِ ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 5 التَّكْمِلَةُ وَالْعَيْوُنُ ابو الحسن علی بن محمد ماوردی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 6 الْوَجِيزُ فِي تَفْسِيرِ الْكِتَابِ الْعَزِيزِ ابو الحسن علی بن احمد واحدی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 7 أَحْكَامُ الْقُرْآنِ ابو بکر احمد بن علی جصاص رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 8 أَحْكَامُ الْقُرْآنِ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 9 أَحْكَامُ الْقُرْآنِ ابو بکر محمد بن عبد اللہ ابن عربی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 10 مَعَالِمُ التَّنْزِيلِ فِي تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ ابو محمد حسین بن مسعود بنغوی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 11 زَادُ الْمَسِيرِ فِي عِلْمِ التَّفْسِيرِ امام جمال الدین عبد الرحمن بن علی بغدادی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 12 التَّفْسِيرُ الْكَبِيرُ ابو عبد اللہ محمد بن عمر رازی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 13 الْجَمَاعُ لِأَحْكَامِ الْقُرْآنِ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 14 أَنْوَارُ التَّنْزِيلِ وَأَسْرَارُ التَّأْوِيلِ ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر بیضاوی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 15 مَدَارِكُ التَّنْزِيلِ وَحَقَائِقُ التَّأْوِيلِ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 16 لِبَابِ التَّأْوِيلِ فِي مَعَانِي التَّنْزِيلِ علاء الدین علی بن محمد خازن رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ

- 17 اَبُو حِيَانِ مُحَمَّدِ بْنِ يُوْسُفَ الدُّلَيْسِيِّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 18 تَفْسِيرُ الْكِتَابِ فِي عُلُومِ الْكِتَابِ اَبُو حَفْصٍ سِرَاجِ الدِّينِ عَمْرُ بْنُ عَلِيٍّ دِمَشْقِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 19 تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ اَبُو الْفِدَاءِ اِسْمَاعِيلُ بْنُ عَمْرِ بْنِ كَثِيرٍ دِمَشْقِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 20 اَلْكَذُّ الْمُنْفُورُ فِي الْقَاوِيلِ بِالْمَأْتُوْرِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ، جَلالُ الدِّينِ سَيُوْطِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 21 تَفْسِيرُ الْجَلالَيْنِ جَلالُ الدِّينِ مَحَلِيٍّ وَجَلالُ الدِّينِ سَيُوْطِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 22 اِرْشَادُ الْعَقْلِ السَّلِيمِ اَبُو السَّعُوْدِ مُحَمَّدِ بْنِ مُحَمَّدِ عِمَادِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 23 رُوْحُ الْبَيَانِ شَيْخُ اِسْمَاعِيلِ حَقِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 24 رُوْحُ الْمَعَانِي شَهَابُ الدِّينِ سَيِّدُ مُحَمَّدٍ اَلْوَسِيُّ بَغْدَادِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 25 حَاشِيَةُ الْجَمَلِ عَلَى الْجَلالَيْنِ شَيْخُ سَلِيْمَانَ الْجَمَلِيِّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- 26 حَاشِيَةُ الصَّاوِي عَلَى الْجَلالَيْنِ عَلَامَةُ اَحْمَدِ صَاوِيٍّ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ
- تفسیر اور تاویل کی تعریف:

مفسرین نے تفسیر اور تاویل کی مختلف تعریفات کی ہیں، ان میں سے تفسیر کی ایک تعریف یہ ہے کہ قرآن مجید کے وہ احوال بیان کرنا جو عقل سے معلوم نہ ہو سکیں بلکہ ان میں نقل کی ضرورت ہو جیسے آیات کا شان نزول یا آیات کا نسخ و منسوخ ہونا بیان کرنا۔ تاویل قرآن کی ایک تعریف یہ ہے کہ قرآنی آیات کے مضامین اور ان کی باریکیاں بیان کی جائیں اور صرفی و نحوی قواعد اور دیگر علوم کے ذریعے قرآنی آیات سے طرح طرح کے نکات نکالے جائیں۔

تفسیر اور تاویل کا شرعی حکم:

قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے سے بیان کرنا حرام ہے اور اپنے علم و معرفت سے قرآن کی جائز تاویل بیان کرنا اہل علم کے لئے جائز اور باعث ثواب ہے۔ حضرت علامہ سلیمان جمل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”شراائط کے ساتھ تاویل بالرائے یعنی رائے سے تاویل کے جواز جبکہ تفسیر بالرائے یعنی رائے سے تفسیر کے ناجائز ہونے میں راز یہ ہے کہ تفسیر تو اللہ تعالیٰ پر گواہی دینا اور اس بات کا یقین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمہ کے یہ ہی معنی مراد لئے ہیں اور یہ بغیر بتائے جائز نہیں، اسی لئے امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے فیصلہ کر دیا کہ صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے اور تاویل چند احتمالات میں سے بعض کو یقین کے بغیر ترجیح دینے کا نام ہے (اس لئے یہ بغیر بتائے اہل علم کے لئے جائز ہے۔) (جمل، مقدمہ، ۱/۳)

مفسر کے لئے ضروری علوم:

علماء کرام نے مفسر کے لئے جن علوم کو ضروری قرار دیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

(1) لغت کا علم۔ (2) نحو کا علم۔ (3) صرف کا علم۔ (4) اشتقاق کا علم۔ (5، 6، 7) معانی، بیان اور بدیع کا علم۔ (8) قرابتوں کا علم۔ (9) اصول دین کا علم۔ (10) اصول فقہ کا علم۔ (11) اسباب نزول کا علم۔ (12) تاریخ اور منسوخ کا علم۔ (13) مجمل اور مبہم کی تفسیر پر مبنی احادیث کا علم۔

ان علوم کو سامنے رکھتے ہوئے ان خواتین و حضرات کو اپنے طرز عمل پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی حاجت ہے جو قرآن مجید کا صرف اردو ترجمہ اور تفسیر کی اردو کتب پڑھ کر ترجمہ و تفسیر کرنا اور اس کے معانی و مطالب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک اقدام ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص از خود میڈیکل کی کتابیں پڑھ کے اپنا کلینک کھول لے اور مریضوں کا علاج کرنا اور ان کے آپریشن کرنا شروع کر دے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ نازک قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا معاملہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا معنی و مفہوم اور اس کی مراد بیان کرنی ہوتی ہے اور یہ کام سیکھے بغیر کرنا اور علم کے بغیر کرنا جہنم میں پہنچا دے گا۔ اس لئے اگر کسی کو تفسیر بیان کرنے کا شوق ہے تو اسے چاہیے کہ باقاعدہ علوم دینیہ سیکھ کر اس کا اہل بنے۔

حضرت حسن بصری کا قول:

امام حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

عجمیوں کو اس بات نے ہلاک کر دیا کہ ان میں سے کوئی قرآن مجید کی آیت پڑھتا ہے اور وہ اس کے معانی سے جاہل ہوتا ہے تو وہ اپنی اس جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا شروع کر دیتا ہے۔

(البحر المحيط، مقدمة المؤلف، الترغیب فی تفسیر القرآن، ۱۱۹-۱۱۸/۱)

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ”جس شخص نے قرآن مجید میں بغیر علم کچھ کہا اسے اپنا ٹھکانہ دوزخ سمجھ لینا چاہئے۔“

(ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برأیه، ۳/۳۳۹، الحدیث: ۲۹۵۹)

درجات تفسیر:

تفسیر قرآن کے متعدد درجات ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ... تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآنی آیات سے کی جائے کیونکہ قرآن مجید میں بعض جگہ ایک حکم بیان کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس حکم کی مدت کے اختتام کا ذکر ہوتا ہے، اسی طرح ایک مقام پر کوئی بات مبہم ذکر کی جاتی ہے اور دوسری جگہ اس ابہام کو دور کر دیا جاتا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر خود اس کی آیات سے کی جائے۔

(2) تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ بِالْحَدِيثِ

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر تاجدار رسالت ﷺ کی احادیث سے کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو قرآن مجید کے معانی، احکام اور تمام اسرار و رموز سکھادیئے ہیں، اس لئے جب قرآن مجید کی تفسیر قرآنی آیت سے نہ ملے تو حضور پر نور ﷺ کی احادیث سے ان کی تفسیر بیان کی جائے۔

(3) تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ بِأَكْبَارِ الصَّحَابَةِ.

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے کی جائے کیونکہ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے براہ راست حضور پر نور ﷺ سے قرآن عظیم کی تعلیم حاصل کی اس لئے جب قرآن مجید کی تفسیر قرآنی آیات اور نبی کریم ﷺ کی احادیث سے نہ ملے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی روشنی میں آیات قرآنی کی تفسیر بیان کی جائے۔

(4) تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ بِأَكْبَارِ التَّابِعِينَ.

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر تابعین کے اقوال کی روشنی میں کی جائے کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن مجید کی تفسیر سیکھی اس لئے جب قرآنی آیات، احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے تفسیر نہ ملے تو تابعین کے اقوال سے تفسیر بیان کی جائے البتہ اس میں یہ لحاظ رہے کہ تابعی اگر کسی صحابی سے تفسیر نقل کر رہے ہیں تو اس کا حکم وہی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ تفسیر کا ہے اور اگر تابعین کا اجماعی قول ہے تو وہ حجت ہے ورنہ نہیں۔

(5) تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ بِاللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ.

قرآن مجید کی بعض آیات ایسی ہیں جن کے مفہوم میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں بلکہ ان کا مفہوم بالکل واضح ہے، ایسی آیات کی تفسیر کے لئے عربی لغت اور عربی قواعد ہی کافی ہیں البتہ وہ آیات جن کا مفہوم واضح نہیں یا جن سے فقہی احکام اخذ کئے جا رہے ہوں تو ان آیات کی تفسیر ماقبل مذکور چاروں ماخذ سے کی جائے گی اور ان کے بعد لغت عرب کو بھی سامنے رکھا جائے گا کیونکہ عربی زبان میں اس قدر وسعت ہے کہ اس میں ایک لفظ کے بسا اوقات کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کا اصلی ماخذ:

قرآن مجید کا اصلی ماخذ اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی وحی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَلَقَدْ جِئْتَهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ" (سورہ قاعراف آیت

نمبر 52)

اور بیشک ہم ان کے پاس ایک کتاب لائے جسے ہم نے ایک عظیم علم کی بنا پر بڑی تفصیل سے بیان کیا، (وہ) ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

اور ارشاد فرمایا: "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" (سورہ نجم آیت نمبر 3-4)

اور وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے۔ وہ وحی ہی ہوتی ہے جو انہیں کی جاتی ہے۔

اس لئے قرآن مجید کی وہ اصطلاحات جن کے معنی و مفہوم کو قرآن اور صاحب قرآن کی وضاحت کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے جیسے ایمان، اسلام، نفاق، شرک، کفر، روح، نفس، لعنہ، صلوة، زکوٰۃ، حج، صوم، ربا، صدقہ اور انفاق وغیرہ۔ ان سب کا معنی نہ تو عربی لغت سے متعین کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی سمجھا جاسکتا ہے بلکہ ان کے معنی و مفہوم کے تعین کے لئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا بہر صورت لازمی ہے اور ان کا جو معنی و مفہوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے اسے بلا تردّد تسلیم کرنا ضروری ہے اور جو لوگ قرآن مجید کی ان اصطلاحات کے معاملے میں صراطِ مستقیم سے بہک گئے ان کے بہکنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے وحی ربانی کی بجائے لغت عرب کو قرآنِ عظیم کا اصلی ماخذ قرار دیا اور لغت میں ان اصطلاحات کا جو معنی مذکور تھا وہی ان کے لئے متعین کر دیا۔

ضرورت و اہمیت تفسیر:

امام جلال الدین سیوطی شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جس زمانے میں قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اس وقت عربی کی فصاحت و بلاغت کے ماہرین موجود تھے، وہ اس کے ظاہر اور اس کے احکام کو تو جانتے تھے لیکن اس کی باطنی باریکیاں ان پر بھی غور و فکر کرنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے کے بعد ہی ظاہر ہوتی تھیں جیسے جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

”الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ“

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی ”ہم میں سے ایسا کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بیان کی کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اور اس پر اس آیت،

”إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ“

سے استدلال فرمایا۔ اسی طرح جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا:

”مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ عُدَّتْ“

یعنی جس سے اعمال کے حساب کے معاملے میں جرح کی گئی تو وہ عذاب میں گرفتار ہو جائے گا۔

تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات،

”فَسَوْفَ يَحْسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا“ (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 8)

اس سے عنقریب سہل حساب لیا جائے گا اور اپنے گھر والوں کی طرف شاد شاد پلٹے گا۔

کے بارے میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”یہ تو صرف اعمال کا پیش ہونا ہے۔ (یعنی یہ وہ مناقشہ نہیں ہے جو حدیث میں فرمایا گیا ہے) (جب میدان فصاحت و

بلاغت کے شہسواروں کو قرآن کے معانی سمجھنے کے لئے الفاظ قرآنی کی تفسیر کی حاجت ہوئی) تو ہم تو اس چیز کے زیادہ محتاج

ہیں جس کی انہیں ضرورت پڑی بلکہ ہم تو سب لوگوں سے زیادہ اس چیز کے محتاج ہیں کیونکہ ہمیں بغیر سیکھے لغت کے اسرار و رموز اور اس کے مراتب معلوم نہیں ہو سکتے۔

(الاتقان فی علوم القرآن، النوع السابع والسبعون، فصل واثنا وجاه الحاجة الیہ۔۔۔ الخ، ۲/۵۳۶-۵۳۷، ملخصاً)

قرآن فہمی:

قرآن فہمی بہت بڑی عبادت و سعادت ہے، لہذا تلاوت قرآن کے ساتھ مستند تفاسیر کے ذریعے معانی قرآن بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت ایاس بن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جو لوگ قرآن مجید پڑھتے ہیں اور وہ اس کی تفسیر نہیں جانتے ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس رات کے وقت ان کے بادشاہ کا خط آیا اور ان کے پاس چراغ نہیں جس کی روشنی میں وہ اس خط کو پڑھ سکیں تو ان کے دل ڈر گئے اور انہیں معلوم نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے؟ اور وہ شخص جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کی تفسیر جانتا ہے اس کی مثال اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس قاصد چراغ لے کر آیا تو انہوں نے چراغ کی روشنی سے خط میں لکھا ہوا پڑھ لیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ (تفسیر قرطبی، باب ماجاء فی فضل تفسیر القرآن و ہلہ، ۱/۴۱، الجزء الاول، ملخصاً)

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تعارف مفسر بیضاوی:

پیدائش: 1282ء

آپ کا نام عبد اللہ بن عمر، آپ رحمۃ اللہ علیہ بیضا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اتا بک ابو بکر بن سعید زنگی کے زمانے میں فارس کے قاضی القضاة تھے۔ آپ نے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور شیراز کے قاضی مقرر ہوئے۔ پھر تبریز میں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال کیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی تفسیر، انوار التنزیل و اسرار التاویل، ہے اسے عموماً تفسیر بیضاوی کہتے ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک یہ بڑے پائے کی تفسیر ہے۔ اور درس نظامی میں شامل ہے۔ دوسری اہم تصانیف منہاج الوصول فقہ میں ہے اور تیسری نظام التاریخ ہے جس میں آپ نے آدم کے زمانے سے اپنے زمانے تک کے حالات قلم بند کیے تھے۔

خُطْبَةُ الْكِتَابِ

الحمد لله الذي نَزَّلَ الفرقان على عبده ليكون للعالمين نذيراً، فتحدى بأقصر سورة من سورة مصاقح الخطباء من العرب العرباء فلم يجد به قديراً، وأفحم من تصدى لمعارضته من فصحاء عدنان وبلغاء قحطان حتى حسوا أنهم سحروا وتسحيراً، ثم بين للتأيس ما نَزَّلَ إِلَيْهِمْ حسبما عن لهم من مصالحهم ليدبروا آياته، وليتذكر أولو الألباب تذكيراً، فكشف لهم قناع الانغلاق عن آيات محكمات هن أم الكتاب، وأخر متشابهات هن رموز الخطاب تأويلاً وتفسيراً، وأبرز غوامض الحقائق ولطائف الدقائق، ليتجلى لهم خفايا الملك والملكوت وخبايا قدس الجبروت ليتفكروا فيها تفكيراً، ومهد لهم قواعد الاحكام وأوضاعها من نصوص الآيات وألماعها، لينهب عنهم الرجس ويظهرهم تطهيراً، فمن كان له قلب أو ألقى السمع وهو شهيد، فهو في الدارين حميد وسعيد، ومن لم يرفع إليه رأسه وأطفأ نبراسه، يعش ذمياً ويصل سعيراً فيا واجب الوجود، ويا فائض الجود، ويا غاية كل مقصود، صل عليه صلاة توازي غناءه، وتجازي غناءه، وعلى من أعانه وقرر تبيانه تقريراً، وأفض علينا من بركاتهم واسلك بنا مسالك كراماتهم، وسلم عليهم وعلينا تسليماً كثيراً.

وبعد، فإن أعظم العلوم مقداراً وأرفعها شرفاً ومناراً، علم التفسير الذي هو رئيس العلوم الدينية ورأسها، ومبنى قواعد الشرع وأساسها، لا يليق لتعاطيه والتصدي للتكلم فيه إلا من برع في العلوم الدينية كلها أصولها وفروعها، وفاق في الصناعات العربية والفنون الادبية بأنواعها.

ولطالبا أحدث نفسى بأن أصنف في هذا الفن كتاباً يحتوى على صفة مما بلغنى من عظماء الصحابة، وعلباء التابعين، ومن دونهم من السلف الصالحين، وينطوى على نكت بارعة، ولطائف رائعة، استنبطتها أنا ومن قبلى من أفاضل المتأخرين، وأمائل

المحققین، ويعرب عن وجوه القراءات المشهورة المعزوة إلى الائمة الثمانية المشهورين، والشواذ الكروية عن القراء المعتبرين، إلا أن قصور بضاعه يثبطني عن الإقدام، ويمدعي عن الانتصاب في هذا المقام حتى سنع لي بعد الاستخارة ما صمم به عزمي على الشروع فيما أردته، والإتيان بما قصدته، ناوياً أن أسميه بعد أن أتممه أنوار التنزيل وأسرار التأويل.

فها أنا الآن أشرع وبحسن توفيقه، أقول وهو الموفق لكل خير ومعطي كل مسؤل.

ترجمہ خطبہ:

ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لئے ہیں جس نے فرقان کو اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ وہ جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو جائے۔ پس چیلنج کیا (اس اللہ یا عبد نے) فرقان کی صورتوں میں سے سب سے چھوٹی سورت کے ساتھ خالص عربوں کے بڑے خطباء کو اس (چیلنج یا سب سے چھوٹی سورت) پر کسی کو قادر نہیں کیا۔ اور اس شخص کو اس (اللہ یا عبد) نے خاموش کر دیا جو اس (عبد خاص یا قرآن) کے معارضہ کے درپے ہوا، قبیلہ عدنان کے فصیح لوگوں اور قبیلہ قحطان کے بلخ لوگوں میں سے حتیٰ کہ انہوں نے اس بات کا گمان کیا کہ ان پر کسی قسم کا جادو کر دیا گیا ہے۔

پھر نازل شدہ کو لوگوں کی طرف بیان کر دیا، اسی کے موافق جو ان کو مصلحتیں پیش آئیں تاکہ وہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور عقل والے نصیحت پکڑیں۔ پس ان کے لئے ان آیات محکمات سے جو ام الکتاب ہیں، کے ذریعے پیچیدگیوں کے پردوں کو کھول دیا گیا۔ اور دوسری آیات تشابہات ہیں جو تاویل اور تفسیر کے اعتبار سے خطاب خداوندی کے خفیہ راز ہیں۔ اور پوشیدہ حقیقتوں اور باریک نکتوں کو ظاہر کیا تاکہ عالم شہود اور عالم غیب کی مخفی چیزیں اور اللہ کریم کی صفات جمالیہ اور جلالیہ کی مخفی چیزیں ان کے لئے روشن ہو جائیں تاکہ وہ ان میں خوب غور و فکر کریں۔ اور احکام کے قواعد اور ان کی علتوں کو ان کے لئے مقرر کیا وہ قواعد و علل جو نصوص آیات اور اشارات آیات سے مستنبط ہیں، تاکہ ان سے گندگی کو دور کر دے اور ان کو خوب پاک کر دے۔ پس وہ آدمی جس کا دل کامل ہو یا وہ آدمی جس نے حاضر النفس ہونے کی حالت میں کان لگائے ہوں وہ دنیا و آخرت میں محمود اور خوش بخت ہے۔ اور وہ شخص جس نے اپنے سر کو اس کی طرف نہیں اٹھایا اور اپنے نور فطرت کو بچھا دیا وہ ذلیل ہو کر زندگی گزارے گا اور عنقریب بڑھکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ پس اے واجب الوجود ذات اور اے فیضان سخاوت اور ہر مقصود کی انتہا آپ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسی رحمت نازل فرما جو ان کے نفع کے برابر ہو اور ان کی مشقت کے مساوی ہو اور ان لوگوں پر رحمت کا نزول فرما جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ

احکامات کو راسخ کیا۔ اور ہم پر بھی ان کی برکتوں سے فیضانِ رحمت عطا فرما۔ اور ہم کو ان کی کرامات کے راستے پر چلا اور ہم سب پر بہت زیادہ سلامتی عطا فرما۔

اور حمد و صلوة کے بعد پس بے شک اعظم العلم مرتبے کے اعتبار سے اور شانِ رفعت و عظمت کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ علم، علمِ تفسیر ہے، جو تمام علوم دینیہ کا سردار اور اصل ہے۔ اور قواعد شرعیہ کی بنیاد اور اساس ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے اور اس میں کلام کرنے کے لائق نہیں ہے مگر وہ شخص جو تمام علوم دینیہ کے اصول و فروع میں فائق ہو۔ اور تمام صناعات عربیہ اور فنون ادبیہ میں ماہر ہو اور بسا اوقات میرے دل میں یہ بات پیدا ہوتی تھی کہ میں اس فن میں ایک ایسی کتاب تصنیف کروں جو خالص ان چیزوں پر مشتمل ہو جو مجھ تک پہنچی ہیں، بڑے جلیل القدر صحابہ کرام، تابعین اور ان سے جو مرتبہ میں کم ہیں ان سے سلف صالحین میں سے۔

وہ کتاب عجیب و غریب نکتوں پر اور ایسے خوش کن لطائف پر مشتمل ہو جن کو میں نے مستنبط کیا ہے اور مجھ سے پہلے کے متاخرین فضلاء اور ہم عصر محققین نے اکٹھا کیا ہے، اور وہ کتاب ان وجوہ قراۃ مشہورہ کو ظاہر کر دے جو آٹھ (8) مشہور آئمہ کی طرف منسوب ہیں۔ اور قرأت شاذہ جو معتبر قراء سے مروی ہے لیکن میری کم مائیگی نے مجھے اس خیال پر عمل کرنے سے روک دیا اور مجھے اس مقاب پر کھڑا ہونے سے روک دیا۔ حتیٰ کہ میرے لئے استخارہ کے بعد وہ چیز ظاہر ہو گئی جس کی وحی سے میرا عزم پختہ ہو گیا۔ اس چیز کے شروع کرنے پر جس کا میں نے ارادہ کیا تھا اور اس چیز کے لانے پر جس کا میں نے قصد کیا تھا، اس حال میں کہ میں اس کو پورا کرنے کے بعد نیت کرنے والا تھا۔

اس کا نام انوار التزیل و اسرار التاویل رکھوں گا۔ پس بیدار رہو! اب میں شروع کر رہا ہوں اور اسی کی حسن توفیق سے کہتا ہوں اور وہی ہر بھلائی کی توفیق دینے والا اور ہر سائل کو عطا کرنے والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

مکیہ و آیہا سبع آیات بسم اللہ الرحمن الرحیم وتسمی أم القرآن، لأنها مفتتحة ومبدؤة فكانها أصله ومنشؤة، ولذلك تسمى أساسا. أو لأنها تشتمل على ما فيه من الثناء على الله سبحانه وتعالى، والتعبد بأمره ونهيه وبيان وعده ووعدته. أو على جملة معانيه من الحكم النظرية، والاحكام العبلية التي هي سلوك الطريق المستقيم والاطلاع على مراتب السعداء ومنازل الاشقياء. وسورة الكنز والوافية والكافية لذلك. وسورة الحمد والشكر والدعاء. وتعليم المسألة لاشتغالها عليها والصلاة لوجوب قراءتها أو استحبابها فيها. والشافية والشفاء

لقوله عليه الصلاة والسلام: «هي شفاء من كل داء والسبع المثاني» لأنها سبع آیات بالاتفاق، إلا أن منهم من عد التسمية دون آتبعث علیهم، ومنهم من عكس، وتثنى في الصلاة، أو الإنزال إن صح أنها نزلت بمكة حين فرضت الصلاة، وبالمدينة حين حولت القبلة، وقد صح أنها مكية لقوله تعالى: وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي، وهو مكي بالنص.

ترجمہ:

یہ سورت مکی ہے اور اس کی سات (7) آیات ہیں۔ اور اس سورت کو ام القرآن کہا گیا ہے کیونکہ قرآن کی ابتداء اسی سے ہے، تو گویا وہ قرآن مجید کی اصل اور بنیاد ہے اسی وجہ سے اس کو اساس بھی کیا جاتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ یہ ان مضامین پر مشتمل ہے جو قرآن مجید میں ہیں یعنی اللہ کریم کی حمد و ثنا اور اس کے احکامات کی پیروی، منہیات سے رکنا اور اس کے وعدہ و وعید کا بیان، یا اس کے تمام مقاصد یعنی ان احکامات نظریہ و احکام عملیہ پر جو کہ صراط مستقیم پر چلنا ہے۔ اور نیک بختوں کے مراتب اور بد بختوں کے ٹھکانوں پر اطلاع ہے۔ اسی وجہ سے اس سورت کا نام سورت الكنز، سورت الوافیہ اور سورت الكافیہ رکھا گیا ہے۔

اور سورت الحمد اور الشکر اور الدعاء اور تعلیم المسئلہ اس کے ان سب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نام دیا گیا ہے۔ اور اس سورت کا نام سورت الصلوٰۃ بھی ہے کیونکہ نماز میں اس سورت کو پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ نیز اس سورت کا نام سورت شافیہ اور سورت الشفاء بھی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ سورت ہر بیماری کی شفاء ہے اور السبع المثانی بھی، کیونکہ اس

سورت کی بالاتفاق سات (7) آیات ہیں۔ بعض نے "بسم اللہ" کو ایک آیت شمار کیا اور "انعمت علیہم" کو بھی اور بعض نے اس کا عکس کہا اور نماز میں اس کو دو بار پڑھا جاتا ہے، یا یہ کہ نازل کرنے میں دو دفعہ ہوا، اگر یہ صحیح ہو کہ یہ پہلی دفعہ مکہ میں نماز فرض ہوتے وقت نازل ہوئی اور دوسری دفعہ مدینہ میں تبدیلی قبلہ کے وقت نازل ہوئی اور یہ صحیح ہے، کہ یہ سورت مکی ہے کیونکہ اللہ کریم کا قول،

ولقد اتيناك سبعاً من المثاني
جو اس سورت کے بارے میں ہے وہ آیت مکی ہے۔

[سورة الفاتحة (1) : آية 1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (1)

ترجمہ:

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

من الفاتحة، ومن كل سورة، وعليه قراءة مكة والكوفة وفقهاؤها وابن المبارك رحمه الله تعالى والشافعي. وخالفهم قراء المدينة والبصرة والشام وفقهاؤها ومالك والاوزاعي، ولم ينص أبو حنيفة رحمه الله تعالى فيه بشيء فظن أنها ليست من السورة عنده.

وسئل محمد بن الحسن الشيباني عنها فقال: ما بين الدفتين كلام الله تعالى

ولنا أحاديث كثيرة: منها.

ما روى أبو هريرة رضي الله تعالى عنه، أنه عليه الصلاة والسلام قال: «فاتحة الكتاب سبع آيات

أولاهن بسم الله الرحمن الرحيم.

وقول أم سلمة رضي الله عنها قرأ رسول الله صلى الله عليه وسلم الفاتحة وعد بسم الله الرحمن الرحيم الحمد

لنورب العالمين» آية

ومن أجلها اختلف في أنها آية برأسها أم بما بعدها، والإجماع على أن ما بين الدفتين كلام الله سبحانه

وتعالى، والوفاق على إثباتها في المصاحف مع المبالغة في تجميد القرآن حتى لم تكتب تمويين.

"بسم الله الرحمن الرحيم" سورة فاتحة کا جزو ہے اور اسی پر مکہ اور کوفہ کے قراء اور ان کے فقہاء اور ابن مبارک اور امام

شافعی رحمۃ اللہ علیہم اور قراء مدینہ، بصرہ اور شام اور ان کے فقہاء اور امام مالک اور امام اوزاعی نے مخالفت کی ہے کہ "بسم اللہ

"سورة فاتحہ کا جزو نہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کسی بھی چیز کی تصریح نہیں فرمائی۔ چنانچہ گمان ہوا کہ امام صاحب کے نزدیک سورة فاتحہ کا جزو نہیں اور امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے جزئییت فاتحہ کے متعلق سوال کیا گیا۔

تو آپ نے جواب کچھ یوں دیا "ما بین الدفتین کلام اللہ" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی دلیل میں چند احادیث مبارکہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ فاتحہ الكتاب کی سات آیتیں ہیں ان میں پہلی آیت مبارکہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سورة فاتحہ پڑھی اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد لله رب العالمین" کو ایک آیت شمار کیا اور یہ روایات ہی وجہ اختلاف بنیں، اس بات میں کہ "بسم اللہ" تمام ہے غیر تام ہے۔ اور اجماع اس بات پر ہے کہ ما بین الدفتین اللہ کا کلام ہے، اور "بسم اللہ" کے مصاحف پر ثابت کرنے پر اتفاق ہے باوجود تجرید قرآن میں مبالغہ کے حتیٰ کہ آئین بھی نہیں لکھا جاتا ہے۔

متن:

والباء متعلقة بمحذوف تقديره:

بسم الله أقرأ لأن الذي يتلوه مقروء. وكذلك يضير كل فاعل ما يجعل التسمية مبدأ له. وذلك أولى من أن يضير أبدا لعدم ما يطابقه ويدل عليه. أو ابتدائي لزيادة إضمار فيه. وتقديم المعمول ما هنا أوقع كما في قوله:

بِسْمِ اللَّهِ فَجَرَّهَا

وقوله: إِيَّاكَ نَعْبُدُ لَأَنَّهُ أَهْمٌ وَأَدْلُ عَلَى الْإِخْتِصَاصِ، وَأَدْخَلَ فِي التَّعْظِيمِ وَأَوْفَى لِلْوُجُودِ فَإِنَّ اسْمَهُ سَجَانَهُ وَتَعَالَى مَقْدَمٌ عَلَى الْقِرَاءَةِ، كَيْفَ لَا وَقَدْ جَعَلَ آلَةً لَهَا مِنْ حَيْثُ إِنَّ الْفِعْلَ لَا يَتِمُّ وَلَا يَعْتَدِبُهُ شَرْعًا مَا لَمْ يَصْدُرْ بِاسْمِهِ تَعَالَى

لقوله عليه الصلاة والسلام كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه ببسم الله فهو أبت

، وقيل الباء للمصاحبة، والمعنى متبركاً باسم الله تعالى اقرأ، وهذا وما بعده إلى آخر السورة مقول على السنة العباد ليعلوا كيف يتبرك باسمه، ويحمد على نعمه، ويُسأل من فضله.

وإنما كسرت ومن حتى الحروف المفردة أن تفتح، لاختصاصها باللزوم الحرفية والجر، كما كسرت لام الامر ولام الإضافة داخلة على المظهر للفصل بينهما وبين لام

الابتداء

ترجمہ:

اور باءِ فعلِ محذوف کے متعلق ہے، اس کی تقدیر عبارت یہ ہوگی "بسم اللہ اقرا" اس لئے جو چیزیں بعد میں آرہی ہیں وہ از قبیلہ مقروء ہیں، اور ایسے ہی ہر تسمیہ کرنے والا مقدر مانے ایسے لفظ کو کہ جس کے لئے تسمیہ کو مبدا بنایا جائے اور یہ لفظ اقرا کو مقدر ماننا اولیٰ ہے بمقابلہ لفظ "ابدء" کو مقدر ماننے کے، بوجہ نہ ہونے اس فعل کے جو لفظ ابدء کے مطابق ہو۔ یعنی ایسا فعل نہیں پایا جاتا جو اس پر صادق آئے اور نہ کوئی ایسا لفظ پایا جاتا جو اس "ابدء" پر دال ہو اور اقرا کو مقدر ماننا اولیٰ ہے بمقابلہ ابتدائی کے، کیونکہ ابتدائی مقدر ماننے میں زیادہ اضمار ہے۔

اور تسمیہ کے موقع پر معمول کو مقدم کرنا زیادہ و قیح ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان "بسم اللہ مجربہا" اور "ایناک نعبد" میں مقدم ہے اس لئے کہ تقدیم اہم ہے اور اختصاص پر زیادہ دلالت کرتی ہے، اور تعظیم میں اس کو دخل ہے اور وجود اسم کے موافق ہے، کیونکہ باری تعالیٰ کا نام قرأت پر مقدم ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ اسم باری کو آکر قرار دیا گیا ہے قرأت کے لئے اس لئے حیثیت سے کہ فعل اس وقت تک شرعاً معتبر اور تام ہی نہیں ہوتا جب تک کہ اسم باری سے اس کی ابتداء نہ کی جائے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر وہ مہتمم بالشان کام جس کی ابتداء اللہ کریم کے نام سے نہ کی جائے وہ ناقص اور بے برکت ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا کہ باء مصاحبت کے لئے ہے اور اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں پڑھ رہا ہوں اس حال میں کہ میں ملتبس ہوں "علیٰ قصد التبرک" اللہ کے نام کے ساتھ اور "بسم اللہ" سے لے کر آخر سورۃ فاتحہ تک بندوں کی زبانی کہلا دیا گیا ہے تاکہ بندے یہ جان لیں کہ اللہ کریم کے نام کے ساتھ برکت کیسے حاصل کی جاتی ہے اور اس کی نعمتوں پر اس کی تعریف کیسے کی جاتی ہے، اور اس کے فضل کا سوال کیونکر کیا جائے۔

اور باء کو کسرہ دیا گیا حالانکہ حروف مفردہ کا حق یہ تھا کہ ان کو فتح دیا جاتا، کسرہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ باء لزومِ حریفیت اور حرفِ جر ہونے کی لزومیت کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح کہ لام امر کو کسرہ دیا گیا اور لامِ اضافت کو جب کہ وہ مظہر پر داخل ہو کسرہ دیا گیا۔ لام امر اور لامِ ابتداء اور لامِ اضافت اور لامِ تاکید کے درمیان فرق کرنے کے لئے۔

متن:

والاسم عند أصحابنا البصريين من الاسماء التي حذفت أعجازها لكثرة الاستعمال،
وبنيت أوائلها على السكون، وأدخل عليها مبتدأ بها همزة الوصل، لأن من دأبهم أن
يبتدئوا بالمتحرك ويقفوا على الساكن، ويشهد له تصريفه على أسماء وأسامى وسمى
وسميت ومعى وسمى كهدى لغة فيه قال:

والله أسماك سمع مُباركاً... أترك الله بو إيتاركا

والقلب بعيد غير مطرد، واشتقاقه من السبول أنه رفعة للمسمى وشعار له.

ومن السبة عند الكوفيين، وأصله وسم حذفت الواو وعوضت عنها همزة الوصل ليقل إعلاله.

ورد بأن الهمزة لم تعهد داخله على ما حذف صدره في كلامهم، ومن لغاته سم وسم قال:

بِسْمِ الذِي فِي كُلِّ سُورَةٍ بِمَعْنَى

والاسم إن أريد به اللفظ فغير المسمى، لأنه يتألف من أصوات متقطعة غير قارة.

ويختلف باختلاف الامم والاعصار، ويتعدد تارة ويتحد أخرى. والمسمى لا يكون

كذلك، وإن أريد به ذات الشيء فهو المسمى لكنه لم يشتهر بهذا المعنى وقوله تعالى:

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ وَسَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ المراد به اللفظ لأنه كما يجب تنزيه ذاته سبحانه

وتعالى وصفاته عن النقائص، يجب تنزيه الالفاظ الموضوعه لها عن الرفث وسوء

الادب. أو الاسم فيه مقحم كما في قول الشاعر:

إلى الحول ثم اسم السلام عليكما وإن أريد به الصفة، كما هو رأى الشيخ أبي الحسن الأشعري.

انقسم انقسام الصفة عندنا: إلى ما هو نفس المسمى، وإلى ما هو غيره، وإلى ما ليس هو ولا غيره.

ترجمہ:

اور بھریوں کے نزدیک اسم ان اسماء میں سے ہے جن کے آخری حرف کو کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور

ابتدائی حرف کو ساکن رکھا گیا ہے پھر ابتداء کرنے کی وجہ سے شروع میں ہمزہ وصل کا اضافہ کیا گیا کیونکہ اہل عرب کا یہی طریقہ

ہے کہ وہ حرف متحرک سے ابتداء کرتے اور حرف ساکن پر ٹھہرتے ہیں اور بھریوں کے مسلک کے لئے شاہد اسم کی وہ گردان

ہے جو اسماء واسامی وتنی اور سمیت کے وزن پر آتی ہے اور کی جو ہندی کے وزن پر ہے اسم کے معنی میں اسم کی ایک لغت بن کر

استعمال ہونا بھی مسلک بھریوں کے شواہد میں سے ہے شاعر کا قول ملاحظہ ہو،

والله أسماك سمع مُباركاً... أترك الله بو إيتاركا

اے ممدوح خدا نے تمہارا نام منتخب کرنے میں تجھ کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دی جس طرح فضیلت بخشنے میں تیری ذات کو

خدا نے دوسروں کی ذات پر ترجیح دی مطلب یہ ہے کہ جس طرح تجھ کو خدا نے بافضل بنایا ہے اسی طرح تیرا نام بھی عمدہ منتخب کیا

ہے۔ اور اسم کے سابقہ اوزان میں قلب کا واقع ہونا مستبعد بات ہے جو اس قدر عام نہیں اور اسم مشتق ہے "سمو" سے اس

لئے ہے کہ اسم مسمی کے لئے موجب رفعت اور طرہ امتیاز ہے۔

اور کوفیوں کے نزدیک اسم "سمة" سے مشتق ہے اور اس کی اصل "وسم" ہے واؤ کو حذف کر کے ہمزہ وصل اس کے

عوض میں لے آئے تاکہ اعلال کم ہوں اور تردید بایں طور کی گئی ہے کہ یہ بات نہیں پہچانی گئی کہ اول سے حذف کر کے ہمزہ کو داخل کیا جائے اور ان کے کلام میں اور اسم کی لغات میں بسم اور سُم بھی ہے جیسا کہ قول شاعر یعنی اس ذات کے نام سے شروع کرتا ہے جس کا نام ہر سورت کے شروع میں ہے۔

پس اسم سے اگر لفظ مراد لیا جائے تو اسم غیر مسمیٰ ہے اس لئے کہ اسم مرکب ہوتا ہے ایسے اصوات سے جو ٹکڑے ٹکڑے ہیں، غیر مجتمع ہیں اور امتوں اور زمانوں کے اختلاف سے مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اور کبھی اسماء مختلف ہوتے رہتے ہیں اور کبھی مختلف نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی اسم ہوتا ہے اور مسمیٰ ایسا نہیں ہوتا اور اگر ذات سے شئی مراد لی جائے تو اسم عین مسمیٰ ہے لیکن اس معنی کے ساتھ مشہور نہیں اور اللہ کریم کا قول،

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ

اور

سَبَّحَ اسْمُ رَبِّكَ

اس سے مراد لفظ ہے اس لئے کہ جس طرح سے ذات و صفات کو نقائص سے پاک کرنا واجب ہے اسی طرح ان الفاظ کو جو ان کے لئے وضع کئے گئے ہیں، پاک کرنا واجب ہے۔ فحش چیزوں اور سوء ادبی سے۔ یا اسم اس آیت میں زائد ہے جیسا کہ شاعر کے شعر میں لفظ اسم زائد ہے،

إِلَى الْحَوْلِ ثُمَّ اسْمُ السَّلَامِ عَلَيْكُمَا

اور اگر صفت مراد لی جائے جیسا کہ شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے تو اسم منقسم ہوگا جیسا کہ ان کے نزدیک صفت منقسم ہوئی ہے ایک وہ جو عین مسمیٰ ہے دوم جو غیر مسمیٰ ہے سوم جو نہ عین مسمیٰ ہے اور نہ غیر مسمیٰ ہے۔

متن:

وَأَمَّا قَالَ بِسْمِ اللَّهِ وَلَمْ يَقُلْ بِاللَّهِ، لِأَنَّ التَّبَارُكَ وَالِاسْتِعَانَةَ بِذِكْرِ اسْمِهِ. أَوَّلَ لِفَرْقِ بَيْنِ الْيَمِينِ وَالشِّمَالِ. وَلَمْ تَكْتُبِ الْآلِفَ عَلَى مَا هُوَ وَضَعِ الْخَطَّ لِكَثْرَةِ الْإِسْتِعْمَالِ وَطَوْلِ النَّبَاءِ عَوْضًا عَنْهَا.

وَاللَّهُ أَصْلُهُ إِلَهُ، فَحَذَفْتَ الْهَمْزَةَ وَعَوْضَ عَنْهَا الْآلِفَ وَاللَّامَ وَلِذَلِكَ قِيلَ:

يَا إِلَهُ، بِالْقَطْعِ إِلَّا أَنَّهُ مُخْتَصٌّ بِالْمَعْبُودِ بِالْحَقِّ، وَالْإِلَهُ فِي الْأَصْلِ لِكُلِّ مَعْبُودٍ، ثُمَّ غَلِبَ عَلَى الْمَعْبُودِ بِالْحَقِّ.

وَاشْتِقَاقُهُ مِنْ آلِهِ الْهَيْئَةِ وَالْوَهْمَةِ وَالْوَهْمِيَّةِ بِمَعْنَى عِبْدِهِ، وَمِنْهُ تَأَلُّهُ وَاسْتَأَلُّهُ، وَقِيلَ مِنْ آلِهِ إِذَا تَحَبَّرَ لِأَنَّ الْعُقُولَ تَتَحَبَّرُ فِي مَعْرِفَتِهِ. أَوْ مِنْ آلِهَتٍ إِلَى فُلَانٍ أَيْ سَكَنْتُ إِلَيْهِ، لِأَنَّ الْقُلُوبَ تَطْمَئِنُّ بِذِكْرِهِ.

والارواح تسكن رالي معرفته.

أو من أله إذا فزع من أمر نزل عليه، وألهة غيره أجارة إذا العائد يفزع إليه وهو بحيرة حقيقة أو بزعمه. أو من أله الفصيل إذا ولع بأمه، إذ العباد يولعون بالتضرع إليه في الشدائد أو من وله إذا تحير وتخطب عقله.

وكن أصله ولاة فقلت الواو همزة لاستثقال الكسرة عليها استثقال الضمة في وجوده فقليل إله كإعاء وإشاح ويرده المجمع على آلهة دون أولهة. وقيل أصله لاه مصدر لاه يليه ليها ولاها، إذا احتجب وارتفع لأنه سبحانه وتعالى محبوب عن إدراك الابصار، ومرتفع على كل شيء وعملا يليق به ويشهد له قول الشاعر:

كحلفه من أبي رباح... يُشهدنا لآلهة الكبار

ترجمہ:

اور قرآن مجید میں "بِسْمِ اللّٰهِ" اسم کے اضافہ کے ساتھ آئی ہے، "باللہ" نہیں ذکر کیا گیا وہ اس لئے کہ برکت حاصل کرنے اور مدد طلب کرنے کی جرات لفظ اسم کے اضافہ کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ یا "باء یحییٰ اور باء یحییٰ" میں فرق کرنے کے لئے اور بسم اللہ شریف کے الف کو کتابت میں نہیں لایا گیا باوجود اس کے کہ رسم الخط کا قانون یہی تھا کہ کثرت استعمال کی وجہ سے لایا جاتا۔ اور اس الف محذوف کے بدلے بسم اللہ شریف کی باء کو "الباء" کر کے لکھا گیا۔

لفظ اللہ اصل میں "الہ" ہے حذف ہمزہ کے عوض الف لام لایا گیا (اور چونکہ الف لام عوضی ہے تعریف کا نہیں) اس لئے بوقت نداء "یا اللہ" ہمزہ قطعی کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ اللہ معبود برحق کے ساتھ خاص ہے اور لفظ الہ اپنے اصلی معنی کے اعتبار سے ہر معبود پر بولا جاتا ہے، پھر اکثر اطلاق اس کا معبود برحق پر ہونے لگا۔

اور لفظ الہ مشتق ہے، آلہ، الہتوا الوستوا الوبیۃ سے جو "عبد" کے معنی میں ہے اور انہیں مصادر سے تالہ اور استالہ مشتق ہے، اور بعض نے کہا کہ الہ مشتق ہے "الہ اصین کے کسرہ کے ساتھ، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی حیرت میں پڑھ جائے (پس الہ کی وجہ اشتقاق یہ ہوگی) اس لئے کہ عقول اللہ کریم کی کما حقہ معرفت حاصل کرنے میں متحیر ہیں یا لفظ الہ ماخوذ ہے "الہت الی فلان" سے جس کے معنی ہیں کہ میں نے فلان کے پاس جا کر سکون حاصل کیا۔ خدا کو الہ اس لئے کہتے ہیں کہ مومنین کے دل اس کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں اور روجوں کو اللہ کریم کی معرفت سے سکون ملتا ہے۔ یا مشتق ہے الہ والہ وغیرہ سے (الہ اس وقت بولتے ہیں) جب کوئی آدمی آنے والی مصیبت سے گھبرائے جب کہ اس گھبرائے ہوئے کو دوسرا پناہ دے دے تو اس صورت میں خدا کو خدا اس لئے کہا جاتا ہے کہ پناہ ڈھونڈنے والے اس کے پاس گھبرا کر جاتے ہیں، اور وہ ان کو حقیقتاً یا پناہ گزیں کے خیال کے مطابق پناہ دیتا ہے۔ یا لفظ الہ مشتق ہے "الہ الفصیل" سے جس کا معنی یہ ہے

کہ اونٹنی کا بچہ اپنی ماں سے چمٹ گیا۔ (خدا کو اللہ اس لئے کہا جاتا ہے) کہ بندے مصائب میں گڑبگڑا کر خدا سے چمٹتے ہیں یا لفظ الہ مشتق ہے "ولہ" سے جس کا معنی مجبوظ العقل ہو جانا ہے۔

اور اس صورت میں الہ کی اصل ولاہ ہوگی واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا اس لئے کہ واؤ پر کسرہ ثقیل ہے جس طرح وجوہ کے واؤ پر ضمہ ثقیل ہے پھر تبدیلی کے بعد الہ ہمزہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس طرح کہ اعام اور اشاح ہمزہ کے ساتھ مستعمل ہیں۔ اور اس قول کی تردید اس بات سے ہوتی ہے کہ الکی جمع "الہة" ہوتی ہے نہ کہ اولہتہ اور بعض کا قول ہے کہ الہ کی اصل "لاہ" ہے جو مصدر ہے لاہ یرلیہ، لیہا ولاہا کا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی پوشیدہ اور بالاتر ہو اس صورت میں خدا کو الہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ نگاہوں کے ادراک سے پوشیدہ اور ہر چیز پر فائق اور نامناسب صفات سے بالاتر ہے اور اس قول کے لئے شاہد شاعر کا شعر ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ابوریاح کی اس ایک دفعہ کی قسم کے مانند جس کو اس کا بڑا معبود بن رہا ہے۔

متن:

وقیل علم لذاتہ المخصوصة لأنه یوصف ولا یوصف بہ، ولأنہ لا بد لہ من اسم تجری
علیہ صفاتہ ولا یصلح لہ مما یطلق علیہ سواہ، ولأنہ لو کان وصفاً لم یکن قول: لا إله
إلا الله، توحیداً مثل: لا إله إلا الرحمن، فإنه لا یمنع الشریکة،
والاظهر أنه وصف فی أصله لکنہ لہا غلب علیہ بحیث لا یتعمل فی غیرہ وصار لہ
کالعلم مثل: الثریا والصعق أجرى مجراہ فی إجراء الاوصاف علیہ، وامتناع الوصف
بہ، وعدم تطرق احتمال الشریکة إلیہ،

لأن ذاته من حیث ہو بلا اعتبار أمر آخر حقیقی أو غیرہ غیر معقول للبشر، فلا یمکن
أن یدل علیہ بلفظ،

ولأنہ لو دل علی مجرد ذاته المخصوصة لہا أفاد ظاہر قوله سبحانه وتعالی: وَهُوَ اللهُ فِي
السَّمَاوَاتِ مَعْنَى صَحِيحاً، ولأن معنی الاشتقاق ہو کون أحد اللفظین مشارکاً للآخر فی
المعنی والترکیب، وهو حاصل بینہ وبين الاصول المذکورة،
وقیل أصله لاها بالسریانۃ فغرب بحذف الالف الاخیره، وإدخال اللام علیہ،
وتفخیم لامہ إذا انفتح ما قبلہ أو انضم سنة، وقیل مطلقاً،

وحذف الفہ لکن تفسد بہ الصلاة، ولا ینعقد بہ صریح الیمین، وقد جاء لضرورة الشعر:

ألا لا بَارِكَ اللهُ فِي سُهَيْلٍ... إِذَا مَا اللهُ بَارِكَ فِي الرَّجَالِ

ترجمہ:

اور بعض کا کہنا ہے کہ لفظ اللہ خدا کی ذات مخصوصہ کا علم ہے اس لیے کہ یہ لفظ خود تو موصوف بن جاتا ہے لیکن صفت نہیں بنتا اور اس لیے بھی کہ ذات واجب کے لئے کوئی ایسا اسم ہونا ضروری ہے جس پر تمام صفات واجب کا اجراء ہو سکے اور اس بات کی صلاحیت لفظ اللہ کے سوا جتنے بھی خدا کے اسماء حسنی ہیں ان میں سے کسی میں بھی نہیں، نیز اس لئے اگر لفظ اللہ کو معنی وصفی مانتے ہو (تو چونکہ وصف میں عموم ہوتا ہے اس لئے) "لا الہ الا اللہ" توحید کا فائدہ نہیں دے گا۔ جس طرح کہ "لا الہ الا الرحمان" توحید کا فائدہ نہیں دیتا کیونکہ وصف مانع شرکت نہیں ہوتا۔

اور اظہر یہ ہے کہ لفظ اللہ درحقیقت وصف ہے لیکن جب غلبہ ذات باری کے لئے اس طور پر استعمال ہونے لگا کہ غیر کے اندر بالکل مستعمل نہیں۔ اور عم کے مشابہ ہو گیا جس طرح کہ لفظ ثریا اور صعق ہیں۔ (کہ درحقیقت معنی وصفی رکھتے ہیں مگر غلبہ کا علم ہو گئے۔) تو اس کو علم کے قائم مقام کر دیا گیا (تین چیزوں میں) تمام صفات کا موصوف بننے میں اور خود کے صفت نہ بننے میں اور اشتراک کا احتمال نہ رکھنے میں۔

اس لئے کہ ذات خداوندی ذات خداوندی ہونے کی حیثیت سے انسان کی عقل میں نہیں آسکتی جب تک کہ ذات کے علاوہ کسی دوسرے لفظ کا لحاظ نہ کیا جائے، وہ وصف حقیقی ہو یا غیر حقیقی پس ممکن نہیں کہ ذات من حیث الذات کسی لفظ کا مدلول بنے۔

اور اس لئے کہ اگر لفظ اللہ محض ذات مخصوص پر دلالت کرے تو فرمان باری "وہو اللہ فی السموات" کی ظاہری عبارت ایسے معنی کا افادہ نہیں کرے گی جو (عقیدہ اہلسنت والجماعت کے پیش نظر) صحیح ہوں اور اس لئے کہ اشتقاق کی حقیقت یہ ہے کہ دو لفظوں میں سے ایک دوسرے کے معنی اور ترکیب میں شریک ہو اور یہ بات لفظ اللہ اور ذکر کردہ اصول کے درمیان موجود ہے۔

اور بعض نے کہا کہ اصل "لاہا" ہے جو سریانی زبان کا لفظ ہے، پھر اس کو عربی اس طرح بنایا گیا کہ آخری الف کو حذف کر دیا گیا اور شروع میں الف لام داخل کر دیا گیا۔ اور لفظ اللہ کے لام کو پڑھنا، جبکہ اللہ کا ماقبل مفتوح یا مضموم ہو، یہ اسلاف قراء کا طریقہ ہے۔ اور بعض نے کہا کہ لفظ اللہ کے لام کو ہمیشہ پڑھا جائے گا۔

اور لفظ اللہ کے الف کو حذف کر کے پڑھنا ایسی غلطی ہے کہ اس سے نماز فاسد ہو جائے گی، اور اس سے صریح یمین بھی منعقد نہیں ہوگی اور شاعر کا قول "لا الہ الا اللہ فی سہیل الخ" میں الف کا حذف کرنا ضرورت شعری کی وجہ سے ہے۔

شعر کا ترجمہ

آگاہ رہو اللہ کریم برکت عطا نہ کرے سہیل نامی کے حق میں، جبکہ اللہ کریم تمام لوگوں کے حق میں برکت کا فیضان

کرے۔

متن:

وَالرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اسْمَانِ بَدِيَا لِلْبَالِغَةِ مِنْ رَحْمٍ، كَالْغَضْبَانِ مِنْ غَضَبٍ، وَالْعَلِيْمِ مِنْ عِلْمٍ، وَالرَّحْمَةُ فِي اللُّغَةِ: رِقَّةُ الْقَلْبِ، وَانْعَاطَافٌ يَّقْتَضِي التَّفْضُلَ وَالْإِحْسَانَ، وَمِنْهُ الرَّحْمُ لِانْعَاطَافِهَا عَلٰی مَا فِيهَا، وَأَسْمَاءُ اللَّهِ تَعَالَى إِنَّمَا تُؤْخَذُ بِاعْتِبَارِ الْغَايَاتِ الَّتِي هِيَ أَفْعَالٌ دُونَ الْمَبَادِي الَّتِي تَكُونُ انْفِعَالَاتٍ. وَالرَّحْمٰنُ أَبْلَغُ مِنَ الرَّحِيْمِ، لِأَنَّ زِيَادَةَ الْبِنَاءِ تَدُلُّ عَلَى زِيَادَةِ الْمَعْنَى كَمَا فِي قَطَّعَ وَقَطَّعَ وَكَبَّرَ وَكَبَّرَ، وَذَلِكَ إِنَّمَا يُؤْخَذُ تَارَةً بِاعْتِبَارِ الْكَمِيَّةِ، وَأُخْرَى بِاعْتِبَارِ الْكَيْفِيَّةِ، فَعَلِيَ الْاَوَّلُ قِيلَ: يَا رَحْمٰنَ الدُّنْيَا لِأَنَّهُ يَعْمَدُ الْمُؤْمِنَ وَالْكَافِرَ، وَرَحِيْمَ الْآخِرَةَ لِأَنَّهُ يَخْصُ الْمُؤْمِنَ، وَعَلَى الثَّانِي قِيلَ: يَا رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ، وَرَحِيْمَ الدُّنْيَا، لِأَنَّ النِّعْمَ الْآخِرِيَّةَ كُلَّهَا جَسَامٌ، وَأَمَّا النِّعْمُ الدُّنْيَوِيَّةُ فَجَلِيلَةٌ وَحَقِيْرَةٌ.

"وَالرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" دو اسم ہیں جو مبالغہ کے لئے مبنی ہیں، اور ماخوذ ہیں "رحم" سے جیسے غضبان ماخوذ ہے غضب سے اور علیم مشتق ہے علم سے۔ اور رحمت لغت میں اس رقت قلب اور نفسانی کو کہتے ہیں جو فضل و احسان کا مقتضی ہو۔ اور رحم (بچہ دانی) بھی اسی سے مشتق ہے کیونکہ وہ رحم بھی اس چیز پر نرم ہوتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے، اور اللہ کریم کے اسمائے حسنیٰ اپنے ان نتائج و آثار کے اعتبار سے ملحوظ ہیں جو از قبیل تاثرات ہیں۔ اور مبادی اور اسباب کے اعتبار سے نہیں جواز قبیل تاثرات ہیں۔

اور رحمان میں، رحیم کے مقابلہ میں زیادہ مبالغہ ہے کیونکہ الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ قطع بالتخفیف اور قطع بالتشديد اور کبار بالتشديد کی مثالوں میں واضح ہے اور اس زیادتی کا کبھی کبھت کے اعتبار سے لحاظ کیا جاتا ہے اور کبھی کیفیت کے اعتبار سے پہلے لحاظ پر "یا رحمان الدنيا" کہا جائے گا۔

اس لئے کہ رحمت دنیا مومن و کافر دونوں کو عام ہے اور رحیم الآخرة (رحیم کی آخرت کی طرف اضافت کرتے ہوئے) کہا جائے گا، اس لئے کہ رحمت آخرت صرف مومن کے لئے ہے اور دوسرے لحاظ کے مطابق "یا رحمن الدنيا والآخرة" (باضافة الرحمان اليهما) اور رحیم الآخرة (باضافة الرحيم الى الآخرة فقط) کہا جائے گا۔ اس لئے کہ اخروی نعمتیں سب کی سب بڑی ہیں اور دنیاوی نعمتیں سووہ چھوٹی بھی ہیں اور بڑی تھیں۔

متن:

وَأَمَّا قَدَمُ وَالْقِيَاسُ يَقْتَضِي التَّرْقِيَّ مِنَ الْاَدْنَى إِلَى الْاَعْلَى، لِتَقَدُّمِ رَحْمَةِ الدُّنْيَا، وَلِأَنَّهُ صَارَ كَالْعِلْمِ مِنْ حَيْثُ إِنَّهُ لَا يُوصَفُ بِهِ غَيْرَةٌ لِأَنَّ مَعْنَاهُ الْمَنْعَمُ الْحَقِيقِيُّ الْبَالِغُ فِي

الرحمة غايتهما، وذلك لا يصدق على غيره لأن من عداة فهو مستعيب بلطفه وإنعامه يريد به جزيل ثواب أو جميل ثناء أو مزيج رقة الجنسية أو حب المال عن القلب، ثم إنه كالواسطة في ذلك لأن ذات النعم ووجودها، والقدرة على إيصالها، والداعية الباعثة عليه، والتبكن من الانتفاع بها، والقوى التي بها يحصل الانتفاع، إلى غير ذلك من خلقه لا يقدر عليها أحد غيره. أو لأن الرحمن لما دل على جلائل النعم وأصولها ذكر الرحيم ليتناول ما خرج منها، فيكون كالتتمة والرديف له. أو للمحافظة على رؤوس الآي.

والاظهر أنه غير مصروف وإن حظر اختصاصه بالله تعالى أن يكون له مؤنث على فعلی أو فعلائة إلحاقاً له بما هو الغالب في بابه.

وإنما خص التسمية بهذه الاسماء ليعلم العارف أن المستحق لأن يستعان به في مجامع الامور، هو المعبود الحقيقي الذي هو مولی النعم كلها عاجلها وآجلها، جليلها وحقيقتها، فيتوجه بشكر اشيرة إلى جناب القدس، ويتمسك بمجبل التوفيق، ويشغل سره بذكره والاستعداد به عن غيره.

اور رحمن کو مقدم کیا گیا حالانکہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ادنیٰ صفت سے اعلیٰ صفت کی طرف ترقی کی جائے اس لئے کہ رحمت دنیا مقدم ہے اور اس لئے بھی کہ لفظ رحمن لفظ اللہ کے مشابہ ہے اس حیثیت سے کہ غیر اللہ کی صفت نہیں بنتا کیونکہ رحمان کے معنی اس نعم حقیقی کے ہیں جو رحمت کے انتہائی مقام کو پہنچا ہوا ہو اور یہ معنی غیر اللہ پر صادق نہیں آتے اس لئے کہ خدا کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں وہ اپنے لطف و انعام کے بدلہ کے خواہاں رہتے ہیں۔ خواہ وہ بدلہ آخرت میں ثواب کثیر ہو یا مخلوق کے منہ سے تعریف کرانا مقصود ہو، یا وہ رقت زائل کرنا پیش نظر ہو جو ہم جنس کی بناء پر پیدا ہوتی ہے یا اپنے دل کو مال کی محبت سے خالی کرنا مقصود ہو اور آدمی اپنے لطف کے اندر ایک واسطہ سا ہے اس لئے کہ خود نعمتوں کی ذات یا ان کا وجود اور غیر کو دینے پر قدرت دینا، اور وہ داعیہ جو بندہ کو دینے پر ابھارتا ہو اور نعمتوں سے منتفع ہونے کی قدرت دینا اور وہ قوتیں عطا کرنا جن کے ذریعہ سے انسان فائدہ حاصل کر سکے اور اس کے علاوہ بہت سی چیزیں یہ سب اللہ کریم کے پیدا کرنے سے ہی ہیں۔ خدا کے علاوہ ان چیزوں کی کوئی دوسرا قدرت نہیں رکھتا یا اس لئے کہ رحمان جب اللہ کریم کی بڑی بڑی نعمتوں اور ان کے اصول پر دلالت کرتا ہے تو رحیم کو ذکر کیا تاکہ ان نعمتوں کو بھی شامل ہو جائے جو لفظ رحمن سے نکل گئی تھیں۔ پس ذکر رحیم بطور تتمہ اور ردیف کے ہوگا یا رؤس الآیات کی حفاظت کی وجہ سے رحیم کو مؤخر ذکر کیا گیا۔

اور اظہر یہ ہے کہ لفظ رحمن غیر منصرف ہے اگرچہ اس کا خدا کے ساتھ مختص ہونا اس بات سے مانع ہے کہ اس کا مؤنث

"فعلى بافلانة" کے وزن پر آئے (مگر پھر بھی غیر منصرف ہے کیوں کہ) ان کلمات کے ساتھ لاحق کر دینے کی وجہ سے جن کے باب میں غیر منصرف ہونا غالب ہے۔

اور تسمیہ میں خاص طور پر انہیں اسما کو ذکر کیا گیا تاکہ عارف اس بات کو جان لے کہ اس بات کے لائق کہ جس سے تمام امور میں مدد طلب کی جائے صرف وہی ذات ہے جو معبود حقیقی ہو اور تمام نعمتوں کو عطا کرنے والا ہو، خواہ وہ نعمتیں فوری ہوں یا بعد میں ملنے والی چھوٹی ہوں یا بڑی، پس عارف اس بات کو سمجھ کر اپنے پورے دل و دماغ کے ساتھ اللہ کریم کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کی توفیق کی رسی کو مضبوط پکڑے اور وہ دل سے اللہ کریم کی عبادت میں مستغرق ہو جائے اور صرف اللہ کریم سے ہی مدد طلب کرے۔

لفظ عوذ کی تحقیق:

العوذ (ن)

کے معنی ہیں کسی کی پناہ لینا اور اس سے چمٹے رہنا۔ جیسا کہ محاورہ ہے: عاذا فلان بفلان فلاں نے اس کی پناہ لی اس سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ (البقرة آیت نمبر 67)

کہ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں۔

لفظ الہ اور لفظ اللہ کی مفصل تحقیق:

الہ (اللہ)

اس میں چند اقوال ہیں:

(۱) بعض کا قول ہے کہ اللہ کا لفظ اصل میں الہ ہے ہمزہ (تخفیفاً) حذف کر دیا گیا ہے اور اس پر الف لام (تعریف)

لا کر باری تعالیٰ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اسی تخصیص کی بناء پر فرمایا:

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (سورة مريم آیت نمبر 65)

کیا تمہیں اس کے کسی ہم نام کا علم ہے۔ الہ کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو الہ کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انہوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔ الہ کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ الہ (ف) یا الہ فلا و نالہ سے مشتق ہے جس کے معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بنا پر الہ کے معنی ہوں گے معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ الہ (س) بمعنی تھیر سے مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات و صفات کے ادراک سے چونکہ عقول متخیر اور دو ماندہ ہیں اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے۔

کل دون صفاتہ تحبیر الصفات وطل هناك تصاریف للغات۔
اے بروں از وہم و قال و قبل من خاک برفرق من و تمیل من اس لئے کہ انسان جس قدر صفات الہیہ میں غور و فکر کرتا ہے
اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بناء پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے،

تفکر وافی آلاء اللہ ولا تفکر وافی اللہ

کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو۔

(2) بعض نے کہا ہے کہ العاصل میں ولاہ ہے داؤ کو ہمزہ سے بدل کر الاء بنا لیا ہے اور ولہ (س) کے معنی عشق و محبت
میں وارفتہ اور بے خود ہونے کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو الہا نہ محبت ہے اس لئے اللہ کہا جاتا ہے
اگرچہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان
اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے ذات باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ:

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ (سورة الاسراء آیت نمبر 44)

مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

(3) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں لاہ یلوہ لیاہا سے ہے جس کے معنی پردہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذات باری

تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محبوب ہے اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (سورة الانعام آیت نمبر 103)

وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ نیز آیت کریمہ:

وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (سورة الحديد آیت نمبر 3)

میں الباطن کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الہ یعنی معبود درحقیقت ایک ہی ہے اس لئے ہونا یہ چاہیے تھا کہ

اس کی جمع نہ لائی جائے، لیکن اہل عرب نے اپنے اعتقاد کے مطابق بہت سی چیزوں کو معبود بنا رکھا تھا اس لئے الہة صیغہ جمع
استعمال کرتے تھے۔ قرآن میں ہے:-

أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِنْ دُونِنَا (سورة الانبياء آیت نمبر 43)

کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں کہ ان کو مصائب سے بچالیں۔

وَيَذَرُكَ وَالْإِهْتِكَ (سورة الاعراف آیت نمبر 127)

اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔ ایک قراءت میں والاهتک ہے جس کے معنی عبادت کے

ہیں الہانت۔ یہ اصل میں اللہ انت ہے ایک لام کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا ہے۔

اللہم بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یا اللہ کے ہیں اور اس میں میم مشدداً (حرف ندا کے عوض میں آیا ہے اور بعض کا

قول یہ ہے کہ یہ اصل میں یا اللہ امانا بخیر (اے اللہ تو خیر کے ساتھ ہماری طرف توجہ فرما) ہے (کثرت استعمال کی بنا پر) --- حی ہلا کی طرح مرکب کر کے اللہم بنا لیا گیا ہے۔ (جیسے ہلم)

لفظ شطن کی تحقیق:

الشیطان

اس میں نون اصلی ہے اور یہ شطن سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اور بشر شطون بمعنی بہت گہرا کنواں شطنت الدار گھر کا دور ہونا غریب شطون بمعنی بطن سے دوری وغیرہ محاورت اسی سے مشتق ہیں بعض نے کہا ہے کہ لفظ شیطان میں نون زائدہ ہے اور یہ شاطی شیط سے مشتق ہے جس کے معنی غصہ سے سوختہ ہو جانے کے ہیں۔ اور شیطان کو بھی شیطان اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے جیسا کہ آیت:

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ (سورۃ الرحمن آیت نمبر 15)

اور جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا،

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ وہ جن وانس سے ہو یا دیگر حیوانات سے۔ قرآن میں ہے:

شَیَاطِينِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ (سورۃ الانعام آیت نمبر 112)

شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو۔

لفظ رجم کی تحقیق و معانی:

الرجام پتھر اسی سے الرجم ہے جس کے معنی سنگسار کرنا کے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے رجمہ اسے سنگسار کیا اور جسے سنگسار کیا گیا ہو اسے مرجوم کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (سورۃ الشعراء آیت نمبر 116)

کہ تم ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْنَا لَنَعْلَمَنَّ كَيْفَ يَزُجُّوكُمْ (سورۃ الکہف آیت نمبر 20)

کیونکہ تمہاری قوم کے لوگ تمہاری خبر پائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ پھر استعارہ کے طور پر رجم کا لفظ جھوٹے گمان تو ہم، سب و شتم اور کسی کو دھتکار دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے رَجُمًا بِالْغَيْبِ یہ سب غیب کی باتوں میں انکل کے تھے چلاتے ہیں۔

وما هو عنہا بالحديث المرکم اور لڑائی کے متعلق یہ بات محض اندازے سے نہیں ہے۔ اور شیطان کو رجم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خیرات اور ملائم اعلیٰ کے مراتب سے راندہ ہوا ہے قرآن میں ہے:

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (سورة النحل آیت نمبر 98)

تو شیطان مردود کے دوسو اس سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ (سورة الحجر آیت نمبر 34)

تو بہشت سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔ اور شہب (ستاروں) کو رجوم کہا گیا ہے قرآن میں ہے:

رُجُومًا لِلشَّيْطَانِ (سورة الملك آیت نمبر 5)

اور انہیں شیطانوں کے لئے مار کیا۔

رجمہ و رجمتہ قبر کا پتھر جو بطور نشان اس پر نصب کیا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لفظ اسم کی تحقیق و اقوال:

الاسم

کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ یہ اصل میں سمو ہے کیونکہ اس کی جمع اسماء اور تصغیر سی آتی ہے۔ اور اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے کسی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:

اَرْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ نَجْرًا هَا (سورة الهود آیت نمبر 41)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کریم کا نام لے کر (کہ اس کے ہاتھ میں) اس کا چلنا (ہے) سوار ہو جاؤ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (سورة النمل آیت نمبر 30)

وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور مضمون یہ ہے اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اور آیت: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ (سورة البقرة آیت نمبر 31)

اور اس آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔ میں اسماء سے یہاں الفاظ و معانی دونوں مراد ہیں۔ خواہ مفرد ہوں خواہ

مرکب اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

اسم کی اقسام:

لفظ اسم دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ایک اصطلاحی معنی میں اور اس صورت میں ہمیشہ مخبر عنہ بنتا ہے۔ جیسے رجل و فرس و دم

وضع اول کے لحاظ سے اس اعتبار سے (کلمہ کی) انواع ثلاثہ یعنی مخبر عنہ (اسم) خبر اور رابطہ (حرف) تینوں سے یہی معنی مراد

ہیں۔ کیونکہ آدم (علیہ السلام) نے جس طرح اسماء کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی طرح افعال و حروف کا علم بھی انہیں حاصل ہو گیا تھا

اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کی ذات کا علم حاصل نہ ہو محض نام کے جاننے سے انسان اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا ہے مثلاً

اگر ہم ہندی یا رومی زبان میں چند چیزوں کے نام حفظ کر لیں تو ان چیزوں کے اسماء کے جاننے سے ہم ان کے مسمیات کو نہیں پہچان سکیں گے۔ بلکہ ہمارے علم انہیں چند اصوات تک محدود رہے گا اس سے ثابت ہوا کہ اسماء کی معرفت مسمیات کی معرفت کو مستلزم نہیں ہے اور نہ ہی محض اسم سے کسی کی صورت ذہن میں حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا آیت:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (سورة البقرة آیت نمبر 31)

میں اسماء سے کلام کی انواع ملاحظہ اور صورت مسمیات بمع ان کی ذوات کے مراد ہیں اور آیت،

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوهَا (سورة يوسف آیت نمبر 40)

جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے رکھ لئے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جن اسماء کی تم پرستش کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف سے عاری

تھے۔ جن کا وہ ان اسماء کے اعتبار سے ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔

اور آیت: وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلُوبًا سَمَّوْهُمْ (سورة الرعد آیت نمبر 33)

اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سے کہو کہ (ذرا) انکے نام تولو، اس میں سموہم سے یہ مراد نہیں

ہے کہ لات، عزی وغیرہ ان کے نام بیان کرو بلکہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن کو تم الہ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق کر کے

یہ تو بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ تم انہیں موسوم کرتے ہو (یعنی نہیں) اسی لئے اس

کے بعد فرمایا

أَمْ تَتَّبِعُونَ مَا لَا يُعَلِّمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ (سورة الرعد آیت نمبر 33)

یا اسے وہ بتاتے ہو جو اس کے علم میں ساری زمین میں نہیں یا یوں ہی اوپری بات۔

اور آیت: تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ (سورة الرحمن آیت نمبر 78)

تمہارے پروردگار۔۔ کا نام بڑا بابرکت ہے۔ اس میں اسم رب کے بابرکت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صفات۔

الکریم، العلیم، الباری، الرحمن الرحیم کے ذکر میں برکت اور نعمت پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (سورة الاعلی آیت نمبر 1)

اپنے رب کے نام کی پاکی بولو جو سب سے بلند ہے۔

وَاللَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى (سورة الاعراف آیت نمبر 180)

اور اللہ کریم کے نام سب اچھے ہی اچھے ہیں۔ اور آیت:

اسْمُهُ يَجْعَلُ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا (سورة المريم آیت نمبر 7)

جن کا نام بخوبی ہے اس کے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا۔

اس آیت میں سمیا کے معنی ہم نام کے ہیں اور آیت:

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (سورۃ البریجہ آیت نمبر 65)

بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

میں سمیا کے معنی نظیر کے ہیں یعنی کیا اس کی کوئی نظیر ہے جو اس نام کی مستحق ہو اور حقیقتاً اللہ کی صفات کے ساتھ متصف ہو اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کیا تم کسی کو بھی پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو کیونکہ ایسے تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر اللہ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان سے معانی بھی وہی مراد ہوں جو اللہ تعالیٰ پر اطلاق کے وقت ہوتے ہیں۔ اور آیت:

لَيَسْمُونُ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةً الْأُنْثَى (سورۃ النجم آیت نمبر 27)

اور وہ فرشتوں کو (خدا کی) لڑکیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ فرشتوں کو لڑکیوں کے نام سے موسوم کرنے کے معنی یہ

ہیں۔ کہ وہ فرشتوں کو بنات اللہ کہتے ہیں۔

نوٹ: لفظ اللہ کی تحقیق گزر گئی ہے۔

رحم کی لفظی تحقیق:

(رحم) الرحم۔

الرحمة وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔ اسی معنی میں نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے،

انه لما خلق الله الرحم قال له ابا الرحمن وانت الرحم شفقت اسمك في اسمي فمن وصلك وصلته ومن قطعت قطعتة۔

کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا: تین رحمان ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے۔ پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کر لیا گا میں

اسے پارہ پارہ کر دوں گا۔

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کر دی ہے احسان کو اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔ تو جس طرح لفظ رحم رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے: یہ دونوں فعلاں و فعیل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں

جیسے ندما نون ندیم پھر رحمن کا اطلاق ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سمایا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ۵

إِنَّ اللَّهَ شَفِيفٌ رَحِيمٌ (سورة البقرة آیت نمبر 182) بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ ۝ (سورة التوبة آیت نمبر 128)

بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان۔

بعض نے رحمن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمن کا لفظ نبوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر

دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت کریمہ:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ (سورة الاعراف آیت نمبر 156)

اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے تو عنقریب میں نعمتوں کو ان کے لئے لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں۔

جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الہی عام ہے اور مومن و کافروں دونوں کو

شامل ہے لیکن آخرت مومنین کے ساتھ مختص ہوگی اور کفار اس سے کلیتہً محروم ہوں گے)

[سورة الفاتحة (1): آية 2]

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (2)

”سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا۔“

متن:

الْحَمْدُ لِلَّهِ الْحَمْدُ:

هو الشناء على الجميل الاختياري من نعمة أو غيرها، والمدح: هو الشناء على الجميل

مطلقاً. تقول حمدت زيداً على علمه وكرمه، ولا تقول حمدته على حسنه، بل مدحته.

وقيل هما أخوان، والشكر: مقابلة النعمة قولاً وعملاً واعتقاداً قال:

أفادتكم النعماء مني ثلاثة... يدي ولساني والضمير المحجبا

فهو أعم منها من وجه، وأخص من آخر

ولما كان الحمد من شعب الشكر أشيع للنعمة، وأدل على مكانها الخفاء الاعتقاد، وما في آداب الجوارح من الاحتمال جعل رأس الشكر والعمدة فيه فقال عليه الصلاة والسلام الحمد رأس الشكر، وما شكر الله من لم يحمده، والذم نقيض الحمد والكفران نقيض الشكر.

ورفعه بالابتداء وخبرة الله وأصله النصب وقد قرء به، وإنما عدل عنه إلى الرفع ليدل على عموم الحمد وثباته له دون تجدد وحدثه، وهو من المصادر التي تنصب بأفعال مضمره لا تكاد تستعمل معها.

والتعريف فيه للجنس ومعناه: الإشارة إلى ما يعرف كل أحد أن الحمد ما هو؛ أو للاستغراق، إذ الحمد في الحقيقة كله، إذ ما من خير إلا وهو موليه بوسط أو بغير وسط كما قال تعالى:

وَمَا يَكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ

وفيه إشعار بأنه تعالى حي قادر مرید عالم، إذ الحمد لا يستحقه إلا من كان هذا شأنه. وقرء الحمد لله بإتباع الدال اللام وبالعكس تنزيلاً لها من حيث إنها يستعملان معاً منزلة كلية واحدة.

ترجمہ:

حمد کا معنی یہ ہے کہ افعال جلیلہ اختیار یہ پر زبان سے تعریف کرنا چاہے یہ تعریف نعت کے مقابلے میں ہو یا نہ ہو۔ اور مدح مطلقاً افعال جلیلہ پر تعریف کرنا خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری آپ

حمدت زیداً علیٰ علیہ وکرمہ

تو کہہ سکتے ہیں مگر

حمدت زیداً علیٰ حسنہ

نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس موقع پر "مدحت کہیں گے۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ حمد و مدح دونوں بھائی بھائی ہیں اور شکر

بمقابلہ نعت ہے چاہے وہ شکر قولاً، عملاً یا اعتقاداً ہو۔ قول شاعر ملاحظہ ہو،

أَفَادَتْكُمْ النُّعْمَاءُ مَنَى ثَلَاثَةً... يَدِي وَلِسَانِي وَالطَّمِيرُ الْمُحَجَّبَا

تمہاری نعمتوں نے میری طرف سے تمہارے لئے تین چیزوں کا افادہ کیا، میرے ہاتھ کا، میری زبان کا اور میرے چہرے

ہوئے دل کا، پس شکر و حمد و مدح سے من وجہ عام اور من وجہ خاص ہے۔

اور چونکہ حمد شکر کی دیگر اقسام کے مقابلہ میں نعمتوں کو زیادہ واضح کاف کرنے والی اور ان کے وجود پر زیادہ رہنمائی کرنے والی تھی کیونکہ اعتقاد مخفی ہے۔ اور اعضاء جو ارجح کے آداب میں دوسری چیز کا بھی احتمال ہو سکتا ہے اس لئے حدیث پاک،

الحمد راس الشکر ما شکر الله من الحمد بمحمد

میں حمد کو شکر کی اصل اور عمدہ ترین قسم قرار دیا گیا ہے، اور ذم نقیض ہے حمد کی اور کفران نقیض ہے شکر کی۔

اور الحمد مرفوع ہے مبتداء ہونے کی وجہ سے اور "لله" اس کی خبر ہے اور الحمد کی اصل حالت نصب ہے چنانچہ ایک قرأت نصب کی بھی ہے اور نصب سے رفع کی طرف عدول اس لئے کیا گیا تاکہ جملہ عموم حمد اور اثبات حمد پر دلالت کرے، نہ کہ حدوث و تجدد پر، اور الحمد مصادر کے ایسے قبیل سے ہے جو افعال محذوفہ کی وجہ سے منصوب ہوتے ہیں اور افعال کے ساتھ مذکور ہو کر استعمال نہیں ہوتے۔

اور "لا" تعریف جنس کے لئے ہے اور الف لام سے مقصود اس حقیقت حمد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے کہ حمد کی حقیقت یہ ہے، اور بعض نے کہا کہ الف لام استغراقی ہے کیونکہ تمام افراد حمد اللہ کریم ہی کے لئے ہیں اس لئے کہ تمام بھلائیوں کا عطا کرنے والا ہے چاہے وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ

وَمَا يَكْفُرُ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (سورة النحل آیت نمبر 53)

اور تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے۔

اور الحمد کے جملہ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کریم "حی" ہے، قادر ہے اور بالارادہ کام کرتا ہے، اور عالم بھی ہے، کیونکہ حمد کی مستحق وہی ذات ہے جو ان تمام صفات کی جامع ہے۔ اور "الحمد لله" بکسر الاول بھی پڑھا گیا ہے۔ وال کو لام جارہ کے تابع کرتے ہیں، اور اس کے برعکس لام کو وال کے تابع کرتے ہوئے "الحمد لله" بضم اللام بھی پڑھا گیا ہے۔ ان دونوں کو کلمہ واحدہ کے منزلہ میں اتار لینے کی وجہ سے کیونکہ یہ دونوں ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔

متن:

رَبِّ الْعَالَمِينَ

الرب في الاصل مصدر بمعنى التربية: وهي تبليغ الشيء إلى كماله شيئاً فشيئاً، ثم وصف به للمبالغة كالصوم والعدل. وقيل: هو نعت من رَبِّه ير به فهو رب، كقولك نم ينم فهو نم، ثم سمي به المالك لأنه يحفظ ما يملكه ويرببه. ولا يطلق على غيره تعالى إلا مقيداً كقوله: اذِجْعِ إِلَى رَبِّكَ

رب در اصل بمعنی تربیت ہے۔ اور تربیت کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے کمال تک آہستہ آہستہ پہنچانا پھر اس کو مبالغہ اللہ کی صفت بنا دیا گیا جس طرح صوم و عدل میں مبالغہ حمل ہوتا ہے اور بعض نے کہا کہ "رب العفت کا صیغہ ہے اور

رتہ، یرتہ فہورت سے مشتق ہے جیسا کہ آپ کا قول نمہ، ینمہ فہونمہ۔ پھر مالک کا نام رب رکھ دیا گیا کیونکہ وہ اپنی مملوکہ چیز کی حفاظت اوت تربیت کرتا ہے۔ اور لفظ رب غیر اللہ پر صرف اضافت کے ساتھ بولا جاتا ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان،

ارجع الی ربک

اپنے رب (بادشاہ) کے پاس پلٹ جا۔ (سورۃ یوسف آیت نمبر 50)

متن:

والعالم اسم لما یعلم بہ، كالأتم والقالب، غلب فیما یعلم بہ الصانع تعالیٰ، وهو كل ما سواہ من الجواهر والاعراض، فإنها لإمكانها وافتقارها إلى مؤثر واجب لذاته تدل علی وجودہ، وإنما جمعه ليشمل ما تحته من الاجناس المختلفة، وغلب العقلاء منهم فجمعه بالياء والنون كسائر أوصافهم.

وقيل: اسم وضع لذوى العلم من الملائكة والثقلين، وتناوله لغيرهم على سبيل الاستتباع. وقيل: عني به الناس ما هنا فإن كل واحد منهم عالم من حيث إنه يشتمل على نظائر ما في العالم الكبير من الجواهر والاعراض يُعَلَّمُ بها الصانع كما يعلم بما أبدعه في العالم الكبير، ولذلك سوى بين النظر فيهما، وقال تعالیٰ: وَفِي أَنْفُسِكُمْ، أَفَلَا تُبْصِرُونَ.

وقرء رَبِّ الْعَالَمِينَ بالنصب على المدح، أو النداء، أو بالفعل الذي دل عليه الحمد، وفيه دليل على أن الممكنات كما هي مفتقرة إلى المحدث حال حدوثها فهي مفتقرة إلى السبق حال بقائها.

ترجمہ:

اور عالم اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم ہو جیسے خاتم اور قالب پھر غلبہ ان چیزوں میں استعمال ہونے لگا جن کے ذریعے صانع کا علم ہو۔ (اور عالم کا مصداق) وہ تمام اشیاء ہیں جو صانع کے علاوہ ہیں خواہ وہ اعراض کے قبیلے سے ہوں یا جواہر کے، اس لئے یہ اشیاء اپنے امکان اور اپنے احتیاج الی المؤثر کی وجہ سے صانع کی وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ اور عالم کو جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ تمام مختلف اجناس کو شامل ہو جائے جو اس کے تحت آسکتی ہیں اور ان اجناس مختلفہ میں عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے عالم کی "یا" "نون" کے ساتھ جمع لائے ہیں جس طرح عقلاء کے دوسرے اوصاف کی یا نون کے ساتھ جمع آتی ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ عالم تام ہے، جن وانس کا جو ذوی العقول ہیں، اور اس صورت میں عالم ان تین مخلوقات کے علاوہ مخلوقات کو جہاں اور اثرات شامل ہوگا۔ اور بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت کریمہ میں عالمین سے مراد انسان ہیں بوجہ اس کے کہ ہر فرد بشر ایک عالم ہے اس حیثیت سے کہ انسان ان جیسی چیزوں پر مشتمل ہے جو عالم کبیر یعنی دنیا میں پائی جاتی ہیں یعنی جواہر و اعراض کہ ان کے ذریعہ صالح کا علم ہوتا ہے جس طرح کہ عالم کبیر کی انہیں ایجادات کی وجہ سے صالح کا علم ہوتا ہے اور اسی وجہ سے عالم کبیر کے اندر نظر عبرت ڈالنے اور انسان کا خود اپنی ذات میں غور کرنے کو مساوی درجہ میں رکھا گیا ہے، اللہ کریم کا ارشاد ہے،

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ. وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین والوں کو اور خود تم میں تو کیا تمہیں سوچتا نہیں۔ (سورۃ الذاریات آیت نمبر 21)

اور "رب العالمین" کو "امدح" کا مفعول ہونے کی وجہ سے یا منادی ہونے یا اس فعل مقدر کا مفعول ہونے کی وجہ سے جس پر "الحمد" دلالت کرتا ہے، منصوب بھی پڑھا گیا ہے، اور یہ آیت اس سلسلہ میں دلیل ہے کہ ممکنات کس طرح اپنے موجود ہونے میں ایک ایسی ذات کی طرف محتاج ہیں جو انہیں باقی رکھے۔

لفظ حمد کی تحقیق اور حمد و شکر میں فرق:

(حمد) (Praise)

الحمد لله (تعالیٰ) کے معنی اللہ تعالیٰ کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثناء بیان کرنے کے ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان اوصاف پر بھی جو پیدا نشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں چنانچہ جس طرح خرچ کرنے اور علم و سخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اسکی درازی قدم و قامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن حمد صرف افعال اختیار پر ہوتی ہے۔ نہ کہ اوصاف اضطراری پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ لہذا ہر شکر حمد ہے، مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے۔ اور جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

إِنَّهُ تَحِيَّاتٌ تَحِيَّاتٌ (سورۃ الہود آیت نمبر 73)

وہی ہے سب خوبوں والا عزت والا۔

میں حمید بمعنی محمود بھی ہو سکتا ہے اور حامد بھی حماد اک ان تفعل کذا یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَمُبَشِّرٍ أَيْ رَسُولٍ يَأْتِي مِنَ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (سورۃ الصافات آیت نمبر 6)

اور ان رسول کی بشارت سنا تا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے۔
 میں لفظ احمد سے حضرت محمد ﷺ کی ذات کی طرف اشارہ ہے اور اس میں تشبیہ ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ کا نام
 احمد ہوگا اسی طرح آپ اپنے اخلاق و اطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی بشارت میں لفظ احمد (صیغہ
 تفضیل) بولنے سے اس بات پر تشبیہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے پیشرو و جملہ انبیاء سے افضل ہیں اور
 آیت کریمہ:

مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ (سورة الفتح آیت نمبر 29)

محمد اللہ کے رسول ہیں۔

میں لفظ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو من وجہ حضرت محمد ﷺ کا نام ہے لیکن اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
 اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:
 اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيٰى (سورة مريم آیت نمبر 7)
 ہم تجھے خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جن کا نام یحییٰ ہے۔
 میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنی حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔

لفظ رب کی عمدہ تحقیق:

(ربب) الرب (ن)

کے اصل معنی تربیت کرنا یعنی کس چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا کے ہیں اور یہ دو راہ و رتبہ تینوں ایک ہی
 معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے:

لان یروہنی رجل من قریش احب الی من ان یرہنی رجل من ہوازن۔

کہ کسی قریشی کا سردار ہونا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ بنی ہوازن کا کوئی آدمی مجھ پر حکمرانی کرے۔

رب کا لفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارۃ بمعنی فاعل استعمال ہوتا ہے اور مطلق (یعنی اصافت اور لام تعریف سے خالی)
 ہونے کی صورت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو جملہ موجودات کے مصالح کا کفیل ہے، اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ
 ارشاد ہے:

بَلَدًا طَيِّبَةً وَرَبِّ غَفُورٍ (سورة قسما آیت نمبر 15)

پاکیزہ شہر اور بخشنے والا رب۔

نیز فرمایا:

وَلَا يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ اَرْبَابًا (سورة آل عمران آیت نمبر 80)

اور نہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرا لو۔

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور دوسروں پر بھی۔ چنانچہ فرمایا:

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (سورة الفاتحة آیت ۱)

ہر طرح کی حمد خدا ہی کو (سزاوار) ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اللَّهُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (سورة الصافات آیت نمبر ۱۲۶)

اللہ کو جو رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادا کا۔

رب الفرس گھوڑے کا مالک اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:

اذْ كُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَأَنْسَاةَ الشَّيْطَانِ ذِكْرَ رَبِّهِ (سورة يوسف آیت نمبر ۴۲)

اس سے کہا اپنے رب (بادشاہ) کے پاس میرا ذکر کرنا تو شیطان نے اسے بھلا دیا کہ اپنے رب (بادشاہ) کے سامنے یوسف کا ذکر کرے۔

اللہ کریم کا ارشاد، اَرْجِعْ اِلَى رَبِّكَ (سورة يوسف آیت ۵۰)

اپنے سردار کے پاس لوٹ جاؤ۔

اور آیت:

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ (سورة يوسف آیت نمبر ۲۳)

کہا اللہ کی پناہ وہ عزیز تو میرا رب یعنی پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ربی سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور بعض نے عزیز مصر مراد لیا ہے۔ لیکن پہلا قول انسب معلوم ہوتا

ہے۔ ربانی بقول بعض یہ ربان (صیغہ صفت) کی طرف منسوب ہے۔ لیکن عام طور پر فعلان (صفت) فعل سے آتا ہے۔ جیسے

عطشان سکران اور فعل۔ (فتح عین سے بہت کم آتا ہے) جیسے نعسان (من نعس) بعض نے کہا ہے کہ یہ رب (مصدر) کی

طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسے حکیم (یعنی جو حکمت کو فروغ دے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

رب مصدر کی طرف ہی منسوب ہے اور ربانی وہ ہے۔ جو علم سے اپنی پرورش کرے۔ درحقیقت یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں

کیونکہ جس نے علم کی پرورش کی تو اس نے علم کے ذریعہ اپنی ذات کی بھی تربیت کی اور جو شخص اس کے ذریعہ اپنی ذات کی

تربیت کرے گا وہ علم کو بھی فروغ بخشے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ رب بمعنی اللہ کی طرف منسوب ہے اور ربانی بمعنی الہی ہے

(یعنی اللہ والا) اور اس میں الف نون زائد تان ہیں جیسا کہ جسم ولحی کی نسبت میں جسمانی و لسانی کہا جاتا ہے۔

اس امت کا عالم ربانی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اناربانى هذه الامة میں اس امت کا عالم ربانی ہوں۔

اس کی جمع ربانیوں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

لَوْلَا يَنْهَاهُمْ رَبُّنَا يُنْهَوْنَ وَالْأَحْبَابُ (سورة المائدة آیت نمبر 63)
انہیں کیوں نہیں منع کرتے اُن کے پادری اور درویش۔

كُونُوا رَبَّانِيِّينَ (سورة آل عمران آیت نمبر 79)
ہاں یہ کہے گا کہ اللہ والے ہو جاؤ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ربانی اصل میں سریانی لفظ ہے اور یہی قول زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عربی زبان میں یہ لفظ بہت کم پایا جاتا ہے اور آیت:

رَبِّيُّونَ كَثِيرٌ (آل عمران آیت نمبر 146) بہت سے اللہ والوں نے۔

میں رسی بمعنی ربانی ہے۔ یہ دونوں مصدر ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے ربوبیۃ اور دوسروں کے لئے ربایۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

الرب (صیغہ صفت) جمع ارباب۔

قرآن مجید میں ہے:

أَرْبَابٌ مُتَّفِقُونَ خَلِقُوا أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورة يوسف آیت نمبر 39)
کیا جدا جدا رب اچھے یا ایک اللہ جو سب پر غالب۔

اصل تو یہ تھا کہ رب کی جمع نہ آتی۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ لفظ خاص کر ذات باری تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن عقیدہ کفار کے مطابق بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے اور ارباب کے علاوہ اس کی جمع اربۃ و ربوب بھی آتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

(بسیط) کانت اربہم بہز و غرہم عقد الجوار و كانوا معشر اغلدا
ان کے ہم عہد بنی بہر تھے جنہیں عقد جوار نے مغرور کر دیا اور درحقیقت وہ خدا لوگ ہیں۔
دوسرے شاعر نے کہا ہے:

و كنت امرء افضت اليك ربابتي و قبلك ربي فضع ربوب
تم آدمی ہو جس تک میری سرپرستی پہنچتی ہے تم سے پہلے بہت سے میرے سرپرست بن چکے ہیں مگر میں ضائع ہو گیا ہوں۔

رابعہ کا معنی:

عہد و پیمان یا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں قمار بازی کے تیر لپیٹ کر رکھے جاتے ہیں۔

رابتہ وہ بیوی جو پہلے شوہر سے اپنی اولاد کی تربیت کر رہی ہو۔ اس کا مذکر راب ہے۔ لیکن وہ اولاد جو پہلے شوہر سے ہو اور دوسرے شوہر کی زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں پرورش پا رہی ہو۔ اسے ریب یا ریبیہ کہا جاتا ہے اس کی جمع رائب آتی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

وَرَبَائِبُكُمُ اللَّائِي فِي مَجُورٍ كُمْ (سورۃ النساء آیت نمبر 23)

اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں۔

ربیت الادیم بالسمن میں نے چڑے کو گھی لگا کر نرم کیا۔ ریبیت الدواء بالعسل میں نے شہد سے دوا کی اصلاح کی سقاء مریوب پانی مشک جسے تیل لگا کر نرم کیا گیا ہو۔

شاعر نے کہا ہے: فکونی له کالسمن ربت له الادم
اس کے لئے ایسی ہو جاؤ جیسے رب لگا ہوا چڑا گھی کے لئے ہوتا ہے۔

الرباب کا معنی:

الرباب:

بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نباتات کی پرورش کرتا اور اسے بڑھاتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے مطر کو (دودھ) اور بادل کو تشبیہ القوح (یعنی دودھ جلی اونٹنی) کہا جاتا ہے محاورہ ہے۔ اربت السحابة بدلی متواتر برستی رہی اور اس کے اصل معنی ہیں بدلی صاحب تربیت ہو گئی اس کے بعد اس سے ٹھہرنے کا معنی لے کر یہ لفظ کسی جگہ پر مقیم ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے ارب فلان بسمکان کذا اس نے فلان جگہ پر اقامت اختیار کی۔

رب تقلیل کے لئے آتا ہے اور کبھی نکشیر کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا:

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا (سورۃ الحجرات آیت نمبر 2)

بہت آرزوئیں کریں گے کافر۔

العالم کا معنی و مفہوم:

العالم فلك الافلاك

اور جن جواہر و اعراض پر حاوی ہے سب کو العالم کہا جاتا ہے دراصل یہ فاعل کے وزن پر ہے جو اسم آلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے طابع بد۔ مایطبع بد خاتم مایختم بد وغیرہ اسی طرح عالم بھی ہے جس کے معنی ہیں ما علم بہ یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ کسی شے کا علم حاصل کیا جائے اور کائنات کے ذریعہ بھی چونکہ خدا کا علم حاصل ہوتا ہے اس لئے جملہ کائنات العالم کہلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں کائنات پر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ اللہ کریم کا فرمان،

أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورة الاعراف آیت نمبر 185)

کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت پر غور نہیں کیا۔ اور عالم کی جمع (العالمون) اس لئے بناتے ہیں کہ کائنات کی ہر نوع اپنی جگہ ایک مستقل عالم کی حیثیت رکھتی ہے مثلاً عالم انسان، عالم الماء و عالم النار وغیرہ نیز ایک روایت میں ہے۔

ان الله بضعته عشر الف عالم

کہ اللہ تعالیٰ نے دس ہزار سے کچھ اوپر عالم پیدا کئے ہیں، باقی رہا یہ سوال کہ (واؤنوں کے ساتھ) اسے جمع سلامت کے وزن پر کیوں لایا گیا ہے (جو ذی العقول کے ساتھ مختص ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ عالم میں چونکہ انسان بھی شامل ہیں اس لئے اس کی جمع سلامت لائی گئی ہے کیونکہ جب کسی لفظ میں انسان کے ساتھ دوسری مخلوق بھی شامل ہو تو تغلیبا اس کی جمع واؤنوں کے ساتھ بنا لیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ لفظ عالم سے خلایق کی خاص قسم یعنی فرشتے جن اور انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس لئے اس کی جمع واؤنوں کے ساتھ لائی گئی ہے۔

عالم کی اقسام:

امام جعفر بن محمد کا قول ہے کہ عالمین سے صرف انسان مراد ہیں اور ہر فرد بشر کو ایک عالم قرار دے کر اسے جمع لایا گیا ہے۔ نیز انہوں نے کہا ہے کہ عالم دو قسم پر ہے:

(1) العالم الکبیر بمعنی فلک و مافیہ

(2) العالم الصغیر یعنی انسان

کیونکہ انسان کی تخلیق بھی ایک مستقل عالم کی حیثیت سے کی گئی ہے اور اس کے اندر قدرت کے وہ دلائل موجود ہیں جو

عالم کبیر میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

أَوَلَمْ نَجْعَلْ لَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ (سورة الحجر آیت نمبر 70)

ہم نے تمہیں منع نہ کیا تھا کہ اوروں کے معاملہ میں دخل نہ دو۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (سورة الفاتحة آیت نمبر 1)

سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔

اور آیت کریمہ:

وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (سورة البقرة آیت نمبر 47)

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ تم یعنی بنی اسرائیل کو ان کی ہمعصر اقوام پر فضیلت دی اور بعض نے اس دور کے فضلا مراد

لئے ہیں جن میں سے ہر ایک نوازشات الہی کی بدولت بمنزلہ ایک عالم کے تھا اور ان کو عالم سے موسم کرنا ایسے ہی ہے،

جیسا کہ آیت کریمہ:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً (سورة الفتح آیت نمبر 120)

بیٹے ابراہیم ایک امام تھا، میں حضرت ابراہیم کو امام کہا ہے۔

[سورة الفاتحة (1): الآيات 3 الى 4]

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ (3) مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ (4)

متن:

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ كررة للتعليل على ما سنذكره.

مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ قراءة عاصم والكسائي ويعقوب ويعضدة قوله تعالى: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئاً وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ. وقرأ الباكون: مَلِكِ. وهو المختار لأنه قراءة أهل الحرمين ولقوله تعالى: لِيَبْنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ؟. ولما فيه من التعظيم. والمالك هو المتصرف في الاعيان المملوكة كيف يشاء من الملك. والمالك هو المتصرف بالامر والنهي في شأموهم من الملك. وقرأ ملك بالتخفيف وملك بلفظ الفعل. ومالكا بالنصب على المدح أو الحال، ومالك بالرفع منوناً ومضافاً على أنه خبر مبتدأ محذوف. وملك مضافاً بالرفع والنصب.

ويوم الدين يوم الجزاء ومنه كما تدين تدان وبيت الحماسة:

ولم يَبْقَ سِوَى الْعَدَا... نِ دِنَاهُمْ كَمَا دَانُوا

أضاف اسم الفاعل إلى الظرف إجراء له مجرى المفعول به على الاتساع كقولهم: يَا سَارِقَ اللَّيْلَةِ أَهْلَ الدَّارِ، ومعناه: ملك الامور يوم الدين على طريقة ونأدى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ. أوله الملك في هذا اليوم، على وجه الاستمرار لتكون الإضافة حقيقية معدة لوقوعه صفة للمعرفة، وقيل: الدِّينِ الشريعة، وقيل: الطاعة.

والمعنى يوم جزاء الدين، وتخصيص اليوم بالإضافة: إما لتعظيمه، أو لتفردة تعالى بنفوذ الامر فيه، وإجراء هذه الاوصاف على الله تعالى من كونه موجداً للعالمين رباً لهم منعياً عليهم بالنعم كلها ظاهرها وباطنها عاجلها وآجلها،

مالكاً لأمورهم يوم الثواب والعقاب، للدلالة على أنه الحقيقي بالحمد لا أحد أحق به

منه بل لا يستحقه على الحقيقة سواة، فإن ترتب الحكم على الوصف يشعر بعليته له، وللإشعار من طريق المفهوم على أن من لم يتصف بتلك الصفات لا يستأهل لأن يحمده فضلاً عن أن يعبد، فيكون دليلاً على ما بعده، فالوصف الاول لبيان ما هو الموجب للحمد، وهو الإيجاد والتربية.

والثاني والثالث للدلالة على أنه متفضل بذلك مختار فيه، ليس يصدر منه لإيجاب بالذات أو وجوب عليه قضية لسوابق الاعمال حتى يستحق به الحمد. والرابع لتحقيق الاختصاص فإنه مما لا يقبل الشركة فيه بوجه ما، وتضمنين الوعد للحامدين والوعيد للمعرضين.

ترجمہ:

جونہایت مہربان اور بڑا رحیم ہے۔ "الرحمن، الرحیم" کو استحقاقِ حمد کی علت بیان کرنے کے لئے مکرر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ عنقریب ذکر ہوگا۔ جو روز جزا کا مالک ہے، عاصم اور کسائی اور یعقوب نے مالک کو الف کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی تائید میں اللہ کریم کا قول پیش کیا ہے،

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ

جس دن کوئی جان کسی جان کا کچھ اختیار نہ رکھے گی اور سارا حکم اس دن اللہ کا ہے۔ (سورۃ الانفطار آیت نمبر 19)

اور باقی تمام قراء نے "ملک" کو بغیر الف کے پڑھا ہے اور اسی کو پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اہل حرم کی قراءت یہی ہے نیز اس لئے بھی کہ اللہ کریم کا ارشاد،

لَيْسَ الْمُلْكُ الْيَوْمَ

آج کس کی بادشاہی ہے۔ (سورۃ المؤمن آیت نمبر 16)

اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں تعظیم زیادہ ہے۔ اور مالک اس کو کہا جاتا ہے جو اعیانِ مملوکہ میں اپنی مرضی کا تصرف کرے۔ اور "مالک" مشتق ہے "ملک" سے بکسر المیم۔ اور ملک وہ ہے جو محکومین کے اندر حکم چلاتا ہو۔ یا یہ ملک بضم المیم سے مشتق ہے۔ اور ملک کی ایک قراءت یہ بھی ہے کہ اس میں لام کے سکون کے ساتھ پڑھا جائے، تخفیف کی وجہ سے، اور یہ ماضی کے صیغہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ نیز مالک کو بحالتِ نصب بر بنائے حال یا مدح بھی پڑھتے ہیں۔ اور مالک رفع کے ساتھ بھی ہے، نیز رفع کی دو صورتیں ہیں یا توتونین کے ساتھ یا پھر مضاف قرار دے کر ضمہ کے ساتھ مالک کا مرفوع ہونا مبتداء محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور "ملک" الف کے بغیر بھی رفع اور نصب دونوں طریقوں سے پڑھا گیا ہے لیکن ان دونوں صورتوں میں "ملک" مضاف ہوگا۔

اور یوم الدین، یوم الجزاء ہے اور اسی قبیل سے (مشہور مثال) "کما تدين تदान" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے)

اور حماسہ کا شعر،

وَلَمَّا يَبْتِغِ سَيِّئِ الْعَدُوِّ... بِدِينِهِمْ كَمَا دَانُوا

جب برائی کو پورے طور پر اس نے ظاہر کر دیا اور سوائے ظلم و صبر کرنے اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہا تو ہم نے بھی ان کو ایسا ہی بدلہ دیا جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھ کیا۔

اور یوم کو اضافت کے لئے مخصوص کرنا یا تو خود یوم کی عظمت کی وجہ سے ہے اور یا اس لئے کہ یوم الدین ہی ایسا موقع ہے جہاں صرف ظاہر اور باطناً خدا کا حکم نافذ ہوگا۔

اور اللہ کریم کے لئے اس موجد للعالمین ہونے اور تمام انعامات کے منعم ہونے کو خواہاں وہ انعامات ظاہرہ ہوں یا باطنہ فوری ہوں یا بعد میں ملنے والے اور تمام امور کا یوم جزاء میں مالک ہونے کے اوصاف کا ذکر کرنا اس لئے ہے کہ یہ اوصاف اس بات پر دلالت کریں کہ حمد کا اللہ کریم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں۔

در اصل سرے سے ہی اللہ کریم کے سوا کوئی بھی حمد کا مستحق نہیں اس لئے کہ حکم کا وصف پر مرتب ہونا یہ بتاتا ہے کہ یہ وصف حکم کے لئے علت ہے نیز اس لئے کبھی اوصاف کو ذکر کیا گیا کہ بطور مفہوم مخالف کے یہ معلوم ہو جائے کہ جو ان صفات کے ساتھ متصف نہیں وہ حمد کا مستحق نہیں اور جب وہ حمد کا مستحق نہیں تو عبادت کا مستحق کیسے ہوگا۔ اور جب بطور مفہوم مخالف کے غیر عبادت کی نفی ہوگئی۔ تو پھر یہ آیات "ایناک نعبد" کے لئے جو بعد میں آ رہا ہے بطور دلیل کے ہو جائیں گی۔ پس وصف اول اس چیز کو بیان کرنے کے لئے جو حمد کا موجب ہے یعنی اللہ کریم کی ایجاد اور تربیت اور دوسری اور تیسری صفت اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ اللہ کریم یہ انعام اپنے اختیار سے بطور تفضل و احسان کرتا ہے۔ یہ انعام اس سے اضطراراً صادر نہیں ہوئے (جیسا کہ فلاسفہ کی رائے ہے) اسی طرح بندہ کے سابقہ اعمال کے تقاضے میں اللہ کریم سے یہ انعام وجوباً بھی صادر نہیں ہوئے (اور ہم نے خدا کو متفضل اور مختار کیوں مانا) تاکہ ان انعامات کی وجہ سے ذات باری تعالیٰ مستحق حمد ٹھہرے، اور چوتھی صفت یعنی "مالک یوم الدین" ذات باری کے ساتھ اختصاص حمد کو ثابت کرنے کے لئے ہے، کیونکہ یوم جزاء کی بادشاہت ان چیزوں میں سے ہے جو اپنے اندر شرکت کو قبول نہیں کرتیں۔ نیز یہ صفت اس لئے بھی ذکر کی گئی ہے تاکہ اس کے ضمن میں حامدین کے لئے ثواب کا وعدہ اور حمد سے اعراض کرنے والوں کے لئے عذاب کی وعید ہو جائے۔

لفظ رحمن اور رحیم میں فرق:

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ دونوں نام رحمت سے مشتق ہیں، دونوں میں مبالغہ ہے رحمن کے معنی میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اس میں رحیم کی نسبت ایک حرف زائد ہے اور زیادة اللفظ تدل علی زیادة المعنی یعنی زائد حروف زیادة معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ رحمن کا لفظ اللہ کی طرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اور اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

قل ادعوا الله ادا دعوا الرحمن اياما تدعوا فله الاسماء الحسنی

تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر جو کہہ کر پکارو سب اسی کے اچھے نام ہیں۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 110)

بخلاف اس کے رحیم کا لفظ ماسوی اللہ کے لئے بھی مستعمل ہے مثلاً نبی کریم ﷺ کو رؤف رحیم، کہا گیا ہے آیت کریمہ

ہے،

لقد جاءكم رسول من انفسكم عزيزٌ عليه ما عنتم حريصٌ عليكم بالمؤمنين

رؤف الرحيم۔ (سورۃ التوبہ آیت نمبر 128)

بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے

نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان۔

بعض کے نزدیک اللہ کریم دنیا میں رحمن اور آخرت میں رحیم ہے کہ دنیا میں مومن اور کافر سب اس کی رحمت سے متمتع

ہوتے ہیں اور آخرت میں رحمت سے فائدہ اٹھانے والے صرف مومن ہوں گے۔

تحقیق لفظ مالک:

ملک کے معنی زیر تصرف چیز پر بذریعہ علم کنٹرول کرنے کے ہیں اور ملک بمنزلہ جنس کے ہیں لہذا ہر ملک کو ملک تو کہہ سکتے

ہیں لیکن ہر ملک ملک نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے:

وَلَا يَمْلِكُونَ لِنَفْسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا

اور خود اپنی جانوں کے بھلے برے کے مالک نہیں اور نہ مرنے کا اختیار نہ جینے کا نہ اٹھنے کا۔ (سورۃ الفرقان آیت نمبر 3)

اور فرمایا:

أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ (سورۃ یونس آیت نمبر 31)

یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا (سورۃ الاعراف آیت نمبر 188)

تم فرماؤ میں اپنی جان کے بھلے برے کا خود مختار نہیں۔

یوم کی تعریف:

(یوم) الیوم (Day)

(ن) یہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے اور عربی زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ

کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا ایک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو، قرآن

مجید میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ (سورة آل عمران آیت نمبر 155)
بے شک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں۔

یَوْمَ الدِّينِ سے مراد:

علامہ پالی پتی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

یَوْمَ الدِّينِ قیامت کا دن ہے۔

دین، جزاء اور بدلے کو کہتے ہیں اور

كَمَا تُدِينُنَّ دَانَ

دین ہی سے مشتق ہے یعنی جیسے تو فعل کرے گا ویسا ہی بدلہ لے گا۔۔۔ یا لفظ دین سے اسلام اور اطاعت مراد ہے کیونکہ وہ ایسا دن ہے کہ جس میں اسلام اور اطاعت کے سوا کوئی چیز نفع نہیں دے گی۔ مجاہد کہتے ہیں کہ

یَوْمَ الدِّينِ بمعنی یَوْمَ الْحِسَابِ

ہے چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے:

یعنی یہ سیدھا حساب ہے۔

ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ

[سورة الفاتحة (1): آية 5]

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ (5)

”ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں۔“

متن:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ثم إنه لما ذكر الحقيقي بالحمد، ووصف بصفات عظام تميز بها عن سائر
الذوات وتعلق العلم بمعلوم معين خوطب بذلك، أي: يا من هذا شأنه نخصك
بالعبادة والاستعانة، ليكون أدل على الاختصاص

وللترقي من البرهان إلى العيان والانتقال من الغيبة إلى الشهود، فكان المعلوم صار
عياناً والمعقول مشاهداً والغيبة حضوراً،

بني أول الكلام على ما هو مبادئ حال العارف من الذكر والفكر والتأمل في أسمائه
والنظر في آلائه والاستدلال بصنائه على عظيم شأنه وباهر سلطانه، ثم قفى بما هو

منتہی امرہ وهو أن يخوض لجة الوصول ويصير من أهل الشاهدة فيراه عياناً ويناجيه شفاهاً.

اللهم اجعلنا من الواصلين للعين دون السامعين للأثر. ومن عادة العرب التفنن في الكلام والعدول من أسلوب إلى آخر تطرية له وتنشيطاً للسامع، فيعدل من الخطاب إلى الغيبة، ومن الغيبة إلى التكلم وبالعكس، كقوله تعالى: حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ وَقوله: وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَخْتِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ وَقول امرء القيس:

تطاوَلْ لَيْلِكَ بِالْإِثْمِ... وَنَامَ الْخَلْقُ وَلَمْ تَرْقُدِ

وَبَاتَ وَبَاتَتْ لَهُ لَيْلَةٌ... كَلَيْلَةِ ذِي الْعَائِرِ الْأَرْمَدِ

وَذَلِكَ مِنْ نَبَأِ جَاءَنِي... وَخَبْرَتُهُ عَنْ أَبِي الْأَسْوَدِ

وایا ضمیر منصوب منفصل، وما يلحقه من الياء والكاف والهاء حروف زیدت لبيان التكلم والخطاب والغيبة لا محل لها من الإعراب، كالتاء في أنت والكاف في أرأيتك. وقال الخليل: إيا مضاف إليها، واحتج بما حكاه عن بعض العرب إذا بلغ الرجل الستين فأياه وإيا الشواب، وهو شاذ لا يعتمد عليه. وقيل: هي الضائر، وإيا عمدة فإنها لها فصلت عن العوامل تعذر النطق بها مفردة فضم إليها إيا لتستقل به، وقيل: الضمير هو المجموع.

وقرء إِيَّاكَ بفتح الهمزة وهياك بقلبها هاء.

والعبادة: أقصى غاية الخضوع والتذلل ومنه طريق معبّد أي منزل، وثوب ذو عبدة إذا كان في غاية الصفاقة، ولذلك لا تستعمل إلا في الخضوع لله تعالى.

ترجمہ:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

پھر جب ما قبل میں اس ذات کا ذکر ہو چکا جو حمد کے لائق ہے اور اس ذات کی ایسی اعلیٰ صفات ذکر کی گئی جن کی وجہ سے وہ ذات دوسری ذوات سے ممتاز ہو گئی اور مخاطب کا علم ایک معلوم معین کے ساتھ وابستہ ہو گیا تو اب اس ذات کو خطاب کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا یعنی اے وہ ذات جس کی شان یہ ہے کہ ہم عبادت اور استعانت کو اسی کے ساتھ خاص کرتے ہیں، اور خطاب کا صیغہ اس لئے لایا گیا کہ اختصاص پر دلالت کرے۔

وللترقى من البرهان... الخ

نیز اس لئے کہ ترقی من البرهان اور انتقال من الغیبة الی الشہود پر دلالت کرے تو گویا جو چیز درجہ معلوم و معقول اور غیبت میں تھی، اب مشاہدہ اور حضور میں آگئی۔

بنی أول الكلام على ما هو... الخ

آغاز کلام کی بنیاد ان کی کیفیات پر تھی جو عارف کے ابتدائی حالات تھے یعنی ذکر و فکر اور صفات باری اور اس کی نعمتوں میں غور و حوض کرنا اور اللہ کریم کی کارگیری سے اس کی عظمت و شان اور اس کی غالب بادشاہت پر استدلال کرنا، پھر ابتدائی حالات کے بعد ان حالات کو بیان فرمایا جو عارف کے درجات کا منتہی ہے یعنی وصول الی اللہ کے حضور میں گھس جانا اور مشاہدین میں سے ہو جانا۔ تو عارف اس مقام پر پہنچ کر اللہ کریم کی زیارت اپنی آنکھوں سے کرتا ہے اور بالمشافہ سرگوشی بھی کرتا ہے۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل کر دے جو اس کی ذات تک پہنچے ہوئے ہیں اور ان سے دور رکھ جنہوں نے صرف تیری خبر سن رکھی ہے۔ (اور وہ تیری زیارت سے محروم ہیں۔)

ومن عادة العرب التفنن... الخ

اور اہل عرب کی عادت قسم بہ قسم کلام کرنے کی اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل ہونے کی ہے، اور یہ تفنن اور اسلوب کی تبدیلی کلام میں نئی زندگی پیدا کرنے اور سامع کو متوجہ کرنے کے لئے ہوتی ہے، چنانچہ خطاب سے غیبت کی طرف اور غیبت سے تکلم کی طرف اور ان کے برعکس عدول کیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان،

حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَئِينَ بِهِمْ

یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہو اور وہ اچھی ہو اسے انہیں لے کر چلیں۔ (سورۃ یونس آیت نمبر 22)

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُحْدِثُ سَعَابًا مُّسْقِنًا (سورۃ الفاطر آیت نمبر 9)

اور اللہ ہے جس نے بھیجیں ہوائیں کہ بادل ابھارتی ہیں پھر ہم اسے کسی مرحوہ شہر کی طرف رواں کرتے ہیں۔
نیز امرء القیس شاعر کا قول بھی اس کی تائید کرتا ہے،

تطاوَلْ لَيْلِكَ بِالْأَمْدِ... وَنَامَ الْخَلْقُ وَلَمْ تَرْقُدِ

اے جان تیری رات مقام امد میں طویل ہوگئی اور جو شخص عشق سے خالی ہے، وہ سو گیا، اور تمہیں نیند نہیں آئی۔

وَبَاتَ وَبَاتَتْ لَهُ لَيْلَةٌ... كَأَيِّلَةِ ذِي الْعَائِرِ الْأَزْمَدِ

اور تم نے رات گزار دی اور رات گزر بھی گئی مگر اس کرب و بے چینی کے ساتھ کہ جس طرح آشوب چشم کے مریض کی رات گزرتی ہے۔

وَذَلِكَ مِنْ نَبَأِ جَاءَنِي... وَخَبْرَتُهُ عَنِ أَبِي الْأَسْوَدِ

اور یہ سب بے چینی اور بیداری کا سبب وہ منحوس خبر تھی جو مجھ تک پہنچی یعنی مجھے ابوالاسود کی موت کی خبر دی گئی۔

وایا ضمیر منصوب منفصل... الخ

اور ایسا ضمیر منفصل ہے اور جو اس کے آخر میں یاء اور کاف اور ہاء گتے ہیں وہ حرف ہیں، تکلم، خطاب اور غائب کو بیان کرنے کے لئے زیادہ کر دیئے گئے ہیں، نیز ان کا کوئی بھی محل اعراب نہیں۔ جس طرح "انت" کی تاء اور "ایتک" کے کاف کا کوئی محل اعراب نہیں۔ اور ظلیل نے کہا کہ "ایا" ان چیزوں کی طرف مضاف ہے اور ان کا استدلال اس مقولہ سے ہے جس کو بعض عربوں سے نقل کیا گیا ہے،

إذا بلغ الرجل الستين فأياها وإيا الشواب

جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو نو جوان عورتوں سے دور رکھے اور جوان عورتوں کو اپنے پاس آنے سے منع کر دے۔

یہ حکایت شاذ اور ناقابل استعمال ہے، اور بعض مفسرین نے کہا کہ حروف لواحق ضمیریں ہیں اور "ایا" ان کے لئے سہارا ہے اس لئے کہ یہ ضمیریں جب اپنے عوامل سے جدا کر دی گئیں، تو ان کا تنہا استعمال معذرہ ہو گیا۔ لہذا "ایا" کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا، تاکہ اس کے ساتھ مل کر مستقل ہو جائیں۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ دونوں چیزوں کا مجموعہ ضمیر ہے، اور بعض مفسرین نے "ایا" ہمزہ کے فتح کے ساتھ اور ہتاک ہمزہ کو ہاء کے ساتھ بدل کر پڑھا ہے۔

والعبادة: أقصى غاية الخضوع... الخ

عبادت نام ہے انتہائی درجہ کے خضوع اور تذلل کا، اسی سے طریق معبد مشتق ہے جس کے معنی مستعمل و ذلیل کردہ راستہ، اور اسی سے ثواب و عبادت ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کپڑا سخت بناوٹ والا ہو اور چونکہ عبادت کے معنی انتہائی خضوع کے ہیں اسی لئے لفظ عبادت صرف اس خضوع و خشوع کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ذات باری تعالیٰ کے لئے ہو۔

متن:

والاستعانة: طلب المعونة وهي: إما ضرورية، أو غير ضرورية. والضرورة ما لا يتأتى الفعل دونه كإقتدار الفاعل وتصوره وحصول آلة ومادة يفعل بها فيها وعند استجماعها يوصف الرجل بالاستطاعة ويصح أن يكلف بالفعل. وغير الضرورية تحصيل ما يتيسر به الفعل ويسهل كالراحلة في السفر للقادر على المشي، أو يقرب الفاعل إلى الفعل ويحمله عليه، وهذا القسم لا يتوقف عليه صحة التكليف والبراد طلب المعونة في المهمات كلها، أو في أداء العبادات، والضمير المستكن في الفعلين للمقارن ومن معه من الحفظة، وحاضري صلاة الجماعة، أو له ولسائر الموحدين.

أدرج عبادته في تضاعيف عبادتهم وغلط حاجته بماجتهم لعلها تقبل ببركها
وبجواب إليها ولهذا شرعت الجماعة

وقدم المفعول للتعظيم والاهتمام به والدلالة على المحصر ولذلك قال ابن عباس
رضي الله عنهما (معناه نعبدك ولا نعبد غيرك) وتقديم ما هو مقدم في الوجود
والتنبيه على أن العابد ينبغي أن يكون نظرة إلى المعبود أولاً وبالذات ومنه إلى
العبادة لا من حيث إنها عبادة صدرت عنه بل من حيث إنها نسبة شريفة إليه
ووصلة سنية بينه وبين الحق، فإن العارف إنما يمتحن وصوله إذا استغرق في ملاحظة
جناب القدس وغاب عما عداه، حتى إنه لا يلاحظ نفسه ولا حالاً من أحوالها إلا من
حيث إنها ملاحظة له ومنتسبة إليه، ولذلك فضل ما حكى الله عن حبيبه حين قال:
لَا تَخْزُنْ إِنَّ اللَّهَ مَعْنَا. على ما حكاها عن كليبه حين قال: إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ.

وكرر الضمير للتنصيص على أنه المستعان به لا غير، وقدمت العبادة على الاستعانة
ليتوافق رؤوس الآي، ويعلم منه أن تقديم الوسيلة على طلب الحاجة أدعى إلى
الإجابة.

وأقول: لها نسب المتكلم العبادة إلى نفسه أو هم ذلك تبجهاً واعتداداً منه بما
يصدر عنه، فعقبه بقوله:

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ليدل على أن العبادة أيضاً مما لا يتم ولا يستتب له إلا بمعونة منه وتوفيق، وقيل:
الواو للحال والمعنى نعبدك مستعينين بك. وقرء بكسر النون فيهما وهي لغة بني
تميم فإنهم يكسرون حروف المضارعة سوى الياء إذا لم ينضم ما بعدها.

ترجمہ:

اور استعانت نام ہے مدد طلب کرنے کا اور معونت ضروری ہوگی یا غیر ضروری۔ اور ضروری وہ ہے کہ جس کے بغیر فعل
حاصل نہ ہو جیسے فاعل کا قادر ہونا اور فاعل کو اس فعل کا علم ہونا اور اس آلہ اور مادہ کا حاصل ہونا کہ جس آلہ کے ذریعے فعل اس مادہ
میں انجام پائے گا۔ اور ان معونات ضروریہ کے اکٹھے ہونے کے وقت آدمی کو اس فعل کا مستطیع قرار دیا جائے گا اور اس کو مکلف
بنانا صحیح ہوگا۔ معونت غیر ضروریہ ان چیزوں کے بھی فراہم کرنے کا نام ہے۔ جو فاعل کو فعل کے قریب کر دے اور اس کو فعل پر
ابھارے اور اس قسم پر سخت تکلیف کا مدار نہیں۔

والمراد طلب المعونة في البهيات... الخ

اور "ایاک نستعین" میں استعانت سے مقصود تمام اہم اور مشکل کاموں میں طلب کرنا ہے یا بالخصوص ادائے عبادت کے سلسلہ میں، اور "نعبد" اور "نستعین" میں جو ضمیر متکلم پوشیدہ ہے اس سے خود پڑھنے والا اور فرشتے جو اس پر نگران مقرر ہیں اور حاضرین جماعت مراد ہیں۔ یا خود پڑھنے والا اور جمیع مومنین مراد ہیں۔ قاری نے اپنی عبادت کو تہوں میں شامل کر دیا اور اپنی حاجت کو ان کی حاجت کے ساتھ ملا دیا۔ عجب نہیں کہ اس کی عبادت ان کی عبادت کی برکت سے قبول کر لی جائے اور ان کی حاجت کے ساتھ اس کی حاجت پوری کر دی جائے اور اسی حکمت کے پیش نظر نماز باجماعت شروع ہوئی۔

وقدم المفعول للتعظيم والاهتمام... الخ

اور مفعول یعنی "ایاک" کو تعظیم کے لئے مقدم کیا گیا یا مہتمم بالشان ہونے کی وجہ سے۔ اور دلالت علی الحصر کی غرض سے اور اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے "ایاک نعبد" کے معنی "نعبدک ولا نعبد غیرک" سے کئے ہیں۔ نیز "ایاک" کو مقدم کیا گیا اس چیز کو پہلے لانے کے لئے جو وجود واقعی میں سب سے پہلے ہے اور عابد کو اس بات پر تہیہ کرنے کے لئے کہ اس کی نظر اول میں بلا واسطہ معبود کی طرف ہونا چاہیے اور پھر معبود سے عبادت کی طرف، لیکن نظر الی العبادت اس حیثیت سے نہیں کہ وہ ایک عبادت ہے جو اس سے صادر ہوئی بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ایک شریف نسبت ہے جس کا منتہی ذات باری ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ عابد اور اللہ کریم کے درمیان ایک تعلق ہے اس لئے کہ عارف باللہ کا وصول الی اللہ اس وقت ثابت ہوگا جب کہ وہ اللہ کریم کے علاوہ ہر ایک سے غائب ہو کر صرف اللہ کریم کی ذات میں مستغرق ہو جائے یہاں تک کہ اپنی ذات اور اپنے احوال کی بھی پروا نہ کرے، اور اگر پروا نہ کرے بھی تو اس حیثیت سے کہ یہ نفس اور حال اللہ کریم کے ملاحظہ کا ذریعہ ہیں، اور اس کی طرف منسوب ہیں۔ اور اسی لئے اس کلام کو جسے اللہ کریم نے اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے جب کہ انہوں نے کہا تھا:

لَا تَجْزُونَ إِنْ أَلَّ اللَّهُ مَعَنَا غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (سورہ التوبہ آیت نمبر 40)

اس کلام پر فضیلت دی گئی ہے جس کو اللہ کریم نے اپنے کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نقل کیا ہے جب کہ انہوں نے کہا

تھا۔

ان معی ربی سہدین

بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے اب راہ دیتا ہے۔ (سورہ الشعراء آیت نمبر 62)

وكرر الضمير للتنصيص... الخ

اور "ایاک" ضمیر کو مکرر لایا گیا اس بات کی تصریح کے لئے کہ قابل استعانت صرف اللہ کریم کی ذات ہے اس کے علاوہ کوئی بھی لائق استعانت نہیں۔ اور عبادت کو استعانت پر مقدم کرنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ آیتوں کے سرے ایک جیسے ہو جائیں

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پتہ چل جائے کہ ضرورت و حاجت کے سوال سے پہلے وسیلہ بھیج دینا قبولیت کے لئے داعی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ جب متکلم نے عبادت کی نسبت اپنی طرف کی تو اس نسبت نے اس کے دل میں ایک زعم اور اپنے صادر ہونے والی عبادت کا وزن بطریق وہم پیدا کر دیا گیا تو اللہ کریم نے اس کے بعد "نستعین" ذکر فرمایا تاکہ اس بات پر رہنمائی ہو جائے کہ عبادت بھی انہی چیزوں میں سے ہے جو اللہ کریم کی مدد کے بغیر مکمل اور درست نہیں ہو سکتیں۔ اور بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "وایاک نستعین" میں واؤ حالیہ ہے اور آیت کے معنی "نعبدک مستعینین بک" یعنی اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اس حال میں کہ تجھ ہی سے مدد بھی چاہتے ہیں۔ اور بعض مفسرین نے "نعبدونستعین" کے نون کو مفتوح پڑھنے کی بجائے مکسور پڑھا ہے اور یہ لغت بنی تمیم کی ہے، کیونکہ یہ لوگ یاء کے علاوہ باقی علامات مضارع کو جب کہ ان کا بعد مضموم نہ ہو کسرہ دیتے ہیں۔

العبودية کا مفہوم:

(عبد)

کے معنی ہیں کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا مگر العبادۃ کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے العبادۃ کا لفظ العبودیۃ سے زیادہ بلوغ ہے لہذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے جو بے حد صاحب افضال و انعام ہو اور ایسی ذات صرف ذات الہی ہی ہے اسی لئے فرمایا:

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاكَ (سورة الاسراء آیت نمبر 23) کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عبادت کی اقسام:

عبادۃ دو قسم پر ہے،

- (1) عبادت بالتشخیر جسے ہم سجد کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔
- (2) عبادت بالاختیار اس کا تعلق صرف ذوی العقول کے ساتھ ہے یعنی ذوی العقول کے علاوہ دوسری مخلوق اس کی مکلف نہیں۔

اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔

اور اللہ کی بندگی کرو۔

آیت کریمہ: اعْبُدُوا رَبَّكُمْ (سورة البقرة آیت نمبر 21)

وَاعْبُدُوا اللَّهَ (سورة النساء آیت نمبر 36)

میں اسی دوسری قسم کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔

الاستعانة:

اس کا معنی مدد طلب کرنا ہے،

قرآن مجید میں ہے، اسْتَوْعِبُوا بِالصَّلَاةِ وَالصَّلَاةِ (سورۃ الفاتحہ آیت نمبر 45)
صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

[سورة الفاتحة (1): آية 6]

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (6)

ترجمہ: ”ہم کو سیدھا راستہ چلا۔“

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

بیان للبعونة المطلوبة فكأنه قال: كيف أعينكم فقالوا اهْدِنَا. أو أفراد لها هو المقصود الاعظم.

والهداية دلالة بلطف ولذلك تستعمل في الخير وقوله تعالى: فَأَهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ وارجع على التهكم. ومنه الهداية وهو ادى الوحش لمقدماتها، والفعل منه هدى، وأصله أن يعدى باللام، أو إلى، فعومل معاملة اختار في قوله تعالى: وَاخْتَارَ مُوسَى قَوْمَهُ

وهداية الله تعالى تتنوع أنواعاً لا يحصيها عد كما قال تعالى: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ولكنها تنحصر في أجناس مترتبة:

الاول: إفاضة القوى التي بها يتمكن البرء من الاهتداء إلى مصالحه كالقوة العقلية والحواس الباطنة والمشاعر الظاهرة.

الثاني: نصب الدلائل الفارقة بين الحق والباطل والصلاح والفساد وإليه أشار حيث قال: وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ وقال: وَأَمَّا تُمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَى عَلَى الْهُدَى.

الثالث: الهداية بإرسال الرسل وإنزال الكتب، وإياها عنى بقوله: وَجَعَلْنَاهُمْ لِمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا وقوله:

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِينَ هُوَ أَوْفَوْا.

الرابع: أن يكشف على قلوبهم السرائر ويريهم الاشياء كما هي بالوحى، أو الإلهام والبنامات الصادقة، وهذا قسم يختص بنبيه الانبياء والاولياء وإياها عنى بقوله: أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبُهِدَاهُمْ أَقْتِدَةً. وقوله:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.

فالمطلوب إما زيادة ما مدعوته من الهدى، أو الثبات عليه، أو حصول المراتب المرتبة عليه. فإذا قاله العارف بأنه الواصل عنى به: أرشدنا طريق السير فيك لتمحو عنا ظلمات أحوالنا، وتميط غواشى أهداننا، لنستضيء بنور قدسك فنراك بنورك. والامر والدعاء يتشاركان لفظاً ومعنى ويتفاوتان بالاستغلاء والتسفل وقيل: بالرتبة.

والسراط: من سراط الطعام إذا ابتلعه فكأنه يسرط السابلة، ولذلك سمي لقباً لأنه يلتقبهم. والظراط من قلب السين صاداً ليطابق الطاء في الإطباق، وقد يشم الصاد صوت الزاى ليكون أقرب إلى المبدل منه. وقرأ ابن كثير برواية قنبل عنه، ورويس عن يعقوب بالأصل، وحمزة بالإشمام، والباقون بالصاد وهو لغة قريش، والثابت في الإمام وجمعه سُرُط ككتب وهو كالطريق في التذكير والتأنيث. وَالْمُسْتَقِيمَ المستوى والمراد به طريق الحق، وقيل: هو ملة الإسلام.

ترجمہ:

أَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ . الخ

اس آیت کریمہ میں اس معونت کی وضاحت ہے جو "نستعین" میں طلب کی گئی ہے، تو گویا اللہ کریم نے بندوں سے پوچھا کہ میں تمہاری کس قسم کی مدد کروں بندے نے "أهدنا الصراط المستقیم" کے ساتھ جواب دیا کہ سیدھے راستے پر چلا دیجئے اور مقصوداً عظیم کو اس آیت کریمہ سے علیحدہ بیان کر دیا گیا۔ اور ہدایت و اسباب اطاعت کو پیدا کر کے رہنمائی کرنے کا نام ہے اور اسی وجہ سے ہدایت کا استعمال صرف خیر میں ہوتا ہے اور باقی رہا اللہ کریم کا فرمان،

فَأَهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْحَنِيمِ . ان سب کو ہانگوراہ دوزخ کی طرف۔ (سورۃ الصافات آیت نمبر 23)

جس میں شر کے معنی موجود ہیں، لہذا وہ استہزاء پر محمول ہے اور اسی ہدایت سے ہدیہ بمعنی تحفہ اور ہودی الوحش گلوں کے پیش رو جانور ماخوذ ہیں۔

اور ہدایت کا نفل اس کی ماضی "ہدی" ہے اور اس کا اصل استعمال یہ ہے کہ (اپنے مفعول ثانی کی طرف) لام یا الی کے واسطے کے ساتھ متعدی ہو لیکن آیت میں اس کے صلہ کو حذف کر کے بغیر واسطے کے متعدی کر دیا گیا، جس طرح کہ اللہ کریم کے فرمان،

وَاخْتَارَ مُوسَى قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا يُحِبُّونَا

اور موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے لئے چنے۔ (سورہ اعراف آیت نمبر 155)
میں "اختار" کے صلہ من کو حذف کر کے "قومہ" کی طرف بلا واسطہ متعدی کر دیا گیا۔

وهداية الله تعالى لتتنوع أنواعاً... الخ

اور اللہ کریم کی ہدایت مختلف قسموں پر مشتمل ہے جن کا شمار ممکن نہیں، البتہ اس کی اجناس محدود ہیں جن میں وہ منحصر ہے اور ان جنسوں میں ترتیب ہے یعنی بعد والی جنس پہلی پر مرتب ہو رہی ہے۔ پہلی جنس ان قوتوں کا فیضان ہے کہ جن کی وجہ سے انسان اپنے مصالح تک راستہ تلاش کرنے پر قادر ہو جاتا ہے جیسا کہ قوت عقلیہ اور حواسِ باطنہ کا فیضان اور دوسری جنس ان دلائل کا قائم کرنا ہے جو حق و باطل اور درستی و بگاڑ کے درمیان امتیاز پیدا کریں اور اللہ کریم نے اسی قسم کی طرف اپنے اس فرمان سے اشارہ کیا،

وَهَدَيْنَاكَ التَّجْدِينَ

اور

وَأَمَّا تَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ.

اور تیسری جنس یہ کہ اللہ کریم نے رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر رہنمائی فرمائی، اور اللہ کریم کے مندرجہ ذیل

اقوال میں اسی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا

اور اللہ کریم کا دوسرا قول،

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِينَ هِيَ أَقْوَمُ.

اور ہدایت کی چوتھی جنس یہ ہے کہ اللہ کریم لوگوں کے دلوں پر راز کی باتیں منکشف کر دے اور اشیاء کی حقیقتوں پر ان کو باخبر کر دے اب یہ کشف حقائق اور اشیاء کا دیکھنا خواہ یہ بذریعہ وحی ہو یا یا الہام اور سچے خوابوں کے ذریعے ہو، اس چوتھی جنس کی تحصیل حضرات انبیاء و اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ کریم کا فرمان اسی کی تائید کرتا ہے،

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ فَبِهَدَاهُمْ اقْتَدُوا.

اور

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.

(تو اللہ کریم کی حمد و ثناء کرنے والے بندے) کا "اهدنا الصراط المستقیم" سے مقصود اس ہدایت پر اضافہ اور

ثابت قدمی طلب کرنا ہے جو اسے اللہ کریم کی طرف سے عطا کی گئی ہے یا ہدایت کے جس درجہ پر فائز ہے اس پر مرتب ہونے والے اگلے مدارج کا حصول مقصود ہے پس جب عارف واصل "اهدنا" کہے گا تو اس کی مراد یہ ہوگی کہ "اے اللہ مجھے سیر فی

اللہ کے راستے پر لگا دیجئے تاکہ ہمارے اعمال کی تیرگی ہم سے ختم ہو جائے اور ہمارے جسمانی حجابات اٹھ جائیں تاکہ ہم آپ کی پاکیزگی کے نور سے روشنی حاصل کریں اور پھر آپ کو آپ ہی کے نور سے دیکھیں۔

والامر والدعاء يتشاور كان لفظاً... الخ

اور امر و دعا لفظاً و معنی ایک ہی طرح کے ہیں مگر ان میں استعلاء اور تسفل کے اعتبار سے فرق ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ ان میں رتبہ و واقعی کے اعتبار سے فرق ہے۔ اور "سراط" "سراط الطعام" سے لیا گیا ہے، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کھانے والا نکلے تو گویا راستہ بھی قافلہ کو نکل لیتا ہے اور اسی وجہ سے راستہ کو "لحم" کہتے ہیں کیونکہ وہ راہگیروں کو لقمہ بنا لیتا ہے۔ اور "صراط" کا صا د سین سے بدلا ہوا ہے، اور یہ تبدیلی اس لئے ہوئی تاکہ صا حروف مطبوعہ ہونے میں طاء کے موافق ہو جائے اور کبھی صا کی ادائیگی میں زاء کی آواز کی بُو پیدا کی جاتی ہے، تاکہ صا اپنے مبدل عنہ یعنی سین سے قریب تر ہو جائے اور ابن کثیر نے بروایت قبیل اور روہین نے بروایت یعقوب سین کے ساتھ پڑھا ہے، اور حمزہ نے اشام کے ساتھ اور باقی قراء نے صا کے ساتھ اور قریش کی قراءت بھی یہی ہے۔ اور مصحف عثمانی میں بھی یہی ہے اور "سراط" کی جمع "سروط" ہے جیسا کہ کتاب کی جمع "کتب"۔ اور صراط مذکور و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے جس طرح لفظ طریق دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور مستقیم کے معنی سیدھے راستے کے ہیں، اور آیت کریمہ میں اس سے مراد راہِ حق ہے اور بعض مفسرین نے اس سے ملتِ اسلامیہ مراد لیا ہے۔

الهدایتہ کا معنی و مفہوم:

(ہدی) ہدی

ہدایت کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کیا ہے۔

(1) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے کی ہے اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔ چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد ہے:

رَبَّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى (سورۃ طہ آیت نمبر 50)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی۔

(2) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ تجارت کی طرف

دعوت دی ہے چنانچہ آیت کریمہ:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 73)

اور ہم نے انہیں امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلا تے ہیں،

اس میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(3) سوم بمعنی توفیق

خاص ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَالَّذِينَ اهْتَدُوا زَادَهُمْ هُدًى (سورۃ محمد آیت نمبر 17)

اور جنہوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمائی۔

(4) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ اللہ کریم نے فرمایا:

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (سورۃ محمد آیت نمبر 5)

جلد انہیں راہ دے گا، اور ان کا کام بنا دے گا۔

اور آیت کریمہ:

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 43)

اور ہم نے ان کے سینوں میں سے کینے کھینچ لئے۔

[سورة الفاتحة (1): آية 7]

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (7)

ترجمہ: ”راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا، نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا،“

متن:

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

بدل من الاول بدل الكل، وهو في حكم تكرير العامل من حيث إنه المقصود بالنسبة، وفائدته التوكيد والتنصيص على أن طريق المسلمين هو المشهود عليه بالاستقامة على أكد وجه وأبلغه لأنه جعل كالتفسير والبيان له فكانه من البين الذي لا خفاء فيه أن الطريق المستقيم ما يكون طريق المؤمنين.

وقيل: الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمُ الانبياء، وقيل: النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه

وقيل: أصحاب موسى وعيسى عليهما الصلاة والسلام قبل التحريف والنسخ. وقرئ

صِرَاطٍ مِنْ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

والإنعام: إيصال النعمة، وهي في الاصل الحالة التي يستلذها الإنسان فأطلقت لها

يستلذذ من النعمة وهي اللين، ونعم الله وإن كانت لا تحصى كما قال: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا تنحصر في جنسين: دنيوی وأخروی.

والاول قسبان: موهبی وکسبی والموهبی قسبان: روحانی کدفع الروح فيه وإشراقه بالعقل وما يتبعه من القوى كالفهم والفكر والنطق، وجسبانی کتخلیق البدن والقوى المحالة فيه والهيئات العارضة له من الصحة وكمال الاعضاء والكسبی تزكية النفس عن الرذائل وتحليتها بالاخلاق السنية والملكات الفاضلة، وتزيين البدن بالهيئات المطبوعة والحلى المستحسنة وحصول الجاه والمال.

والثاني: أن يغفر له ما فرط منه ويرضى عنه ويبوئه في أعلى عليين مع الملائكة المقربين أبدأ الأبدان.

والمراد هو القسم الاخير وما يكون وصلة إلى نيله من الآخرة فإن ما عدا ذلك يشترك فيه المؤمن والكافر.

ترجمہ:

صراط الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ... الخ

یہ عبارت "صراط الذین" سے بدل الکل ہے۔ اور بدل کل تکرار عامل کے حکم میں ہوتا ہے اس حیثیت سے کہ فعل کی نسبت اس کی طرف مقصود ہوتی ہے اور بدل الکل کا فائدہ تاکید اور اس بات کی تصریح کرنا ہے کہ مسلمانوں کا راستہ ہی وہ راستہ ہے جس کے مستقیم ہونے کی گواہی دی جا چکی ہے کیونکہ یہ کلمات ما قبل کے لئے تفسیر اور بیان کے درجہ میں مؤکد اور بلیغ طریقہ پر ہیں۔ (تو گویا بدل کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ) یہ بار روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس میں کوئی خفاء نہیں کہ طریق مستقیم وہی ہے جو مومنین کا راستہ ہے۔

وقیل: الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمُ الانبياء... الخ

بعض مفسرین نے کہا کہ "انعمت علیہم" سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ اس سے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے وہ اصحاب ہیں اپنے ادیان میں منسوخ و تحریف سے پہلے تھے۔ اور ایک قراءت میں "صراط الذین" کی بجائے "صراط من انعمت علیہم" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

والإنعام: إيصال النعمة، وهي في الاصل... الخ

انعام نعمت پہنچانے کا نام ہے، اور اصل میں ایسی کیفیت کا نام ہے جس کو آدمی لذیذ پاتا ہے۔ پھر اس کا استعمال ان اشیاء میں ہونے لگا جو اس کیفیت کا سبب بنتی ہیں۔ اور یہ نعمت بکسر نون نعمت بفتح نون سے مشتق ہے۔ جس کا معنی نرمی ہے، اور اللہ کریم

کی نعمتوں کے افراد اگرچہ شمار میں نہیں آسکتے جیسا کہ خود اللہ کریم کا ارشاد ہے،

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا

اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے۔ (سورۃ النحل آیت نمبر 18)۔

جنسی اعتبار سے نعمت دو قسموں پر ہے دنیاوی اور اخروی، پھر دنیاوی کی دو قسمیں ہیں وہی یعنی اللہ کریم کی عطا کردہ اور دوسری کسی۔ پھر وہی کی دو قسمیں ہیں روحانی جیسے کہ انسان کی ذات میں روح کا پھونکنا اور اس روح کو عقل سے اور عقل کے بعد جو باطنی قوتیں حاصل ہوتی ہیں، ان سے روشن کرنا اور باطنی قوتیں یعنی فہم و فکر و نطق ہیں اور جسمانی ڈھانچے کو پیدا کرنا، اور ان قوتوں کو پیدا کرنا جو اس ڈھانچے میں سموی ہوئی ہیں، اور ان کیفیات کو پیدا کرنا جو اس بدن کو عارض ہیں یعنی صحت اور اعضاء کا کمال۔ اور کسی نعمت سے مراد نفس کو زائل سے پاک کرنا اور اس کو اخلاق اور عمدہ صلاحیتوں سے مزین کرنا۔ اور بدن کو اچھے اور خوبصورت زیورات سے سجانا اور مال و مرتبہ کا حاصل ہونا ہے،

اور اخروی نعمت یہ ہے کہ اللہ کریم اس کی غلطیوں کو معاف کر دے اور اس سے راض ہو کر اعلیٰ علیین میں مقرب فرشتوں کے ساتھ ہمیشگی عطا فرمائے اور آیت کریمہ میں اخروی نعمتوں اور ان کے وسائل مراد ہیں کیونکہ اس کے سوا دوسری نعمتوں میں تو مومن و کافر دونوں شامل ہیں۔

تحقیق لفظ صراط:

(صراط) الصراط (Right path)

بمعنی سیدھی راہ، قرآن مجید میں ہے:

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا (سورۃ الانعام آیت نمبر 153)

اور یہ کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ۔

صراط اور سراط میں فرق:

اسے سراط (بسین مہملہ) پڑھا جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

(سراط) السراط

کے معنی آسان راستہ، کے آتے ہیں اور اصل میں سرطت الطعام و زاردتہ سے مشتق ہے جس کے معنی طعام کو نگل جانے کے ہیں۔ اور راستہ کو صراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راہرو کو گویا نگل لیتا ہے یا راہرو اس کو نگلتا ہوا چلایا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔

قتل ارضا عالها وقتلت ارض جاھلھا

کہ واقف کار ہو تو زمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک کر دیتی ہے۔

قول ابوتمام:

ابوتمام نے کہا ہے:

رغته الفيأ في بعد ما كان حقة رعاها اذا ما المزن ينهل سا كبه
اس کے بعد کو اس نے ایک زمانہ دراز تک سرسبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھالیا یعنی دبا کر دیا۔ اسی
طرح راستہ کو لقم اور ملتقم بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گویا راہرو اس کو لقمہ بنا لیتا ہے۔

مفہوم استقامت:

الاستقامة (استفعال)

کے معنی راستہ خط مستقیم کی طرح سیدھا ہونے کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر راہ حق کو بھی صراط مستقیم کہا گیا ہے چنانچہ اللہ کریم
نے فرمایا:

أهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (سورة الفاتحة آیت نمبر 6)

ہم کو سیدھا راستہ چلا۔

اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کریم

نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (سورة فصلت آیت نمبر 13)

پیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے۔

متن:

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ

بدل من الَّذِينَ عَلَى مَعْنَى أَنْ الْمَنْعَمِ عَلَيْهِمْ هُمُ الَّذِينَ سَلِمُوا مِنَ الْغَضَبِ وَالضَّلَالِ. أَوْ
صِفَةٌ لَهُ مَبِينَةٌ أَوْ مَقِيدَةٌ عَلَى مَعْنَى أَنَّهُمْ جَمَعُوا بَيْنَ النِّعْمَةِ الْمَطْلُوقَةِ، وَهِيَ نِعْمَةُ الْإِيمَانِ

وَبَيْنَ السَّلَامَةِ مِنَ الْغَضَبِ وَالضَّلَالِ

وَذَلِكَ إِنَّمَا يَصِحُّ بِأَحَدٍ تَأْوِيلِينَ، إِجْرَاءَ الْبُوصُولِ مَجْرَى النُّكْرَةِ إِذَا لَمْ يَقْصُدْ بِهِ مَعْهُودٌ
كَالْمَحَلِّ فِي قَوْلِهِ:

وَلَقَدْ أَمَرْتُ عَلَى اللَّيْمِ يَسْتَبْنِي وَقَوْلُهُمْ: إِنِّي لَأَمْرٌ عَلَى الرَّجُلِ مِثْلَكَ فَيَكْرَمُنِي. أَوْ جَعَلَ غَيْرَ
مَعْرِفَةٍ بِالْإِضَافَةِ لِأَنَّهُ أَضِيفَ إِلَى مَالِهِ ضِدًّا وَاحِدًا وَهُوَ الْمَنْعَمُ عَلَيْهِمْ، فَيَتَعَيَّنُ تَعَيَّنَ

الحركة من غير السكون.

وعن ابن كثير نصبه على الحال من الضمير المجرور والعامل أتعبت. أو بإخضرار أعنى.
أو بالاستثناء إن فسر النعم بما يعم القبيلين

والغضب: ثوران النفس إرادة الانتقام. فإذا أسند إلى الله تعالى أريد به المنتهى
والغاية على ما مر. وعليهم في محل الرفع لأنه نائب مناب الفاعل بخلاف الأول. ولا
مزيدة لتأكيد ما في غير من معنى النفي. فكأنه قال: لا الم غضوب عليهم ولا الضالين
ولذلك جاز أنا زيدا غير ضارب. كما جاز أنا زيدا لا ضارب. وإن امتنع أنا زيدا مثل
ضارب وقرء وغيرو الضالين

والضلال: العدول عن الطريق السوي عمداً أو خطأ، وله عرض عريض والتفاوت ما
بين أدناه وأقصاه كثير.

قيل: الْمُغْضُوبِ عَلَيْهِمُ اليهود لقوله تعالى فيهم: مَنْ لَعَنَهُ اللهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ.
وَالضَّالِّينَ النصارى لقوله تعالى: قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا. وقد روى مرفوعاً،
ويتجه أن يقال: المغضوب عليهم العصاة والضالين الجاهلون بالله. لأن المنعم عليه
من وفق للجمع بين معرفة الحق لذاته والخير للعبل به، وكان المقابل له من اختل
إحدى قوتيه العاقلة والعاملة. والمخل بالعبل فاسق مغضوب عليه لقوله تعالى في
القاتل عمداً وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ. والمخل بالعقل جاهل ضال لقوله:
فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ.

ترجمہ:

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ... الخ

یہ کلام "الذین۔ الخ" کا بدل الکل ہے اس معنی میں کہ منعم علیہم یعنی لوگ ہیں جو اللہ کریم کے غضب اور گمراہی سے
دور ہیں، یا یہ عبارت ما قبل کے لئے صفت کافہ یا صفت مقیدہ ہے اس معنی میں کہ منعم علیہم نعمت مطلقہ یعنی ایمان و نعمت
کاملہ یعنی اللہ کریم کے غضب اور گمراہی سے سلامتی کے جامع ہیں۔

وذلك إنما يصح بأحد تأويلين... الخ

اس عبارت کو صفت بنانا دو تاویلوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ ہی صحیح ہو سکتا ہے۔ پہلی یہ کہ اسم موصول کو نکرہ کے درجہ
میں رکھا جائے جب کہ اس سے کسی معبود خارجی کا قصد نہ کیا جائے، جس طرح معرف باللام یعنی لفظ اللئیم شاعر کے قول میں

"القد امرء۔۔ الخ میں نکرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو،

وَلَقَدْ أَمَرْتُ عَلَى اللَّيْثِيِّ يَسْتَبْنِي وَقَوْلُهُمْ: إِلَى لِأَمْرِ عَلَى الرَّجُلِ مِثْلَكَ فَيَكْرَمُنِي
میں اتنے کہنے انسان کے پاس سے گزرتا ہوں جو مجھے برا بھلا کہتا رہتا ہے تو میں وہاں سے یہ کہتا ہوا گزر جاتا ہوں کہ
گالیاں دینے والے کی مراد میں نہیں ہوں۔ اور جس طرح معرف باللام عرب کے قول "إِنِّي لِأَمْرِ عَلَى الرَّجُلِ مِثْلَكَ
فَيَكْرَمُنِي" میں نکرہ کی حیثیت رکھتا ہے یا یہ تاویل کی جائے کہ غیر کو مضاف ہونے کے وجہ سے معرف بنا لیا جائے اس لئے کہ اس
کی اضافت ایسے اسم کی طرف کی گئی ہے جو اس کا واحد مقابل ہے یعنی منعم علیہم، لہذا غیر میں یک گونہ تعین آ گیا جیسا کہ
غیر السکون سے حرکت کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔

اور علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ "غیر المعضوب۔۔ الخ" انعمت علیہم" کی ضمیر مجردہ سے حال
واقع ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں انعمت عامل ہے یا منصوب ہے تقدیر اعمی کی وجہ سے یا استثناء کہ وجہ سے، مگر
استثناء کی صورت اس وقت درست ہو سکے گی جب کہ انعمت میں ایسی نعمتیں مراد لی جائیں وہ دنیاوی اور اخروی نعمتوں دونوں کا
شامل ہے۔

والغضب: ثوران النفس إرادة... الخ

خون دل کے جوش مارنے کو غضب کہا جاتا ہے پھر جب اس کی نسبت اللہ کریم کی طرف کی جائے تو اس کا انجام کار یعنی
انتقام مراد ہوتا ہے جیسا کہ "رحمن ورحیم" کی بحث میں گزر چکا۔ اور "المغضوب علیہم" میں "علیہم مغضوب" کا
نائب فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں واقع ہے۔ اس کے برخلاف وہ "علیہم" جو "انعمت" کے بعد واقع ہے کہ وہ
منصوب یعنی محل نصب میں واقع ہے۔

اور "لا" اس معنی نفی کی تاکید کے لئے بڑھایا ہے جو غیر میں موجود ہیں۔ تو گویا اللہ کریم نے بالفاظ دیگر فرمایا،

لا مغضوب علیہم ولا الضالین۔

اور اسی وجہ سے (کہ غیر حرف نفی کے معنی میں ہے)۔

انازید غیر ضارب بتقدیم زیداً
اگرچہ

انازیداً مثل ضارب بتقدیم زیداً

ممتنع ہے، اور ایک قراءت "غیر الضالین" کی بھی ہے۔

والضلال: العدول عن الطريق السوی... الخ

ضلال کا معنی راہ راست سے جان بوجھ کر یا غلطی سے بھٹک جانا ہے، اور ضلال ایک کشادہ میدان ہے اس کے اعلیٰ

اور ادنیٰ درجہ کے درمیان بہت فرق ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ "مغضوب علیہم" سے مراد یہودی ہیں، کیونکہ اللہ کریم نے ان کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے،

فَمَهُم مِّن لَّعْنَةِ اللَّهِ وَغَضَبِ عَلَيْهِمْ

اور "الضالین" سے مراد نصاریٰ ہیں کیونکہ اللہ کریم نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا

جو پہلے گمراہ ہو چکے اور بہتوں کو گمراہ کیا۔ (سورۃ المائدہ آیت نمبر 77)

اور ایک مرفوع روایت میں بھی اس قول کی تائید کی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ "مغضوب علیہم" سے نافرمان اور "ضالین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کریم کی معرفت سے کورے ہیں اس لئے منعم علیہ وہ ہے جسے حق اور خیر دونوں کی معرفت عطا کی گئی ہو۔ حق کی معرفت تو برائے حق، اور خیر کی معرفت اس پر عمل کرنے کے لئے، تو اب منعم علیہ کا مقابل وہ ہوگا جس کی دونوں قوتوں یعنی عاقلہ و عاملہ میں سے کوئی ایک مختل ہو گئی ہو چنانچہ جس نے قوت عمل کو مختل کر دیا وہ فاسق مغضوب علیہ ہے۔ اس لئے کہ اللہ کریم نے عہد اقل کرنے والے آدمی کے بارے میں،

و غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ

فرمایا ہے اور جس نے قوت عاقلہ کو مختل کر دیا وہ جاہل و گمراہ ہے، کیونکہ اللہ کریم نے "فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ"

"فرمایا ہے۔"

نعمت کا معنی:

(نعم) النعمة (Blessing)

اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فعلتہ کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے:

جلسة وركبة وغيره ذالك

اور نعمتہ کے معنی تنعم یعنی آرام و آسائش کے ہیں اور یہ فعلتہ کے وزن پر ہے جو مومرہ ہے جو مومرہ کے لئے استعمال ہوتا

ہے جیسے: ضربتہ و شتمتہ اور نعمتہ کا لفظ اسم جنس ہے جو قلیل و کثیر کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (سورۃ النحل آیت نمبر 18)

اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔

لفظ غیر کا معنی:

(غی) ر غیو (Stranger)

اور غیر محض نفی کے لئے یعنی اس سے کسی دوسرے معنی کا اثبات مقصود نہیں ہوتا جیسے مررت برجل غیر قائم یعنی میں ایسے

آدی کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن میں ہے:

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هُؤُلَاءَ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (سورة القصص آیت نمبر 50)
اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون جو اپنی خواہش کی پیروی کرے اللہ کی ہدایت سے جدا۔

لفظ غضب کا معنی:

(غضب) الغضب (Violence)

انتقام کے لئے دل میں خون کا جوش مارنا اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے،

اتقوا الغضب فإنه جمره توقدئ قلب ابن ادم الم ترو الى امتقاخ اوداجه وحمرة
عينية

کہ غصہ سے بچو بیشک وہ انسان کے دل میں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح ہے تم اس کی رگوں کے پھولنے اور آنکھوں کے سرخ ہو جانے کو نہیں دیکھتے، لیکن غضب الہی سے مراد انتقام (اور عذاب) ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے۔

فَبَأَوْ بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ (سورة البقرة آیت نمبر 90)
تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے۔

وَبَأَوْ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ (سورة آل عمران آیت نمبر 112)
اور غضب الہی کے سزاوار ہوئے۔

وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي (سورة طه آیت نمبر 81)
اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا۔

غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ (سورة المجادلة آیت نمبر 14)
اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔

اور آیت کریمہ:

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ (سورة الفاتحة آیت نمبر 7)
ندان کے جن پر غمے ہوتا رہا۔

میں بعض نے کہا کہ مغضوب علیہم سے یہ مراد ہیں اور غضبہ کے معنی سخت چٹان کے ہیں۔

المغضوب بہت زیادہ غمے ہونے والا یہ سانپ اور تیر مزاج اونٹنی پر بھی بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فلاں غضبہ کے معنی ہیں فلاں بہت جلد غمے ہونے والا ہے۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ غضبیت لفلان کے معنی کسی زندہ شخص کی حمایت میں ناراض ہونا ہیں اور غضبیت بہ کے معنی کسی مردہ شخص کی حمایت کے لئے غضب ناک ہونا۔

متن:

وقرء: ولا الضالين بالهزة على لغة من جد في الهرب من التقاء الساكنين.

- آمين - اسم الفعل الذي هو استجب.

وعن ابن عباس قال سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن معناه فقال: "افعل

بني على الفتح كأمين لا لتقاء الساكنين"

وجاء مد ألفه وقصرها قال:

ويرحم الله عبداً قال آميناً وقال:

أمين فزاد الله ما بيننا بعداً وليس من القرآن وفاقاً، لكن يسن ختم السورة به

لقوله عليه الصلاة والسلام «علمني جبريل آمين عند فراغي من قراءة الفاتحة وقال

إنه كالختم على الكتاب»

وفي معناه.

قول علي رضي الله عنه: آمين خاتم رب العالمين، ختم به دعاء عبده

يقوله الإمام ويجهر به في الجهرية لها

روى عن وائل بن حجر «أنه عليه الصلاة والسلام كان إذا قرأ ولا الضالين قال آمين

ورفع بها صوته».

وعن أبي حنيفة رضي الله عنه أنه لا يقوله: والمشهور عنه أنه يخفيه كما رواه عبد الله

بن مغفل وأنس، والماموم يؤمن معه

لقوله عليه الصلاة والسلام إذا قال الإمام ولا الضالين فقولوا آمين فإن الملائكة

تقول آمين فمن وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه.

وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لأبي ألا أخبرك

بسورة لم ينزل في التوراة والإنجيل والقرآن مثلها. قال: قلت بلى يا رسول الله.

قال: فاتحة الكتاب إنها السبع المثاني والقرآن العظيم الذي أوتيته».

وعن ابن عباس رضي الله عنهما قال بينا رسول الله صلى الله عليه وسلم جالس إذ

أتاه ملك فقال: أبشر بنورين أوتيتهما لم يؤتهما نبي قبلك: فاتحة الكتاب وخواتيم

سورة البقرة. لن تقرأ حرفاً منها إلا أعطيته.

وعن حذيفة بن اليمان أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «إن القوم ليبعث الله عليهم العذاب حثماً مقضياً فيقرأ صبي من صبيانهم في الكتاب: الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ فيسبعه الله تعالى فيرفع عنهم بذلك العذاب أربعين سنة

ترجمہ:

اور "ولا الضالین" کی ایک قراءت ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ بھی ہے، اویہ ان لوگوں کی لغت پر مبنی ہے جو اجتماع ساکنین سے بھاگنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ "آمین" فعل "استجب" کا نام ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ سے اس کے معنی پوچھے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا، اس کے معنی "افعل" کے ہیں۔ یعنی اے میرے اللہ کریم میرا کام کر دے۔ اور یہ لفظ آمین اجتماع ساکنین کی وجہ سے مبنی برفتحہ ہے جیسا کہ "آین" اور "آمین" الف ممدودہ و مقصورہ دونوں کے ساتھ کلام عرب میں وارد ہے۔ (الف ممدودہ) شاعر کے قول میں،

ويؤتمُّ الله عبداً قال آمينا

اور مقصورہ

أمين فزاد الله ما بيننا بعدا

اور لفظ آمین بالاتفاق جزو قرآن نہیں لیکن آمین کہہ کر سورۃ فاتحہ کو ختم کرنا سنت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ مجھے جبریل امین نے میرے قراءت فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد آمین کہنے کی تعلیم دی، اور یہ کہا کہ آمین بحیثیت خط کی مہر کے ہے اور اسی حدیث کے ہم معنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا ارشاد ہے، فرماتے ہیں، کہ آمین "رب العالمین" کی مہر ہے، اس نے اپنے بندے کی دعا اس پر مکمل کی۔

يقوله الإمام ويجهر به في الجهرية لبا... الخ

امام بھی آمین کہے گا، جہری نماز میں باواز بلند کہے گا، کیونکہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ "ولا الضالین" پڑھنے کے بعد آمین کہتے تھے، اور بوقت آمین آواز بلند رکھتے تھے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ امام آمین نہ کہے اور ان کی مشہور روایت یہ ہے کہ امام آمین کہے لیکن آہستہ آواز کے ساتھ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مغفل اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ثابت ہے اور مقتدی بھی امام کے ساتھ آمین کہے گا اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ جب امام "ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہو، اس لئے کہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں، پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا، تم کو ایسی سورت نہ بتاؤں جس کی مثل تو رات، انجیل، اور قرآن میں نازل نہیں ہوئی، میں نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ

وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا

(سورۃ النساء آیت نمبر 136)

اور جو نہ مانے اللہ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کو تو وہ ضرور دور کی گمراہی میں پڑا۔
میں اس قسم کی گمراہی کو ضللا بعید کہا گیا ہے۔

(2) علومِ علیہ میں ضلالت ہے جس کے معنی ہیں احکام شرعیہ یعنی عبادات (اور معاملات) کی معرفت میں غلطی کرنا اور

آیت مذکورہ میں ضللا بعید سے اس کے کفر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت کے ابتداء ومن یكفر اور آیت:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا (سورۃ النساء آیت نمبر 167)

وہ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا بے شک وہ دور کی گمراہی میں پڑے۔

اور آیت: فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ (سورۃ سبأ آیت نمبر 8)

عذاب اور دور کی گمراہی میں ہیں۔

میں بھی معنی مراد ہیں اور فی کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی کی سزا میں گرفتار ہوں گے اور یہی معنی آیت:

إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ (سورۃ الملک آیت نمبر 9)

تم تو نہیں مگر بڑی گمراہی میں۔

میں مراد ہیں۔ نیز فرمایا:

قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ (سورۃ المائدہ آیت نمبر 77)

جو (خود بھی) پہلے گمراہ ہوئے اور بھی اکثروں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

اور آیت کریمہ: إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 10)

کے معنی یہ ہیں کہ جب مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے۔ اور آیت:

وَالضَّالِّينَ (سورۃ الفاتحہ آیت نمبر 7)

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسِي (سورۃ طہ آیت نمبر 52)

کے معنی ہیں: یعنی میرے پروردگار کو کوئی چیز غافل نہیں کرتی۔

اور آیت: أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضَلُّلٍ (سورۃ الغیل آیت نمبر 2)

کیا ان کی تدبیر کو ضائع نہیں کیا (گیا) میں فی تضلیل کے معنی ضائع کر دینا اور غلط راہ لگا دینا کے ہیں۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

مدنیة وایاتہا مائتان وسبع ثمانون

[سورة البقرة (2): آية 1]

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

متن:

الم (۱)

الم وسائر اللفاظ التي يتهجى بها، أسماء مسيياتها الحروف التي ركبت منها الكلم لدخولها في حد الاسم، واعتوار ما يخص به من التعريف والتنكير والجمع والتصغير ونحو ذلك عليها، وبه صرح الخليل وأبو علي، وما

روى ابن مسعود رضي الله تعالى عنه أنه عليه الصلاة والسلام قال: «من قرأ حرفاً من كتاب الله فله حسنة والحسنة بعشر أمثالها لا أقول الم حرف بل ألف حرف ولام حرف وميم حرف»

فالمراد به غير المعنى الذي اصطلح عليه، فإن تخصيصه به عرف مجدد بل المعنى اللغوي، ولعله سماه باسم مدلوله.

ولما كانت مسيياتها حروفاً وحداناً وهي مركبة، صدرت بها لتكون تأديتها بالمسمى أول ما يقرع السمع، واستعيرت الهزرة مكان الالف لتعذر الابتداء بها وهي ما لم تلتها العوامل موقوفة خالية عن الإعراب لفقد موجهه ومقتضيه، لكنها قابلة إياه ومعرضة له إذ لم تناسب مبنى الاصل ولذلك قيل: ص وق مجموعاً فيها بين الساكنين ولم تعامل معاملة أين وهؤلاء.

ترجمہ:

الم اور اس کی مثل سارے الفاظ، جن کے ساتھ کلمات کے جے کئے جاتے ہیں ان کو اسماء کہتے ہیں۔ اور ان کے

مدلولات اور مسیات وہ حروف مہانی ہیں جن سے کلمات مرکب ہوتے ہیں۔ (جیسے اب، ت وغیرہ) کیونکہ وہ اسم کی تعریف میں داخل ہیں اور اسم کے خواص اور علامات ان پر صادق آتے ہیں۔ جیسا کہ معرفہ و کمرہ ہونا اور جمع و مصدر ہونا وغیرہ۔ صرف کے امام ابوعلی فارسی اور نحو کے امام ظلیل نے ان کے اسم ہونے کی تصریح کی ہے۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے قرآن مجید سے ایک حرف پڑھا اس کو ایک نیکی ملے گی اور آخرت میں اس نیکی کا ثواب دس نیکیوں کے برابر ہوگا۔ (آپ نے فرمایا) میں یہ نہیں کہتا کہ الہ ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف، لام دوسرا حرف اور میم علیحدہ حرف ہے۔ تو گویا جس نے الم پڑھا اس نے تین حرف پڑھے اور اس آخرت میں تیس نیکیاں ملیں گی اس حدیث پاک میں حرف سے مراد وہ حرف نہیں جو اسم اور فعل کے مقابلے میں آتا ہے۔ اس کا لغوی معنی طرف یا کنارہ ہے، کیونکہ حرف کا اصطلاحی معنی بہت پرانا نہیں ہے یہ اسلام کے اول زمانہ سے سو سال کے بعد وضع کی گئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدلول بول کر دال مراد لیا ہو۔

اور جبکہ ان اسماء کے مسیات الگ الگ حروف ہیں اور وہ اسماء انہیں حروف سے مرکب ہیں اس لئے ان حروف کے ساتھ اسماء کا آغاز کیا گیا ہے۔ تاکہ جو بات سب سے پہلے سننے والے کی سماعتوں کے نظر ہو وہ اسماء کے مسیات کو ادا کرنا ہو۔ اور استعارہ کے طور پر الف کی جگہ ہمزہ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ الف ساکن ہوتا ہے اور ساکن حرف سے ابتداء ممکن نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ اسماء عوائل کے ساتھ متصل نہیں (یعنی ان سے پہلے عامل کوئی نہیں) اس لئے ان پر وقف کیا جاتا ہے۔ اور یہ اعراب سے خالی ہوتے ہیں کیونکہ موجب اعراب اور مقتضی یعنی عامل ان سے پہلے نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تمام اسم اعراب قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے قابل بھی ہیں اور یہ بنی الاصل کے مشابہ نہ ہونے کی وجہ سے ص اور ق پر سکون کے ساتھ وقف کیا جاتا ہے۔ اور اس میں دو ساکن جمع ہو جاتے ہیں۔ (باوجود اس کے کہ اجتماع ساکنین جائز نہیں) اور این اور ہولاء والامعاملہ ان کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔

متن:

ثم إن مسياتها لما كانت عنصر الكلام وبسائطه التي يتزكب منها. افتتحت السورة بطائفة منها إيقاظاً لمن تحدى بالقرآن وتنبهاً على أن أصل المتلو عليهم كلام منظوم منا ينظون منه كلامهم. فلو كان من عند غير الله لما عجزوا عن آخرهم مع تظاهرهم وقوة فصاحتهم عن الإتيان بما يدانيه، وليكون أول ما يقرع الاسماع مستقلاً بنوع من الإعجاز، فإن النطق بأسماء الحروف مختص بمن خط ودرس، فأما من الإلهي الذي لم يخالف الكتاب فمستبعد مستغرب خارق للعادة كالكتابة والتلاوة سيباً.

ترجمہ:

پھر ان اسماء کے مسیات جو اصل الکلام اور اس کے بسیط حروف ہیں جن سے کلام مرکب کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے اس سورت کے آغاز میں، ان میں سے چند ذکر کئے گئے ہیں، ان لوگوں کو جگانے اور چوکنا کرنے کے لئے جن کو قرآن پاک کے مقابلے میں کلام لانے کا پہنچ کیا گیا ہے، اور ان کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ جو قرآن ان کو سنایا جا رہا ہے وہ اسی قسم کے حروف سے مرکب ہے جن کے ذریعے وہ اپنا کلام کرتے ہیں اور اگر یہ کتاب اللہ کی بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتی تو وہ تمام کے تمام باوجود باہمی تعاون اور قوت فصاحت کے، ایسا کلام لانے سے عاجز نہ آتے، جو اس کے قریب تک بھی پہنچ سکتا ہو اور (اسی وجہ سے بھی ان کو سورۃ کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے) تاکہ سب سے پہلی بات جو کانوں کے پردوں پر دستک دے وہ اعجاز کی ایک مستقل قسم ہو۔ کیونکہ اس آدمی کے ساتھ حروف کے اسماء کا تلفظ کرنا خاص ہو جس نے لکھنا یا پڑھنا سیکھا ہو۔ لیکن ایسی ذات کا ان اسماء کے ساتھ تلفظ کرنا جس نے کبھی بھی کسی سکول میں استاذ کی شاگردی نہ کی ہو یہ بہت عجیب، بعید از قیاس اور عادت کے خلاف ہے۔ خاص طور پر لکھنا اور تلاوت کرنا استاذ کی رہنمائی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

متن:

وقد راعى في ذلك ما يعجز عنه الاديب الاريب الفائق في فنه، وهو أنه أورد في هذه الفوايح أربعة عشر اسماً هي نصف أسامي حروف المعجم، إن لم يعد فيها الالف حرفاً برأسها في تسع وعشرين سورة بعددها إذا عد فيها الالف الاصلية مشتبهة على أنصاف أنواعها.

فذكر من المبهوسة وهي ما يضعف الاعتماد على مخرجه ويجمعها (ستشحك خصفه) نصفها الحاء والكاف والهاء والصاد والسين والكاف، ومن البواقى المجهورة نصفها يجمعها (لن يقطع أمر). ومن الشديدة الثمانية المجموعة في (أجدت طبقك) أربعة يجمعها (أطك). ومن البواقى الرخوة عشرة يجمعها «خمس» على نصره، ومن المطبقة التي هي الصاد والضاد والطاء والظاء نصفها، ومن البواقى المنفتحة نصفها، ومن القلقة وهي: حروف تضرب عند خروجها ويجمعها (قد طبع) نصفها الاقل لقلتها، ومن اللينتين الياء لأنها أقل ثقلًا، ومن المستعلية وهي التي يتصعد الصوت بها في الحنك الاعلى، وهي سبعة القاف والصاد والطاء والحاء والغين والضاد والظاء نصفها الاقل، ومن البواقى المنخفضة نصفها.

ترجمہ:

خاص طور پر اس تلفظ میں اللہ کریم نے ایسی چیزوں کا لحاظ رکھا ہے جس سے بڑے بڑے ادیب، ماہر عالم اور اس فن کے ماہرین بھی عاجز آجاتے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ حروف تہجی کے چودہ اسماء جو ان سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں وہ حروف تہجی کے اسماء کا نصف ہیں، اس شرط پر کہ الف کو مطلقاً ان حروف میں شمار نہ کیا جائے اور یہ قرآن مجید کی اکتیس (29) سورتوں کے آغاز میں بیان کئے گئے ہیں جو کہ حروف تہجی کی مجموعی تعداد کے مطابق ہیں۔ بشرطیکہ کہ الف کو مستقل حرف شمار کیا جائے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان حروف کی اقسام میں سے نصف نصف یعنی نصف اکثر یا نصف مساوی یا نصف اقل ان سورتوں کے آغاز میں بیان کئے گئے ہیں۔

حروف مہموسہ میں سے نصف حروف سورتوں کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائے ہیں جن کی کل تعداد دس (10) ہے ان میں سے درج ذیل پانچ (5) سورتوں کے آغاز میں ذکر کئے گئے ہیں،

ح، ہا، ص، س، اورق

حروف مہموسہ کا مجموعہ مندرجہ ذیل ہے،

(عنقریب حفصہ تجھ سے اصرار و زاری کرے گی)

اس کے علاوہ سورتوں کے آغاز میں حروف مجبورہ ذکر کئے گئے ہیں جن کی تعداد اٹھارہ (18) اور ان کے نصف کا مجموعہ مندرجہ ذیل ہے،

لن یقطع امر امر ہرگز قطع نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ حروف شدیدہ ہیں جن کی مجموعی تعداد آٹھ (8) اور مجموعہ یہ ہے،

اجدت طبقك

اور ان میں سے چار (4) سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

اقطك حروف شدیدہ کے علاوہ باقی سارے حروف رخوہ ہیں ان کی کل تعداد بیس (20) ہے اور ان میں سے

دس (10) سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں۔ ان دس کا مجموعہ ملاحظہ ہو۔

خمیس علی نصرہ، وہ اس کی مدد پر بہادر ہے۔

ان کے علاوہ حروف مطبقہ ہیں، ان کی کل تعداد چار (4) ہے،

ص، ط، ظ جبکہ سورتوں کے آغاز میں نصف لائے گئے اور وہ یہ ہیں

ص، ط ان کے علاوہ حروف منفتحہ ہیں ان کو بھی نصف سورتوں کے آغاز میں لایا گیا ہے۔

ان کے علاوہ حروف قلقلہ ہیں جو مخرج میں اضطراب سے ادا ہوتے ہیں، یہ چھ (6) ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

قد طویح ان کا نصف اقل سورتوں کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے بوجہ ان کی قلت کے۔ یعنی دو (2) کا،

اور حرف لیں دو (2) ہیں جو زمی سے ادا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں،

وی ان دو میں سے کسی کو ذکر کیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ حروف مستعلیہ ہیں جن کو ادا کرتے وقت آواز میں گونج پیدا ہوتی ہے اور وہ حنک اعلیٰ کی طرف بلند ہوتی ہے یہ سات (7) ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ق، ص، ط، ح، ض، ظ ان کا بھی نصف اقل ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ باقی حروف مخفضہ ہیں یہ بائیس (22) ہیں ان میں سے بھی گیارہ (11) حروف ذکر کئے گئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں،

الفیل، ذلک، ہی، ع، س، ج اور ن

ومن حروف البدل وہی أحد عشر علی ما ذکرہ سیبویہ، واختارہ ابن جنی وجمعها (أجد طویت) منها الستة الشائعة المشهورة التي يجمعها (أهطین) وقد زاد بعضهم سبعة أخرى وهي اللام في (أصیلال) والصاد والزای في (صراط و زراط) والفاء في (أجداف) والعین في (أعن) والشاء في (ثروغ الدلو) والباء في «باسمک» حتی صارت ثمانية عشر وقد ذكر منها تسعة الستة المذكورة واللام والصاد والعین.

ترجمہ:

سیبویہ اور ابن جنی کے مختار قول کے مطابق حروف بدل گیارہ (11) ہیں۔ اور ان کا مجموعہ درج ذیل ہے۔

أجد طویت منها

ان میں سے چھ (6) حروف مشہور ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا مجموعہ یہ ہے: أهطین

بعض نے ان کے علاوہ مزید سات (7) کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں، لام اصیل اور اصیلال میں ہے۔

ص، ز جو صراط اور زراط اور جودف میں ہیں اور عین جو أعین میں ہے اور ث جو ثروغ الدلو میں ہے اور ب جو باسمک میں ہے یہاں تک کہ ان کی تعداد اٹھارہ (18) ہو گئی ان میں سے نو (9) سورتوں کے آغاز میں ذکر کئے گئے ہیں۔ چھ مذکورہ بالا ہیں اور تین یہ ہیں۔

ل ص ع

متن:

وما يدغم في مثله ولا يدغم في المقارب وهي خمسة عشر: الهمة والهاء والعین والصاد والطاء والميم والياء والحاء والغين والضاد والفاء والطاء والشين والزای

والواو نصفها الاقل. ومما يدغم فيها وهي الثلاثة عشر الباقية نصفها الاكثر: الحاء والقاف والكاف والراء والسين واللام والنون لهما في الإدغام من الخفة والفصاحة، ومن الاربعة التي لا تدغم فيما يقاربها ويدغم فيها مقاربها وهي: الميم والزاي والسين والفاء نصفها.

ترجمہ:

اور وہ حروف جو اپنی ہم مثل (ہم مخرج) میں مدغم ہوتے ہیں لیکن اپنے قریب المخارج حروف میں مدغم نہیں ہوتے، ان کی تعداد پندرہ (15) ہے اور وہ درج ذیل ہیں،

ء، ع، ص، ط، م، ی، خ، غ، ض، ظ، ش، ز، ف، و

ان کا نصف اقل سورتوں کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور ایسے حروف جو اپنے مخرج اور قریب المخرج دونوں میں مدغم ہوتے ہیں ان کی تعداد تیرہ (13) ہے اور ان کا نصف اکثر سورتوں کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے،

خ، ق، ک، د، س، ل، ن

کیونکہ ادغام میں فصاحت اور خفت ہوتی ہے۔ اور وہ حروف جو اپنے قریب المخارج حروف میں مدغم نہیں ہوتے لیکن ان کے قریب المخارج ان میں مدغم ہوتے ہیں ان کی تعداد چار (4) ہے اور وہ درج ذیل ہیں۔

ر، ش، ف، م

ان میں سے نصف یعنی دو (2) سورتوں کی ابتداء میں لائے گئے ہیں جو ذیل میں مذکور ہیں۔

مرد

متن:

ولما كانت الحروف الذلقية التي يعتد عليها بئلق اللسان وهي ستة يجمعها (رب منفل) والحلقية التي هي الحاء والحاء والعين والغين والهاء والهمزة. كثيرة الوقوع في الكلام ذكر ثلثيها. ولما كانت أبنية المزيد لا تتجاوز عن السباعية ذكر من الزوائد العشرة التي يجمعها (اليوم تنساء) سبعة أحرف منها تنبهاً على ذلك، ولو استقرت الكلم وتراكيبها وجدت الحروف المتروكة من كل جنس مكشورة بالمذكورة

ترجمہ:

اور حروف ذلقیہ وہ ہیں جن کی ادائیگی کے وقت زبان کی نوک کا سہارہ لیا جاتا ہے۔ یہ چھ ہیں جن کا مجموعہ درج ذیل ہے

رب منفل

اور حروف حلقیہ بھی ایسے ہی ہیں یعنی ان کا مخرج بھی حلق ہے وہ بھی چھ (6) ہیں۔

ح، خ، ع، غ، ق، ک، ہ

ان دونوں قسموں کے حروف بہت زیادہ مستعمل ہیں جس کی وجہ سے ان کی مجموعی تعداد کے دو (2) ٹکٹ سے سورتوں کا آغاز کیا گیا ہے، اور چونکہ مزید کا صیغہ سات حروف سے زائد نہیں ہوتا اس لئے ان حروف کو زائدہ کہتے ہیں ان کا مجموعہ یہ ہے۔

الیوم تنساہ

ان میں سے سات حروف سے سورتوں کا آغاز کیا گیا ہے۔ تاکہ تمبیہ ہو جائے کہ مزید فیہ کا وزن سات حروف سے تجاوز نہیں کرتا اگر آپ عربی کلام اور اسکی تراکیب کی چھان بین کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حروف کی ہر قسم سے جتنے حروف کو چھوڑا گیا ہے ان کی تعداد جو مذکور ہے ان کے مقابلے میں قلیل ہے۔

متن:

ثم إنه ذكرها مفردة وثنائية وثلاثية ورباعية وخماسية، إيداناً بأن المتحدى به مركب من كلماتهم التي أصولها كلمات مفردة، ومركبة من حرفين فصاعداً إلى الخمسة، وذكر ثلاث مفردات في ثلاث سور لأنها توجد في الأقسام الثلاثة:

الاسم والفعل والحرف وأربع ثنائيات لأنها تكون في الحرف بلا حذف (كبل)، وفي الفعل بحذف ثقل (كقل). وفي الاسم بغير حذف (كمن)، وبه (كدم) في تسع سور لوقوعها في كل واحد من الأقسام الثلاثة على ثلاثة أوجه: ففي الأسماء من واذ و ذو. وفي الأفعال قل وبع وخف. وفي الحروف من وإن ومنذ على لغة من جربها. وثلاث ثنائيات لمجيئها في الأقسام الثلاثة في ثلاث عشرة سورة تنبئها على أن أصول الابنية المستعملة ثلاثة عشر، عشرة منها للأسماء، وثلاثة للأفعال، ورباعيتين وخماسيتين تنبئها على أن لكل منها أصلاً: كجعفر وسفرجل، وملحقاً: كقردد وحنفل.

ولعلها فرقت على السور ولم تعد بأجمعها في أول القرآن لهذه الفائدة مع ما فيه من إعادة التحدى وتكرير التنبيه والمبالغة فيه.

والمعنى أن هذا المتحدى به مؤلف من جنس هذه الحروف. أو المؤلف منها، كذا

ترجمہ:

پھر اس کے بعد اللہ کریم نے حروف تہجی میں سے مفرد، ثنائی، ثلاثی، رباعی اور خماسی سے بھی سورتوں کا آغاز فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس قرآن کے مقابلہ میں انہیں کلام پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ وہ ایسے کلمات سے مرکب ہے جن کے اصول مفرد اور دو حرفوں سے مرکب اور اس سے زیادہ پانچ (5) حرفوں تک سے مرکب ہوتے ہیں، تین سورتوں کی ابتداء میں تین مفرد حروف ذکر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ تین حروف کلمے کی تینوں قسموں اسم، فعل اور حرف میں پائے جاتے ہیں۔ اور چار دو حرفی کلمات ذکر کئے گئے ہیں کیونکہ دو حرفی کلمات صرف میں بغیر حذف کے پائے جاتے ہیں۔ جیسے قل۔ اور فعل میں حذف کے ساتھ جیسے قل۔ اور اسم میں بغیر حذف کے بھی جیسے من۔ اور ایک حرف کے حذف کے ساتھ بھی پائے جاتے ہیں جیسے دم اصل میں دم تھا۔ دو حرفی حروف نو سورتوں کی ابتداء میں ذکر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ کلمہ کی تینوں اقسام میں یہ حروف تین طرح سے موجود ہیں اسماء میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ جیسے از، ضمہ کے ساتھ ذ جیسے ذ اور میم کے فتح کے ساتھ جیسے من۔ اور افعال میں بھی اسی کی مثل پہلے حروف کے ضمہ، فتح اور کسرہ کے ساتھ پائے جاتے ہیں جیسے قل، خف اور یح۔

اسی طرح حروف میں بھی پہلے حرف کے فتح، ضمہ اور کسرہ سے مذکور ہیں، جیسے ان، من، اور مذ۔ ان لوگوں کی لغت کے مطابق جو مذکور حرف جرمانتے ہوئے اس کے مابعد کو کسرہ دیتے ہیں اور اور تین ثلاثی یعنی تین حروف سورتوں کی ابتداء میں ذکر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ ثلاثی کلمے تینوں قسموں میں پائے جاتے ہیں۔ تیرہ سورتوں کا آغاز ان سے کیا گیا ہے۔ اس بات پر تشبیہ کرنے کے لئے کہ کلمہ کے تیرہ (13) اوزان مستعمل ہوتے ہیں ان میں سے دس اسم کے اصول ہیں اور تین فعل کے اور رباعی اور خماسی میں سے دو دو ذکر کئے گئے ہیں۔ اس بات پر تشبیہ کرنے کے لئے کہ رباعی اور خماسی کی دو دو قسمیں ہیں۔ جیسے جعفر اس سفر جل اور ان کے ملحقات جیسے فرد اور جنتقل۔

اور شاید سورتوں کے آغاز میں حروف تہجی کو علیحدہ علیحدہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ ایک فائدہ یہ ہو کہ (قرآن پاک کا آغاز ثابت ہو جائے) اور اس کے ساتھ ساتھ چیلنج کا اعادہ اور تشبیہ کا تکرار ہو جائے۔ یہ سورتیں اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہیں اس میں اگر اظہار مبالغہ بھی ہو جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس کلام کے مقابلہ میں عربوں کو کلام پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا وہ کلام انہی حروف سے مرکب ہے جن سے وہ اپنا کلام مرکب کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس جیسا کلام پیش نہ کر سکے۔

متن:

وقیل: ہی أسماء للسور، وعلیہ إطباق الاكثر. سمیت بها إشعاراً بأنها كلمات معروفة التركيب فلو لم تكن وحيًا من الله تعالى لم تتساقط مقدماتهم دون معارضتها، واستدل عليه بأنها لو لم تكن مفهومة كان الخطاب بها كالخطاب بالبهمل والتكلم بالزنجي مع العربي، ولم يكن القرآن بأسره بياناً وهدى. ولما أمكن التحدى به وإن

كانت مفهومة، فإما أن يراد بها السور التي هي مستعملها على أنها ألقابها، أو غير ذلك. والثاني باطل لأنه إما أن يكون المراد ما وضعت له في لغة العرب فظاهر أنه ليس كذلك، أو غيره وهو باطل لأن القرآن نزل على لغتهم لقوله تعالى: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ فلا يحمل على ما ليس في لغتهم.

ترجمہ:

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں اور اسی پر ہی اکثر کا اتفاق ہے ان کو سورتوں کے اسماء کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شعور دلایا جائے کہ وہ سورتیں ایسے کلمات سے مرکب ہیں جن کی ترکیب مشہور و معروف ہے۔ اور ہاں اگر یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہ ہوتا تو عرب اپنی فصاحت کے پیش نظر اس کلام کے مقابلہ میں کلام لانے سے عاجز نہ آتے۔ اور یہ دلیل بھی پیش کرتے کہ اگر ان کلمات کا کوئی مفہوم ہی نہ ہو (جیسا کہ بعض نے کہا) تو ان کے ساتھ خطاب کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے مہل کلمات سے خطاب کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس طرح ہوگا جیسے حبشی زبان میں عربی النسل سے کلام کرنا۔ اور ساتھ ہی یہ کہ سارے کا سارا قرآن ہدایت اور بیان نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے ساتھ چیخ کرنا ممکن ہوگا اور اگر ان کا معنی اور مفہوم ہے تو پھر یا تو یہ ان سورتوں کے اسماء ہوں گے جن کے شروع میں یہ الفاظ تہجی مذکور ہیں اور یہ ان کے القاب ہوں گے۔ اور یا ان سے سورتوں کے علاوہ کوئی اور معنی مراد لیا جائے گا تو یہ باطل ہوگا کیونکہ اس صورت میں ان سے یا تو وہ معنی مراد ہوگا جس کے لئے لغت عرب میں یہ وضع کئے گئے ہوں تو یہ بالکل واضح ہے کہ یہ کسی اور معنی کے لئے وضع نہیں کئے گئے یا ان سے مراد یہ ہوگا کہ یہ لغت عرب کے علاوہ کسی اور معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں تو یہ بھی باطل ہے کیونکہ قرآن کریم عربی لغت میں نازل کیا گیا ہے جیسے کہ فرمان باری تعالیٰ،

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ

متن:

لا يقال: لم لا يجوز أن تكون مزيدة للتنبية؛ والدلالة على انقطاع كلام واستئناف آخر؛ كما قاله قطرب، أو إشارة إلى كلمات هي منها اقتصرت عليها اقتصار الشاعر في قوله:

قلتُ لها قفي فقالت قاف كما روى عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: الالف آلاء الله، واللام لفظه، والميم ملكه. وعنه أن الروحمون مجموعها الرحمن. وعنه أن الم معناه: أنا الله أعلم ونحو ذلك في سائر الفوايح. وعنه أن الالف من الله، واللام من جبريل، والميم من محمد أي: القرآن منزل من الله بلسان جبريل على محمد عليهما

الصلاة والسلام، أو إلى مدد أقوام و آجال بحساب الجمل كما قال أبو العالية متمسكاً
بها

روى أنه عليه الصلاة والسلام لما أتاه اليهود تلا عليهم الم البقرة، فحسبوه وقالوا:
كيف ندخل في دين مدته إحدى وسبعون سنة، فتبسم رسول الله صلى الله عليه
وسلم فقالوا: فهل غيره، فقال: البص والر والبر، فقالوا: خلطت علينا فلا ندري
بأيها نأخذ

فإن تلاوته إياها بهذا الترتيب عليهم وتقريرهم على استنباطهم دليل على ذلك،
وهذه الدلالة وإن لم تكن عربية لكنها لا شتهارها فيما بين الناس حتى العرب تلحقها
بالمعربات كالمشكاة والسجيل

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسا نہ کہا جائے کہ اگر ان حروف کو سورتوں کے اسماء نہ بنایا جائے تو ان کا عربی
زبان میں کوئی ایسا معنی نہیں جس کے لئے یہ وضع کئے گئے ہوں۔ کیونکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ حروف تہجی زائدہ ہوں اور تہجیہ،
انقطاع، اور استیناف پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہوں جیسے قطرب کی رائے جو کہ سیبویہ کا شاگرد تھا۔ یا پھر ان کے
ذکر کرنے کا مقصد ایسے کلمات کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کے یہ مخفف ہیں۔ اور انہی حروف پر اقتصار کیا گیا ہو جیسے کوئی شخص
اپنی محبوبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے اسے کہا ٹھہر جاؤ تو اس نے مجھے کہا کہ میں ٹھہر گئی گو یا اس میں "قفت" کی
جگہ اس مخفف قاف کہہ دیا جو کہ بمعنی قفت ہے۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آلاء اللہ سے
الف، اور لطف اللہ سے لام اور ملک اللہ سے میم مخفف ہیں اور آپ ہی سے مروی ہے کہ الترحم و الرحمان کا مجموعہ الرحمان ہے اور
آپ ہی کی روایت ہے کہ الہ کا معنی انا اللہ اعلم (میں اللہ خوب جانتا ہوں) گو یا کہ لفظ اللہ سے الف اور اعلم سے میم مخفف
ہیں۔ اور اس پر بقی سورتوں کے فواح کو قیاس کر لیا جائے، یعنی التران اللہ ارا سے اور المران اللہ اعلم و ازی سے مخفف ہے۔
اور آپ ہی روایت کرتے ہیں کہ الف لفظ اللہ سے اور لام لفظ جبریل سے اور میم لفظ محمد ﷺ سے مخفف ہے۔ پس الف، لام
اور میم کا معنی یہ ہوا کہ یہ کلام پاک اللہ کریم کی طرف سے حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے کے ساتھ حضرت محمد ﷺ پر
نازل ہوا۔

نیز یہ حروف تہجی، حروف ابجد کے حساب سے قوموں کی بقاء اور ان کی عمروں کی طرف اشارہ ہیں۔ جیسا کہ ابو العالیہ نے
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بتایا کہ نبی پاک ﷺ کے پاس یہودیوں کا ایک وفد
حاضر ہوا (اور کلام مجید سننے کا مطالبہ کیا تو) آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورۃ البقرہ تلاوت فرمائی انہوں نے الم کے حروف

کے اعداد سے حساب لگا کر کہا کہ ہم اس دین کو کیسے قبول کریں جس کی مدت بقا صرف اکہتر (71) سال ہے۔ ان کا یہ استدلال دیکھ کر نبی کریم ﷺ مسکرائے تو انہوں نے عرض کیا کہ ان کے علاوہ بھی اگر کچھ حروف ہیں تو وہ بھی بیان کیجئے تو آپ ﷺ نے ان کو المصن، المرز اور الرز پڑھ کر سنائے یہ سنتے ہی یہودی بول اٹھے کہ آپ نے تو ہم پر اپنے (دین کا) معاملہ خلط ملط کر دیا اب ہمیں نہیں معلوم کہ ہم آپ کی کون سی بات کو اختیار کریں (اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے) نبی کریم ﷺ کا اس طرح ان حروف کو ترتیب سے پڑھنا اور ان کے استنباط پر انہیں برقرار رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان حروف سے قوموں کی مدت بقا اور ان کی عمروں کی طرف اشارہ کرنا ہے اگرچہ اس قسم کا استنباط نہ تو عربی ہے اور نہ ہی عربی لیکن لوگوں کے علاوہ خاص طور پر عربوں میں بھی یہ اشارہ اور دلالت اتنی مشہور ہے کہ اس کو ملحق بمعرب کر دیا گیا ہے جیسے کہ مشکوٰۃ کا لفظ (جو کہ حبشی زبان کا لفظ ہے) جس کا معنی وہ طاق ہے جس میں چراغ رکھا جاتا ہے اور بحیل فارسی زبان کا لفظ، جس کا معنی مٹی کا پتھر ہے۔

متن:

والقسطاس، أو دلالة على الحروف المبسوطة مقسماً بها لشرها من حيث إنها بسائط
أسماء الله تعالى ومادة خطابه.

هَذَا وَإِن الْقَوْل بِأَنَّهَا أَسْمَاءُ السُّورِ يُخْرِجُهَا مَا لَيْسَ فِي لُغَةِ الْعَرَبِ، لِأَنَّ التَّسْمِيَةَ بِثَلَاثَةِ
أَسْمَاءٍ فَصَاعِداً مُسْتَكْرَةً عِنْدَهُمْ وَيُؤَدِّي إِلَى اتِّحَادِ الْأَسْمِ وَالْمَسْمِيِّ، وَيَسْتَدْعِي تَأْخِرَ الْجُزْءِ
عَنِ الْكُلِّ مِنْ حَيْثُ إِنَّ الْأَسْمَ تَأْخِرُ عَنِ الْمَسْمِيِّ بِالرَّتْبَةِ

لَأَنَا نَقُولُ: إِنَّ هَذِهِ الْأَلْفَاظَ لَمْ تَعْهَدْ مَزِيدَةً لِلتَّنْبِيهِ وَالذَّلَالَةَ عَلَى الْإِنْقِطَاعِ
وَالِاسْتِثْنَاءِ يَلْزِمُهَا وَغَيْرُهَا مِنْ حَيْثُ إِنَّهَا فَوَاحِشُ السُّورِ، وَلَا يَقْتَضِي ذَلِكَ أَنْ لَا يَكُونَ
لَهَا مَعْنَى فِي حَيْزِهَا وَلَمْ تَسْتَعْمَلْ لِلِاخْتِصَارِ مِنْ كَلِمَاتٍ مَعِينَةٍ فِي لُغَتِهِمْ، أَمَّا الشَّعْرُ
فَشَاذٌ، وَأَمَا قَوْلُ ابْنِ عَبَّاسٍ، فَتَنْبِيهِ عَلَى أَنَّ هَذِهِ الْحُرُوفَ مِنْبَعُ الْأَسْمَاءِ وَمِبَادُ الْخُطَابِ
وَتَمَثِيلٌ بِأَمْثَلَةٍ حَسَنَةٍ، أَلَا تَرَى أَنَّهُ عَدَّ كُلَّ حَرْفٍ مِنْ كَلِمَاتٍ مُتَبَايِنَةٍ لَا تَفْسِيرُ،
وَتَخْصِيصُ بِهَذِهِ الْمَعْنَى دُونَ غَيْرِهَا إِذْ لَا مَخْصَصَ لِفِظاً وَمَعْنَى وَلَا بِحِسَابِ الْجَهْلِ فَتَلْحَقُ
بِالْمَعْرَبَاتِ، وَالْحَدِيثُ لَا دَلِيلَ فِيهِ، لِحُجُوزِ أَنَّ عَلَيْهِ الصَّلَاةَ وَالسَّلَامَ تَبَسُّمٌ تَعْجَباً مِنْ
جَهْلِهِمْ، وَجَعَلَهَا مَقْسِماً بِهَا وَإِنْ كَانَ غَيْرُ مَمْتَنَعٍ لَكِنَّهُ يَجُوجُ إِلَى إِضْمَارِ أَشْيَاءَ لَا دَلِيلَ
عَلَيْهَا، وَالتَّسْمِيَةَ بِثَلَاثَةِ أَسْمَاءٍ إِنَّمَا تَمْتَنَعُ إِذَا رَكِبَتْ وَجَعَلَتْ أَسْمَاءً وَاحِداً عَلَى طَرِيقَةِ
بِعَلْبِكَ، فَأَمَّا إِذَا نَثَرَتْ نَثْرَ أَسْمَاءِ الْعَدَدِ فَلَا، وَنَاهِيكَ بِتَسْوِيَةِ سَيَبُويهِ بَيْنَ التَّسْمِيَةِ

بالجملة والبيت من الشعر وطائفة من أسماء، حروف المعجم، والمسمى هو مجموع السورة والاسم جزؤها فلا اتحاد، وهو مقدم من حيث ذاته مؤخر باعتبار كونه اسماً، فلا دور لاختلاف الجهتين. والوجه الاول أقرب إلى التحقيق وأوفق للطائف التنزيل وأسلم من لزوم النقل ووقوع الاشتراك في الاعلام من واضح واحد فإنه يعود بالنقض على ما هو مقصود بالعلمية

ترجمہ:

اور قسط اس جواب ترازو کے معنی میں آتا ہے اور رومی زبان کا لفظ ہے۔ اب یہ تینوں کلمے انہی معانی میں عربی کلام میں بھی استعمال ہوتے ہیں، گویا ان کو معرب بنا دیا گیا۔ لہذا ان حروف تہجی سے قوموں کی مدت بقاء اور ان کی عمروں کی طرف اشارہ اور دلالت کو بھی معرب بنا دیا گیا ہوگا۔

یا یہ الفاظ تہجی ان حروف بیسطہ پر دلالت کرتے ہیں جن کے ساتھ قسم اٹھائی جاتی ہے جیسے و، ب، ت۔ چونکہ یہ رب تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے بیسطہ حروف اور رب تعالیٰ کے خطاب کے مادی حروف ہیں اس لئے ان کی بزرگی اور مرتبہ کی وجہ سے ان کے ساتھ قسم اٹھائی جاتی ہے۔

اور امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں یہ نہ کہا جائے کہ ان حروف تہجی کو سورتوں کے اسماء بنا نا جائز نہیں کیونکہ عرب میں یہ روانج نہیں کہ ایک مسمیٰ کا نام تین یا تین سے زائد اسمائے کے مجموعہ کے ساتھ رکھا جائے بلکہ وہ اس کو بے حد ناپسند کرتے ہیں۔

نیز اسم اور مسمیٰ کا اتحاد لازم آتا ہے اگر ان الفاظ تہجی کو ان سورتوں کے اسماء بنا یا جائے۔ اور یہ اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ جز کا وجود کل سے متاخر ہو حالانکہ جز مقدم ہوتا ہے۔ اور کل مؤخر ہوتا ہے۔ اور ان الفاظ کو سورتوں کے اسماء بنانے سے اس کا الٹ لازم آئے گا، کیونکہ باعتبار رتبہ مسمیٰ مقدم ہوتا ہے اور اسم مؤخر۔ (اس لئے یہ سورتوں کے اسماء نہیں ہوں گے۔)

(مذکورہ بالا اعتراضات نہ کئے جائیں) کیونکہ یہ الفاظ تہجی اس اس معنی میں مشہور نہیں کہ یہ زائد ہوں اور کتاب اللہ پڑھنے اور سننے والوں کو بیدار کرنے اور خواب غفلت سے جگانے کے لئے ہوں۔ اور ایک سورت کے انقطاع اور دوسری سورت کے استیناف پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہوں کیونکہ عربی لغت میں یہ حرف تشبیہ نہیں بلکہ وہ اور ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

الا، ما، وغیرہ

اور انقطاع و استیناف تو ان سورتوں کا بھی ہوتا ہے جن کے آغاز میں یہ کلمات تہجی نہیں ہوتے۔ اس حیثیت سے کہ یہ ان سورتوں کے فوائج اور ابتدائے ہیں۔

اور یہ کلمات تجھی عربی لغت میں کسی معین کلمہ معنی کے لئے نہیں ہو سکتے اور وہ شعر جو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے وہ شاذ ہے (کیونکہ شذوذ سے لغات ثابت نہیں ہوتے) باقی رہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اقوال تو ان سے آپ کی مراد تمبیہ کرنا ہے کہ جو کلمات تجھی سورتوں کی ابتدا میں ذکر کئے گئے ہیں وہ اللہ کریم کے اسماء کا منبع ہیں اور اس کے خطاب کے مہادی ہے اور مقصد خوبصورت مثالیں پیش کرنا ہے۔ کیا آپ نے اس امر کی طرف توجہ کی ہے کہ آپ نے ہر حرف کو جدا جدا کلمات سے شمار کیا ہے جو نہ تو ان کلمات کی تفسیر ہے اور نہ ہی ان کو خواص معانی کے ساتھ مخصوص کرنا مطلوب ہے اس حیثیت سے کہ یہ حروف اور معنی پر دلالت ہی نہ کرتے ہوں کیونکہ یہاں ایسا کوئی بھی لفظی یا معنوی قرینہ موجود نہیں جو ان کو صرف ان معانی کے ساتھ خاص کرنے کا تقاضا کرتا ہو۔ اور یہ حروف بحساب جملہ اقوام کی مدت بقاء اور ان کی عمروں کا اندازہ لگانے کے لئے وضع کئے گئے ہیں کہ ان کو ملحق بمعربات کر دیا جائے اور ان کی دلالت کو معربات کے ساتھ خاص کرنے کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے جو روایت بطور دلیل پیش کی گئی ہے وہ بھی اس دلالت کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مسکرانا ان کی جہالت پر تعجب کی وجہ سے ہونے کی وجہ سے کہ آپ ﷺ نے ان کے اس استنباط کو جائز سمجھا ہو۔ اور ان حروف کو اگرچہ مقسم بہا (وہ جن کے ساتھ قسم اٹھائی جاتی ہے) بنانا ممنوع نہیں لیکن اس کی وجہ سے بغیر ضرورت متعدد اشیاء مضمرا ماننا پڑیں گی اور وہ چیزیں یہ ہوں گی فعل قسم، فاعل قسم اور حروف قسم اور جواب قسم مضمرا مانا جائے گا (اور یہ جائز نہیں) اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر ان کو سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو تین یا تین سے زائد اسماء کے ساتھ کسی چیز کا نام رکھنا درست ہو حالانکہ اہل عرب اس کو درست نہیں گردانتے کیونکہ ایسا کرنا اس وقت منع ہوتا ہے جب ان کو بعلبک کی طرح مرکب بنائی بنا کر کسی چیز کا نام رکھا جائے مگر جب ان کو بطور گنتی اسماء اعداد کی طرح الگ الگ شمار کیا جائے اور اس کے ساتھ کسی کا نام رکھا جائے تو منع نہیں بوجہ مروج ہونے کے، جیسا کہ پورے ایک جملہ اور شعر کے ایک مصرعے کو سیبویہ نے کسی چیز کا نام رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسے سُور۔ مَن رَأَىٰ يَٰ اِيك شَهْرًا كَانَتْ يَٰ اِيك شَاعِرًا لِقَبِّ اِيك اور اسی طرح انہوں نے حروف معجمہ کے ایک پورے حصے کے ساتھ، کسی کا نام رکھنے کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ لہذا اس اعتبار سے ایک مسمی کے تین یا تین سے زائد اسماء کے ساتھ نام رکھنا جائز ہوگا۔ (اور یہ جو اعتراض کیا گیا ہے کہ ان حروف تجھی کو اگر سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو اسم و مسمی کا اتحاد لازم آتا ہے اور کل کا جز پر تقدم بھی لازم آتا ہے۔ یہ درست نہیں، اس کا جواب ملاحظہ ہو) ساری کی ساری سورۃ مسمی ہے اور اس کا اسم اس کا جز ہے اس لئے اسم و مسمی میں کوئی اتحاد نہیں اور اسی طرح کل کا جز پر تقدم بھی لازم نہیں آتا۔

اور پہلی وجہ تحقیق کے زیادہ قریب ہے اور قرآن پاک جو کہ اللہ کریم کی طرف سے نازل کردہ ہے وہ لطائف کے زیادہ قریب ہے اور اعلام میں وقوع اشتراک اور لزوم نقل سے بھی زیادہ محفوظ ہے جبکہ اشتراک ایک ہی واضح کی طرف سے ہو کیونکہ اس سے مقصود بالعلمیت باطل ہو جاتا ہے اور مسمی کا امتیاز ہی نہیں ہو سکتا۔

متن:

وقیل: إنها أسماء القرآن ولذلك أخبر عنها بالكتاب والقرآن.
 وقیل: إنها أسماء لله تعالى ويدل عليه
 أن علیاً كرم الله وجهه كان يقول: يا كهيص، ويا جمعسق،
 ولعله أراد یا منزلها.

ترجمہ:

بعض کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ تہجی قرآن کے اسماء ہیں اسی لئے اکثر سورتوں میں ان اسماء کی خبر کتاب یا قرآن آئی ہے۔
 بعض کا کہنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں اور اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل ہے کہ آپ ان کلمات کو دعائیہ
 انداز میں استعمال کرتے تو ان سے پہلے حروف نداء ذکر کرتے تھے۔ اور اس طرح پڑھتے
 یا کھیص، ویا جمعسق،
 اس سے آپ رضی اللہ عنہ کی مراد یہ ہوتی ہو یا منزلہا کہ اے دونوں سورتوں کو اتارنے والے۔

متن:

وقیل الالف: من أقصى الحلق وهو مبدأ المخارج واللام: من طرف اللسان وهو
 أوسطها، والميم:
 من الشفة وهو آخرها جمع بينها إيماء إلى أن العبد ينبغي أن يكون أول كلامه وأوسطه
 وآخره ذكر الله تعالى.
 وقیل: إنه سر استأثر الله بعلمه وقد روى عن الخلفاء الأربعة وغيرهم من الصحابة ما
 يقرب منه، ولعلمهم أرادوا أنها أسرار بين الله تعالى ورسوله ورموز لم يقصد بها
 إفهام غيره إذ يبعد الخطاب بما لا يفيد.

ترجمہ:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ الم کا مطلب یہ ہے کہ الف کا مخرج حلق کا آخری حصہ ہے جو مخارج کا مبداء ہے اور لام
 زبان کی نوک سے ادا کیا جاتا ہے جو کہ اوسط المخارج ہے اور میم کا مخرج ہونٹ ہیں جو مخارج کا آخری حصہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ
 تعالیٰ نے تینوں کے مخارج کا اکٹھا کر دیا ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ انسان کو یہی مناسب ہے کہ آغاز، درمیان اور آخر میں اللہ
 کریم کا ہی ذکر ہو۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ حروف تہجی جو سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں یہ وہ راز ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے اسی کے موافق روایات خلافاً راشدین سے بھی مروی ہیں۔ اور دیگر صحابہ کرام سے بھی اسی کے مثل مرویات ہیں۔

اور بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کے درمیان ایسے اسرار ہیں جن کا دوسروں پر عیاں کرنا مقصود نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو لازم آئے گا کہ ایسے کلام کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے خطاب کرنا، جو مفید نہیں تو یہ بعید از قیاس ہے۔

متن:

فإن جعلها أسماء الله تعالى، أو القرآن، أو السور كان لها حظ من الإعراب إما الرفع على الابتداء، أو الخبر، أو النصب بتقدير فعل القسم على طريقة الله لأفعلن بالنصب أو غيره كما ذكر، أو الجر على إضمار حرف القسم، ويتأق الإعراب لفظاً والحكاية فيما كانت مفردة أو موازنة لمفرد كحم فإنها كهابيل، والحكاية ليست إلا فيما عدا ذلك، وسيعود إليك ذكره مفصلاً إن شاء الله تعالى، وإن أبقيتها على معانيها فإن قدرت بالمؤلف من هذه الحروف كان في حيز الرفع بالابتداء أو الخبر على ما مر، وإن جعلتها مقسماً بها يكون كل كلمة منها منصوباً أو مجروراً على اللغتين في الله لأفعلن، وتكون جملة قسبية بالفعل المقدر له، وإن جعلتها أبعاض كلمات أو أصواتاً منزلة منزلة حروف التنبيه لم يكن لها محل من الإعراب كالجمل المبتدأة والمفردات البعدودة ويوقف عليها وقف التمام إذا قدرت بحيث لا تحتاج إلى ما بعدها، وليس شيء منها آية عند غير الكوفيين. وأما عندهم فالم في مواقعها، والبص وكهيعص وطه وطسم وطس ويس وحم آية، وحم عسقى آيتان، والبواقى ليست بآيات وهذا توقيف لا مجال للقياس فيه.

ترجمہ:

اگر ان کلمات کو اللہ کریم، قرآن پاک اور سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو ان کا اعراب میں لازماً حصہ ہوگا اس کی چند مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ مبتداء اور خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوں گے۔ دوسری یہ کہ منصوب ہوں گے فعل کے مقدر ہونے کی وجہ سے۔ اور تیسری صورت یہ کہ حرف قسم کے مضمحل ہونے کی وجہ سے مجرور ہوں گے جو کہ درج ذیل ہیں،

وبت

توان میں سے وہ کلمات جو مفرد ہیں جیسے م، ن، ا، اور ق اور وہ کلمے جو مفرد کے ہم وزن ہیں جیسے حم بروزن، ہائیل، توان کا اعراب لفظی ہوگا اور جو مفرد اور اس کے ہم وزن کلموں کے علاوہ ہوں گے ان کا اعراب حکائی ہوگا یعنی وہ محل رفع، نصب یا جر میں ہوں گے ان کے آخر میں اعراب لفظوں میں ظاہر نہیں ہوتا، ان کا مفصل ذکر جلد آئیگا۔ اور اگر آپ انہیں اپنے اصلی اور حقیقی معنی میں رکھیں۔ اور ان سے پہلے المؤلف من هذه الحروف مقدر مانیں تو یہ مبتداء یا خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہونگے جیسا کہ اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی المؤلف من جنس هذه الحروف ذالک الكتاب اور اگر انہیں مقسم بہا بنایا جائے تو ان میں ہر کلمہ منصوب یا مجرور ہوگا۔ یعنی اگر ان سے پہلے فعل قسم محذوف تصور کیا جائے تو مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہوں گے۔ اور اگر ان سے قبل حرف جر محذوف مانا جائے تو یہ مجرور ہوں گے۔ اور یہ اپنے ماقبل مقدر فعل کے ساتھ مل کر جملہ قسمیہ ہوں گے اور اگر ان کو بعض کلمات کے مخفف تسلیم کیا جائے، یا انہیں حرف تمبیہ مانا جائے تو ان کا اعراب میں کائی محل نہیں ہوگا جس طرح مستانفہ جملوں اور اور ان کلمات کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوتا جو صرف گنتی کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔ جیسے زید، عمر اور بکر وغیرہ اور ان پر جو وقف ہوگا اس کا نام وقف تام ہوگا اور یہ اپنے مابعد کے محتاج نہیں ہوں گے۔

[سورة البقرة (2): آية 2]

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2)

ترجمہ:

”وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں، اس میں ہدایت ہے ڈروالوں کو“۔

متن:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ذٰلِكَ اِشَارَةٌ اِلَى الْمَدِ اِنْ اَوَّلَ بِالْمَوْلَفِ مِنْ هٰذِهِ الْحُرُوفِ اَوْ فِى السُّورَةِ اَوْ الْقُرْآنِ فَاِنَّهُ لَمَّا تَكَلَّمَ بِهِ وَتَقَضَى، اَوْ وَصَلَ مِنَ الْمُرْسَلِ اِلَى الْمُرْسَلِ اِلَيْهِ صَارَ مُتْبَاعًا اَشِيرًا اِلَيْهِ بِمَا يَشَارُ بِهِ اِلَى الْبَعِيدِ وَتَذَكِيرًا. مَتَى اُرِيدَ بِ الْمَسُورَةِ لِتَذَكِيرِ الْكِتَابِ فَاِنَّهُ خَبْرَةٌ اَوْ صِفَتُهُ الَّذِى هُوَ هُوَ، اَوْ اِلَى الْكِتَابِ فَيَكُونُ صِفَتُهُ وَالْمُرَادُ بِهِ الْكِتَابُ الْمَوْعُودُ اِنْزَالَهُ بِنَحْوِ قَوْلِهِ تَعَالَى: اِنَّا سَنُلْقِيْكَ عَلَيْنَا قَوْلًا ثَقِيْلًا. اَوْ فِى الْكُتُبِ الْمَتَقَدِّمَةِ. وَهُوَ مُصَدَّرٌ سَمِيَّ بِهِ الْمَفْعُولُ لِلْمَبَالِغَةِ.

وقيل فعال بمعنى المفعول كاللباس، ثم اطلق على المنظوم عبارة قبل أن يكتب لأنه مما يكتب. وأصل الكتب الجمع ومنه الكتيبة.

ترجمہ:

ذالک اسم اشارہ للبعید ہے اور الم اس کا اشاریہ ہے اگر اس سے مراد المؤلف من هذه الحروف یا سورة یا قرآن کریم ہو کیونکہ اس کے مراد وہ کلام ازلی ہوگا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ازل میں کلام فرمایا اور اسے لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کرنے کا فیصلہ کیا اور یا مرسل اور مرسل الیہ تک پہنچانے میں بعید ہو گیا اسی وجہ سے اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بعید کا اسم اشارہ ذکر فرمایا اور جب مراد الم سے سورة ہو تو اسم اشارہ کو مذکر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس کے بعد الکتاب مذکر ہے۔ اور وہ یا تو اس کی خبر ہے یا اس کی صفت اور اس سے مراد وہی ہوگا جو مذکور ہے یا اس کا اشاریہ الکتاب ہے کیونکہ وہ اس کی صفت ہے تو اس سے مراد وہ کتاب ہے جس کا ذکر سورة مزمل میں کیا گیا ہے۔

اِنَّا سَنُلْقِيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا

(ہم آپ کی طرف ایک وزنی قول القاء کریں گے)

یا اس سے مراد وہ کتاب ہوگی جس کے نازل کرنے کا کتب سماویہ میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اور کتاب مصدر ہے اور اسم مفعول کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے تاکہ مبالغہ پر دلالت کرے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ فعال کے وزن پر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس طرح لباس بمعنی ملبوس اور فراش بمعنی مفروش پھر اس کا اطلاق ایسی منظوم عبارت پر ہوگا جس کو لکھنے سے پہلے منظوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسی چیزوں میں سے ہے جو لکھی جائیں گی اور کتاب کا لغوی معنی ہے جمع کرنا اسی لئے وہ لشکر جس میں زیادہ لشکر جمع ہوں اس کو کتیبہ کہا جاتا ہے۔

متن:

لَا رَيْبَ فِيْهِ

معناه أنه لو ضوحه وسطوع برهانه بحيث لا يرتاب العاقل بعد النظر الصحيح في كونه
وحياً بالغاً حد الإعجاز، لا أن أحداً لا يرتاب فيه، ألا ترى إلى قوله تعالى: وَإِنْ كُنْتُمْ فِي
رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا، الآية فإنه ما أبعد عنهم الريب بل عرفهم الطريق المبرج له،
وهو أن يجهدوا في معارضة نجم من نجومه ويبذلوا فيها غاية جهدهم حتى إذا عجزوا
عنها تحقق لهم أن ليس فيه مجال للشبهة ولا مدخل للريبة.

وقيل: معناه لا ريب فيه للمتقين، وهدى حال من الضمير المجرور، والعامل فيه
الظرف الواقع صفة للمنفى، والريب في الاصل مصدر راہنی الشيء إذا حصل فيك
الريبة، وهي قلق النفس واضطرابها، سمي به الشك لأنه يقلق النفس ويزيل الطمأنينة.

وفي الحديث دع ما يريبك إلى ما لا يريبك
فإن الشك ريبة والصدق طمأنينة، ومنه ريب الزمان لدوائبه.

ترجمہ:

(اس میں کسی قسم کا شک نہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی واضح، روشن اور غالب دلیلوں کو ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ مقام پر فائز ہے کہ کوئی بھی زیرک انسان اس میں تدبر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور حد اعجاز تک پہنچنے میں شک نہیں کر سکتا۔ کیا آپ نے رب تعالیٰ کے اس قول پر تدبر نہیں کیا جس میں عربوں کو چیلنج کیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے تو لاؤ اس کی مثل کوئی ایک چھوٹی سی سورت۔ اللہ کریم نے ان کا شک دور نہیں کیا بلکہ وہ راستہ بتایا جس کے ذریعے ان کا شک زائل ہو جائے، اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اس کی مثل کوئی چھوٹی سی سورت لاؤ اور یہ بھی کہا کہ اپنی ساری کی ساری علمی طاقت صرف کرو اور جب وہ اس کی مثل لانے سے عاجز آجائیں گے تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں نہ تو شک و شبہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی یہ محل شک ہے۔ لاریب فیہ کے متعلق بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام مجید میں متقین کے لئے شک و شبہ نہیں صورت میں ہدیٰ اس ضمیر مجرور متصل سے حال ہے جو کہ فیہ میں ہے اور اس حال کا عامل وہ منفی (ریب) کی صفت واقع ہو رہی ہے (اس صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی

لَا رَيْبَ كَائِنًا فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

ریب میں رابنی الشی کا مصدر ہے جس کا مطلب ہے کہ اس چیز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اور پریشان کر دیا۔ کیونکہ ریب کا معنی ہے نفس کا مضطرب اور پریشان ہونا اسی لئے ریب کو شک کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اطمینان کو زائل اور نفس کو پریشان کر دیتا ہے۔ اور حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ تو اس چیز کو چھوڑ دے جو تجھے پریشان کرتی ہے۔ اور وہ کام کر جو تجھے اضطراب میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ شک صرف اور صرف بے چینی اور پریشانی ہے جبکہ سچ اطمینان اور سکون ہے حادثات زمانہ اور مصیبتیں بھی انسان کو پریشان کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کو ریب الزمان کہا جاتا ہے۔

متن:

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

يَهْدِيهِمْ إِلَى الْحَقِّ، وَالْهُدَى فِي الْأَصْلِ مَصْدَرٌ كَالسَّرِيِّ وَالتَّقَى وَمَعْنَاهُ الدَّلَالَةُ.

وقيل: الدلالة الموصلة إلى البغية لأنه جعل مقابل الضلالة في قوله تعالى: إِنَّا أَوْ
إِيَّاكُمْ لَعَلَّ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ولأنه لا يقال مهدى إلا لمن اهتدى إلى المطلوب.
واختصاصه بالمتقين لأنهم المهتدون به والمنتفعون بنصه، وإن كانت دلالة عامة

لكل ناظر من مسلم أو كافر وبهذا الاعتبار قال تعالى: هُدًى لِّلنَّاسِ، أو لأنه لا ينتفع بالتأمل فيه إلا من صقل العقل واستعمله في تدبر الآيات والنظر في المعجزات، وتعرف النبوات، لأنه كالغذاء الصالح لحفظ الصحة فإنه لا يجلب نفعاً ما لم تكن الصحة حاصلة، وإليه أشار بقوله تعالى: وَنُنزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَاراً، ولا يقدر ما فيه من الجمل والمتشابه في كونه هدى لما لم ينفك عن بيان يعين المراد منه.

والمتقى اسم فاعل من قولهم وقاه فاتقى، والوقاية: فرط الصيانة، وهو في عرف الشرع اسم لمن يقى نفسه مما يضره في الآخرة، وله ثلاث مراتب: الأولى: التوقى من العذاب المخلد بالتبرى من الشرك وعليه قوله تعالى: وَالزَّمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى.

الثانية: التجنب عن كل ما يؤثم من فعل أو ترك حتى الصغائر عند قوم وهو المتعارف باسم التقوى في الشرع، وهو المعنى بقوله تعالى: وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا.

الثالثة: أن يتنزه عما يشغل سره عن الحق ويتبتل إليه بشر اشرة وهو التقوى الحقيقي المطلوب بقوله تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَقَدْ فسر قوله: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ها هنا على الأوجه الثلاثة.

ترجمہ:

(ہدایت ہے ڈروالوں کو)

یہ کتاب رہنمائی الحق ہے، الہدیٰ اصل میں مصدر ہے اور اس کا مطلب رہنمائی کرنا یا منزل مقصود تک پہنچانا ہے۔ جیسا کہ سری (رات کا سفر) اور الثقی (بہت زیادہ پرہیزگار) اس کا یہ معنی اسلئے کیا گیا ہے کیونکہ یہ کلام اللہ میں ضلال کے معنی میں آتا ہے۔ جس کا معنی سیدھے راستے سے بھٹکنا ہے۔ کہ اللہ کریم کا فرمان ہے،

إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

اور اسی لئے وہ شخص جو منزل مقصود تک پہنچائے اس کو مہدی کہا جاتا ہے۔ اور قرآن پاک کو متقین کی ہدایت کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہی لوگ فائدہ اور ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اور وہی لوگ اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے اور اس کی عظمت و کبریائی پر قائم کردہ دلائل سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ قرآن کی رہنمائی عام ہے لیکن ہدایت اس کو ملے گی

جو غور و فکر کرے گا چاہے وہ کافر ہو یا مسلم، اسی لئے قرآن میں فرمان مذکور ہے۔ ہدی اللناس (تمام لوگوں کے لئے ہدایت) اور ہدایت کو متقین کے ساتھ خاص کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں تدبیر کے وہی لوگ نفع حاصل کرتے ہیں جو گناہوں کی گندگی سے اپنے عقل کو پاک رکھتے ہیں اور معجزات میں غور و فکر کر کے نبوت اور دلائل نبوت کو پہچاننے کے لئے استعمال کیا ہو۔ کیونکہ قرآن پاک کی مثال ایسی ہی ہے جیسے صحت کے لئے اچھی خوراک کی، کہ صحت مند آدمی اچھی غذا سے صحیح فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس کی دلیل اللہ کریم کا قول،

وَنَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا.

ہم قرآن نازل فرما رہے ہیں جو مومنین کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کے لئے خسارہ کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا۔

اور بعض آیات کا مجمل اور مشابہ ہونا، حصول ہدایت میں خلل کا باعث نہیں کیونکہ وہ معلوم المراد ہوتی ہیں اور اپنے معنی کی وضاحت سے خالی نہیں ہوتیں۔

المتقی مشتق ہے عربوں کے اس قول وقاہ فاتقی سے، اور یہ واحد مذکر اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے اس نے اس کو بچایا تو وہ بچ گیا۔ اور اگر وقایہ کا معنی خطرناک چیز سے انتہائی کوشش کے بعد بچنا ہو تو متقی کا معنی یہ ہوگا کہ نقصان دہ اشیاء سے بچنے کے بھرپور کوشش کرنے والا۔ عرف شرع میں یہ نام اس آدمی کا ہے جو آخرت میں نقصان پہنچانے والی ہر چیز سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان کا شرک سے براءت حاصل کرنا اور توحید پر یقین رکھنا اللہ تعالیٰ کے قول کا یہی معنی ہے۔ والزمہم کلمۃ التقویٰ کہ اس نے ان کے لئے تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا مطلب یہ کہ جس نے کلمہ طیبہ کا اقرار کیا وہ دائمی عذاب سے بچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ انسان ہر ایسے کام کو بجالانے سے بچے جس کی وجہ سے گنہگار ہو اور بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ وہ صغائر (چھوٹے گناہ) سے بھی بچے اور یہی معنی اصطلاح شریعت میں ہے۔ اور کلام اللہ بھی اسی کے ہم معنی ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَسُوهُ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرًا.

(اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ان کے لئے اللہ کریم کی طرف سے بہت ہی ثواب ہوتا۔)

اور تیسرا درجہ یہ کہ انسان ایسی چیزوں سے بچے کہ جو اس کے باطن کو ذرا اللہ سے غافل کر دیں۔ اور تقویٰ کا یہی حقیقی درجہ ہے کہ بندہ اللہ کریم کی ذات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائے۔ اور اللہ کریم کے قول سے بھی یہی مراد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ.

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔)

یہاں پر هُدَى الْمُتَّقِينَ
کی تفسیر بھی انہی تین طریقوں پر کی جائے گی۔

متن:

واعلم أن الآية تحتل أوجهاً من الإعراب: أن يكون الم مبتداً على أنه اسم للقرآن أو السورقة أو مقدر بالمؤلف منها، وذلك خبره وإن كان أخص من المؤلف مطلقاً، والاصل أن الاخص لا يحمل على الاعم لأن المراد به المؤلف الكامل في تأليفه البالغ أقصى درجات الفصاحة ومراتب البلاغة والكتاب صفة ذلك. وأن يكون الم خبر مبتداً محذوف وذلك خبراً ثانياً. أو بدلاً والكتاب صفة ولا ريب في المشهورة مبني لتضمنه معنى من منصوب المحل على أنه اسم لا النافية للجنس العاملة عمل إن لأنها نقيضتها ولازمة للأسماء لزومها. وفي قراءة أبي الشعثاء مرفوع بلا التي بمعنى ليس وفيه خبره ولم يقدم كما قدم في قوله تعالى: لَأَفِيهَا غَوْلٌ لأنه لم يقصد تخصيص نفي الريب به من بين سائر الكتب كما قصد ثمة. أو صفة وللمتقين خبره. وهدي نصب على الحال، أو الخبر محذوف كما في لا ضير، فلذلك وقف على لا ريب، على أن فيه خبر هدي قدم عليه لتكبيره والتقدير: لا ريب فيه فيه هدي، وأن يكون ذلك مبتداً والكتاب خبره على معنى: أنه الكتاب الكامل الذي يستأهل أن يسمى كتاباً، أو صفة وما بعده خبره والجملة خبر الم.

ترجمہ:

تو جان لے کہ یہ آیات ترکیب کے مختلف احتمال رکھتی ہے، پہلا یہ کہ الم مبتداء اور ذالک موصوف اور الكتاب اس کی صفت ہے موصوف صفت ل کر خبر، مبتداء اور خبر مل کر جملہ اسمیہ خبریہ اس صورت میں الم سے مراد یا تو سورتیں ہوں گی یا پھر قرآن یا المؤلف من جنس ہزہ الحروف مراد ہوگا۔ اور اگر الم سے المؤلف من جنس ہزہ الحروف لیا جائے تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا الم بمعنی المؤلف من جنس ہزہ الحروف عام مطلق ہے اور ذالک الكتاب اخص مطلق ہے اور قاعدہ کے مطابق خاص مطلق کو عام مطلق پر محمول کرنا جائز نہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ المؤلف من جنس ہزہ الحروف سے مراد عام کلام نہیں بلکہ وہ کلام ہے جو اپنی تالیف و ترکیب میں کامل اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہے۔ جس نے عربوں کو اپنے مقابلہ میں کلام لانے سے عاجز کر دیا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ الم مبتداء خبر ہے مبتداء محذوف کی۔ جو ہذا ہے اور ذالک اسم اشارہ موصوف الکتاب مشار الیہ صفت ہے، موصوف اور صفت مل کر اس کی خبر ثانی ہے اور یا الم سے بدل ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہوگا جب الم سے مراد قرآن یا سورت ہو تو اصل عبارت یوں ہوگی۔

هَذَا الْقَدْرَ ذَلِكَ الْكُتُبِ

اور اگر الم سے مراد المؤلف من جنس هذه الحروف لیا جائے تو اس کا مبتداء المتحدی بہ من جنس هذه الحروف ہو گا اور الم اس کی خبر ہوگی۔

ربب کا لفظ مشہور قرأت میں لائے نفی جنس کا اسم ہے یہ نکرہ مفرد مبنی برفتحہ ہے کیونکہ یہ اپنے ضمن میں من استغراقیہ کا معنی لئے ہوئے ہے اور بوجہ اسم لائے نفی جنس ہونے کے یہ منصوب محل ہے۔ اور بھی حروف مشبہ بالفعل والاعمل کرتا ہے۔ یعنی اس کا اسم منصوب خبر مرفوع ہوتی ہے۔ اور یہ ان کی ضد ہے کیونکہ لاکسی چیز کی جنس کی نفی کے لئے آتا ہے۔ جبکہ ان کسی چیز کے ثبوت کے تحقق کے لئے آتا ہے۔ جس طرح ان کا دو اسموں پر داخل ہونا لازمی ہوتا ہے اسی اس کا دخول بھی دو اسموں پر ہی ہوتا ہے۔ اور تابعین سے ابی شعشاء کی قرأت کے مطابق لا بمعنی لیس ہے اور یہ اپنے اسم ریب کو رفع دیتا ہے اور فیہ اس کی خبر ہے۔

اس جملہ میں لاکسی خبر کو اسم پر مقدم نہیں کیا گیا مثلاً لای فیہا غول میں فیہا کو مقدم کیا گیا ہے اور اس کا معنی ہے جنت کی شراب میں مدہوش کرنا نہیں۔ اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جنت کی شراب سے غیلان کی نفی اسی کے ساتھ خاص ہے جب کہ یہاں ریب کی نفی صرف قرآن کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سارے کا سارا کلام اللہ شک و شبہ سے بالاتر ہے اگر لفظ ریب سے خبر مقدم ہوتی تو ریب کی نفی صرف اسی کتاب مقدس کے ساتھ خاص ہو جاتی جو کہ خلاف مقصود ہے کیونکہ خبر کا مقدم ہونا تخصیص پر دلالت کرتا ہے۔ یا فیہ اپنے متعلق کا نناء کے ساتھ مل کر ریب کی صفت ہے اور للمتقین خبر لا ہے۔ اور ہدی بمعنی ہادی ہے اور اس میں فیہ محذوف ہے اس عبارت کچھ یوں ہے۔

لاریب فیہ، فیہ ہدی للمتقین

تھا، اسی وجہ سے اس صورت میں لاریب پر وقف تام ہوگا جیسا کہ لاضمیر میں اور جب ہدی کو مبتداء بنایا جائے اور اس کی خبر فیہ میں محذوف نکالی جائے یعنی عبارت اس طرح ہو۔

فیہ ہدی للمتقین

تو خبر کو مقدم کرنے کی وجہ، ہدی کا نکرہ ہونا ہے۔ عبارت اصل میں کچھ یوں تھی،

لاریب فیہ، فیہ ہدی للمتقین۔

متن:

والاولی أن یقال إنها أربع جمل متناسقة تقرر اللاحقة منها السابقة ولذلك لم

یدخل العاطف بيها. ف المر، جملة دلت على أن المتحدى به هو المؤلف من جنس ما
ير كيون منه كلامهم، وذلك الكتاب جملة ثانية مقررة لجهة التحدى، ولا ريب في
جملة ثالثة تشهد على كماله بأن الكتاب المدعوت به غاية الكمال إذ لا كمال أعلى مما
للحق واليقين، وهُدَى لِّلْمُتَّقِينَ، بما يقدر له مبعداً جملة رابعة تؤكد كونه حقاً لا يحوم
الشك حوله بأنه هُدَى لِّلْمُتَّقِينَ، أو تستتبع السابقة منها اللاحقة استتباع الدليل
للمدلول، وبيانه أنه لما نبه أولاً على إجمار المتحدى به من حيث أنه من جنس
كلامهم وقد عجزوا عن معارضته، استنتج منه أنه الكتاب البالغ حد الكمال
واستلزم ذلك أن لا يتشبه الريب بأطرافه إذ لا أنقص مما يعتريه الشك والشبهة،
وما كان كذلك كان لا محالة هُدَى لِّلْمُتَّقِينَ، وفي كل واحدة منها نكتة ذات جزالة ففي
الاولى الحذف والرمز إلى المقصود مع التعليل، وفي الثانية فخامة التعريف، وفي الثالثة
تأخير الطرف حذراً عن إبهام الباطل، وفي الرابعة الحذف والتوصيف بالمصدر
للمبالغة وإيرادة منكرًا للتعظيم وتخصيص الهدى بالمتقين باعتبار الغاية تسمية
المشارف للتقوى متقياً إيجازاً وتفعيلاً لشأنه.

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس آیت میں ترکیبی احتمالات کے علیحدہ علیحدہ چار
جملے بنائے جائیں۔ اور یہی قرآن کا مزاج ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ان کو علیحدہ علیحدہ چار جملے بنایا جائے تو پہلا جملہ موکد، دوسرا
تاکید ہوگا، یا پہلا جملہ دلیل اور دوسرا مدلول ہوگا۔ ان جملوں کا آپس میں گہرہ تعلق ہے اور تغایر نہیں اسی لئے ان کے درمیان
حرف عطف مذکور نہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ پہلا جملہ یعنی الم اپنی خبر مخذوف یا مبتداء مخذوف کے ساتھ مل کر قرآن کریم کے اعجاز
پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت کا مظہر ہے۔ کیونکہ ان کلمات کو سورتوں کو آغاز میں ذکر کیا گیا اس کا مقصد یہ تھا
کہ جس کلام کے کے مقابلے میں کلام لانے چیلنج کیا گیا ہے وہ کلام اسی قسم کے کلموں، جملوں اور ترکیبوں سے مرکب ہے۔ جن
سے وہ اپنا کلام مرکب کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود بھی وہ ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز آگئے اور چھوٹی سی سورت بھی نہ لا
سکے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ اور ذالک الكتاب نے قرآن پاک کی فصاحت و
بلاغت پر تصدیق کی مہر لگا دی۔ کیونکہ اس میں مبتداء اور خبر معروفہ ہیں اور ان کا معروفہ ہونا ان کے مدلول کے کمال پر دلالت کرتا
ہے۔ تو لا یریب فیہ کے جملہ نے ثابت کر دیا کہ اس کلام میں شک و شبہ کی گنجائش تک نہیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ اس کلام سے جنس شک کی نفی ہوگئی اور شک کا نہ ہونا حق ہونے کو مستلزم ہے۔ لہذا اس پر یقین کرنا لازم

ہے اور ہدیٰ للمتقین نے بیان کیا کہ متقین کے لئے باعث ہدایت ہے۔ یا پہلا جملہ پیچھے والے جملے کو اپنے پیچھے اسی طرح لاتا ہے جیسے دلیل کے بعد مدلول اسکو کچھ ایسے سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ کریم نے متحدی بہ کے اعجاز پر آگاہ فرمایا کہ یہ وہی کلام ہے جو ان کے کلام کی جنس سے مرکب ہے تو وہ اس کی مثل لانے سے عاجز آگئے تو اس سے نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ قرآن پاک ایسی عظیم کتاب ہے جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے اور شک و شبہ اس کے قریب و اطراف میں پھٹک نہیں سکتا۔ کیونکہ جس کلام میں شک و شبہ کی گنجائش ہو، وہ کلام ناقص ہوتا ہے۔ اور جو کلام شک و شبہ سے خالی ہو، وہ لازماً متقین کے لئے ہدایت ہوگا۔

نیز ان چاروں جملوں میں سے ہر جملہ میں ایک عظیم نکتہ ہے جس کے اندر کئی نکتے پوشیدہ ہیں مثال کے طور پر پہلے جملہ میں مبتداء یا خبر مخدوف ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی وحی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ علت بھی بیان کر رہا ہے کہ دوسرے جملہ میں مبتداء اور خبر معرفہ ہیں جو اس کلام کی عظمت و کمال پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ جب مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو وہ اپنے مدلول کے کمال اور تخصیص کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور تیسرے جملہ میں جو خبر ہے "فیہ" اس کو اسم سے موخر کیا گیا تاکہ اس امر پر دلالت کرے کہ کلام اللہ میں کسی قسم کا باطل و ہم نہیں گزر سکتا۔ اور چوتھے جملے میں مبتداء یا خبر مخدوف ہے اور ہدیٰ مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں ذکر کر کے مبالغہ کا اظہار بھی ہے۔ اور مبتداء کا کمرہ ہونا کلام کی عظمت پر دال ہے۔ کیونکہ کمرہ کا کام ہی مدلول کی شان ظاہر کرنا ہے اور متقین کے ساتھ ہدایت کا مخصوص ہونا، اسی آخری درجہ کے اعتبار سے ہے کہ متقین کا آخری درجہ تقویٰ ہی ہے اس لئے وہ اس کی ہدایت سے نفع حاصل کرتے ہیں نیز اس جملہ میں ایسے لوگوں کو متقین کہا گیا ہے جو تقویٰ کے راستے پر چلتے ہیں، ابھی متقی نہیں۔ اس میں ان کی بلند شان کو بیان کرنا ہے اور کلام میں اختصار بھی ہے۔

ذالک کی تحقیق:

(ذا) ہاں ہذا میں ذاکالفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ ہذہ وہ ہدیٰ وہاتا۔ ان میں سے صرف ہاتا کا تشبیہ ہاتا نا آتا ہے۔ ہذہ اور ہذی کا تشبیہ استعمال نہیں ہوتا قرآن میں ہے:

أَرَأَيْتَكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْت عَلٰی (سورۃ الاسراء آیت نمبر 62)

کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ (سورۃ ق آیت نمبر 53)

یہ ہے وہ جس کا تم وعدہ دیئے جاتے ہو۔

هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُوْنَ (سورۃ الداربات آیت نمبر 14)

یہ وہی ہے جس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

اِنَّ هٰذَا لَسَاجِرًا (سورۃ طہ آیت نمبر 63)

کہ یہ دونوں جادو گر ہیں۔

هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكذِّبُونَ (سورۃ الطور آیت نمبر 14)

یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ (سورۃ الرحمن آیت نمبر 43)

یہ ہے وہ جہنم جسے مجرم جھٹلاتے ہیں۔

ذاک اور ذالک میں فرق:

ہذا کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔ اس کے لئے ذاک اور ذالک استعمال

ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا،

الْمِ ذٰلِكَ الْكِتٰبِ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 1-2)

وہ بلند مرتبہ کتاب (قرآن)۔

ذٰلِكَ مِنْ آيٰتِ اللّٰهِ (سورۃ الکہف آیت نمبر 17)

یہ اللہ کی نشانیوں سے ہے۔

یہ اس لئے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ہلاک کر دے۔

کتاب کا معنی:

(کتاب) الکتب۔ (book)

الکتاب اصل میں مصدر ہے اور پھر مکتوب فیہ (یعنی جس چیز میں لکھا گیا ہو) کو کتاب کہا جانے لگا ہے دراصل

الکتاب اس صحیفہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ:

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِنَ السَّمَاءِ (سورۃ النساء آیت نمبر 153)

اے محبوب اہل کتاب تم سے سوال کرتے ہیں کہ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار دو۔

اس میں،، کتاب،، سے وہ صحیفہ مراد ہے جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔

حرف لا کے معانی و اقسام:

لا زبیب

میں (حرف) لا یہ کبھی عدم محض کے لئے آتا ہے۔ جیسے: زید لا عالم یعنی زید جاہل ہے اور کبھی نفی کے لئے ہوتا ہے۔ اور

اسم و فعل دونوں کے ساتھ ازمنہ ثلاثہ میں نفی کے معنی دیتا ہے لیکن جب زمانہ ماضی میں نفی کے لئے ہو تو یا تو اس کے بعد فعل کو ذکر

ہی نہیں کیا جاتا مثلاً اگر کوئی ہل خرچت کہے تو اس کے جواب میں صرف لا کہ دنیا کافی ہے یعنی لا خرچت اور اگر نفی فعل مذکور بھی ہوتا ہے تو شاذ و نادر اور وہ بھی اس وقت جب لا اور فعل کے درمیان کوئی فاعل آجائے۔ جیسے،

لا رجل ضربت ولا امرأة

(2) جب اس پر دوسرے فعل کا عطف ہو جیسے۔ لا خرچت ولا ضربت

اور یا،

(3) لا مکرر ہو جیسے؛

فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى (سورة القيامة آیت نمبر 31)

تو اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی۔

اور یا،

(4) جملہ دعائیہ میں جیسے لا کان (خدا کرے ایسا نہ ہو) لا افلح وہ کامیاب نہ ہو وغیرہ۔ اور زمانہ مستقبل میں نفی کے

متعلق فرمایا:

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ (سورة سبأ آیت نمبر 3)

ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔

اور کبھی لا کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور کلام محذوف کی نفی کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (سورة یونس آیت نمبر 61)

اور تمہارے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز غائب نہیں زمین میں نہ آسمان میں۔

اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی بعض نے لا کو اسی معنی پر حمل کیا ہے۔

لَا أَقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (سورة القيامة آیت نمبر 1)

روز قیامت کی قسم یاد فرماتا ہوں۔

فَلَا أَقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغْرِبِ (سورة المعارج آیت نمبر 40)

تو مجھے قسم ہے اس کی جو سب پوربوں سب مہموں کا مالک ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ (سورة النساء آیت نمبر 65)

تمہارے پروردگار کی قسم یہ مومن نہیں ہوں گے۔

فَلَا أَقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ (سورة الواقعة آیت نمبر 75)

تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں تارے ڈوبتے ہیں۔

اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے:

لا وایک ابته العامری
نہیں تیرے باپ کی قسم اے عامری کی بیٹی۔

غروب سے پہلے افطار:

اور مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر نے یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو گیا ہے روزہ افطار کر دیا اس کے بعد سورج نکل آیا تو آپ نے فرمایا:

"لأنقضیه ماتجالفنا الاثم فیہ"

اس میں بھی لاکلام مخدوف کی نفی کے لئے ہے یعنی اس غلطی پر جب لوگوں نے کہا کہ آپ نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اس کی نفی کے لئے انہوں نے لافرمایا۔ یعنی ہم گنہگار نہیں ہیں۔ اس کے بعد تقضیہ سے از سر نو جملہ شروع کیا ہے۔ اور کبھی یہ لانیہی کے لئے آتا ہے جیسے اللہ کریم نے فرمایا:

"لا یسخر قوم من قوم" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 11)

اے ایمان والو نہ مرد مردوں سے نہیں۔

"ولا تنابزوا باللقاب" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 11)

اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

اور آیت: "یا بنی آدم لا یفتنکم الشیطان" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 27)

اے آدم کی اولاد خبردار تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈالے۔

اور نیز: "لا یحیطنکم سلیمان و جنودہ" (سورۃ النمل آیت نمبر 18)

ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تم کو چل ڈالیں۔

میں بھی لانیہی کے لئے ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وإذا أخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون إلا اللہ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 83)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لانا فیہ یعنی خبر ہے یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اسی طرح آیت

کریمہ:

"وإذا أخذنا میثاقکم لا تسفکون دماءکم" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 84)

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں کشت و خون نہیں کرو گے۔ میں بھی لانیہی پر محمول ہے اور فرمان باری تعالیٰ،

”مَا لَكُمْ لَا تَقَاتِلُونَ“ (سورۃ النساء آیت نمبر 75)

تمہیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں نہیں لڑتے۔

میں ہو سکتا ہے کہ لا تقاتلون موضع حال میں ہو۔ اور معنی یہ ہوگا مالکم غیر مقاتلین یعنی تمہیں کیا ہوا اور در آنحالیکہ لڑنے والے نہیں ہو۔ اور لا کے بعد اسم مکرہ آجائے تو وہ جہنمی برقعہ ہوتا ہے اور لافنی کے معنی دیتا ہے جیسے فرمایا: نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے۔

فَلَا رَفَقًا وَلَا فُسُوقًا (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 197)

اور کبھی دو متضاد معنوں کے درمیان لا کرا آجاتا ہے۔ اور دونوں کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے:

لا زید بمقیم ولا ظاعن نہ زید مقیم

ہے اور نہ ہی مسافر یعنی کبھی مقیم ہے اور کبھی سفر پر اور کبھی متضاد مقصود ہوتا ہے جیسے، لیس ابیض ولا اسود سے مراد ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کے درمیان ہے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا رنگ ہو چنانچہ آیت کریمہ:

لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ (سورۃ النور آیت نمبر 35)

یعنی زیتون کی نہ شرق کی طرف منسوب اور نہ مغرب کی طرف کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ بیک وقت شرقی بھی ہے اور غربی بھی۔ اور بعض نے اس کا افراط اور تفریط سے محفوظ ہونا مراد لیا ہے۔ کبھی لامحس سلب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک شے کی نفی کر کے دوسری کا اثبات مقصود نہیں ہوتا مثلاً انسان کہہ کہ صرف انسانیت کی نفی کا قصد کیا جائے اور عالمی محاورہ لاحد بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

ریب کی حقیقت:

(ریب) (Doubt)

اور ریب کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی طرح کا وہم ہو مگر بعد میں اس توہم کا ازالہ ہو جائے۔ قرآن مجید میں

ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 23)

اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا۔

ہدایت کیا ہے؟

(ہادی) (الهدایۃ) (Instruction)

کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں۔

چار طرف سے ہدایت:

انسان کو اللہ کریم نے چار طرف سے ہدایت عطا کی ہے۔

(1) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے کی ہے۔

اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا

ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقًا ثُمَّ هَدَى (سورۃ طہ آیت نمبر 50)

کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی۔

(2) دوسری قسم ہدایت

کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ تجارت کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ

آیت کریمہ:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 73)

اور ہم نے انہیں امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلا تے ہیں۔

اس میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(3) سوم بمعنی توفیق

یہ خاص قسم ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (سورۃ صافات آیت نمبر 17)

اور جنہوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمائی۔

(4) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بِالْهَمِّ (سورۃ صافات آیت نمبر 5)

(بلکہ) وہ انہیں (منزل) مقصود تک پہنچا دے گا۔

اور آیت کریمہ: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 43)

اور ہم نے ان کے سینوں میں سے کینے کھینچ لئے۔

تقویٰ کی تعریف اور اصل معنی:

التقویٰ (Fear of GOD, Piety)

اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہوں کا موجب ہو۔ اور یہ بات محظورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لئے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔

الحلال بین و احرام بین ومن وقع حول الحمی فحقیق ان یقع فیہ
کہ حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور جو شخص چراگاہ کے ارد گرد چرائے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے (یعنی مشتبہ چیزیں اگرچہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن پاک میں ہے:

فَمَنْ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورة الاعراف آیت نمبر 35)
تو جو پرہیزگاری کرے اور سنورے تو اس پر نہ کچھ خوف اور نہ کچھ غم۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا (سورة النحل آیت نمبر 128)
بیشک اللہ ان کے ساتھ ہے جو ڈرتے ہیں۔

وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (سورة الزمر آیت نمبر 73)
اور جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ان کی سواریاں گروہ گروہ جنت کی طرف چلائے جائیں گی۔
پھر تقویٰ کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لئے آیات،

وَاتَّقُوا يَوْمَ مَا تَرْتَجِعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (سورة البقرة آیت نمبر 281)
اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھرو گے۔

وَاتَّقُوا رَبَّكُمْ (سورة النساء آیت نمبر 1)
اور ڈرو اس خدا سے جس کا نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔

اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ (سورة فال عمران آیت نمبر 102)
اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقویٰ کا ایک خاص معنی مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے اور بعد بیان ہوگی۔ اتقی فلان بکذا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:

أَفَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (سورة الزمر آیت نمبر 24)

تو کیا وہ جو قیامت کے دن برے عذاب کی ڈھال نہ پائے گا اپنے چہرے کے سوانجات والے کی طرح ہو جائے گا۔
میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ
عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:

وَتَغْشَىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 50)

اور ان کے چہرے آگ ڈھانپ لے گی۔

يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ (سورۃ القمر آیت نمبر 48)

جس دن آگ میں اپنے مونہوں پر کھینٹے جائیں گے۔

[سورة البقرة (2) : آية 3]

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (3)

ترجمہ:

”وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم رکھیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں۔“

متن:

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ إِمَّا موصول بالمتقين على أنه صفة مجرورة مقيدة له إن فسر
التقوى بترك ما لا ينبغي مترتبة عليه ترتيب التحلية على التخلية، والتصوير على
التصقيل، أو موضحة إن فسر بما يعم فعل الحسنات وترك السيئات لاشتماله على ما
هو أصل الاعمال وأساس الحسنات من الإيمان والصلاة والصدقة، فإنها أمهات
الاعمال النفسانية والعبادات البدنية والمالية المستتبعة لسائر الطاعات
والتجنب عن المعاصي غالباً، ألا ترى إلى قوله تعالى: إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ
وَالْمُنْكَرِ.

وقوله عليه الصلاة والسلام

الصلاة عماد الدين، والزكاة قنطرة الإسلام

أو مسوقة للمدح بما تضمنه المتقين، وتخصيص الإيمان بالغيب وإقامة الصلاة
وإيتاء الزكاة بالذكر إظهار لفضلها على سائر ما يدخل تحت اسم التقوى. أو على أنه
مدح منصوب، أو مرفوع بتقدير أعني أو هم الذين، وإما مفصول عنه مرفوع بالابتداء

وَعِبْرَةٌ لِّكَ عَلَىٰ هَذِهِ، فَيُكُونُ الْوَقْفُ عَلَى الْمُتَّقِينَ تَامًا.

ترجمہ:

اعراب میں یہ آیت یا تو متقین کے ساتھ متصل ہے یعنی اعراب میں اس کے تابع ہے تو اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر متقین کی صفت مقیدہ مجرورہ ہوگی اس شرط پر کہ تقویٰ کا معنی ایسے کاموں کو ترک کرنا ہو جو کہ مناسب نہ ہوں، اس صورت میں تقویٰ پر ایمان بالغیب اس طرح مرتب ہوگا جس طرح کسی چیز کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر کے نقش و نگار سے مزین کیا جاتا ہے یا پھر کسی چیز کو میٹل کر کے تصویر بنائی جاتی ہے۔ اور تقویٰ کا یہ معنی لیا جائے کہ نیکی اختیار کرنا اور برائی کو چھوڑنا تو اس صورت میں یہ صفت موصیہ ہوگی۔ کیونکہ الذین یومنون ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو اعمال کی اصل اور بنیاد ہیں اور یہ عبادات اپنے پیچھے عموماً باقی تمام اطاعتوں کو عمل جامہ پہنانے اور تمام گناہوں سے بچنے کو لاتے ہیں کیا آپ اللہ کے اس فرمان کو ملاحظہ نہیں کرتے؟

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ.

کہ بے شک نماز تمام برائیوں اور ناپسندیدہ اعمال سے روکتی ہے اور حدیث پاک ہے،

الصلاة عماد الدين، والزكاة قنطرة الإسلام
نماز دین کا ستون، اور زکوٰۃ اسلام کا پل ہے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یا یہ متقین کی صفت مادحہ ہوگی اور ان صفات کو بیان کر رہی ہے جن کو متقین اپنے ضمن میں کہے ہوئے ہیں اور غیب پر ایمان، نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ خاص کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام اعمال کی فضیلت ظاہر ہو جو تقویٰ کے معنی میں آتے ہیں۔

یا پھر یہ صفت ہے اپنے ما قبل کی لیکن یہ بطور مدح محل نصب میں ہے اور اس صورت میں اس سے پہلے آعینی فعل محذوف ہوگا۔ اور یہ آیت اس کا مفعول ہوگی یا ہم ضمیر اس سے پہلے مبتداء محذوف ہوگا جس کی وجہ سے یہ مرفوع ہے اور یہ اس کی خبر، دونوں صورتوں میں اصل عبارت یوں ہوگی۔

اعني الذین یومنون... الخ یا هم الذین یومنون... الخ

یا یہ اعراب میں اسکے تابع نہیں ہوگی اور اعراب میں متقین سے جدا ہوگی۔ اور یہ ایک علیحدہ جملہ ہوگا، اس صورت میں اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہوگا اور مرفوع ہوگا۔ اور الیک علی ہدیٰ اسکی خبر ہوگی۔ اس صورت میں متقین پر وقف تام ہوگا۔

متن:

وَالْإِيمَانُ فِي اللِّغَةِ عِبَارَةٌ عَنِ التَّصَدِيقِ مَا خُوذَ مِنَ الْإِمْنِ، كَأَنَّ الْبَصِطِقَ أَمِنَ الْبَصِطِقِ

من التکذیب والمغالفة، وتعديته بالباء لتضمنه معنى الاعتراف وقد يطلق بمعنى الوثوق من حيث إن الواثق بالشىء صار ذا أمن منه، ومنه ما أمنت أن أجد صحابة وكلا الوجهين حسن في يؤمنون بالغيب.

وأما في الشرع: فالتصديق بما علم بالضرورة أنه من دين محمد صلى الله عليه وسلم كالتوحيد والنبوة والبعث والجزاء، ومجموع ثلاثة أمور: اعتقاد الحق، والإقرار به، والعمل بمقتضاه عند جمهور المحدثين والمعتزلة والخوارج.

فمن أخل بالاعتقاد وحده فهو منافق، ومن أخل بالإقرار فكافر، ومن أخل بالعمل ففاسق وفاقاً، وكافر عند الخوارج وخارج عن الإيمان غير داخل في الكفر عند المعتزلة، والذي يدل على أنه التصديق وحده أنه سبحانه وتعالى أضاف الإيمان إلى القلب فقال: أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ، وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ، وَلَمْ يَلْمُ مِنْ قُلُوبِهِمْ، وَلَكِنَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ، وعطف عليه العمل الصالح في مواضع لا تحصى وقرنه بالمعاصي فقال تعالى: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ، الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ مَعِ مَا فِيهِ مِنْ قِلَّةٍ التَّغْيِيرِ فَإِنَّهُ أَقْرَبُ إِلَى الْإِصْلَاحِ وَهُوَ مُتَعَيِّنٌ الْإِرَادَةِ فِي الْآيَةِ، إِذِ الْمَعْدَى بِالْبَاءِ هُوَ التَّصَدِيقُ وَفَاقاً، ثُمَّ اخْتَلَفَ فِي أَنْ مَجْرَدُ التَّصَدِيقِ بِالْقَلْبِ هَلْ هُوَ كَافٍ لِأَنَّهُ الْمَقْصُودُ أَمْ لَا بَدَ مِنْ انْتِزَاعِ الْإِقْرَارِ بِهِ لِلْمَتَمَكِّنِ مِنْهُ، وَلَعَلَّ الْحَقُّ هُوَ الثَّانِي لِأَنَّهُ تَعَالَى ذَمُّ الْمَعَانِدِ أَكْثَرَ مِنْ ذَمِّ الْجَاهِلِ الْمَقْصُرِ، وَلِلْمَانَعِ أَنْ يَجْعَلَ الذَّمَّ لِلْإِنْكَارِ لَا لِعَدَمِ الْإِقْرَارِ لِلْمَتَمَكِّنِ مِنْهُ.

ترجمہ:

ایمان امن سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے تصدیق کرنا اور اس کا امن میں ہونا اور ایمان کا مطلب محفوظ کرنا ہے۔ امن میں کرنا ہے۔ گویا کہ تصدیق کرنے والا جس کی تصدیق کر رہا ہے، اس کو تکذیب اور مخالفت سے محفوظ کر رہا ہے۔ اور اس حرف جرب کے ساتھ متعدی ہونا اپنے ضمن میں اعتراف کا معنی لیے ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور کبھی اعتماد اور وثوق پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ اعتماد کرنے والا امن میں ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے

ما امنت ان اجد صحابۃ

کہ مجھے اعتماد نہیں کی اپنے ساتھیوں کو پالوں گا اور یہ دونوں معانی یومنون بالغیب میں جائز ہیں۔ یعنی اعتماد و اعتراف

مطلب وہ غیب کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی اعتماد کرتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ اور اصطلاح شرح میں اس کا معنی یہ ہے کہ ہر اس چیز کی تصدیق کرنا جس کا علم بالبداہت ہو جائے کہ یہ دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جیسا کہ تصدیق کرنا توحید، نبوت، قبروں سے اٹھنے اور سزا و جزا کے برحق ہونے کی۔ محدثین، معتزلہ اور خوارج کے نزدیک ایمان تین امور کے مجموعے کا نام ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

1- حق کا یقین کرنا

2- زبان سے اس کا اقرار کرنا

3- اور اس کے تقاضے کے مطابق عمل کرنا۔

اور وہ آدمی منافق ہے جو حق کے عقیدہ میں گڑبڑ کرے اور وہ آدمی کافر ہوگا جو زبان کے ساتھ اقرار نہیں کرے گا۔ اور فاسق وہ ہوگا جو تصدیق اور اقرار پر عمل نہ کرے۔ البتہ ایسا آدمی خوارج کے نزدیک کافر ہوگا۔ اور معتزلہ کے نزدیک ایمان سے خارج لیکن کافر نہیں کیونکہ محققین تصدیق قلبی کو ایمان کہتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں ایمان کی نسبت قلب کی طرف کی ہے۔ ان میں سے ایک آیت کا معنی ہے کہ اللہ کریم نے ان کے دلوں میں ایمان کو ثابت کر دیا۔

دوسری جگہ فرمایا، جس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو وہ، وہ مومن ہے۔

تیسری آیت کا مفہوم، منافق ہے وہ جس کا دل مومن نہیں۔

اور چوتھی آیت کا مفہوم ہے ایمان ابھی تک ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اور مزید یہ کہ متعدد مقامات پر عمل صالح کا ایمان پر عطف ڈالا ہے، اور کئی مقامات پر گنہگار کو بھی مومن کہا گیا ہے۔ مفہوم آیت، اگر دو گروہ مومنین آپس میں لڑ پڑیں۔ ایک اور مقام پر فرمایا، اے ایمان والو قتل میں تمہارے اوپر قصاص فرض ہے۔ مزید فرمایا، جو لوگ ایمان لائے اور ان کا ایمان ظلم کے ساتھ ملتبس نہیں ہوا۔

اور کبھی کبھی شرعی معنی مراد لینے کے لئے لغوی معنی میں تھوڑی سی تبدیلی کی جاتی ہے۔ کیونکہ ایمان بمعنی تصدیق کرنا حقیقی معنی کے زیادہ قریب ہے اور اس آیت میں ایمان کو ب کے ساتھ متعدی کر کے اس کی مراد متعین کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد قلب کی تصدیق ہی ہے جو کہ متفق معنی مراد ہے۔ مزید ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ کیا تصدیق قلبی نجات کے لئے کافی ہے کیونکہ یہی مقصود ہے، یا اس آدمی کے لئے جو تصدیق قلبی کے ساتھ اقرار کر سکتا ہے، اس کے لئے اقرار باللسان ضروری ہے۔ شاید یہ دوسرا معنی ہی برحق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے ایسے لوگوں کی جو حق جاننے کے باوجود اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ نسبت اس آدمی کے جو کہ جاہل ہے اور قاصر من الاقرار ہے، اور جو لوگ اس کے منکر ہیں ان کا کہنا ہے کہ سرکش کی مذمت کرنا اس کے انکار کی وجہ سے ہے نہ کہ عدم اقرار کی وجہ سے۔

متن:

والغیب مصدر، وصف به للمبالغة كالشهادة في قوله تعالى: عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
والعرب تسمى البطئ من الارض والخصبة التي تلى الكلية غيباً، أو فيعمل خفف
كقيل، والمراد به الخفي الذي لا يدركه الحس ولا تقتضيه بديهة العقل، وهو قسبان:
قسم لا دليل عليه وهو المعنى بقوله تعالى: وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يُعَلِّمُهَا إِلَّا هُوَ
وقسم نصب موقع عليه دليل: كالصانع وصفاته واليوم الآخر وأحواله وهو المراد به
في هذه الآية، هذا إذا جعلته صلة للإيمان وأوقعته موقع المفعول به، وإن جعلته حالاً
على تقدير ملتبس بالغيب كان بمعنى الغيبة والخفاء، والمعنى أنهم يؤمنون غائبين
عنكم لا كالمنافقين الذين إذا لقوا الذين آمنوا قالوا آمناً، وإذا خلوا إلى شياطينهم
قالوا إنا معكم إثمًا نحن مُسْتَهْزِؤُونَ. أو عن المؤمن به لما روى أن ابن مسعود رضي الله
تعالى عنه قال: والذي لا إله غيره ما آمن أحد أفضل من إيمان بغيب، ثم قرأ هذه
الآية.

وقيل المراد بالغيب: القلب لأنه مستور، والمعنى يؤمنون بقلوبهم لا كمن يَقُولُونَ
بأفواههم مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ. فالباء على الاول للتعدي. وعلى الثاني للمصاحبة. وعلى
الثالث للآلة.

ترجمہ:

اور غیب مصدر ہے اور اس کے ساتھ صفت مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ:

عَلَّمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

میں شہادت اسم فاعل، صفت کے معنی میں ہے۔ اہل عرب پست زمین اور اس کے سوراخ، جو گردے کا پاس ہوتا ہے
اس کو غیب کہتے ہیں یا یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے بروزن فعیل کہ اصل میں غیب تھا اور ایک یا کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا
ہے جس طرح قبیل اصل میں قبیل تھا اس میں بھی ایک یا کو تخفیفاً حذف کیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ مخفی چیز ہے جس کا
ادراک نہ تو حواس سے ہو سکتا ہے اور نہ ہی بداہت عقل اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اور غیب کی دو قسمیں ہیں

☆ پہلی قسم

وہ غیب جس کی کوئی بھی دلیل نہیں، اور اللہ کریم کے فرمان سے یہی مراد ہے

عدده مفاع الغيب لا يعلمها الا هو
یعنی غیب کی چاہاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا۔

☆ دوسری قسم

وہ غیب جس کا ثبوت عقلی یا نقلی دلیل پر ہو جیسے صانع، عالم اور اس کی صفات، یوم آخرت اور اس کے احوال ان سب پر دلائل قائم ہیں اور اس آیت سے یہی مراد ہیں اور یہ معنی اس وقت ہوگا جب ہا کو یومنون کا صلہ بنایا جائے گا اور اسے مفہول بہ کے قائم مقام رکھا جائے اور اگر ہا کو ملتسبین بالغیب کے معنی میں کر کے حال بنایا جائے تو غیب سے مراد خفا اور غیبیہ ہوگا تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں وہ اس حال میں ہیں کہ وہ تم سے غائب ہیں۔ وہ ان منافقوں کی طرح نہیں جو ایمان والوں سے ملتے ہیں تو ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور جب شیاطین جیسے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں یا وہ مومن بہ یعنی حضور نبی کریم ﷺ سے غیب ہونے کے باوجود آپ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اس صورت حال میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو صحابہ کرام کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا،

قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس شخص کے ایمان سے کسی کا ایمان افضل نہیں جو حضور ﷺ کے غیب ہونے کے باوجود ایمان لایا پھر یہ آیت تلاوت کی۔

الذین یؤمنون بالغیب۔

اور بعض نے کہا کہ غیب سے مراد دل ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے دلوں کے ساتھ تصدیق کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں کی طرح اپنی زبان سے ایسی بات کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی۔ از روئے معنی اول باتعدیہ کے لئے ہوگی اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مصاحبت اور استعانت کے لئے اور تیسرے معنی کے اعتبار سے آلہ کے لئے ہے۔

متن:

وَيُلْقِيُونَ الصَّلَاةَ أَي يَحْدِلُونَ أُرْكَانَهَا وَيَحْفَظُونَهَا مِنْ أَنْ يَقَعَ زَيْغٌ فِي أَعْمَالِهَا، مِنْ أَقَامِ الْعُودِ إِذَا قَوْمُهُ أَوْ يُواظِبُونَ عَلَيْهَا، مِنْ قَامَتِ السُّوقُ إِذَا نَفَقَتْ وَأَقْرَبَهَا إِذَا جَعَلَهَا نَافِقَةً
قال:

أَقَامَتْ غَزَالَةَ سُوقِ الصُّرَابِ... لِأَهْلِ الْعَرَاقِ مِنْ حَوْلِ قَرْيَتَا

فِيهِ إِذَا حَافِظٌ عَلَيْهَا كَانَتْ كَالنَّافِقِ الَّذِي يَرِغِبُ فِيهِ، وَإِذَا ضَيَعَتْ كَانَتْ كَالكَاسِدِ الْمَرْغُوبِ عَنْهُ، أَوْ يَتَشَبَّهُونَ لِأَدَائِهَا مِنْ غَيْرِ فَتُورٍ وَلَا تَوَانٍ، مِنْ قَوْلِهِمْ قَامَ بِالْأَمْرِ وَأَقَامَهُ إِذَا جَدَّ فِيهِ وَتَجَلَّدَ، وَضَدَهُ قَعْدَ عَنِ الْأَمْرِ، وَتَقَاعَدَ، أَوْ يُؤَدُّونَهَا، عِبْرٌ عَنِ الْإِدَاءِ

بالإقامة لاشتغالها على القيام، كما عبر عنها بالقنوت والركوع والسجود والتسبيح، والاول أظهر لأنه أشهر وإلى الحقيقة أقرب، وأفيد لتضيقه العنبيه على أن الحقيقي بالمدح من راعي حدودها الظاهرة من الفرائض والسنن، وحقوقها الباطنة من الخشوع والإقبال بقلبه على الله تعالى، لا البصلون الذين هُم عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، ولذلك ذكر في سياق المدح والبعثين الصلاة، وفي معرض الذم فويل للبصلين، والصلاة فعلة من صلى إذا دعا كالزكاة من زكى، كتبتا بالواو على لفظ المفعم، وإنما سمي الفعل المخصوص بها لاشتغاله على الدعاء.

وقيل: أصل صلى حرك الصلويين لأن البصلى يفعل في ركوعه وسجوده، واشتهار هذا اللفظ في المعنى الثاني مع عدم اشتهاره في الاول لا يقدر في نقله عنه، وإنما سمي الداعي مصلياً تشبيهاً له في تخشعه بالراكع الساجد.

ترجمہ:

اور وہ نماز کو ارکان کے ساتھ بالکل ٹھیک طریقے اور اطمینان سے ادا کرتے ہیں۔ اور اس کے افعال کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، اور مشتق ہوگا اقام العود اذا قومہ سے، اور اس کا معنی ہوگا کہ اس نے لکڑی کو سیدھا کیا جب وہ اس کے ٹیڑھے پن کو دور کر کے اس کو سیدھا کر دے۔ یا یقیمون بمعنی یواظبون علیہا ہے، اس صورت میں اس کا معنی اقامت السوق سے مشتق ہوگا جس کا مطلب ہے رونق والا بازار۔ واقمتها جب کہ تو اس کو بارونق بنا دے یعنی جب بازار میں سودا سلف ہو تو اس میں بیچ وشرابھی ہوگی اور اسی طرح نماز پر بھی مواظبت اختیار کی جائے تو اس میں رغبت کی جاتی ہے۔ اور جب نماز کو ضائع کیا جائے گا تو وہ بے رونق بازار کی طرح ہو جائے گی اور لوگ اس کی طرف رغبت نہیں کریں گے۔ ایمن ابن حزم انصاری ایک شاعر کا قول ہے،

أقامت غزاله سوق الطراب لأهل العراقين حولاً قبيطاً

بصرہ اور کوفہ والوں کے لئے غزالہ نے پورا سال بازار جنگ گرم کئے رکھا۔ یقیمون یتشمرون لادانہا کے معنی میں ہوگا تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ نماز، بغیر سستی وکامپی کے ادا ہو۔ اور یہ قام بالامر و اقامہ سے مشتق ہوگا، یہ عربوں کا قول ہے جس کا معنی ہے کہ کسی کام کو پوری کوشش و قوت کے ساتھ کیا جائے اور اس کی ضد قعد عن الامر و تقاعد ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ کسی امر سے سست ہو کر بیٹھ گیا، یا یہ یود و نہا کے معنی میں ہوگا یعنی وہ لوگ نماز ادا کرتے ہیں چونکہ نماز قیام پر مشتمل ہوتی ہے اس وجہ سے اس اقامت الصلوٰۃ کے ساتھ تعبیر کیا گیا جس طرح کئی دوسری جگہوں پر نماز کو قوت، رکوع، سجدہ اور تسبیح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

والاول أظهر لأنه أشهر

اور پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے یعنی بعد لون ارکانہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حقیقی اور مشہور معنی کے زیادہ قریب ہے اور دوسرے معانی کے مقابلہ میں زیادہ مفید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ضمن میں اس بات کو بطور تشبیہ لئے ہوئے ہے کہ درحقیقت مدح کے لائق وہی شخص ہے جو اس نماز کو ظاہری حدود یعنی سنتوں اور فرائض کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اللہ کریم عزوجل کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ پیش آتا ہے نہ کہ وہ نمازی جو اپنی نماز سے غافل ہے۔ اسی لئے جہاں نمازیوں کی تعریف کرنا مقصود ہو، وہاں والمقیمین الصلوٰۃ لایاجاتاہے، اور فویل للمصلین اس مقام پر لایا جاتا ہے جہاں جہاں نمازی کی مذمت بیان کرنا مقصود ہو۔

اور لفظ صلوٰۃ فعلتہ کے وزن پر ہے یہ مشتق ہے صلی سے جس کا معنی ہے دعا کرنا جس طرح زکوٰۃ کا معنی پاک کرنا ہے۔ اور یہ بنا ہے زکاء سے اور ان دونوں کو واو کے ساتھ لکھا گیا ہے یعنی اس کا الف اس طرح لکھا گیا ہے جس طرح واو سے بدلا ہوا الف لکھا جاتا ہے کیونکہ ان کا مادہ اشتقاق یائی ہے، اس میں تغخیم ہونے کی وجہ سے، تغخیم کا مطلب یہ ہے کہ صلوٰۃ کے فتح لام کو اور زکوٰۃ کے فتح کاف کو مائل بضمہ پڑھا جائے۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب فتح کے بعد ایسا الف آئے جو واو سے بدلا ہوا ہو اور دعا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مخصوص ارکان کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ صلی کا لغوی معنی سرین کو حرکت دینا ہے۔ اسی لئے نمازی دوران رکوع و سجود سرین کو حرکت دیتا ہے۔ اور صلوٰۃ کا ارکان صلوٰۃ کے معنی میں مشہور ہونا اور حرک الصلوین میں مشہور نہ ہونا یہ اس کے منقول ہونے میں باعث عیب نہیں اور مصلی، دعا کرنے والے کو اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ خشوع و خضوع میں رکوع اور سجدہ کرنے والے کے مشابہ ہوتا ہے۔

متن:

وَمَا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ

الرزق في اللغة: الحظ قال تعالى: وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْكُمْ تُكذِّبُونَ. والعرف خصه بتخصيص الشيء بالحيوان للانتفاع به وتمكينه منه.

وأما المعتزلة لما استحالوا على الله تعالى أن يمكن من الحرام لأنه منع من الانتفاع به وأمر بالزجر عنه، قالوا: الحرام ليس برزق، ألا ترى أنه تعالى أسند الرزق ما هنا إلى نفسه إيداناً بأنهم ينفقون الحلال المطلق.

فإن إنفاق الحرام لا يوجب المدح، وذم المشرکین علی تحریم بعض ما رزقهم الله تعالى بقوله: قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَاماً وَحَلَالاً .

ترجمہ:

اور جو ہم نے انہیں رزق دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

رزق کا لغوی معنی ہے حصہ۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْكُمْ تُكذِّبُونَ.

اور تم اپنا حصہ بناتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو، اور عرف نے کسی چیز کو حیوان کے ساتھ خاص کر دینے اور اس سے منفعت کی طاقت دینے کے ساتھ اس کو خاص کر دیا ہے اور جب معتزلہ نے اس کو ناممکن سمجھا کہ اللہ کریم کسی کو حرام پر قدرت دے کیونکہ اس نے اس سے فائدہ حاصل کرنے سے روک دیا ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ تو کہنے لگے کہ حرام اصل میں رزق ہی نہیں۔ توجہ طلب امر ہے کہ یہاں اللہ کریم نے رزق کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اس بات کو عام کرنے کے لئے کہ متقی وہ ہیں جو حلال مال خرچ کرتے ہیں کیونکہ حرام خرچ کرنے پر تعریف نہیں کی جاتی اور اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی مذمت اس لئے کی کہ جو رزق اللہ نے ان پر حلال کیا تھا، انہوں نے اپنے آپ پر حرام کر لیا۔ ارشاد باری تعالیٰ

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَاماً وَحَلَالاً

آپ فرمائیے کہ کیا تم نے خیال نہیں کیا کہ جو چیز اللہ کریم نے اپنے رزق سے تمہیں عطا کی تھی، اس میں تم نے حلال اور

حرام بنا دیا۔

متن:

وأصحابنا جعلوا الإسناد للتعظيم والتحريض على الإنفاق، والذم لتحريم ما لم

يحرّم. واختصاص ما رزقناهم بالحلال للقرينة. وتمسكوا الشمول الرزق له

بقوله صلى الله عليه وسلم في حديث عمرو بن قرّة:

لقد رزقك الله طيباً فاخترت ما حرم الله عليك من رزقه مكان ما أحلّ الله لك من

حلاله

وبأنه لو لم يكن رزقاً لم يكن المتغذى به طول عمرة مرزوقاً، وليس كذلك لقوله

تعالى:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا.

ترجمہ:

ہمارے اصحاب (اشاعرہ) کا قول ہے کہ اللہ کریم کی عظمت کو ظاہر کرنے اور خرچ پر ابھارنے کے لئے رزق کی نسبت

اس کی طرف کی گئی ہے۔ اور حلال چیزوں کو اپنے آپ پر حرام کرنے کی مذمت کے لئے کہ حلال کو حرام کر دیا۔ لہذا اس مقام پر

ما رزقنہم میں رزق کو حلال کے ساتھ خاص کرنے قرینہ کی وجہ سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آیت سیاق مدح میں ذکر کی گئی ہے اور اشاعرہ نے اپنے اس قول کہ رزق حرام بھی رزق ہی ہے، کو ثابت کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کے مندرجہ ذیل فرمان کو اپنی دلیل بنایا ہے۔

بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث عمرو بن قرۃ: "لقد رزقك الله طيباً فاخترت ما حرم الله عليك من رزقه مكان ما أحل الله لك من حلاله"

عمر بن قرہ دف لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میری بدبختی غالب آگئی ہے، اللہ کریم نے میرا رزق دف بجانے میں رکھا ہے لہذا مجھے اس کی اجازت دیجئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے حلال رزق عطا کیا تھا مگر تو نے حلال کو چھوڑ کر حرام کو اختیار کیا ہے، جو کہ تجھ پر حرام تھا۔ اور یہاں پر اہلسنت نے یہ استدلال کیا ہے کہ ایسا آدمی جس نے پوری زندگی رزق حرام کھایا، کیا وہ مرزوق نہیں حالانکہ ایسا نہیں، بوجہ فرمان باری تعالیٰ کے،

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا.

زمیں پر چلنے والی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے مگر اس کا رزق اللہ پر ہے۔

لہذا معلوم ہوا کہ ہر ذی روح چیز مرزوق ہے۔

متن:

وأنفق الشيء وأنفد أخوان، ولو استقرت الالفاظ وجدت كل ما فإوة نون وعينه فاء دالاً على معنى الذهاب والخروج والظاهر من هذا الإنفاق صرف المال في سبيل الخير من الفرض والنفل. ومن فسر بالزكاة ذكر أفضل أنواعه والاصل فيه، أو خصه بها لاقتترانه بما هو شقيقها. وتقديم المفعول للاهتمام به وللحفاظة على رؤوس الآي، وإدخال من التبعيضية عليه لمنع المكلف عن الإسراف المنهي عنه. ويحتمل أن يراد به الإنفاق من جميع المعاون التي أتاهم الله من النعم الظاهرة والباطنة، ويؤيده

قوله عليه الصلاة والسلام: «إن عِلماً لا يُقال به، ككثرة لا يُنفق منه»
وإليه ذهب من قال: ومما خصصناهم به من أنوار المعرفة يفيضون.

ترجمہ

انفق اور انفذ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں اگر آپ تمام الفاظ میں استقراء کر لیں تو آپ ہر اس لفظ کو جس کا ف اور ح کلمہ موافق پائیں گے اس کی دلالت ذہاب اور خروج کے معنی میں ہوگی۔

یہاں ظاہری طور پر مَارَزَقْنَهُم اللہ سے مراد مال کو اچھائی کے کاموں پر خرچ کرنا ہے۔ خواہ وہ کار خیر فرض سے یا نفل سے تعلق رکھتا ہو۔ اور جس نے مَارَزَقْنَهُم اللہ سے صرف زکوٰۃ مراد لی اس نے بھی نیکی کی اعلیٰ قسم مراد لی ہے۔ یا پھر اس نے اس لئے مراد لیا ہے کہ اس کے ساتھ متصل ہے جو زکوٰۃ کی جڑواں یعنی نماز کے ساتھ متصل ہے۔

یہاں اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے مفعول بہ کو مقدم کیا گیا ہے اور آیات کے سروں کی حفاظت کے لئے ہے۔ اور مَارَزَقْنَهُم سے پہلے جو من ہے وہ تبعیض کے لئے ہے جس کا معنی فضول خرچی سے روکنا ہے۔ جو منہی عنہ ہے اور یہ اس کا بھی احتمال رکھتی ہے کہ اس سے مراد تمام عطیات کا خرچ کرنا ہے جو اللہ کریم نے ان کو ظاہری اور باطنی نعمتوں سے عطا فرمائی ہیں اور اس کی تائید نبی کریم ﷺ کا یہ قول بھی کر رہا ہے کہ علم کے بارے میں ایسا نہ کہا جائے کہ یہ ایسا خزانہ ہے جو خرچ نہیں کیا جاسکتا اور یہی معنی اس شخص نے بھی مراد لیا ہے جو آیت کی تفسیر،

وَمَا خَصَّنَاهُمْ بِهِ مِنْ أُنْوَارِ الْمَعْرِفَةِ فِيضُونَ.

کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی ہم نے جو انوار اپنے بندوں کو عطا کئے ہیں وہ ان کو دوسرے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

ایمان کی تعریف:

(ام ن) الايمان (Religion)

کے ایک معنی شریعت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالطَّيِّبِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ"

بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر

ایمان لائیں۔ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 62)

یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے۔

اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہو سکتا ہے جو توحید کا اقرار کر کے شریعت محمدی ﷺ میں داخل ہو جائے اور بعض

نے آیت،

"وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 106)

اور ان میں اکثر وہ ہیں کہ اللہ پر یقین نہیں لاتے مگر شرک کرتے ہوئے۔

کو بھی اسی معنی پر محمول کیا۔

لفظ غیب کا معنی:

(غی ب) الغیب (ض) (Invisible)

غابت الشمس وغیرہا کا مصدر ہے جس کے معنی کسی چیز کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے،

غاب عنی کذا فلاں چیز میری نگاہ سے اوجھل ہوئی۔ قرآن مجید میں ہے:

أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ (سورۃ النمل آیت نمبر 20)

یا وہ واقعی حاضر نہیں۔

اور ہر وہ چیز جو انسان کے علم اور جو اس سے پوشیدہ ہو اس پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے۔

تحقیق اقامت:

الاقامته (افعال) فی المكان

اقامۃ کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اقامتہ الشیئی (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ (سورۃ المائدہ آیت نمبر 68)

تم فرما دو اے کتابوں کے لوگو! تم کچھ بھی نہیں ہو جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل۔

یعنی جب تک کہ علم و عمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا:

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ (سورۃ المائدہ آیت نمبر 66)

اور اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ وہاں اقامتہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیبت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اقیمو الصلوٰۃ اور المتقین الصلوٰۃ کہا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالًا (سورۃ النساء آیت نمبر 142)

اور جب نماز کو کھڑے ہوں تو ہارے جی سے۔

میں قاموا اقامتہ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت:

"رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 40)

اے میرے رب مجھے نماز کا قائم کرنے والا رکھ۔

میں دعا ہے کہ الہی مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور آیت کریمہ:

"فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 11)

پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم رکھیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامتہ سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے

کے ہیں۔

المقام:

یہ مصدر میسی، ظرف، مکان ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر میسی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا" (سورة الفرقان آیت نمبر 66)

اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مقامتہ (بضم الیم) معنی اقامتہ ہے جیسے فرمایا:

"الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ" (سورة فاطر آیت نمبر 35)

وہ جس نے ہمیں آرام کی جگہ اتارا اپنے فضل سے۔

یہاں جنت کو دار المقامتہ کہا ہے جس طرح کہ اسے دار الخلد اور جنات عدن کہا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"لَا مَقَامَ لَكُمْ فَارِجُوعًا" (سورة فاطر آیت نمبر 35)

یہاں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔

میں مقام کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور ایک قرأت میں مقام (بضم الیم) اقام سے ہے اور کبھی

اقامتہ سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"عَذَابٌ مُّقِيمٌ" (سورة قہود آیت نمبر 39)

وہ عذاب جو ہمیشہ رہے۔

اور ایک قرأت میں آیت کریمہ: "إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ" (سورة الدخان آیت نمبر 51)

پیشک ڈروالے امان کی جگہ میں ہیں۔

مقام بضم الیم ہے۔ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ تقویم الشی کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔

چنانچہ فرمایا:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" (سورة التین آیت نمبر 4)

بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا۔

اس میں انسان کے عقل و فہم قدر و قامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے

حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

صلوٰۃ کے معانی:

(صلی الصلن) (س) (Prayers offered by the MUHAMMADANS)

کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں صلی بالنار اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا صلی بکذا سے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صلیت الشاة میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مصلیة کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

إِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (سورۃ قیس آیت نمبر 64)
آج اس میں جاؤ بدلہ اپنے کفر کا۔

الصلوٰۃ:

بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ صلاۃ کے معنی دعا دینے۔ تحسین و تبریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے صلیت علیہ میں نے اسے دعا دی نشوونما دی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے کہ

إِذَا دَعِيَ أَحَدٌ كَمَا إِلَى طَعَامٍ فَلْيَجِبْ، وَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ أَيْ: لِيَدْعَ لِأَهْلِهِ،
جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کر لے اگر روزہ دار ہے تو وہ انکے لئے دعا کر کے واپس چلا آئے، اور قرآن مجید میں ہے،

"وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ" (سورۃ قیس آیت نمبر 64)

اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صلاۃ کے معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 56)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتاتے والے۔

اور الصلوٰۃ جو کہ ایک عبادت مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے اسے صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تسمیۃ الشنی باسم الجزء کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے ضمنی مفہوم کے نام سے موسوم کرنا اور صلاۃ (نماز) ان عبادت سے ہے جن کا وجود شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 103)

بے شک نماز مسلمانوں پر وقت باندھا ہوا فرض ہے۔

رزق کی تعریف:

(رزق) الرزق

وہ عطیہ جو جاری ہو خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور رزق بمعنی نصیبہ بھی آجاتا ہے۔ اور کبھی اس چیز کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بنتی ہے، کہا جاتا ہے،

اعطى السلطان رزق الجنود بادشاہ نے فوج کو راشن دیا۔ رزقت علما، مجھے علم عطا ہوا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَّ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (سورة المنافقون آیت نمبر 10)

اور ہمارے دیئے میں سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں کسی کو موت آئے۔

انفاق کے معانی:

(ن ف ق) نفق (ن) (Spend or Expend)

نفق الشنی کے معنی کسی چیز کے ختم ہونے یا چلے جانے کے ہیں۔ اور چلے جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

(1) خوب فروخت ہونے سے جیسے نفق البیع (سامان کا) خوب فروخت ہونا اسی سے نفاق الایتمیم ہے جس کے معنی

بیوہ عورت سے نکاح کے طلب گاروں کا بکثرت ہونا کے ہیں۔ نفق القوم بازار کا پر رونق ہونا۔

(2) بذیوہ مر جانے کے جیسے نفقت الدابة نفوقا جانور کا مر جانا۔

(3) بذریعہ فنا ہو جانے کے جیسے نفقت الدراہم دراہم خرچ ہو گئے، انفق تھا ان کو خرچ کر دیا۔ الانفاق کے معنی مال

وغیرہ صرف کرنا کے ہیں اور یہ کبھی واجب ہوتا ہے۔ اور کبھی مستحب اور مال اور غیر مال یعنی علم وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے

جیسے فرمایا۔

"وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ" (سورة البقرة آیت نمبر 195)

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

"وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ" (سورة البقرة آیت نمبر 254)

اللہ کی راہ میں ہمارے دیئے میں سے خرچ کرو۔

[سورة البقرة (2): آية 4]

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (4)

ترجمہ:

"اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا، اور آخرت پر یقین رکھیں۔"

متن:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

ہم مؤمنوا اہل کتاب کعبدا اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ وأضرابه معطوفون علی الذین یؤمنون بالغیب، داخلون معهم فی جملة المتقین دخول اخصین تحت اعم، إذ المراد بأولئك الذین آمنوا عن شرک وانکار، وبہؤلاء مقابلوہم فكانت الایتان تفصیلاً للمتقین، وهو قول ابن عباس رضی اللہ عنہما، أو علی المتقین وكأنہ قال ہدی للمتقین عن الشرک، والذین آمنوا من اہل الملل، ویحتمل أن یراد بہم الاولون بأعیانہم، ووُسط العاطف کما وسط فی قولہ:

إلى الملك القرم وابن الهمام... وليت الكتابية في المزدحم

وقوله:

يا لهف ذؤابة للحارث الص... أخ فالغانم فالآئب

علی معنی انہم الجامعون بین الإیمان بما یدرکہ العقل جملة والإیتان بما یصدقہ من العبادات البدنیة والمالیة و بین الإیمان بما لا طریق إلیہ عبر السمع، و کور الموصول تنبیہاً علی تغایر القبیلین وتباین السبیلین، أو طائفة منهم وهم مؤمنوا اہل کتاب، ذکرہم مخصصین عن الجملة کذا کر جبریل ومیکائیل بعد الملائكة تعظیماً لشأنہم وترغیباً لأمثالہم.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور اس آیت کا عطف،

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ

پر ہوگا اور اس آیت میں مذکور گروہ متقین اسی طرح داخل ہوئے جیسے ایک اعم کے تحت دو اخص داخل ہوتے ہیں۔ جس طرح حیوان کے تحت انسان اور فرس داخل ہوتے ہیں الذین یؤمنون بالغیب سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو شک اور انکار کو ترک کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور

الذین یؤمنون بما انزل الیک... الی آخره

سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے اہل کتاب تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کے قول کے مطابق یہ دونوں آیتیں متقین کی تفصیل بیان کر رہی ہیں۔ یا اس آیت کا عطف متقین پر ہے یعنی اس کے ماتحت ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کریم کا قول ہے کہ قرآن ان لوگوں کے لئے بھی ہدایت ہے پہلے مشرک تھے، بعد میں مسلمان ہوئے۔ اور ان اہل کتاب کے لئے بھی ذریعہ ہدایت ہے جو پہلے کتابی تھے اور بعد میں مشرف باسلام ہوئے۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کے مابعد آیت سے بھی وہی لوگ مراد ہوں جو

الذین یؤمنون بالغیب

سے مراد ہیں۔ تو اس صورت میں ان کے درمیان حرف عاطفہ تغایر بالصفات کے لئے ہوگا جیسا کہ اشعار میں ایک صفت کا عطف دوسری صفت پر ہے تو گویا ان کے درمیان حرف عطف تغایر بالصفات کے لئے ہے نہ کہ تغایر بالذات کے لئے یعنی الذین یؤمنون بالغیب سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل عرب سے شرک چھوڑ کر ایمان لائے اور دوسری آیت،

الذین یؤمنون بما أنزل الیک

سے وہ لوگ مراد ہیں جو اہل کتاب میں سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور عربوں میں ایسا عطف جائز ہے۔ قول

شاعر،

إلی الملک القرم وابن الہمام ...

ولینب الکتیبۃ فی المزدحم ...

اس بادشاہ کی طرف جو بہادر ہے اور سردار ہے اور میدان میں شیر ہے اپنے لشکر کا۔

یہاں حرف واد الملک القرم وابن الہمام اور لیث الکتیبۃ صفت کے درمیان تغایر ظاہر کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے۔

دوسرا شعر،

یا لہف ذؤابۃ للحارث الص ... أتح فالغانم فالآئب

اے میری ماں زیاہ کی حسرت حارث کی لوٹ مار کی وجہ سے ہے جو صبح سویرے حملہ آور ہوا پس مال غنیمت لوٹا پھر صبح سلامت واپس چلا گیا۔

تو آیت سے مراد یہ ہوگا کہ بے شک وہ اس ایمان کو بھی جمع کرنے والے ہیں جس کا ادراک عقل اجمالاً کرتی ہے۔ اور وہ

ان اشیاء کو عملی جامہ پہناتی ہے جن کی وہ تصدیق کرتے ہیں جن کا ادراک سوائے عقلی اور سمعی دلیل کے، اور کوئی طریقہ نہیں۔

دونوں آیات میں اسم موصول کو مکرر ذکر کرنے کی وجہ یہ کہ تشبیہ ہو جائے کہ ایمان کی ان دو قسموں کے راستے علیحدہ علیحدہ

ہیں۔ قسم اول میں ایمان سے مراد عقل کے ادراک سے ایمان لانا ہے۔ اور قسم دوم میں منقول دلیل سے ایمان لانا ہے یا،

الذین یؤمنون بما أنزل الیک

سے مراد ایمان بالغیب لانے والوں میں سے ایک گروہ ہوگا جو اہل کتاب ہیں اور ان کی شان و شوکت اور عظمت ظاہر کرنے اور ان کے ہم جنسوں کو ایمان لانے کی ترغیب دینے کے لئے الگ الگ ذکر فرمایا جیسا کہ ملائکہ کے بعد جبریل امین اور میکائیل کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔

متن:

والإنزال نقل الشيء من الأعلى إلى الأسفل وهو إنما يلحق المعاني بتوسط حوقه النوات الحاملة لها، ولعل نزول الكتب الإلهية على الرسل بأن يلتقفه للملك من الله تعالى تلقفاً روحانياً، أو يحفظه من اللوح المحفوظ فينزل به فيبلغه إلى الرسول، والمراد بما أنزل إليك القرآن بأسره والشريعة عن آخرها، وإنما عبر عنه بلفظ الماضي وإن كان بعضه مترقياً تغليباً للموجود على ما لم يوجد، أو تنزيلاً للمنتظر منزلة الواقع، ونظيره قوله تعالى: إِنَّا سَمِعْنَا كِتَاباً أَنْزَلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ فَإِن الْجَنِّ لَم يَسْمَعُوا جَمِيعَهُ وَلَمْ يَكُنِ الْكِتَابُ كُلَّهُ مُنزَلاً حِينئذٍ. وبما أنزل من قبلك التوراة والإنجيل وسائر الكتب السابقة، والإيمان بها جملة فرض عين، وبالأول دون الثاني تفصيلاً من حيث إنا متعبدون بتفاصيله فرض، ولكن على الكفاية. لأن وجوبه على كل أحد يوجب المحرج وفساد المعاش.

ترجمہ:

سوال مقدر اور اس کا جواب:

انزال کا مطلب کس چیز کو نیچے یا اوپر کی طرف حرکت دینا یا منتقل کرنا ہے۔ (اوپر اور نیچے کی طرف وہی چیز منتقل ہوتی ہے جس کا جسم ہو کیونکہ معانی اور صفات منتقل نہیں ہوتے اور اللہ کریم کا کلام جسم نہیں بلکہ معانی ہیں انہیں انتقال کیسے لاحق ہوگا) ان معانی کو یہ انتقال اور حرکت ان ذاتوں کے واسطے سے لاحق ہوگا جو ان معانی کو اٹھانے والے ہیں اور شاید کہ اللہ کی کتابوں کا نزول نبیوں پر اس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ روحانی طور پر فوراً ان معانی کو حاصل کر لیتا ہو۔ یا انہیں لوح محفوظ سے یاد کر لیتا ہو پھر اسے لے کر نازل ہو اور رسولوں تک پہنچاتا ہو اور،

بما أنزل إليك

سے مراد پورا قرآن ایسی ساری شریعت مطہرہ مراد ہے۔ اور اس کو فعل ماضی مجہول کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ (اس آیت کے نزول کے وقت) پورا قرآن اور ساری شریعت نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے نزول کا انتظار تھا تو جس کے نزول کا انتظار تھا چونکہ اس کا نزول یقینی امر تھا اس لئے جو نازل ہو چکا تھا اسی کو نازل ہونے والے کلام کے قائم مقام رکھ دیا گیا اور جو

موجود تھا اسی کو جس کے نزول کا انتظار تھا، اس پر غلبہ دے دیا گیا۔

اور اللہ کریم کا وہ قول مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس میں جنوں کے قرآن پاک سننے کا ذکر ہے کہ جنوں نے کہا کہ ہم نے وہ کلام سنا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی یہ جنوں نے اپنی قوم کو تب بتایا جب وہ اپنی قوم میں واپس گئے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو وادی تہامہ میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے۔ اس وقت جنوں نے سارا قرآن نہیں سنا بلکہ کچھ حصہ سنا تھا اور اس بعض سنے ہوئے کو سارے قرآن کے قاسم مقام کر دیا۔ اور بے انزال الیک سے مراد پہلی تمام نازل شدہ کتابیں ہیں جیسا کہ تورات، زبور، انجیل اور قرآن پاک۔ ان میں سابقہ نازل شدہ پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے جب کہ قرآن پاک تفصیلی ایمان لانا اور اس کے احکامات عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ہم اس کے مکلف ہیں اور اس کی تخصیلات کا علم حاصل کرنا امت کے ہر فرد پر لازم نہیں اگر ایسا ہو تو حرج عظیم لازم آئے گا جس سے معاشیات میں خرابی بنتی ہے۔

متن:

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ

اور آخرت پر یقین رکھیں،،

أى يوقنون إيقاناً زال معه ما كانوا عليه من أن الجنة لا يدخلها إلا من كان هوداً أو نصارى، وأن النار لن تمسهم إلا أياماً معدودةً واختلافهم في نعيم الجنة: أهو من جنس نعيم الدنيا أو غيره؛ وفي دوامه وانقطاعه، وفي تقديم الصلاة وبناء يوقنون على هم تعريض لمن عداهم من أهل الكتاب، وبأن اعتقادهم في أمر الآخرة غير مطابق ولا صادر عن إيقان، واليقين: إتقان العلم بنفى الشك والشبهة عنه نظراً واستدلالاً، ولذلك لا يوصف به علم الباطن ولا العلوم الضرورية. والآخرة تأنيث الآخر، صفة الدار بدليل قوله تعالى: تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ فغلبت كالدنيا، وعن نافع أنه خففها بحذف الهمزة إلقاء حر كها على اللام، وقرأ «يوقنون» بقلب الواو همزة لضم ما قبلها إجراء لها مجرى المضمومة في وجوه ووقتت ونظيرة:

لحِبِّ الْمُؤَدِّانِ إِلَى مُوسَى... وَجَعْدَةً إِذْ أَضَاءَ هُمَا الْوَقُودُ

ترجمہ:

مندرجہ بالا آیات مقدرہ میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا آخرت پر اتنا پختہ ایمان ہے کہ اس کے ساتھ تمام باطل عقائد ختم ہو جاتے ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں کے تھے، مثلاً جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جائیں گے۔ اور اگر جہنم میں گئے بھی تو صرف چند دنوں کے لئے جائیں گے اور ان کا جنت کی نعمتوں کے بارے میں بھی اختلاف تھا کہ وہ دنیاوی نعمتوں کی

مثل ہوں گی یا ان سے مختلف، ابدی ہوں گی یا عارضی۔ اس مقام پر یوقنون جو کہ بالآخر کا صلہ ہے، یوقنون پر اس لئے مقدم کیا گیا ہے کہ تعریفیاضیہ ثابت کیا جائے کہ جو ان مذکورہ بالا کے علاوہ اہل کتاب ہیں وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کا آخرت کے معاملہ میں اعتقاد کا دعویٰ کرنا واقع کے مطابق نہیں اور یقین سے بھی صادر نہیں ہے۔

یقین سے مشتق ہے یوقنون، اس کا معنی شک و شبہ کی لٹی کرتے ہوئے، نظر و فکر اور استدلال کے ساتھ علم کو مضبوط کرنا ہے۔ چونکہ یہ علم نظر و فکر سے حاصل ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے علم کو متصف بہ یقین نہیں کیا جاتا اور نہ ہی علوم بدیہیہ اور ضروریہ کی صفت یقین کے ساتھ لائی جاتی ہے۔

اور آخرۃ اسم فاعل، واحد مونث کا صیغہ ہے اور صفت ہے دار کی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں مذکور ہے،

تلك الدار الآخرة

یہاں الدار موصوف اور الآخرة صفت ہے۔ لیکن بہت زیادہ استعمال کی وجہ سے عالم برزخ کے علم کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور دنیا کا لفظ زیادہ استعمال کی وجہ سے دار فانی کا علم بن گیا ہے حالانکہ یہ اسم تفضیل مونث کا صیغہ ہے جو صفت کا صیغہ ہے اور الآخرة میں نافع نے تخفیف کی ہے اس کے ہمزہ کو حذف کر کے اس کی حرکت لام کو دے دی اور لاخرۃ کر کے پڑھا ہے اسی طرح بعض قراء نے یوقنون کی واو کو ہمزہ سے بدل کر یوء قنون پڑھا ہے۔ اور اس کے ما قبل کے ضمہ کو واو مضموم کی جگہ رکھ دیا ہے، جیسے وُجُوہ اور وقتت میں واو مفہوم کو ہمزہ کے ساتھ بدل کر اُجُوہ اور اُقتت کر کے پڑھا ہے اس کی مثال میں شاعر کا قول ہے،

لحبت المؤقدان إلى مؤنسى وجعدة إذا ضاء هما الوقود

مجھے جعدہ کا محبوب بنانے والے گرمی اور سردی میں چلنے والے چولہے ہیں جبکہ ان دونوں کو ایک ہی ایندھن روشن کرتا ہے اور اسی ایندھن نے ان کو مشہور کر دیا ہے۔ یہاں پر مؤقدان اور مؤنسى میں واو کو ما قبل کے ضمہ کی وجہ ہمزہ کے ساتھ بدل کر پڑھا ہے۔

لفظ "ما" کی تحقیق مع اقسام:

(۱) یہ عربی زبان میں دو قسم پر ہے۔ اسی اور حرفی

پھر ہر ایک پانچ قسم پر ہے لہذا کل دس قسمیں ہیں۔

(۱) ما اسی ہو تو واحد اور تذکیر و تانیث کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ پھر لفظ مفرد ہونے کے لحاظ سے اس کی طرف

ضمیر مفرد بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور معنی جمع ہونے کی صورت میں ضمیر جمع کا لانا بھی صحیح ہوتا ہے۔ یہ ما کبھی بمعنی الذی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا،

"وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ" (سورۃ یونس آیت نمبر ۱۸)

اور اللہ کے سوا ایسی چیز کو پوجتے ہیں جو ان کا کچھ بھلا نہ کرے۔

تو یہاں ما کی طرف بضرہم میں مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے اس کے بعد معنی جمع کی مناسب سے

يَقُولُونَ هُوَ لَآءِ شَفَعُوْنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتَذَّبُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ

(سورۃ بقرہ آیت نمبر 18)

اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں تم فرماؤ کیا اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جو اس کے علم میں نہ آسماؤں میں ہے نہ زمین میں۔

آگیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:

"وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا" (سورۃ النحل آیت نمبر 73)

اور اللہ کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو انہیں آسمان اور زمین سے کچھ بھی روزی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔

اس میں بھی جمع کے معنی ملحوظ ہیں اور آیت کریمہ:

"قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 93)

تم فرما دو کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو۔

میں بھی جمع کے معنی مراد ہیں اور کبھی نکرہ ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ نِعْمًا يَّعْظُكُمْ بِهٖ" (سورۃ النساء آیت نمبر 58)

بے شک اللہ تمہیں کیا ہی خوب نصیحت فرماتا ہے۔

تو یہاں نعماً بمعنی شینا ہے نیز فرمایا:

"فَبِعَيْنَاهُ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 271) تو وہ بھی خوب ہیں۔

آیت کریمہ:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَعِجِ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 26)

بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے چمھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔

اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماکرہ بمعنی شیاء ہو اور یہ بھی کہ ماسلہ ہو اور اس کا مابعد یعنی بعوضۃ مفعول ہو اور نظم کلام

در اصل یوں ہو اُن بضر ب مثلاً بعوضۃ اور کبھی استفہا فیہ ہوتا ہے اس صورت میں کبھی کبھی چیز کی نوع یا جنس سے سوال

کے لئے آتا ہے اور کبھی کسی چیز کی صفات جنسیہ یا نوعیہ کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اور کبھی غیر ذوی العقول اشخاص اور

اعیان کے متعلق سوال کے لئے بھی آجاتا ہے۔ بعض علمائے نحو کا قول ہے کہ کبھی اس کا اطلاق اشخاص ذوی العقول پر بھی ہوتا ہے

چنانچہ فرمایا:

"إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ" (سورة المؤمنون آیت نمبر 6)
مگر اپنی بیبیوں یا شرعی ہاندیوں پر جو ان کے ہاتھ کی ملک ہیں۔
اور آیت کریمہ:

"إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ" (سورة العنكبوت آیت نمبر 42)
اللہ جانتا ہے جس چیز کی اس کے سوا پوجا کرتے ہیں۔

اس میں ظلیل نے کہا ہے کہ ماتدعون میں ما استفہامیہ ہے ای شئی تدعون من دون اللہ اور انہوں نے یہ تکلف اس لئے کیا ہے کہ یہ ہمیشہ ابتداء کلام میں واقع ہوتا ہے اور مابعد کے متعلق استفہام کے لئے آتا ہے۔ جو آخر میں واقع ہوتا ہے جیسا کہ آیت:

"مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ"

(سورة فاطر آیت نمبر 2)

اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھولے اس کا کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ روک لے تو اس کی روک کے بعد اس کا کوئی چھوڑنے والا نہیں۔

اور مثال ما تضرب اضرب میں ہے۔ اور کبھی تعجب کے لئے ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

"فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ" (سورة البقرة آیت نمبر 175)
تو کس درجہ انہیں آگ کی سہار (برداشت) ہے۔

ما حرفی کی اقسام:

ما حرفی ہونے کی صورت میں بھی پانچ قسم پر ہے،

اول یہ کہ اس کا بعد بمنزلہ مصدر کے ہو،

جیسا کہ فعل مستقبل پر ان ناصبہ داخل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَمَا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ" (سورة البقرة آیت نمبر 3)

اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں۔

تو یہاں ما رزق بمعنی رزق مصدر کے ہے اور اس ما کے بمعنی ان مصدر یہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی طرف کہیں بھی لفظ ما تقدیر ضمیر نہیں لوثی۔

اور آیت کریمہ: "يَمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ" (سورة البقرة آیت نمبر 10) بدلہ ان کے جھوٹ کا۔

میں بھی ما مصدری معنی پر محمول ہے۔ اسی طرح اتانیا القوم ما عدا زیدا میں بھی ما مصدری ہے اور تقدیر ظرف کی

صورت میں بھی ما مصدریہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ" (سورة البقرة آیت نمبر 20)

جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے۔

"كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ" (سورة المائدة آیت نمبر 64)

جب کبھی لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے۔

"كُلَّمَا حَبَّبْتَ ذُنَاهُمْ سَعِيدًا" (سورة الاسراء آیت نمبر 97)

جب کبھی بجنے پر آئے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔

اور آیت کریمہ: "فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (سورة الحجر آیت نمبر 94)

تو اعلانیہ کہہ دو جس بات کا تمہیں حکم ہے۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما مصدریہ ہو اور یہ بھی کہ ما موصولہ بمعنی الذی ہو۔ یاد رکھو کہ ما اپنے ما بعد کے ساتھ مل کر مصدری معنی میں ہونے کی صورت میں ہمیشہ حرفی ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اسی ہو تو اس کی طرف ضمیر کا لوٹنا ضروری ہے پس یہ اریدان اخراج میں ان کی طرح ہوتا ہے جس طرح ان کے بعد ضمیر نہیں ہوتی جو اس کی طرف لوٹ سکے اسی طرح ما کے بعد بھی عائد ضمیر نہیں آتی۔

دوم مانا فیہ ہے۔

اہل حجاز اسے مشروط عمل دیتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"مَا هَذَا بَشَرًا" (سورة يوسف آیت نمبر 31) یہ آدمی نہیں ہے۔

تیسرا ما کا نہ ہے۔

جو ان واخواتہا اور (رب کے ساتھ مل کر فعل پر داخل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" (سورة فاطر آیت نمبر 28)

اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

"إِنَّمَا تُمَلَى لَهُمْ لِيُذَادُوا إِنَّمَا" (سورة آل عمران آیت نمبر 178)

ہم تو اسی لئے انہیں ڈھیل دیتے ہیں کہ اور گناہ میں بڑھیں۔

"كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ" (سورة الانفال آیت نمبر 6)

گویا وہ آنکھوں دیکھی موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

"رُءْمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 2)

بہت آرزو میں کریں گے کافر کاش مسلمان ہوتے۔

میں بھی ما کا فہ ہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ قلم اور لہما میں بھی ما کا فہ ہوتا ہے۔

چہارم ما مسلمۃ یعنی وہ ما جو کسی غیر عامل کلمہ کو عامل بنا کر مابعد پر مسلط کر دیتا ہے۔

جیسا کہ اذا ما و حیثما کا ما ہے کہ ما کے ساتھ مرکب ہونے سے قبل یہ کلمات غیر عاملہ تھے لیکن ترکیب کے بعد اسمائے

شرط کا سا عمل کرتے ہیں اور فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں جیسے حیثما نقعدا قعد وغیرہ

پانچواں ما زائدہ ہے،

جو محض پہلے لفظ کی تاکید کے لئے آتا ہے جیسے اذا ما فعلت کذا جب تم ایسا کرو ما تخرج اخرج اگر تم باہر نکلو گے تو میں بھی

نکلوں گا قرآن پاک میں ہے:

"فَاِمَّا تَرَيَنَّ مِنْ الْبَشَرِ اٰحٰدًا" (سورۃ مریم آیت نمبر 26)

پھر اگر تو کسی آدمی کو دیکھے۔

"اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اٰحٰدُهُمَا اَوْ يَكْلَاهُمَا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 23)

اگر تیرے سامنے ان میں ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

نزول کے معنی اور انزال و تنزیل میں فرق:

(نزل) النزول (ض) (Come down, Alight)

اصل میں اس کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:

نزل عن دابة وہ سواری سے اتر پڑا۔ نزل فی مکان کذا کسی جگہ پر ٹھہرنا نزل و افعال اتارنا قرآن میں ہے۔ عذاب

کے متعلق انزال کا لفظ استعمال ہوا ہے قرآن اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق انزال اور تنزیل دونوں لفظ استعمال ہوئے

ہیں ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ تنزیل کے معنی ایک چیز کو مرہ بعد آخری اور متفرق طور نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔

اور انزال کا لفظ عام ہے جو ایک ہی دفعہ مکمل طور کسی چیز نازل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ وہ آیات ملاحظہ ہو جہاں تنزیل کا

لفظ استعمال ہوا ہے۔

"نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 193) اسے روح الامین لے کر اترا۔

ایک قرأت میں نزل ہے۔

اور ہم نے اسے بتدریج رہ رہ کر اتارا۔

"وَنَزَّلْنَاهَا تَنْزِيلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 106)

لفظ آخر کا مفہوم اور اس کا تہ مقابل:

آخر. (Ultimate, End, Last)

اول کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور آخر (دوسرا) واحد کے مقابلہ میں آتا ہے اور الدار الاخرة سے نشاۃ ثانیہ مراد

لی جاتی ہے جس طرح کہ الدار الدنیا سے نشاۃ اولیٰ چنانچہ فرمایا،

"وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)

اور بیشک آخرت کا گھر ضرور وہی سچی زندگی ہے۔

لیکن کہیں الدار کا لفظ حذف کر کے صرف الاخرة کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"أُولَئِكَ الَّذِينَ لَیْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ" (سورۃ ہود آیت نمبر 16)

یہ ہیں وہ جن کے لئے آخرت میں کچھ نہیں مگر آگ۔

اور دار کا لفظ کبھی الاخرة کا موصوف ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے چنانچہ فرمایا۔

"وَلِلدَّارِ الْآخِرَةِ حَیْذُ لِلَّذِينَ یَتَّقُونَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 32)

اور بے شک پچھلا گھر بھلا ان کے لئے جو ڈرتے ہیں۔

"وَلَا جَزَاءُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا یَعْلَمُونَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 41)

اور بیشک آخرت کا ثواب بہت بڑا ہے کسی طرح لوگ جانتے۔

یہ اصل میں ولاجر دار الحیاة الاخرة ہے (اور دار کا لفظ الحیاة الاخرة کی طرف مضاف ہے) اور اخر (جمع

الاخروی) کا لفظ الاخر (معرف بلام) سے معدول ہے اور کلام عرب میں اس کی دوسری نظیر نہیں ہے کیونکہ افعل من کذا

(یعنی صیغہ تفصیل) کے ساتھ اگر لفظ من لفظاً یا تقدیراً مذکورہ ہو تو نہ اس کا تشبیہ ہوتا اور نہ جمع اور نہ ہی تانیث آتی ہے اور اس کا

تشبیہ جمع دونوں آسکتے ہیں لیکن لفظ آخر میں اس کے نظائر کے برعکس الف لام کے بغیر اس کے استعمال کو جائز سمجھا گیا ہے تو معلوم

ہوا کہ یہ الاخر سے معدول ہے۔

معرفة یقین.

(یقین) الیقین (Belief)

یقین کے معنی کسی امر کو پوری طرح سمجھ لینے کے ساتھ اس کے پایہ ثبوت تک پہنچ جانے کے ہیں اسی لئے یہ صفات علم سے

ہے اور معرفت اور وغیرہ سے اس کا درجہ اوپر ہے یہی وجہ ہے کہ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے لیکن معرفة الیقین نہیں بولتے اور

قدر معنوی فرق پایا جاتا ہے جسے ہم اس کتاب کے بعد بیان کریں گے استیقن والیقن یقین کرنا قرآن میں ہے:

"إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُحْسِنِينَ" (سورة البقرة آیت نمبر 32)
ہمیں تو یونہی کچھ گمان سا ہوتا ہے اور ہمیں یقین نہیں۔

"وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ" (سورة الناریک آیت نمبر 20)
اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین والوں کو۔

"قَدْ بَدَيْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُؤَقِنُونَ" (سورة البقرة آیت نمبر 118)
بیشک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے۔

اور آیت کریمہ:

"وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" (سورة النساء آیت نمبر 157)

اور ہے یہ کہ انہوں نے نہ اُسے قتل کیا اور نہ اُسے سولی دی بلکہ ان کے لئے اُس کی شبیہ کا ایک بنا دیا گیا۔
کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے قتل ہو جانے کا یقین نہیں ہے بلکہ ظن و تخمین سے ان کے قتل ہو جانے کا حکم لگاتے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 5]

أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًىٰ مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (5)

ترجمہ

"وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے۔"

متن:

أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًىٰ مِنْ رَبِّهِمْ الْجُمْلَةَ فِي مَحَلِّ الرَّفْعِ إِنْ جَعَلَ أَحَدَ الْمَوْصُولِينَ مَفْصُولًا عَنْ الْمُتَقِينَ خَبَرَ لَهُ، فَكَانَ لَهَا قِيلٌ هُدًىٰ لِلْمُتَّقِينَ قِيلٌ مَا بَالَهُمْ خَصُوا بِذَلِكَ؛ فَأَجِيبَ بِقَوْلِهِ: الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ إِلَىٰ آخِرِ الْآيَاتِ. وَالْإِفاستئناف لا محل لها، فَكَانَ نَتِيجَةَ الْإِحْكَامِ وَالصِّفَاتِ الْمُتَقَدِّمَةِ. أَوْ جَوَابَ سَائِلٍ قَالَ: مَا لِلْمَوْصُولِينَ بِهَذِهِ الصِّفَاتِ اخْتَصُوا بِالْهُدَىٰ؛ وَنَظِيرَةٌ أَحْسَنَتْ إِلَىٰ زَيْدٍ صَدِيقِكَ الْقَدِيمِ حَقِيقٌ بِالْإِحْسَانِ، فَإِنْ اسْمُ الْإِشَارَةِ هَاهُنَا كإعادة الموصوف بصفات المذكورة، وهو أبلغ من أن يستأنف بإعادة الاسم وحدة لها فيه من بيان المقتضى وتلخيصه، فإن ترتب الحكم على الوصف إيدان بأنه الموجب له. ومعنى الاستعلاء في عَلَىٰ هُدًىٰ تمثيل تمكّنهم من الهدى واستقرارهم عليه بحال من اعتلى الشيء وركبه، وقد صرح حوا به في قولهم:

امتطی الجہل وغوی واقتعد غارب الہوی، وذلك إنما يحصل باستفراغ الفكر وإدامة
النظر فيما نصب من الحجج والمواظبة على محاسبة النفس في العمل، ونُكِّرْ هَدْيِي
للتعظيم. فكانه أريد به ضرب لا يباليغ كنهه ولا يقادر قدره، ونظيرة قول الهذلي:

فلا وابي الطير المربة بالضحى

على خالد لقد وقعت على لحم

وأكد تعظيمه بأن الله تعالى مَائِحَةٌ والموفق له، وقد أدغمت النون في الراء بغنة وبغير
غنة.

ترجمہ:

یہاں پر یہ جملہ محل رفع میں ہے، اس شرط کے ساتھ کہ پیچھے مذکور دونوں اسمائے موصول میں سے ایک کو متقین سے اعراب
میں الگ کر دیا جائے (تو اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہوگا) اور جملہ اس کی خبر ہوگا۔ تو معنی یہ ہوگا کہ جب اللہ کریم کی
طرف سے فرمایا گیا کہ قرآن مجید متقین کے لئے ہی سرچشمہ ہدایت ہے تو یہ اس سوال کا جواب ہوگا۔ کہ متقین کو ہی ہدایت کے
ساتھ، کیونکہ خاص کیا جا رہا ہے تو جواب دیا گیا کہ وہ غیب پر ایمان، نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور آخرت پر ایمان جیسی
صفات سے متصف ہیں تو جوان اوصاف سے متصف ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف سے فلاح پانے والا اور ہدایت یافتہ ہوتا
ہے۔ اور اگر ان موصولات میں سے کسی کو متقین سے اعراب میں جدا نہ کیا جائے۔ (اور ان کو متقین کی مجرور صفت بنایا
جائے) تب یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور اس کا کوئی بھی محل اعراب نہیں ہوگا۔ دریں صورت یہ سابقہ احکامات پر عمل پیرا ہونے اور
ماقبل بیان کردہ صفات سے متصف ہونے کا ثمرہ اور نتیجہ ہوگا۔ یا سوال کرنے والے کا جواب ہوگا جس کا سوال یہ ہو کہ ان مذکورہ
صفات سے متصف ہونے والوں کو کس وجہ سے ہدایت کے ساتھ متصف کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل قول ایام بیضاوی رحمۃ اللہ
تعالیٰ علیہ نے بطور مثال پیش کیا ہے۔

ونظيرة أحسنت إلى زيد صديقك القديم حقيق بالإحسان
اور تو نے احسان کیا ہے اپنے پرانے دوست زید کے ساتھ، تیرا دوست احسان کے لائق ہے
فی قول ہذا زید متقین کی نظیر ہے

صديقك الذين يؤمنون بالغيب الى آخره

کی مثال ہے۔ اور

صديقك القديم حقيق بالإحسان اولئك هدى من ربهم الى آخره

کی مثال ہے

تو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مندرجہ بالا مثال میں استیناف بالصفات کی مثال بیان کر رہے ہیں لہذا اس مندرجہ بالا عبارت میں جہاں جہاں بھی استیناف ہوگا وہاں یہ جملہ اور قول، نظیر اور مثال ہوگا۔ اسی وجہ سے نظیر کی ضمیر کا مرجع ماذکر بیان کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل وہ دو صورتیں ہیں، جن میں استیناف ثابت کیا گیا ہے۔

1- سب سے پہلی

2- سب سے آخری صورت

پس یہ جملہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں کی نظیر ہے۔

فان اسم الاشارة ههنا.....

یہاں پر اسم اشارہ کا ذکر کرنا اور اسم ظاہر ذکر نہ کرنا اس لئے ہے کہ اسم اشارہ ذکر کرنا ایسے ہی ہے جیسے موصوف جمع صفات کا اعادہ کیا جائے کیونکہ اسم اشارہ کا ذکر بغیر مشار الیہ کے نہیں ہو سکتا۔ اور اسم ظاہر ذکر کرنے سے، اس کا ذکر کرنا زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس طرح حکم کا مقتضی اور اس کی تلخیص کا بھی بیان ہے کیونکہ کہ جب حکم کو کسی وصف پر مرتب کیا جائے تو وہی وصف اس حکم کی علت اور موجب ہوتا ہے۔ لہذا اس کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مومنین کا اپنے رب کی طرف سے ہدایت کے ساتھ خاص ہونا اس کا سبب اور موجب مذکورہ بالا صفات سے متصف ہونا ہے۔

و معنى الاستعلاء فى على هدى.....

علیٰ جو کہ ہدیٰ سے پہلے آیا ہے، وہ استعلاء کے معنی میں ہے یعنی کسی چیز پر غالب آنا اور اس پر قادر ہونا یہاں یہ بات سمجھانے کے لئے لایا گیا ہے کہ متقین ہدایت پر متمسک اور غالب ہیں جیسا کہ ماہر شاہسوار اپنی سواری پر قدرت رکھتا ہے۔ عرب میں ایسی مثالیں عام ہیں، مثلاً

امتطى الجهل وغوى وہ جہالت پر سوار ہوا اور گمراہ ہو گیا۔

واقعد على غارب الهوى کہ وہ نفسانی خواہشات کے کندھے پر سوار ہو گیا۔

اور ہدایت پر تمسک وغلبہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنے فکر و نظر کو اپنے دلائل میں اس طرح مرکوز کر دے کہ وہ ہر قسم کی فکر سے خالی ہو۔ نیز وہ اپنے نفسانی اعمال کا محاسبہ بھی کرتا رہے اور یہاں ہدیٰ کے لفظ نکرہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے عظیم ہدایت مراد ہے یعنی وہ عظیم الشان ہدایت جس کی حقیقت اور گہرائی تک رسائیں حاصل کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی کسی پیمانہ سے ناپنا ممکن۔

ہزلی کا یہ شعر اسم نکرہ ذکر کر کے اس کی عظمت شان مراد لینے کی مثال ہے۔

فلا و ابى الطير النربة بالضحى علیٰ خالد لقد وقعت علیٰ لحمی

اے مخاطب، جو تو سمجھا ہے، وہ بات نہیں۔ بلکہ ان پرندوں کے باپ کی عظم جو چاشت کے وقت خالد کی نعش پر

جھٹ رہے تھے یقیناً وہ ایک عظیم گوشت پر گر رہے تھے۔

یہاں پر لحم لفظ کو نکرہ، بطور استشہاد لایا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد عظیم گوشت ہے جو ایسے آدمی کا ہے جو بہت عظیم تھا تو اس کے گوشت کی عظمت کا حال کیا ہوگا۔ یہ شعر ہذلی نے خالد بن زہر کے مرثیہ میں کہا تھا جب اس کو قتل کر دیا گیا تھا اور بوقت چاشت پر ندے اس کا گوشت کھا رہے تھے۔ اور آیت مبارکہ میں ہدیٰ کے بعد من ربہم ذکر کرنا یہ اس ہدایت کی عظمت میں مزید تاکید پیدا کر رہا ہے کہ اس ہدایت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے تو جس کی توفیق اللہ کریم عزوجل عطا کرے وہ کتنی عظیم ہوگی اور من ربہم سے پہلے من کے نون کو اس کی راء میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ ادغام بغیر غنہ کے ہے اور بعض کے نزدیک غنہ کے ساتھ ہے۔

متن:

وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

کرر فیہ اسم الإشارة تنبیہاً علی أن اتصافہم بتلك الصفات یقتضی کل واحدة من الاثرین وإن کلاً منهما کاف فی تمییزہم بہا عن غیرہم، ووسط العاطف لاختلاف مفہوم الجملتین ماہنا بخلاف قوله أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ، فإن التسجیل بالغفلة والتشبیہ بالبهائم شیء واحد فكانت الجملة الثانية مقررة للأولی فلا تناسب العطف، وهم:

فصل یفصل الخبر عن الصفة ویؤکد النسبة، ویفید اختصاص المسند إلیہ، أو مبتدأ والمفْلِحُونَ خبره والجملة خبر أولئک، والمفْلِحُ بالحاء والجیم: الفائز بالمطلوب، كأنه الذی انفتحت له وجوه الظفر، وهذا التركيب وما یشارکہ فی الفاء والعین نحو فلتق وقلذ وقلی یدل علی الشق، والفتح وتعریف المفْلِحین للدلالة علی أن المتقین هم الناس الذین بلغک أنهم المفْلِحُونَ فی الآخرة، أو الإشارة إلی ما یعرفہ کل أحد من حقيقة المفْلِحین وخصوصیاتہم.

تنبیہ:

تأمل کیف نبه سبحانه وتعالی علی اختصاص المتقین بنیل ما لا ینالہ کل أحد من وجوه شتی، وبناء الكلام علی اسم الإشارة للتعلیل مع الإیجاز وتکریرہ وتعریف الخبر وتوسیط الفصل لإظهار قدرهم والترغیب فی اقتفاء أثرهم، وقد تشبہت به الوعیدیة فی خلود الفساق من أهل القبلة فی العذاب، ورد بأن المراد بالمفْلِحین کاملون فی

الفلاح ويلزمه عدم كمال الفلاح ليس على صفتهم، لا عدم الفلاح له رأساً.

ترجمہ:

اس آیت مقدسہ:

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

میں اسم اشارہ دوبارہ لانے کا مقصد یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ مذکورہ بالا صفات کے ساتھ متصف ہوں گے تو وہ دونوں نعمتوں کو حاصل کرنے والے ہوں گے یعنی ہدایت اور فلاح، نیز اس بات پر آگاہی بھی مقصود ہے کہ ان دونوں نعمتوں میں سے ہر ایک نعمت متقین کو غیر متقین سے ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور ان دونوں جملوں کے درمیان واو عاطفہ کا ذکر کرنا، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان تغایر پر دال ہے۔ جب کہ اسی قسم کے دو جملے اور ہیں ان کے درمیان واو عاطفہ ذکر نہیں کی گئی۔

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ

کہ کافر چوپایوں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں حقیقت میں وہی غافل ہیں۔

پہلے دو جملوں میں واو عاطفہ اس لئے ذکر کی گئی ہے کہ مفہوم اور وجود میں تغایر ہے اور ان دونوں جملوں کے مفہوم میں تغایر نہیں بلکہ پہلے جملے میں کافروں کو چوپایوں کے ساتھ تشبیہ دے کر، ان کی جہالت و غفلت کو ذکر کیا جبکہ دوسرے جملے میں ان کی غفلت و جہالت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تو جب ان دونوں جملوں میں تغایر نہیں بلکہ کفار کو بہائم کے ساتھ تشبیہ دینا اور غفلت و جہالت پر مہر لگانا ایک ہی چیز ہے کہ ان کی جہالت ثابت کی جائے۔ دوسرا جملہ پہلے جملے کی تاکید ہے۔ نیز موکد اور تاکید کے درمیان حرف عطف نہیں لایا جاتا۔

فصل يفصل الخبر عن الصفة ويؤكده النسبة

مفصلون سے پہلے لفظ ہم کا ذکر کرنا خبر کو صفت سے جدا کرنا ہے کیونکہ جب اسم اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو یہ ثابت کرنے کے لئے اس ضمیر کے بعد والا کلمہ ماقبل مبتداء کی خبر ہے اس کی صفت نہیں اسی لئے اس کو فصل کہا جاتا ہے ضمیر فصل کو ذکر کرنے کے مندرجہ ذیل تین فائدے ہیں،

پہلا خبر کو صفت سے جدا کرنا،

دوسرا نسبت حکمیہ میں تاکید پیدا کرنا

اور تیسرا یہ کہ مسند کو مسند الیہ کے ساتھ خاص کرنا

یا یہ ضمیر مبتداء ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے مبتداء اور خبر مل کر مل کر جملہ، التک کی خبر ہے۔

المفصل کا لفظ جیم کے ساتھ ہو یا حاء کے ساتھ دونوں کا معنی مطلوب کو پانے والا ہی ہے گویا یا تو مفلج ہو گا یا پھر مفلح،

دونوں کا معنی یہ ہے کہ جس کے لئے کامیابی کے تمام دروازے کھل گئے ہوں مزید یہ کہ ہر وہ کلمہ جو فاء اور عین کلمہ میں قلم کے ساتھ شریک ہو تو وہ چیرنے اور کھولنے کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ فلق، فلذجد اکرنا، فلی بالوں کو جدا کر کے جو عین تلاش کرنا اور مفلاحون کو معرف باللام ذکر کرنا، اشارہ ہے کہ متقین وہ ہوتے ہیں کہ جن کو ہر ایک جانتا ہے اور ان تک یہ خبر پہنچی ہوئی ہے کہ وہ آخرت میں کامیاب ہوں گے یا اس کا معنی یہ ہے کہ ہر شخص متقین کی حقیقت سے باخبر ہے اور ان کی خصوصیات سے مکمل باخبر ہے۔

تشبیہ:

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ غور کرو کہ کس طرح مختلف طریقوں سے اس بات پر تشبیہ کی ہے کہ متقین ہی ان چیزوں کو پانے کے ساتھ خاص ہیں۔ اور وہ مختلف طریقے یہ ہیں کہ کلام یعنی ہدایت اور فلاح کے حکم کی بنیاد اسم اشارہ پر رکھی تاکہ اختصار کے ساتھ ان دونوں حکموں کی علت بھی معلوم ہو جائے اور اسم اشارہ کو مکرر لائے اور پھر خبر کو، معرف باللام ذکر کیا نیز درمیان میں ضمیر فصل لائے، اور متقین کی اس خصوصیت پر متنبہ کرنے کا مقصد ان کے مرتبہ کا اظہار ہے اور دوسروں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی رغبت دلانی ہے۔

متقین کو ان انعامات کے ساتھ خاص کرنے کی وجوہات:

متقین کو ان انعامات کے ساتھ خاص کرنے کی بے شمار وجوہات ہیں۔

1۔ کلام کو اسم اشارہ پر محمول کیا، جس کا مقصد ہدایت و فلاح کی علت بیان کرنا ہے اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ متقین متصف

بصفات مذکورہ ہیں۔

2۔ کلام بھی مختصر ہے۔

3۔ ہدیٰ کو نکرہ ذکر کیا جو کہ اس کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

4۔ خبر معرف ذکر کی جو مبتداء کے ساتھ خاص ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

5۔ مبتداء اور خبر کے درمیان ہم ضمیر فصل ذکر کی جو متقین کے بلند مرتبہ کا اظہار ہے۔

6۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو متقین کی پیروی کرنے میں رغبت دلانی جائے۔

ہدایت کی چار اقسام:

(۵دی) الهدایۃ (Instruction)

کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کیا ہے۔

(1) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے کی ہے۔

اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا

ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: "رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى" (سورۃ طہ آیت نمبر 50)

کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی۔

(2) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ تجارت کی طرف

دعوت دی ہے چنانچہ آیت:

"وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اُمَّةً يَهْتَدُونَ بِاَمْرِنا" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 73)

اور ہم نے انہیں امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلا تے ہیں۔

(3) سوم بمعنی توفیق

یہ خاص ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى" (سورۃ محمد آیت نمبر 17)

اور جنہوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمائی۔

(4) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا۔

مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا: "سَيَهْدِيهِمْ وَيُضِلُّهُم بِالْهَمِّ" (سورۃ محمد آیت نمبر 5)

جلد انہیں راہ دے گا اور ان کا کام بنا دے گا۔

اور مندرجہ ذیل آیت میں فرمایا:

"وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 43)

اور ہم نے ان کے سینوں میں سے کینے کھینچ لئے۔

نوٹ:

لفظ رب کی تحقیق "الحمد لله رب العالمين" کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

فلاح کے معنی:

(ف ل ح) الفلاح (Betterment)

الفلاح کے معنی پھاڑنا کے ہیں مثل مشہور ہے الحديد بالحديد يفلح لوبالو ہے کو کاٹتا ہے اس لئے فلاح کسان کو کہتے

ہیں۔ (کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے) اور فلاح کے معنی کامیابی اور مطلب وری کے ہیں۔

اقسام فلاح:

یہ دو قسم پر ہے دنیوی اور اخروی۔ فلاح دنیوی ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جن سے دنیوی زندگی خوشگوار بنتی ہو یعنی بقاء لہال اور عزت و دولت۔

چنانچہ شاعر نے اسی معنی کے مد نظر رکھتے ہوئے نحل البسیط میں کہا ہے،

افلح بما شئت فقد يدرك بالصد عفو قد يخذع الاريب

جس طریقہ سے چاہو خوش عیشی کرو کبھی کمزور کامیاب ہو جاتا ہے اور چالاک دھوکا کھا جاتا ہے۔

اور فلاح اخروی چار چیزوں کے حاصل ہو جانے کا نام ہے بقا بلا فناء، غنا بلا فقر، عزت بلا ذلت، علم بلا جہل اسی لئے کہا

گیا ہے،

لا عيش الا عيش الآخرة

کہ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے

اور اسی فلاح کے متعلق فرمایا:

"وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)

اور زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے۔

"أَلَا إِنَّ جِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" (سورۃ المجادلہ آیت نمبر 22)

(اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔

"قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَوَّجَ" (سورۃ الاعلیٰ آیت نمبر 14)

بیشک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا

"قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَهَّا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 9) جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

"قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 1)

بیشک ایمان والے رستگار ہوئے۔

"لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 189) تاکہ تم فلاح پاؤ۔

"إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 117)

کچھ شک نہیں کہ کافر رستگاری نہیں پائیں گے۔

"فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" (سورۃ الحشر آیت نمبر 9) وہ تو نجات پانے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

”وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنْ اسْتَقْبَلَ“ (سورۃ آیت نمبر 64) اور آج جو غالب رہا وہ کامیاب ہوا۔

میں یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے فلاح دنیوی مراد لی ہو بلکہ یہی معنی (بلحاظ قرآن) اقرب الی الصحت معلوم ہوتے ہیں۔ اور مسحور یعنی طعام محرک کو بھی فلاح کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت حی علی الفلاح کی آواز بلند کی جاتی ہے اور اذان میں حی علی الفلاح کے معنی یہ ہیں کہ اس کامیابی کی طرف آؤ جو نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے۔ اور حدیث حتی خفنا از یفوتنا الفلاح (حتی کہ فلاح کے فوت ہو جانے کا ہمیں اندیشہ ہوا) میں بھی فلاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو صلاۃ عشا اور کرنے کی وجہ سے ہمارے لئے مقدر کی گئی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 6]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (6)

ترجمہ:

”بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے، انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں۔“

متن:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

لما ذكر خاصة عبادة، وخلاصة أوليائه بصفاتهم التي أهلهم للهدى والفلاح عقوبهم بأضدادهم العتاة المردة، الذين لا ينفع فيهم الهدى ولا تغني عنهم الآيات والنذر، ولم يعطف قصتهم على قصة المؤمنين كما عطف في قوله تعالى إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ لتباينهما في الغرض، فإن الأولى سيقت لذكر الكتاب وبيان شأنه والآخرى مسوقة لشرح تمردهم، وانهما كهم في الضلال و (ان) من الحروف التي تشابه الفعل في عدد الحروف والبناء على الفتح ولزوم الاسماء وإعطاء معانيه، والبتعدى خاصة في دخولها على اسمين. ولذلك أعملت عمله الفرعي وهو نصب الجزء الاول ورفع الثاني إيذاناً بأنه فرع في العمل دخيل فيه.

وقال الكوفيون: الخبر قبل دخولها كان مرفوعاً بالخبرية، وهي بعد بأقية مقتضية للرفع قضية للاستصحاب فلا يرفعه الحرف. وأجيب بأن اقتضاء الخبرية الرفع مشروط بالتجرد لتغلفه عنها في خبر كان، وقد زال بدخولها فتعين إعمال الحرف. وفائدتها تأكيد النسبة وتحقيقها، ولذلك يُتَلَكَّى بها القَسَم ويصدر بها الاجوبة،

وتذكر في معرض الشك مثل قوله تعالى: وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ ذِي الْقُرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا إِنَّا مَكِّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ قَالَ الْمِبْرِدُ (قولك: عبد الله قائم، إخبار عن قيامه، وإن عبد الله قائم، جواب سائل عن قيامه، وإن عبد الله لقائم، جواب منكر لقيامه).

وتعريف الموصول: إما للعهد، والمراد به ناس بأعيانهم كأبي لهب وأبي جهل والوليد بن المغيرة، وأخبار اليهود، أو للجنس، متناولاً من صمم على الكفر، وغيرهم. فخص منهم غير البصرين بما أسند إليه، والكفر لغة: ستر النعمة، وأصله الكفر بالفتح وهو الستر، ومنه قيل للزارع وللليل كافر، ولكيام الشرة كافر. وفي الشرع: إنكار ما علم بالضرورة مجيء الرسول صلى الله عليه وسلم به، وإنما عدَّ لبس الغيار وشد الزنار ونحوهما كفرًا لأنها تدل على التكذيب، فإن من صدق الرسول صلى الله عليه وسلم لا يجترأ عليها ظاهر إلا لأنها كفر في أنفسها.

ترجمہ:

یہاں پر امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ برسر عنوان آیت کا ما قبل کلام کے ساتھ جو معنوی تعلق ہے، اس کو بیان فرما رہے ہیں کہ جب اللہ کریم نے آیت سے ما قبل میں اپنے خاص بندوں اور مخلص دوستوں کا ذکر ان صفات کے ساتھ بیان فرمایا۔ جنہوں نے ان کو ہدایت اور فلاح کا اہل بنا دیا۔ تو اس آیت میں ان کی ضدوں اور مد مقابلوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ایسے ضدی، ہٹ دھرم اور سرکش ہیں کہ ان کو راہ راست پر لانے کے لئے ڈرانے میں نہ تو اللہ کریم کی ترغیبات مفید ثابت ہوئیں اور نہ ہی وعیدات نے انہیں کوئی نفع پہنچایا اور وہ اپنے کفر و انکار پر مضبوطی سے ڈٹے رہے اگرچہ مومنوں اور کافروں کے درمیان تقایر ہے اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا جس طرح،

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ

میں حرف عطف ذکر کیا گیا ہے ان دونوں واقعات میں یعنی مومنین اور متقین اور منکرین اور کافرین کے درمیان واو عاطفہ نہیں لائی گئی کیونکہ ان دونوں کے مقاصد مختلف ہیں اور ان کے درمیان اعلیٰ درجے کا انقطاع بھی ہے۔ اس وجہ سے کہ پہلے قصے میں قرآن کریم کی شان و عظمت اور اس کے لاریب ہونے کا ذکر ہے۔ جو مومنین کے لئے سراپا نفع و ہدایت ہے۔ اور دوسرے قصے میں مشرکین کی ضد، سرکشی، تمرد اور گمراہی میں منہمک ہونے کا ذکر ہے۔ اس لئے حرف عطف ذکر کر کے تقایر ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور مندرجہ بالا دونوں جملے،

ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم

غرض میں متحد ہیں اس لئے ان میں تغایر ظاہر کرنے کے لئے حرف عطف ذکر کیا گیا ہے۔ اسی لئے امام بیضاوی نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہاں عطف القصة علی القصة ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ متعدد جملوں کے مجموعہ کا متعدد جملوں کے مجموعہ پر عطف کیا جائے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں قصے آپس میں غرض کے اعتبار سے متحد ہوں اور اس دوسری آیت،

ان الابوار لفي نعيم وان الفجار لفي بحيم

میں جہنمیوں کے قصے کو جنتیوں کے قصے پر عطف کیا گیا ہے لیکن ان میں ان دونوں جملوں میں غرض کا اتحاد ہے کیونکہ پہلے جملے سے اعمال پر مرتب ہونے والی جزا کا ذکر ہے اور دوسرے جملہ میں فجار کے اعمال پر مرتب ہونے والی سزا کا ذکر ہے لیکن دونوں قصے الگ الگ ہیں اس لئے ان کے درمیان حرف عطف کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

وان من الحروف التي شابهت الفعل...

اور ان حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے جو اسم کو منصوب اور خبر کو مرفوع کرتے ہیں۔ او ان کی فعل کے ساتھ مشابہت کی چند وجوہات ہیں:

- 1- یہ تعداد حروف میں فعل کے مشابہ ہوتے ہیں یعنی ان میں سے بعض فعل کی طرح ثلاثی ہوتے ہیں۔ جیسے ان، ان اور لیت اور بعض رباعی ہیں جیسے لعل، لکن اور کان
 - 2- بناء میں بھی مشابہ ہے جس طرح فعل ماضی مبنی برفقہ ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی مبنی برفقہ ہوتے ہیں۔
 - 3- جس طرح فعل متعدی دو اسموں پر داخل ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی دو اسموں پر داخل ہوتے ہیں جس طرح فعل، فاعل اور مفعول تک اپنا معنی پہنچاتا ہے اسی طرح یہ بھی اسم اور خبر تک اپنا معنی پہنچاتے ہیں اور فعل متعدی کے ساتھ ان کی خاص مشابہت ہے کیونکہ وہ بھی دو اسموں پر داخل ہوتا ہے اور فاعل کو رفع اور مفعول کو نصب دیتا ہے۔ اسی طرح یہ حروف بھی دو اسموں پر داخل ہو کر فعل متعدی کا عمل فرعی کرتے ہیں یعنی پہلے اسم کو نصب اور دوسرے کو رفع دیتے ہیں۔ اور انہیں فعل کا عمل فرعی اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ عمل میں اصل نہیں بلکہ فعل کے تابع اور اس میں ذخیل ہیں۔
- اس کے متعلق کوئیوں کا قول ہے کہ حروف بالفعل کا عمل صرف ان کے اسماء تک ہی محدود ہوتا ہے۔ اور یہ خبر کو رفع نہیں دیتے چونکہ خبر ان کے دخول سے پہلے ہی مرفوع ہوتی ہے۔ اس لئے سابقہ تقاضا کے مطابق ان حروف کے داخل ہونے کے باوجود بھی وہ مرفوع ہوگی جس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حروف اس کو رفع دے رہے ہیں کہتے ہیں کہ یہ حروف اسم اور خبر دونوں میں عمل کرتے ہیں اس وجہ سے امام بیضاوی نے بصریوں کی تائید کرتے ہوئے کوئیوں کے نظریہ کا جواب یہ دیتے تھے کہ خبر شخصیت خبر اس وقت مرفوع ہوتی ہے جب کہ وہ عوامل لفظیہ سے خالی ہو جب اس سے پہلے کوئی عالم آجائے تو اس کا وہ تقاضا ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس وقت اس عامل کی وجہ سے منصوب یا مرفوع ہوتی ہے جیسے کان جو افعال ناقصہ سے ہے وہ اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتا ہے لیکن جب وہ جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے وہ اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتا ہے اس کی خبر کے تقاضا کی وجہ سے

مرفوع نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کو نصب دیتا ہے اس لئے ثابت ہوا کہ حروف مشبہ بالفعل کی وجہ سے ہی ان کی خبر بھی مرفوع ہے۔ کلام میں ان کا استعمال بے شمار فائدے رکھتا ہے ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ نسبت حکمیہ میں تاکید پیدا کرتا ہے اور اس کے معنی کو پختہ کرتا ہے اسی لئے جو ان قسم، دوسرے سوالات اور شک کرنے والوں کے جوابات میں اس ذکر کیا جاتا ہے قرآن مجید میں سوال کے جواب میں ذکر کرنے کی مثال مذکور ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الَّذِينَ قُلْنَا عَلَيْهِمْ مِنْهُ ذِكْرًا إِنَّا مَكِّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ

اے محبوب وہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ فرمادیجئے میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس کا حال ہم نے بے شک اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں۔ اس آیت میں انا مکنناہ ذی القرنین کے متعلق سوال کا جواب ہے اس لئے جواب کے شروع میں ان ذکر کیا گیا ہے، مزید ایک آیت میں مقام شک کی مثال ہے،

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ

چونکہ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں شک تھا تو آپ نے اس کے شک کا ازالہ کرنے کے لئے فرمایا، بے شک میں رب العالمین کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے کلام مخاطب کے ذہن کے مطابق چلائی جاتی ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مبرد کا وہ جواب، جو اس نے ابو العباس الکندی کے سوال کو زائل کرنے کے لئے دیا تھا وہ ذکر فرمایا ہے ابو العباس الکندی نے کہا کہ عربی لغت میں حشو وزائد ہیں، مبرد نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا تیرا عبد اللہ قائم (عبد اللہ کھڑا ہے) کہنا ان کے اضافہ سے کلام کرنا عبد اللہ کے کھڑا ہونے کے متعلق سوال کرنے والے کے شک کو زائل کرنے کے لئے ہے اور ان عبد اللہ لقاؤں (بے شک عبد اللہ یقیناً کھڑا ہے۔) اس جملہ کے آغٹ میں ان اور قائم سے پہلے لام مفتوح کا اضافہ کرنا عبد اللہ کے کھڑا ہونے سے انکار کرنے والے کا جواب ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ عربی زبان حشو وزائد سے خالی ہے۔

اسم موصول چونکہ اس معرف باللام کے قائم مقام ہوتا ہے اس لئے اسم موصول یا تو عہد خارجی افراد کے لئے ہوگا یا جنس اور ماہیت کو معرفہ بنانے کے لئے ہوگا اگر یہ عہد خارجی کے لئے ہو تو اس وقت اس سے مراد معین اور مخصوص کافر ہوں گے جیسے ابو لہب، ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور یہود کے علماء (جو ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کفر پر مصر تھے) یا یہ اسم موصول جنس کے لئے ہو گا۔ اس صورت میں اس سے مراد مصر علی الکفر اور غیر مصر تمام مراد ہوں گے پھر سواء علیہم کی وجہ سے غیر مصر، ان سے خارج ہو جائیں گے (اس لئے اس سے مصر علی الکفر ہی مراد ہوں گے) کیونکہ ڈرانا یا نہ ڈرانا صرف ان ہی کے لئے مفید نہ ہوا۔ کفر کا لغوی معنی نعمت کو چھپانا ہے، یہ اصل میں کفر بفتح ک ہے جس کا معنی کسی چیز کو مطلق چھپانا ہے خواہ وہ نعمت ہو یا عدم

نعت ہو۔ اسی لئے زراعت کرنے والے اور رات کو کافر کہتے ہیں کیونکہ زراعت (کسان) بیج کو زمین میں چھپاتا ہے اور رات بھی تمام ایسی اشیاء کو اپنے اندھیرے میں چھپالیتی ہے اور شکوفہ میں پوشیدہ پھل کو کافر کہتے ہیں۔ اور شریعت کی اصطلاح میں اس چیز کو ماننے سے انکار کرنا جس کا ثبوت تو اتر سے ہو کہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر آئے، کفر کہلاتا ہے اور لمبی ٹوپی پہننے اور گلے میں تعویذ لٹکانے اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کو کفر شمار کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ تکذیب قلبی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ یہ کافروں کا شعار اور ان کو پہچاننے کی علامات ہیں،

اور وہ شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرتا ہے وہ ظاہری طور پر کافروں کے پہچاننے کی علامات اور شعار کو اپنانے کی جرات ہی نہیں کر سکتا، حالانکہ یہ چیزیں بذات خود تکذیب اور کفر نہیں بلکہ کافروں کا شعار ہیں۔

متن:

واحتجت المعتزلة بما جاء في القرآن بلفظ الماضي على حدوثه لاستدعائه سابقة
المخبر عنه، وأجيب بأنه مقتضى التعلق وحدثه لا يستلزم حدوث الكلام كما في
العلم.

ترجمہ:

ماضی کے جو صیغے قرآن میں ذکر کئے گئے ہیں ان سے معتزلہ نے قرآن پاک کے حدوث پر دلیل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی واقعہ کی خبر فعل ماضی کے صیغوں سے دینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ واقعہ خبر دینے سے مسبق ہوا اور جو مسبق باخیر ہو۔ وہ ازلی اور قدیم نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ماضی کے صیغوں کے ساتھ قرآن کریم جو کلام نفسی ہے اس کے حدوث پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کے حدوث پر دلیل قائم کرنا درست نہیں کیونکہ مخبر عنہ کا خبر دینے کے وقت سے پہلے ہونا کلام نفسی کے حدوث پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ اس تعلق کے حدوث پر دلالت کرتا ہے جو کلام ازلی کا اس واقعہ کے ساتھ ہے کیونکہ وہ تعلق واقع کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اس کے ساتھ ہوتا ہے اور تعلق کا حدوث کلام ازلی کے حدوث کو مستلزم نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے قدیم اور ازلی ہونے پر تمام کا اتفاق ہے لیکن اس علم ازلی کا تعلق معلوم چیز کے ساتھ اس وقت ہوتا ہے جب وہ معرض وجود میں آجاتی ہے لہذا علم حادث نہ ہوا بلکہ اس کا تعلق جو معلوم کے ساتھ ہے وہ حادث ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلام نفسی کا وہ تعلق جو اس واقع کے ساتھ ہے، وہ کلام نہیں ہے بلکہ حادث ہے۔

متن:

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ

خبر ان وسواء اسم بمعنى الاستواء، نعت به كما نعت بالمصادر قال الله تعالى: تَعَالَوْا
إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ رَفَعَ بِأَنَّهُ خَبَرٌ إِنْ وَمَا بَعْدَهُ مَرْتَفَعٌ بِهِ عَلَى الْفَاعِلِيَّةِ كَأَنَّهُ
قِيلَ: إِنْ الَّذِينَ كَفَرُوا مَسْتَوٍ عَلَيْهِمْ إِنْذَارُكَ وَعَدْمُهُ أَوْ بِأَنَّهُ خَبَرٌ لِمَا بَعْدَهُ بِمَعْنَى:
إِنْذَارُكَ وَعَدْمُهُ سَيَانٌ عَلَيْهِمْ، وَالْفِعْلُ إِنَّمَا يَمْتَنِعُ الْإِخْبَارُ عَنْهُ إِذَا أُريدَ بِهِ تَمَامٌ مَا وَضَعَ
لَهُ، أَمَا لَوْ أُطْلِقَ وَأُريدَ بِهِ اللَّفْظُ، أَوْ مَطْلُقُ الْحَدِيثِ الْمَدْلُولِ عَلَيْهِ ضَمْنًا عَلَى الْإِتْسَاعِ فَهُوَ
كَالاسْمِ فِي الْإِضَافَةِ، وَالْإِسْنَادُ إِلَيْهِ كَقَوْلِهِ تَعَالَى: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا وَقَوْلِهِ: يَوْمَ يَنْفَعُ
الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ وَقَوْلِهِمْ:

تَسْتَعِجُ بِالْبَعِيدِ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَرَاهُ.

وإنما عدل هاهنا عن المصدر إلى الفعل لما فيه من إيهام التجدد وحسن دخول
الهمزة، وأم عليه لتقرير معنى الاستواء وتأكيده، فإنها جردتا عن معنى الاستفهام
لمجرد الاستواء، كما جردت حروف النداء عن الطلب لمجرد التخصيص في قولهم:
اللهم اغفر لنا أيتها العصابة.

والإنذار: التخويف أريد به التخويف من عذاب الله، وإنما اقتصر عليه دون البشارة
لأنه أوقع في القلب وأشد تأثيراً في النفس، من حيث إن دفع الضر أهم من جلب النفع،
فإذا لم ينفع فيهم كانت البشارة بعدم النفع أولى، وقرأ: **أَنْذَرْتَهُمْ** بتحقيق الهمزتين
وتخفيف الثانية بين بين، وقلبها ألفاً وهو لحن لأن المتحركة لا تقلب، ولأنه يؤدي إلى
جمع الساكنين على غير حدة، وبتوسيط ألف بينهما محققتين، وبتوسيطها والثانية
بين بين وبجذف الاستفهامية، وبجذفها وإلقاء حركتها على الساكن قبلها.

ترجمہ:

کفار کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا نفع مند نہ ہونے میں برابر ہے۔

سواء علیہم.... الخ

سواء اسم بمعنى استواء ہے جو مصدر ہے اور اس کو اسی طرح ما قبل کلام کی صفت بنایا جاتا ہے جس طرح دوسری مصادر کو
صفت بنایا جاتا ہے۔ (یعنی یا تو یہ بمعنی مستوا اسم فاعل کے معنی میں ہے اور یا اس سے پہلے مضاف محذوف ہے جو ذو ہے) اللہ
تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں بھی سواء ما قبل کلام کی صفت ہے

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

اے اہل کتاب تم ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان مساوی ہے۔

اس آیت میں سواء اعراب میں کلمتہ کے تالیف ہے اور مجرور ہے اور یہ اس کی صفت محوی ہے۔ مذکورہ آیت طیبہ میں سواء ان کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور سواء کا مابعد کلام بتاویل مصدر سواء بمعنی مستو کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ گویا اصل عبارت اس طرح ہے کہ،

ان الذین کفروا مستو علیہم انذارک و عدمہ
بے شک کافروں کے لئے آپ کا ڈرنا اور نہ ڈرانا مساوی ہے۔

یا مستوا اپنے مابعد

انذرتمہم ام لم تنذرہم

جو مبتداء ہے، کی خبر ہے۔ اس صورت میں اصل عبارت اس طرح ہوگی۔

انذارک او عدمہ مستو علیہم

اس مذکورہ عبارت میں

انذرتمہم ام لم تنذرہم

کو بتاویل مصدر کر کے مبتداء بنایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ فعل ہیں اور فعل مسند الیہ نہیں ہوتا تو یہاں اس کو مبتداء کیسے بنا دیا

گیا؟

اس کا جواب

والفعل انما یمتنع الاخبار عنہ... الخ

کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یعنی فعل کو اس وقت مسند الیہ اور مبتداء بنانا اس وقت ممتنع ہوتا ہے جب اس سے تمام ماوضع کہ معنی

مراد لیا جائے۔

تمام ماوضع لہ سے تین چیزیں مراد ہیں:

1- معنی مصدری پر دلالت کرتا ہے۔

2- وہ خاص وزن پر ہو۔

3- مصدری معنی کا کسی زمانہ کے ساتھ اقتران ہو۔

مگر جب اس فعل سے صرف لفظ مراد ہوں یا اس سے مصدری معنی مراد ہو، جس پر وہ ضمناً دلالت کرتا ہے تو ان صورتوں

میں اس کو مضاف اور مضاف الیہ اور مسند الیہ بنانا جائز ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ اسم ہی کی طرح ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا

۴

وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا

یہاں امنو، قیل کا نائب قائل مندا لیا ہے اور دوسری مثال،

اٰی یَوْمَ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صَدَقَتُهُمْ

یہاں

یَنْفَعُ صَدَقَتُهُمْ یَوْمَ کا مضاف الیہ ہے۔ کیونکہ یہ مصدری معنی میں ہے

اٰی یَوْمَ لَنْفَعَهُمْ

اسی طرح شاعر کا قول ہے۔

تَسْمَعُ بِالصَّغْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَرٰهَ

وَسَتَعْرِفُ قَلْدَرَةَ اَنْ فَتَحَ فَاہَ

نعمان ابن منذر نے کہا کہ تیرا معیری کون لینا ہی کافی ہے، اس کے دیکھنے سے اور تو اس کی قدر معلوم کر لے گا۔ ملاقات

کے وقت جب وہ تم سے اپنے منہ سے بات کرے گا۔

اس شعر میں تَسْمَعُ، سَمَاعُکَ کے معنی میں ہے۔

سوال عدول:

اس مقام پر امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک سوال کا جواب ارشاد فرما رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب یہاں اس کو

مصدر کے معنی میں استعمال کرنا تھا تو اس سے فعل کی طرف عدول کیوں کیا گیا؟

جواب:

تاکہ سننے والے کے دل میں ڈرانے کے تجدد اور حدوث کا وہم پیدا کر دیا جائے کیونکہ جملہ فعلیہ حدوث اور تجدد کے معنی پر

دلالت کرتا ہے۔ اور ہمزہ استفہام اور ام کا فعل پر دخول استواء کے معنی میں تاکید اور پختگی پیدا کرنے کے لئے بہت بہتر ہے

کیونکہ ہمزہ اور ام دو معنوں پر دلالت کرتے ہیں۔

2- استواء

1- استفہام

اس مقام پر یہ صرف استواء کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ ان کو معنی استفہام سے خالی کر دیا گیا ہے۔ اور یہ عربوں کا

مروج اسلوب ہے۔ جس طرح حرف نداء و معانی پر دلالت کرتا ہے۔

2- تعیین متلاوی

1- طلب

لیکن بعض مقامات پر اس کو طلب کے معنی سے خالی کر دیا جاتا ہے۔ اور صرف تعیین و تخصیص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں

اللهم اغفر لنا ايها العصابة اے اللہ ہمیں بخش دے ہم ایک گروہ ہیں۔

یہاں ایبتہا کے لفظ سے صرف نا ضمیر متکلم کی تخصیص مطلوب ہے یعنی نا سے مراد ہمارا گروہ ہے۔

الانذار کا معنی مطلقاً ڈرانا ہے لیکن یہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہے۔ اور اس مقام پر صرف اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور اللہ کریم نے اپنی عادت کے مطابق بشارت کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈرانا دل میں زیادہ اثر رکھتا ہے کیونکہ نفع حاصل کرنے کے مقابلے میں نقصان سے بچنا زیادہ ضروری ہوتا ہے تو جب ڈرانا ان کے لئے باعث نفع نہ ہوا تو بشارت بطریق اولیٰ نفع کا باعث نہ ہوگی۔

ءَأَنْذَرْتَهُمْ

میں دونوں ہمزہ کی چند قراتیں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ذکر کی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ دونوں ہمزہ کو بدستور باقی رکھتے ہوئے پڑھنا۔

2۔ دوسرے ہمزہ کو بین بین یعنی تسہیل کے ساتھ پڑھنا۔

3۔ دوسرے ہمزہ کو الف کے ساتھ قلب کر کے پڑھنا۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ ہمزہ متحرک کو الف کے ساتھ تبدیل نہیں کیا جاتا نیز اس طرح اجتماع ساکنین علی غیر حدہ لازم آتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔

4۔ دونوں ہمزہ کو بدستور جاری رکھتے ہوئے اور درمیان میں الف ساکن کا اضافہ کر کے پڑھا جائے۔

5۔ دونوں ہمزوں کے درمیان الف کا اضافہ کیا جائے اور دوسرے ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا جائے۔

6۔ پہلے ہمزہ (ہمزہ استفہامیہ) کو حذف کر کے پڑھا جائے۔

7۔ پہلے ہمزہ کو حذف کر کے اور اس کی حرکت دوسرے ہمزہ کو دے کر پڑھا جائے۔

متن:

لَا يُؤْمِنُونَ

جملة مفسرة لإجمال ما قبلها فيما فيه الاستواء فلا محل لها أو حال مؤكدة أو بدل عنه. أو خبر إن والجملة قبلها اعتراض بما هو علة الحكم.

والآية مما احتج به من جوز تكليف ما لا يطاق، فإنه سبحانه وتعالى أخبر عنهم بأنهم لا يؤمنون وأمرهم بالإيمان، فلو آمنوا انقلب خبره كذبا. وشمل إيمانهم بأنهم لا يؤمنون فيجتمع الضدان، والحق أن التكليف بالمستنع لذاته وإن جاز عقلاً من حيث

إن الأحكام لا تستدعي غرضاً سبباً الامتثال، لكنه غير واقع للاستقراء، والإخبار بوقوع الشيء أو عدمه لا يدعى القدرة عليه كإخباره تعالى عما يفعله هو أو العبد باختياره، وفائدة الإنذار بعد العلم بأنه لا يندفع إلزام الحجة، وحيارة الرسول فضل الإبلاغ، ولذلك قال سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَدْعَوْهُمْ لَهُمْ أَمْ أَنْتُمْ صَامِتُونَ.

وفي الآية إخبار بالغيب على ما هو به إن أريد بالموصول أشخاص بأعيانهم فهي من المعجزات.

ترجمہ:

یہ فاعل اور فعل مل کر جملہ مفسرہ ہے اور اس کے ماقبل کلام میں جو اجمال ہے اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ یعنی وہ چیز جس میں ڈرانا یا نہ ڈرانا مفید نہیں وہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے دریں صورت اس جملہ کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوگا۔ یہ جملہ علیہم میں صم سے حال موکدہ ہے یعنی ماقبل کلام میں تاکید پیدا کر رہا ہے۔ یا یہ ماقبل جملہ سے بدل اشتمال ہے یعنی یہ ماقبل جملہ کے متعلق معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کا متعلق ما فیہ الاستواء ہے۔

لایومنون اپنے فاعل کے ساتھ مل کر ان کی خبر ہے اور اس سے ماقبل جملہ، جملہ معترضہ ہے اور یہ اس حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ جو الذین کفروا پر لگایا گیا ہے، کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ کیونکہ انہیں کے لئے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔

امام بیضاوی اور تکلیف مالا یطاق کا جواز:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے کہ یہ آیت ایسی آیات میں سے ہے جن سے ان لوگوں نے دلیل قائم کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو ایسے عمل کا مکلف بنانا عقلاً جائز ہے جو اس کی طاقت میں نہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے خبر دی ہے کہ مصر علی الکفر ایمان نہیں لائیں گے اب اگر انہیں یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ ایمان لائیں، اب اگر وہ ایمان لاتے ہیں اور امنوا میں جو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں تو اس خبر کا جھوٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نیز ان کا اس آیت لا یومنون پر بھی ایمان لانے کو وہ حکم شامل ہوگا تو اس طرح دو ضدیں جمع ہو جائیں گی۔ (ایمان لانا اور نہ لانا) او اجتماع ضدین محال ہے۔

ان دونوں دلیلوں سے ثابت ہوا کہ ان کا ایمان لانا محال ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کریم ان کو مکلف بنا رہا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ کسی کو ممتنع لذاتہ کا مکلف بنانا عقلاً جائز ہے کیونکہ احکام

کے مطابق عمل پیرا ہونے کا حکم دینا کسی غرض سے وابستہ نہیں ہوتا خصوصاً وہ احکام جن میں مامور سے اطاعت اور اتباع کرانا مقصود ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اگر شریعت کے احکام میں تنبیح اور استقراء کہا جائے تو ایسا کوئی حکم موجود نہیں جس کو بجالانے کا حکم دیا گیا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے کسی کام کے واقع ہونے یا نہ ہونے کی اپنے علم ازلی کے مطابق خبر دینا اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ مامور سے اس کام کرنے کی قدرت اور آلات چھین لئے گئے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا کہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے کسی کام کو انجام دے گا یا وہ اپنے بندوں میں سے کسی کے متعلق یہ خبر دے دے کہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے اس کام کو عملی جامہ پہنائے گا تو یہ خبر دینا اس کام کے نہ کرنے کے اختیار کو سلب نہیں کرتا۔

کفار کو ڈرانے کا حکم کیوں؟

سوال: جب اللہ کریم کو یہ علم تھا کہ کافر ایمان نہیں لائیں گے اور ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا باعث نفع نہیں تو پھر ان کو ڈرانے اور تبلیغ کا حکم کیوں دیا گیا؟

جواب: اتمام حجت کے لئے یہ حکم دیا گیا تاکہ بروز قیامت یہ نہ کہیں کہ نہ ہی ہمیں تبلیغ کی گئی اور نہ ہی عذاب سے ڈرایا گیا جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ عزوجل ہے۔

إِنَّا كُنَّا هَذَا غٰفِلِينَ، لَوْلَا أَرْسَلْنَا إِلَيْكَ رَسُولًا فَتَتَّبِعِ آيَاتِكَ وَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔
ہم تو اس سے غافل تھے آپ نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی اتباع کرتے اور
مومنین سے ہو جاتے۔

مزید اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو تبلیغ کرنے کی فضیلت اور ثواب مل جائے اسی لئے فرمایا،
سواء علیہم

یعنی ان کافروں کو ڈرانا یا نہ ڈرانا مفید نہیں، یہ نہیں فرمایا کہ آپ ﷺ کے لئے جیسا کہ بتوں کے متعلق فرمان باری
تعالیٰ،

سواء علیکم ادعوا تموہم ام انتم صامتون
تمہارے اوپر برابر ہے چاہے تم ان کو پکارو یا خاموش رہو۔

اللہ کریم نے جو ان کے ایمان نہ لانے کی خبر دی وہ غیب ہے جس پر آیت کریمہ الذین کفرو اولالت کرتی ہے کہ اس
سے مخصوص کافر مراد لئے جائیں مثلاً عقبہ، شیبہ اور ابولہب وغیرہ۔ چونکہ بالواسطہ یہ خبر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے سامنے پیش
کی اس لئے یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہوئی۔

مفہوم کفر:

(کفر) الکفر (Infidelity)

اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپالیتی ہے۔ اسی طرح کاشکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لئے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔

سب سے بڑا کفر:

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔ پھر کفر ان کا لفظ زیادہ نعمت کا انکار کرنے کے معنی ہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار یہ دین کے معنی میں اور کفور کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَأَبَى الظَّالِمُونَ إِلَّا كُفُورًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 99) تو ظالم نہیں مانتے بے ناشکری گئے۔

مساواة کی تحقیق:

(سوی) المساواة (Equality)

مکان سوی و سوا کے معنی وسط کے ہیں اور سوا و سوی و سوی سے کہا جاتا ہے جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہوں اور یہ یعنی سوا و صف بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور طرف بھی لیکن اصل میں یہ مصدر ہے قرآن میں ہے۔

"فِي سَوَاءٍ الْجَحِيمِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 55) تو اس کو وسط دوزخ میں۔

"وَسَوَاءٌ السَّبِيلِ" (سورۃ القصص آیت نمبر 22) تو وہ (سیدھے راستے سے۔

"فَأَنبِذُوا إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 58)

تو ان کا عہد انہیں کی طرف پھینک دو اور برابر کا جواب دو۔

تو یہاں علی سوا سے عادلانہ حکم مراد ہے جیسے فرمایا:

"إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 64)

ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے۔

اور آیات: "سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 6)

انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔

"سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" (سورۃ المنافقون آیت نمبر 6)

ان پر ایک سا ہے تم ان کی معافی چاہو یا نہ چاہو۔

تحقیق الانذار اور انذار و نذیر میں فرق:

(ن ذن النذر (Frighten))

الانذار کے معنی کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل تبشیر کے معنی کسی اچھی بات کی خوشخبری سنانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى" (سورۃ اللیل آیت نمبر ۱۴)
ستو میں تمہیں ڈراتا ہوں اس آگ سے جو بھڑک رہی ہے۔

النذیر کا معنی:

کے معنی منذر یعنی ڈرانے والا ہیں، اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس میں خوف پایا جائے خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَمَا آتَاكَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر ۹) اور میں نہیں مگر صاف ڈرسانے والا۔

ام کا استعمال:

(ام حرف) ام

جب یہ ہمزہ استفہام کے بالمقابل استعمال ہو تو بمعنی اور ہوتا ہے جیسے ازید فی الدار ام عمرو۔ یعنی ان دونوں میں سے کون ہے؟ اور اگر ہمزہ استفہام کے بعد نہ آئے تو بمعنی بل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ الْأَبْصَارُ" (سورۃ ص آیت نمبر 63)
یا آنکھیں ان کی طرف سے پھر گئیں۔

ایمان کے معانی:

(امن) الايمان

کے ایک معنی شریعت محمدی ﷺ کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّظْرِي وَالضَّبِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 62)

بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصراہیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔

اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص منصف ہو سکتا ہے جو توحید کا اقرار کر کے شریعت محمدی ﷺ میں داخل ہو جائے اور بعض

نے آیت،

"وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَهُمْ يُكَفِّرُونَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 106)
اور ان میں اکثر وہ ہیں کہ اللہ پر یقین نہیں لاتے مگر شرک کرتے ہوئے۔

[سورة البقرة (2) : آية 7]

خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (7)

ترجمہ:

"اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھٹائوپ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب۔"

متن:

خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ
تعلیل للحکم السابق وبيان لما يقتضيه.

والختم الكتم، سمي به الاستيثاق من الشيء بضرب الخاتم عليه لأنه كتم له والبلوغ آخره نظراً إلى أنه آخر فعل يفعل في إحرازة. والغشاوة: فعالة من غشاها إذا غطاها بنيت لها يشتمل على الشيء، كالعصابة والعمامة ولا ختم ولا تغشية على الحقيقة، وإنما المراد بهما أن يحدث في نفوسهم هيئة تمرنهم على استحباب الكفر والمعاصي، واستقباح الإيمان والطاعات بسبب غيهم، وانهما كهم في التقليد وإعراضهم عن النظر الصحيح، فتجعل قلوبهم بحيث لا ينفذ فيها الحق، وأسماعهم تعاف استماعه فتصير كأنها مستوثق منها بالختم، وأبصارهم لا تجتلي الآيات المنصوبة لهم في الانفس والآفاق كما تجتليها أعين المستبصرين، فتصير كأنها غطي عليها. وحيل بينها وبين الإبصار، وسماها على الاستعارة ختماً وتغشية. أو مثل قلوبهم ومشاعرهم المؤوفة بها بأشياء ضرب حجاب بينها وبين الاستنفاع بها ختماً وتغطية، وقد عبر عن إحداث هذه الهيئة بالطبع في قوله تعالى: أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَاسْمَعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ. وبالاعمال في قوله تعالى:

وَلَا تُطِيعُ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا، وبالاقساء في قوله تعالى: وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً
وهي من حيث إن الممكنات بأسرها مستندة إلى الله تعالى واقعة بقدرته أسندت إليه

ومن حيث إنها مسببة مما باقر فوه بدليل قوله تعالى: بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ
وقوله تعالى: ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَرَدَّتْ آيَةُ نَاعِيَةِ عَلَيْهِمْ
شناعة صفتهم ووخامة عاقبتهم.

ترجمہ:

”اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھناٹو پ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب۔“
یہ آیت کریمہ ماقبل کلام میں بیان کردہ حکم کی علت سبب اور ان کا مقتضی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی وضاحت اور بیان
بھی ہے۔

مفرد کلمات کے معانی:

الختم یہ بمعنی کتم ہے جس کا مطلب چھپانا ہے۔

2- کسی چیز پر مہر لگا کر اسے قابل وثوق بنا دینے کو بھی ختم کہتے ہیں کیونکہ کسی چیز پر مہر لگا کر اس چیز کو پوشیدہ رکھنا ہوتا ہے۔

3- وہ ختم کا معنی کسی چیز کے آخر اور انتہاء کو پہنچنا بھی ہے کیونکہ کسی چیز کے محفوظ کرنے میں مہر لگانا آخری فعل ہوتا ہے۔

الغشاوة یہ فعالہ کے وزن پر ہے اور غشاہ کا معنی اس نے اس کو ڈھانپ لیا سے مشتق ہے اور یہ وزن اس چیز پر دلالت
کرنے کے لئے بنایا گیا ہے جو کسی چیز پر مشتمل اور لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے عصابہ جس کا معنی گروہ اور پٹی ہے کیونکہ گروہ میں
بھی کچھ افراد ہوتے ہیں اور پٹی زخم پر لپٹی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح عمامہ بمعنی پگڑی فعالہ کے وزن پر ہے کیونکہ وہ بھی سر کو
ڈھانپے ہوئے ہوتی ہے۔

(مزید امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کا جواب دے رہے ہیں کہ جب ان کے دلوں، کانوں پر مہر لگا دی گئی اور ان
کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا تو ایمان نہ لانے کی وجہ سے انہیں عذاب عظیم کی وعید کیوں سنائی گئی ہے۔)
امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ حقیقت میں نہ تو مہر لگائی گئی اور نہ ان کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل کئے گئے بلکہ مجازاً
اس حقیقت کو بیان کیا جا رہا ہے جو انہوں نے خود پیدا کر لی کہ ناحق کہ بات سمجھتے ہیں اور نہ اسے سنتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی قدرت
کی آیات کو دیکھتے ہیں کیونکہ جب انہوں نے کفر عناد اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے خود ایسی حالت پیدا کر لی تو اسی کو ختم
اور غشاوة کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا اس حالت نے انہیں کفر اور معاصی کو پسند کرنے اور ایمان و اطاعت کو ناپسند کرنے کا عادی بنا
دیا ہے اور اس حالت کے پیدا ہونے کے سبب ان کی گمراہی، اندھی تقلید میں انہماک ہے جس سے وہ صحیح نظر و فکر سے اعراض
کرنے لگے اور اس حالت نے ان کو ایسا بنا دیا کہ حق کی بات ان کے دلوں پر اثر انداز نہ ہوتی اور اس نے کانوں کو ناکارہ اور
ماوف بنا دیا جس کی وجہ سے وہ حق کی بات سننے سے نفرت کرنے لگے تو گویا وہ ایسے ہو گئے جیسے ان پر مہر لگا کر انہیں بند کر دیا گیا
اور ان کی آنکھیں اسی طرح ہو گئے کہ وہ ان آیات کو جو ان کے نفوس و اطراف عالم میں پھیلا دی گئی ہیں۔ انہیں دیکھنے سے عاجز

ہو گئے تو اب ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ ان کی آنکھیں دیکھتی ہی نہیں اور نہ ہی ان آیات سے بصیرت حاصل کرتی ہیں تو گویا ان کے سامنے پردہ حائل کر کے انہیں ڈھانپ دیا گیا ہو اور وہ پردہ ان آیات اور ان کی روشن نگاہوں کے درمیان دیکھنے میں آٹ بن گیا اب اسی حالت کو بطور استعارہ تمثیلیہ اللہ کریم نے ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تعبیر فرمادیا یا ان کے دلوں پر نا کارہ مشاعر کو ایسی اشیاء کے ساتھ تشبیہ وے دی گئی ہے جن کے اپنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے درمیان پردے حائل کر دیئے گئے ہوں تو اس چیز کو ختم اور تغشیۃ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

اور یہ کیفیت جو ان کے اندر ان کی غلط کاریوں کی وجہ سے پیدا کر دی گئیں اس کو کبھی طبع کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے فرمایا،

أُولَئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَسَمِعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ. (سورۃ النحل آیت نمبر 108)

یہ ہیں وہ جن کے دل اور کان اور آنکھوں پر اللہ نے فہر کر دی ہے۔

اور کبھی اس حالت کو اغفال کے ساتھ تعبیر کیا جیسے ارشاد باری تعالیٰ،

وَلَا تُطِيعُ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا (سورۃ الکہف آیت نمبر 28)

اور اس کا کہنا نہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔

اور کبھی اس کو قساوت کے ساتھ بیان کیا گیا جس طرح اللہ کریم کا ارشاد ہے،

وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَسِيَةً وَأُورَانُ كَالْحِجَابِ (سورۃ المائدہ آیت نمبر 13)

اور اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممکنات میں سے ہے اور تمام ممکنات کی نسبت اللہ کریم ہی کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ تمام کی تمام حقیقت اس کی قدرت سے معرض وجود میں آتی ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ ان کے دلوں اور آنکھوں پر مہر لگانا اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل کرنا ان کے کفر و عناد اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ یعنی اس حالت کے پیدا کرنے کے وہ خود سبب ہیں۔

اللہ کریم کا قول ہے: بَل طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ

کہ اللہ کریم نے ان پر کفر کی وجہ مہر لگادی ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا فَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ

اور یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ وہ ایمان لے آئے پھر مرتد ہو کر کفر اختیار کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی اس لئے ان

کے برے اور قبیح فعل اور برے انجام کی مزاحمت اور ان کی قباحت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ آیت طیبہ ذکر کی گئی ہے۔

متن:

واضطربت المعتزلة فيه فذكروا وجوهاً من التأويل:

الاول: أن القوم لما أعرضوا عن الحق وتمكن ذلك في قلوبهم حتى صار كالطبيعة لهم، شبه بالوصف الخلقى النجبول عليه.

الثاني: أن المراد به تمثيل حال قلوبهم بقلوب البهائم التي خلقها الله تعالى خالية عن الفطن، أو قلوب مقدر ختم الله عليها، ونظيرة: سال به الوادي إذا هلك، وطارت به العنقاء إذا طالت غيبته.

الثالث: أن ذلك في الحقيقة فعل الشيطان أو الكافر، لكن لما كان صدوره عنه بإقدارة تعالى إياه أسند إليه إسناد الفعل إلى السبب.

الرابع: أن أعراقهم لما رسخت في الكفر واستحكمت بحيث لم يبق طريق إلى تحصيل إيمانهم سوى الإجماع والقسر، ثم لم يقسرهم إبقاء على غرض التكليف، عبر عن تركه بالختم فإنه سد لإيمانهم. وفيه إشعار على تمادي أمرهم في الغي وتناهي انهماكهم في الضلال والبعي.

الخامس: أن يكون حكاية لما كانت الكفرة يقولون مثل: قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ تَهْكَأً وَاسْتَهْزَاءً بِهِمْ كَقَوْلِهِ تَعَالَى: لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ الْآيَةَ.

ترجمہ:

ختم اور غشاوہ کو اللہ کی طرف منسوب کرنے میں اختلاف:

معتزلہ، اہلسنت وجماعت اور اصحاب ظاہران افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں علیحدہ علیحدہ نظریات رکھتے

ہیں۔

جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

اصحاب ظاہر کا نظریہ:

کا کہنا ہے کہ یہاں ختم اور غشاوہ کی نسبت اللہ کریم کی طرف حقیقی ہے وہ کہتے ہیں کفر اور معاصی کا ارتکاب کرنے والوں کے کانوں اور دلوں پر فی الحقیقت مہر لگا دی گئی ہے جس کی وجہ سے نہ وہ حق بات قبول کر سکتے ہیں اور نہ ہی اسے سن سکتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل کر دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے حق پر دلالت کرنے والی آیات کو نہ وہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان سے بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔

امام بیضاوی ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ حقیقت میں نہ ان کے دل اور کان مہر زدہ ہیں اور نہ ہی ان کی آنکھوں کے دسامنے پردے لٹکائے گئے ہیں۔

اس لئے یہاں ختم اور غشاوۃ کی نسبت اللہ کریم کی طرف حقیقی نہیں بلکہ ان کو بطور استعارہ تمثیلیہ ذکر کیا گیا ہے اور ان کے ناکارہ اعضاء کو ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور مشہہ کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے انہوں نے فرمایا،

لا ختم ولا تغشیه

یعنی نہ ہی حقیقت میں مہر لگائی گئی اور نہ ہی ان کی آنکھوں پر پردے ڈالے گئے۔

معتزلہ کا نظریہ:

کہتے ہیں کہ یہاں ان الفاظ کا نہ حقیقی معنی مراد لینا جائز ہے اور نہ ان کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا جائز ہے۔ کیونکہ کسی کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ڈالنا اور نیک اعمال سے روکنا بہت برا ہے اور جس طرح برے افعال سے انجام دینا جائز نہیں اسی طرح ان کو اللہ کریم کی طرف منسوب کرنا بھی جائز نہیں اس لئے یہاں ان کا مجازی معنی مراد ہوگا جس کی چند درج ذیل توجیہات ہو سکتی ہیں۔

- 1- یہاں پر اللہ کریم نے کفار کے حق سے اعراض کرنے اور ان کے دلوں میں کفر کے راسخ ہونے کو تخلیقی وصف کے ساتھ تشبیہ دی ہے یعنی کفر اور گمراہی ان کے دلوں میں اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ گویا ان پر مہر لگا دی گئی ہے اس لئے وہ حق قبول کرنے سے رکے ہوئے ہیں اور اس تشبیہ دینے کو ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تعبیر فرمایا۔
- 2- کفار کے ایمان سے خالی دلوں کو ان جانوروں کے دلوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی جو عقل سے خالی ہیں یا ان کو ایسے دلوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جن کے متعلق فرض کر کیا گیا ہے کہ ان پر مہر لگ چکی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے کسی کی ہلاکت کو وادی کی طرف اور لمبی جدائی کو عنقاء کی طرف منسوب کر لیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ

سال بہ الوادی

کہ وادی اسے بہا کر لے گئی اور

طارت بہ العنقاء

عنقاء پرندہ اسے اڑا کر لے گیا۔ حالانکہ نہ ہی وادی نے کسی کو ہلاک کیا اور نہ ہی عنقاء اڑا کر لے گیا۔

- 3- ختم اور اضلال در حقیقت شیطان یا کافر کا فعل ہے۔ لیکن ان سے یہ فعل اللہ کریم کے انہیں قدرت دینے سے صادر ہوا اس لئے اس کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی جیسے سبب کی نسبت مسبب کی طرف کر دی جاتی ہے یہ اسناد حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔

- 4- کافروں کے دلوں میں کفر اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ سوائے جبر و اکراہ کے ایمان لانے کا کوئی راستہ باقی نہ تھا، اور

اللہ کریم عزوجل نے انہیں مکلف بنانے کی غرض سے اور سزا و جزا کے مستحق ہونے کی وجہ سے ان پر جبر و اکراہ نہیں کیا بلکہ انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا اور ایمان لانے پر مجبور نہ کرنا گویا ایمان لانے سے روکنا تھا تو اسی کو ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تشبیہ دے کر تعبیر کر دیا۔

5- یہ ختم اور اضلال آخرت میں ہوگا اور اس فعل کو فعل ماضی کے ساتھ اس لئے بیان فرما دیا کہ اس کا وقوع یقینی تھا اور اس تو جیہہ پر فرمان باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمِّيًّا وَبُكْمًا وَصُمًّا
قیامت کے دن چہروں کے بل اندھا، گونگا اور بہرہ کر کے اٹھائیں گے۔

متن:

السادس: أن ذلك في الآخرة، وإنما أخبر عنه بالماضى لتحققه وتيقن وقوعه ويشهد له قوله تعالى:

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمِّيًّا وَبُكْمًا وَصُمًّا.

السابع: أن المراد بالختم وَنَمَّ قُلُوبَهُمْ بسبب تعرفها للملائكة، فيبغضونهم وينفرون عنهم، وعلى هذا المنهاج كلامنا وكلامهم فيما يضاف إلى الله تعالى من طبع وإضلال ونحوها.

ترجمہ:

6- چونکہ کفار خود کہا کرتے تھے کہ اے محمد ﷺ جس کام کی آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اس کے سمجھنے سے ہمارے دلوں پر پردہ ہے کیونکہ وہ یہ بات سمجھتے ہی نہیں اور ہمارے کانوں پر بوجھ ہے کہ وہ حق کی بات سنتے ہی نہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے پردے حائل ہیں کہ وہ آیات کو دیکھتے ہی نہیں تو اسی کو بطور استہزاء انہی کے الفاظ میں نقل کر دیا گیا ہے۔

7- ختم سے مراد کفار کے دلوں پر اور چہروں پر آخرت میں ایسے نشانات لگانا ہے جن سے ملائکہ انہیں پہچان لیں اور ان سے بغض اور نفرت کرنے لگیں اور یہ نشانات ایمان نہ لانے اور کفر اختیار کرنے ہوں گے ان ہی نشانات کو غشاوۃ اور ختم سے تعبیر کر دیا۔

متن:

وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ

مَعْطُوفٌ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: وَخَتَمْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَلِلَّوْفِاقِ عَلَىٰ الْوَقْفِ عَلَيْهِ.

ولأنها لما اشتركا في الإدراك من جميع الجوانب جعل ما يمدعها من خاص فعلها المختم الذي يمدع من جميع الجهات، وإدراك الابصار لما يختص بجهة المقابلة جعل الباع لها عن فعلها الغشاوة المعتصمة بتلك الجهة، وكرر الجار ليكون أدل على شدة الختم في البوضعين واستقلال كل منهما بالحكم. ووجد السبع للأمن من اللبس واعتبار الاصل، فإنه مصدر في أصله والصادر لا يجمع، أو على تقدير مضاف مغل وعلى حواس سمعهم.

والابصار جمع بصر وهو: إدراك العين، وقد يطلق مجازاً على القوة الباصرة، وعلى العضو وكذا السبع، ولعل المراد بهما في الآية العضو لأنه أشد مناسبة للختم والتغطية، وبالقلب ما هو محل العلم وقد يطلق ويراد به العقل والمعرفة كما قال تعالى: إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ. وإنما جاز إمالتها مع الصاد لأن الراء المكسورة تغلب المستعلية لما فيها من التكرير. وغشاوة رفع بالابتداء عند سيبويه، وبالجار والمجرور عند الاخفش، ويؤيدة العطف على الجملة الفعلية. وقرأ بالنصب على تقدير، وجعل على أبصارهم غشاوة، أو على حذف الجار وإيصال الختم بنفسه إليه والمعنى: وختم على أبصارهم بغشاوة، وقرأ بالضم والرفع، وبالفتح والنصب وهما لغتان فيها. و«غشوة» بالكسر مرفوعة، وبالفتح مرفوعة ومنصوبة و«عشاوة» بالعين الغير المعجبة.

ترجمہ:

مذکورہ بالا عبارت میں وعلى سمعهم کا عطف على قلوبهم پر ہے اور اس عطف کی تائید میں تین دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

1- قرآن کریم کو ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے،

ختم الله على سمعهم وقلوبهم

یہاں پر قلب کا عطف سمع پر ہے اور یہ اس قول کا مصداق ہے مفسر القرآن بعضہ بعضاً کہ قرآن کریم کا ایک حصہ

دوسرے حصہ کی وضاحت کرتا ہے۔

2- تمام قراء کا اس پر اتفاق ہے کہ على سمعهم پر وقف تام کیا جاتا ہے جو اس کا مابعد سے اعرابی تعلق منقطع کر دیتا ہے۔

3- کیونکہ سمع اور قلب تمام جہات سے ادراک حاصل کرنے میں شریک ہیں اس لئے ان دونوں کو ان کے خاص فعل

ادراک سے روکنے کے لئے جو مانع بنایا گیا ہے، وہ ختم ہے جو ساری جہات سے ادراک کرنے سے روکتی ہے یہ بھی علی سمعہم کے علی قلوبہم پر عطف کا تقاضا کرتا ہے چونکہ ابصار کا ادراک صرف سامنے اور مقابلہ والی جہت کے ساتھ خاص ہے اس لئے مانع بھی وہ بنایا جو ان کے سامنے والی جہت سے ادراک کرنے سے روک دے اور وہ ہے غشاوۃ۔

معطوف علیہ اور معطوف پر علی حرف جر مکرر ذکر کیا گیا ہے تاکہ دونوں مقامات یعنی سمع اور قلب پر مہر کی شدت پر دلالت کرے اور دونوں کے مستقل بال حکم ہونے کو ظاہر کرے کیونکہ جب حرف جر مکرر ہوگا تو اس کا عامل بھی مکرر ہوگا اور عامل کا تکرار اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مہر بھی شدید ہوگی اور معطوف و معطوف علیہ پر بھی مستقل حکم ہوگا۔ اس مقام پر علی سمعہم کو علی قلوبہم پر عطف کیا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ معطوف علیہ جمع ہے اور معطوف واحد ہے جس کو جمع کی ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے یہ اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ یہاں بھی علی اسماعہم ہونا چاہئے تھا نہ کہ علی سمعہم۔

تو امام بیضاوی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ سمع کے لفظ کو مفرد لانے کی تین وجوہات ہیں۔

1- یہاں التباس کا اندیشہ ہے کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ مخاطبین پر یہ بات ملتبس نہیں ہوگی کہ ایک ہی کان اور سمع میں کفار مشترک ہوں گے کیونکہ سمع بمعنی کان ان اشیاء میں سے ہے جو متصل ہوتی ہیں اور اس کو ہر ایک سمجھتا ہے۔ کہ کان ہر فرد کے الگ ہی ہوتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

اشتریت راس کبشتین

میں نے دو مینڈھوں کا سر خرید اب ہر ایک کو معلوم ہے کہ دو مینڈھوں کا ایک سر نہیں ہوتا بلکہ دو الگ الگ ہوتے ہیں چونکہ التباس کا اندیشہ نہیں اس لئے راس واحد ذکر کر دیا اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں ہوگا۔

2- چونکہ سمع مصدر ہے اور مصدر ہمیشہ واحد ہی ذکر کیا جاتا ہے اس لئے اصل کا اعتبار کرتے ہوئے سمع کا لفظ واحد ذکر فرمادیا۔

3- یا سمع سے پہلے مضاف مخذوف ہے اور مخذوف پر اعتماد کرتے ہوئے سمعہم ذکر فرمادیا اصل عبارت،

علی حواس سمعہم ہے۔

ولا بصار بصیر کی جمع ہے جس کا معنی ہے ادراک العین یعنی آنکھوں سے ادراک کرنا، لیکن مجازاً اس کا اطلاق قوت باصرہ اور دیکھنے کے آلات پر ہوتا ہے یہاں بھی اس سے مراد قوت باصرہ یا آلہ ہے اس لئے اس کو جمع لایا گیا۔ اسی طرح سمع کا بھی مجازاً قوت سماعت اور سننے کے آلہ یعنی کان پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن ان دونوں سے عضو مراد ہے۔

جس کے ساتھ دیکھا اور سنا جاسکتا ہے کیونکہ مہر لگانے اور ڈھانپنے کے لئے عضو ہی مراد لینا مناسب ہے اور قلب سے مراد گوشت کا وہ ٹکڑا مراد ہے جو صنوبری شکل کا ہوتا ہے اور علم کا محل ہوتا ہے اور مجازاً اس کا اطلاق عقل اور معرفت پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد:

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ.

بے شک اس میں ٹھیکت ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس عقل و معرفت ہے۔
یہاں لفظ قلب عقل و معرفت کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

علی ابصار ہم

میں صا و کراء کے مخرج کی طرف امالہ کرنا بھی جائز ہے باوجود اس بات کے کہ صا و حروف مستعلیہ میں سے ہے اور ان میں امالہ جائز نہیں۔ کیونکہ امالہ کا مطلب ہے کہ فتح اور الف کو کسرہ اور یاء کی طرف مائل کر کے پڑھا جائے یعنی ان کو ادا کرتے ہوئے آواز پست کی جائے۔ جبکہ حروف مستعلیہ کو ادا کرتے ہوئے آواز کو بلند کیا جاتا ہے اور اس مقام پر امالہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ الف کے بعد راء مکسور ہے جس کو ادا کرتے ہوئے مخرج میں تکرار پیدا ہوتا ہے گویا راء مکسورہ دورا کے قائم مقام ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو حروف مستعلیہ پر غلبہ دیتے ہوئے الف اور فتح کو یاء کے مخرج کی طرف مائل کر کے پڑھا جاتا ہے اور غشاوہ مگرہ ہونے کے باوجود سیبویہ کے نزدیک مبتداء ہے اور مرفوع ہے، اور الحفش کے نزدیک یہ ظرف کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اس جملہ

غشاوۃ علی ابصار ہم

کو ختم اللہ (جملہ فعلیہ) پر عطف کرنا بھی اسی کی تائید کرتا ہے اور غشاوہ کو فعل محذوف کا مفعول بناتے ہوئے منصوب بھی پڑھا گیا ہے اور اس سے پہلے جعل فعل محذوف ہوگا اصل عبارت یوں ہوگی۔

وجعل علی ابصار ہم غشاوۃ

اور غشاوۃ سے پہلے حرف جر تھا جس کو حذف کر کے فعل کو بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کر دیا گیا ہے۔ اصل میں بغشاوۃ تھا اور اس کو عین کے ضمہ کے ساتھ آخری حرف کے رفع کے ساتھ اور عین کے فتح اور آخری حرف کے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

یعنی غشاوۃ اور غشاوۃ یہ دونوں لغتیں عام مشہور ہیں۔ اس کو غشاوۃ اور غشاوۃ بھی پڑھا گیا ہے اور اسی طرح غشاوۃ، غشاوۃ اور غشاوۃ بھی پڑھا گیا ہے اور بعض قاریوں نے غشاوۃ کو غشاوۃ (ع کے ساتھ) بھی پڑھا ہے۔

متن:

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

وعید و بیان لما يستحقونه. والعذاب كالنكال بناءً، ومعنى تقول: عذب عن الشيء ونكل عنه إذا أمسك، ومنه الماء العذب لأنه يقمع العطش ويردعه ولذلك سمى نقاخاً وفراتاً، ثم اتسع فأطلق على كل ألم قادح وإن لم يكن نكلاً، أي: عقاباً يردع

الجائی عن المعاودة فهو أعم منها. وقيل اشتقاقه من التعذيب الذي هو إزالة العذب كالتقذية والتمريض. والعظيم نقيض الحقيق، والكبير نقيض الصغير، فكما أن الحقيق دون الصغير، فالعظيم فوق الكبير، ومعنى التوصيف به أنه إذا قيس بسائر ما يجانسه قصر عنه جميعه وحقر بالإضافة إليه ومعنى التنكير في الآية أن على أبصارهم نوع غشاوة ليس مما يتعارفه الناس، وهو التعامى عن الآيات، ولهم من الآلام العظام نوع عظيم لا يعلم كنهه إلا الله.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں بھی کافروں کے لئے وعید ہے اور اس سزا کا ذکر بھی جس کے وہ مستحق ہیں۔ عذاب کا لفظ معنی اور صیغہ کے اعتبار سے نکال کی طرح ہے یعنی دونوں لفظوں کا ایک ہی معنی ہے اور ان کا معنی روکتا ہے۔ عرب کہتے ہیں

عذب عن الشيء ونكل عنه اذا امسك

جب کوئی شخص کسی کام سے روک جائے تو کہتے ہیں کہ وہ اس سے روک گیا اور اسی سے بیٹھے پانی کو الماء العذب کہتے ہیں کیونکہ یہ پیاس کو ختم کر دیتا ہے اور روک دیتا ہے اسی وجہ سے شیریں پانی کو نقاح اور فرات بھی کہتے ہیں پھر مجازاً اس کا اطلاق ہر بوجھل درد پر ہونے لگا اگرچہ وہ اس سزا سے نہ ہو جو مجرم کو دوبارہ جنایت کرنے سے روک دیتی ہے اور یہ لفظ یعنی عذاب نکال اور عقاب دونوں سے عام ہے اور بعض نے کہا عذاب کا لفظ تعذیب سے بنا ہے جس کا مطلب ہے عمدہ چیز کو زائل کرنا جس طرح تقذیہ کا معنی آنکھ سے سٹکے کو دور کرنا اور تمريض کا معنی مرض کو دور کرنا ہے یعنی مریض کی تیمارداری اس طرح اچھے انداز میں کرنا کہ اس کا مرض زائل ہو جائے۔ اور حقیر عظیم کی ضد ہے جیسے کبیر کا لفظ صغیر کی ضد ہے جس طرح حقیر، صغیر سے کتر ہوتا ہے اسی طرح عظیم کبیر سے بلند تر ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر عذاب کو عظیم کی صفت کے ساتھ موصوف کرنا اس وجہ سے ہے کہ جب اس کا دوسرے عذابوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو وہ سارے اس سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور اس سے مقابلہ میں قاصر اور حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ اور آیت طیبہ میں عظیم کو نکرہ ذکر کرنا اس وجہ سے ہے کہ ان کی آنکھوں پر جو پردہ ہے وہ اس قسم کا پردہ نہیں جس سے عام لوگ متعارف ہوں اور وہ آیات بینات کو دیکھنے سے جان بوجھ کر اندھے بنے ہوئے ہیں اور ان کے لئے عظیم دردوں سے ایک عظیم الشان عذاب کی قسم ہے جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

الختم کا مفہوم:

(ختم) الختم والطبع۔ (Seal)

کے لفظ دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں کبھی تو ختم اور طبیعت کے مصدر ہوتے ہیں اور اس کے معنی کسی چیز پر مہری کی

طرح نشان لگانا کے ہیں اور کبھی اس نشان کو کہتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔ مجازاً کبھی اس سے کسی چیز کے متعلق وثوق حاصل کر لینا اور اس کا محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے جیسا کہ کتابوں یا دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔ قرآن میں ہے۔

"خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشْوَةً" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 7)

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوٹ ہے۔

"وَحَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَقَلْبِهِمْ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِمْ غِشْوَةً" (سورۃ المجالیۃ آیت نمبر 23)

اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈالا۔

اور کبھی کسی چیز کا اثر حاصل کر لینے سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ مہر نقش ہو جاتا ہے اور اسی سے ختمت القرآن کا محاورہ ہے۔

یعنی قرآن ختم کرایا۔ اور آیت کریمہ:

"خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشْوَةً" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 7)

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوٹ ہے۔

اور آیت:

"قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 46)

تم فرماؤ بھلا بتاؤ تو اگر اللہ تمہارے کان اور آنکھ لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے۔

میں عادت الہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اعتقاد باطل یا محرّمات کے ارتکاب میں حد کو پہنچ جاتا ہے اور کسی طرح

حق کی طرف (التفات نہیں کرتا تو اس کی ہیئت نفسانی کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی خوبی بن جاتی ہے۔

گویا اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمِعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ" (سورۃ النحل آیت نمبر 108)

یہ ہیں وہ جن کے دل اور کان اور آنکھوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے۔

اسی طرح آیات کریمہ:

"وَلَا تُطِيعُ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 28)

جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام حد سے گزر گیا۔

"وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 25)

اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

"وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 13)

اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

میں افعال کن اور قساوت سے بھی علی الترتیب یہی معنی مراد ہیں۔

قولِ جبائی:

جبائی کہتے ہیں کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے ان کے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔ لیکن یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامات سے بے نیاز ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنی ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ" (سورۃ یونس آیت نمبر 65)

آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کلام نہیں کر سکیں گے اور آیت میں نبی کریم ﷺ کو خاتم النبیین فرمانے کے معنی یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی آمد سے سلسلہ نبوت کی مکمل کر دیا ہے (اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔

مسک کی مہر:

اللہ کریم کا فرمان آیت: "خِتَامُهُ مِسْكٌ" (سورۃ المطففین آیت نمبر 26)

جس کی مہر مسک کی ہوگی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ختام کے معنی مایختم بہ کے ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے مگر آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا آخری لفظ اور بیان میں باقی ماندہ جھوٹ مسک کی طرح مہکے گا اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی مگر یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ شراب کو بذات خود لذت ہونا چاہیے اگر وہ بذات خود لذت لڈیز نہ ہو تو اس پر مسک کی مہر لگانا چنداں مفید نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کی لذت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

نوٹ: لفظ اللہ کی تحقیق گزر گئی ہے۔

معنی قلب:

(ق ل ب) قلوب جمع قلب

الشیء کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قلب الثوب (کپڑے کو

الٹنا) اور قلب الانسان کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ لَظَلِيمٌ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 21)
عذاب دیتا ہے جسے چاہے اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہے اور تمہیں اسی کی طرف بھرتا ہے۔

معنی سماعت:

(س م ر ع) السمع. قوت سامعہ (Hearing)

کان میں ایک حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے معنی سننا (مصدر) بھی آتے ہیں اور کبھی اس سے خود کان مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"خَسَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 7)
اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی۔

اور کبھی لفظ سمع کی طرح اس سے مصدری معنی مراد ہوتے ہیں (یعنی سننا) چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"إِيْتَهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمْعٌ ذُلُومٌ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 212)
وہ تو سننے کی جگہ سے دور کر دیئے گئے ہیں۔

"أَوَّلَى السَّمْعِ وَهُوَ شَهِيدٌ" (سورۃ ق آیت نمبر 37)
یا کان لگائے اور متوجہ ہو۔

اور کبھی سمع کے معنی فہم و تدبر اور کبھی طاعت بھی آجاتے ہیں مثلاً تم کہو۔ اسمع ما اقول لک میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو لم تسمع ما قلت لک تم نے میری بات سمجھی نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

"وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا" (سورۃ الانفال آیت نمبر 31)
اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جائیں تو کہتے ہیں ہاں ہم نے سنا ہم چاہتے تو ایسی ہم بھی کہہ دیتے۔

معنی بصارت:

(ب ص ر) البصر (The Sight, Seeing)

کے معنی آنکھ کے ہیں جیسے فرمایا:

"وَمَا أَمْرًا إِلَّا وَجِدَةٌ كَلْبَحٍ بِالبَصْرِ" (سورۃ القمر آیت نمبر 50)

اور ہمارا کام تو ایک بات کی بات ہے جیسے پلک مارنا۔

سورۃ احزاب میں فرمایا:

"وَإِذْ ذُاعَتِ الْاَبْصَارُ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10) اور جبکہ ٹھٹک کر رہ گئیں نگاہیں۔

بصرہ اور بصیرت:

نیز قوت بینائی کو بصر کہہ لیتے ہیں اور دل کی بینائی پر بصرہ اور بصیرت دونوں لفظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے:

"فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصُرْتَكَ الْيَوْمَ حَدِيدًا" (سورۃ ق آیت نمبر 22)

تو ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھایا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

لفظ غشاوة کا معنی:

(غش و) غشبية غشاوة و غشاء (To hide)

اس کے پاس اس چیز کی طرح آیا جو اسے چھپائے غشاوة (اسم) پردہ جس سے کوئی چیز ڈھانپ دی جائے قرآن میں

ہے:

"وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً" (سورۃ الجاثیہ آیت نمبر 23) اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

عذاب کا مفہوم:

(عذب) العذاب (Torture)

سخت تکلیف دینا عذبه تعذیبا اسے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔ قرآن میں ہے۔

"لَا عَذَابَ لَهُ عَذَابًا شَدِيدًا" (سورۃ النمل آیت نمبر 21)

ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا۔

لفظ عذاب کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ عذب (ض) الرجل کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پیراس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور

نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عاذب و عذوب کہا جاتا ہے لہذا تعذیب کے اصل معنی ہیں

کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا۔

عظم کا لغوی و اصطلاحی معنی:

(عظم) العظم (Bone)

عظم الشئی کے اصل معنی کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے ہیں مجازاً ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا

تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یہ معنی قرآن میں ہے:

"عَذَابٌ يَوْمَ عَظِيمٍ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 13)

بڑے سخت دن کا عذاب تھا۔

"قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ" (ص آیت نمبر 67)
تم فرماؤ وہ بڑی خبر ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 8]

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ (8)

ترجمہ:

"اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں۔"

متن:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

لہا افتتاح سبحانہ و تعالیٰ بشرح حال کتاب و ساق لبیانہ، ذکر المؤمنین الذین اخلصوا دینہم للہ تعالیٰ و واطأت فیہ قلوبہم ألسنتہم، وثنی بأضدادہم الذین محضوا الکفر ظاہراً و باطناً ولم یلتفتوا لفتة رأساً، ثلث بالقسم الثالث المذبذب بین القسبین، و ہم الذین آمنوا بأفواہہم ولم تؤمن قلوبہم تکمیلاً للتقسیم، و ہم أخبث الکفرة و أبغضہم إلی اللہ لأنہم موہوا الکفر و خلطوا بہ خداعاً و استہزاءً، ولذلك طول فی بیان خبیثہم و جہلہم و استہزاء بہم، و تہکم بأفعالہم و سجد علی عہم و طغیانہم، و ضرب لہم الامثال و أنزل فیہم إَنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ و قصتہم عن آخرها معطوفة علی قصة البصیرین.

وَالنَّاسِ أَصْلَهُ أَنَسٌ لِقَوْلِهِمْ: إِنْسَانٌ وَأَنَسٌ وَأَنَاسِي فَحَذَفَتْ الْهَيْزَةَ حَذْفَهَا فِي لَوْقَةٍ وَعَوَّضَ عَنْهَا حَرْفَ التَّعْرِيفِ وَلِذَلِكَ لَا يَكَادُ يُجْبَعُ بَيْنَهُمَا. وَقَوْلُهُ:

إِنَّ الْمَنَايَا يَطْلَعْنَ عَلَى الْإِنْسَانِ الْأَمِينِ شَاذٌ. وَهُوَ اسْمٌ جَمْعٌ كَرَجَالٍ، إِذْ لَمْ يَثْبُتْ فِعَالٌ فِي أَبْنِيَةِ الْجَمْعِ. مَا خُوذَ مِنْ أَنَسٍ لِأَنَّهُمْ يَسْتَأْنِسُونَ بِأَمْثَالِهِمْ. أَوْ أَنَسٍ لِأَنَّهُمْ ظَاهِرُونَ مَبْصُرُونَ، وَلِذَلِكَ سَمُوا بِشَرِّ كَمَا سَمِيَ الْجِنُّ جِنًّا لِاجْتِنَابِهِمْ. وَاللَّامُ فِيهِ لِلْجِنْسِ، وَمَنْ مَوْصُوفَةٌ إِذْ لَا عَهْدَ فَكَأَنَّهُ قَالَ: وَمِنَ النَّاسِ نَاسٌ يَقُولُونَ، أَوْ لِلْعَهْدِ وَالْمَعْهُودِ: هُمْ الذِّينَ كَفَرُوا، وَمَنْ مَوْصُولَةٌ مَرَادُهَا ابْنُ أَبِي وَأَصْحَابُهُ وَنَظَرِ أَوْ، فَأَنَّهُمْ مِنْ حَيْثُ إِنَّهُمْ صَمُّوا عَلَى النِّفَاقِ دَخَلُوا فِي عِدَادِ الْكُفَّارِ الْمُخْتَوِّمِ عَلَى قُلُوبِهِمْ، وَاخْتِصَاصِهِمْ بِزِيَادَاتٍ

زادوها على الكفر لا يأتى دخولهم تحت هذا الجنس، فإن الاجناس إنما تتنوع بزيادات
يختلف فيها أبعاضها فعلى هذا تكون الآية تقسيماً للقسم الثانى.

واختصاص الإيمان بالله وباليوم الآخر بالذكر، تخصيص لها هو المقصود الاعظم من
الإيمان وادعاء بأنهم احتازوا الإيمان من جانبيه وأحاطوا بقطريه، وإيدان بأنهم
منافقون فيما يظنون أنهم مخلصون فيه، فكيف بما يقصدون به النفاق، لأن القوم
كانوا يهوداً وكانوا يؤمنون بالله وباليوم الآخر إيماناً كلاً إيمان، لاعتقادهم التشبيه
واتخاذ الولد، وإن الجنة لا يدخلها غيرهم، وأن النار لا تمسهم إلا أياماً معدودة
وغيرها، ويرون المؤمنين أنهم آمنوا مثل إيمانهم، وبيان لتضاعف خبثهم وإفراطهم
فى كفرهم، لأن ما قالوه لو صدر عنهم لا على وجه الخداع والنفاق وعقيدتهم
عقيدتهم لم يكن إيماناً، فكيف وقد قالوه تمويهاً على المسلمين وتهكماً بهم، وفى
تكرار الباء ادعاء الإيمان بكل واحد على الاصلالة والاستحكام.

والقول هو التلفظ بما يفيد، ويقال بمعنى القول، وللمعنى المتصور فى النفس المعبر
عنه باللفظ وللزأى والمذهب مجازاً، والمراد باليوم الآخر من وقت الحشر إلى ما لا
ينتهى، أو إلى أن يدخل أهل الجنة الجنة، وأهل النار النار لأنه آخر الاوقات المحدودة.

ترجمہ:

”اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں۔“

اس آیت کریمہ کا ماقبل سے دو طرح کا تعلق ہے:

1- معنوی 2- لفظی

معنوی تعلق:

اس سورت کی ابتداء میں ایک عظیم الشان کتاب کے تذکرے سے کی گئی ہے۔ اس دعویٰ کہ ساتھ کہ یہ وہ کتاب ہے عاجز
کرنے والی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں۔ پھر جن کی رہنمائی کے لئے اس
ہدایت والی کتاب کو نازل کیا گیا تو ان کے احوال و اوصاف اور ان کا انجام بیان کیا گیا اور دونوں جہاں میں کامیابی کی خوشخبری
بھی سنائی گئی۔ بعض لوگوں نے اس کو تہہ دل سے قبول کر لیا اور بعض نے انکار کر دیا۔ لہذا اس اعتبار سے اس پر ایمان لانے
اور نہ لانے والوں کی تین قسمیں ہیں:

(1) مخلص مومن (2) ظاہراً اور باطناً انکار کرنے والے۔ (3) منافق

پہلا گروہ مومنین:

وہ خوش قسمت جنہوں نے قرآن پاک کو تہ دل سے قبول کیا اور اس پر عمل کر کے منزل مقصود کو پایا، ابدی سعادتوں اور فلاح و کامرانی سے اپنے دامنوں کو بھر لیا ان کو متفقین جیسا بہترین لقب دیا گیا اور ان کو دائمی ہدایت اور ابدی فلاح کی خوشخبری سنائی۔

دوسرا گروہ کافرین:

وہ ازلی بد بخت جنہوں نے اپنے کفر اور گناہوں کی وجہ سے اس کتاب حق کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کی آیات بیانات کا مشاہدہ کرنے اور اس کے چیلنج کا جواب نہ دے سکنے کے باوجود ظاہری اور باطنی طور پر کفر پر مصر رہے اور جس طرح ان کا دل کفر کی گندگی سے آلودہ تھا۔ اسی طرح اپنے ظاہری اور عمل سے بھی اس کا ثبوت پیش کرتے رہے اور ماننے سے صاف انکار کرتے رہے جس کی وجہ سے انہیں دائمی عذاب کا مستحق ہونے کی وعید سنائی گئی اور انہیں کافرین کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

تیسرا گروہ منافقین:

تیسرا گروہ منافقین کا ہے جنہوں نے اپنی جان اور مال کی حفاظت کی خاطر اور دنیاوی مال کے حصول کے لئے، بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا مگر دل میں کفر ہی رہا زبان سے اسلام کا دعویٰ لیکن حقیقت میں کفر میں ہی مبتلا رہے اور ان کی دوزخی پالیسی کی وجہ سے ان کو منافق کہا گیا ان کی مثال نبی کریم ﷺ نے اس بکری سے دی ہے جو زر کی تلاش میں دور یوڑوں کے درمیان پھرتی ہے کبھی ایک ریوڑ میں جاتی ہے اور کبھی دوسرے گروہ میں جا گھستی ہے۔ اسی طرح منافقین جب بھی مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب کافروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان سے تو ہم مذاق کر رہے تھے۔

تو چونکہ ان کا ظاہر اور تھا اور باطن اور ایسے لوگ دین و ملت کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور عام آدمی کے لئے ان کو پہچاننا بھی تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے اللہ کریم نے ان کے حالات اور احوال سے پردہ اٹھانے کے نئے کلام کے مختلف اسلوب اور انداز اپنائے اور ضرب الامثال بیان فرمائیں تاکہ مومنین ان کی مکاری اور خفیہ سازشوں سے باخبر رہیں اور ان دشمنان دین و ملت سے اپنا دفاع کر لیں ان کے احوال اور اوصاف بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان اندوہناک انجام بھی بیان فرمادیا اور فرمایا کہ بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

اعرابی تعلق:

واو عاطفہ ہے اور اس کے بعد جو منافقین کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس سارے کا عطف کفر پر اصرار کرنے والوں کے پورا قصہ پر ہے ایک جملہ کا عطف دوسرے جملہ پر نہیں۔ کفر پر اصرار کرنے والے، ان کے واقعات اور حالات جو بیان کئے گئے ہیں جو بیان کئے گئے ہیں، وہ تمام معطوف علیہ ہیں اور اس واو کے بعد منافقین ان کے تمام واقعات، اوصاف اور احوال کی

وضاحت کے کئے بیان کرہ ضرب الامثال معطوف ہیں۔ تو گویا ایک پورے قصے اور کہانی کا عطف کے قبیل سے ہوگا۔ جس میں انفرادی جملوں کی مناسبت کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ اس عطف میں دونوں قصوں کے بیان کردہ مضامین کا لحاظ ہوتا ہے اور ان کی مناسبت کو دیکھا جاتا ہے۔

الناس کی لغوی تحقیق:

والناس اصلہ اناس (People)

ومن الناس: الناس سے پہلے من بعض کے معنی میں ہے اصل میں بعض الناس ہے اس کے صیغہ میں چند احتمال ہیں۔

پہلا احتمال:

یہ جمع کا صیغہ ہے اور اس کا انس، ناس یا انسان ہوگا۔ یہ اصل میں الناس ہے یا اناس ہوگا۔ اناس میں اس سے پہلے ہمزہ تخفیفاً گرا دیا گیا جیسے أُلُوقة بمعنی مکھن۔ سے پہلے ہمزہ کو حذف کر کے لُوقة پڑھا جاتا ہے۔ انس میں ہمزہ کو حذف کرنے کے بعد اس کے عوض میں اس سے پہلے ال کا اضافہ کر دیا گیا ہے چونکہ اس سے پہلے ہمزہ محذوف کے عوض میں ال داخل کر دیا گیا ہے اس لئے ال اور ہمزہ دونوں اکٹھے ذکر نہیں کئے جاتے البتہ درج ذیل شعر میں ان دونوں کو جمع کیا گیا ہے تو یہ قلیل الاستعمال ہے اور شاذ ہے۔

إِنَّ الْمَنَايَا يَظْلِعْنَ عَلَى الْإِنْسَانِ الْأَمْعِينَا

مطمئن اور غافل لوگوں پر موتیں اچانک آپڑتی ہیں۔

اس میں الاناس پر ال اور ہمزہ دونوں جمع ہیں لیکن یہ شذوذ کے قبیلہ سے ہے۔

دوسرا احتمال:

یہ جمع کا صیغہ نہیں بلکہ اسم جمع ہے۔ اور اسم جمع وہ کلمہ ہے جو دو سے زیادہ افراد پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ جمع کے اوزان میں سے کسی وزن پر بھی نہیں ہے جیسے رُحال بھیڑ کے مذکر اور مونث بچے کو کہتے ہیں اور اس جمع کی مثال رھط اور قوم وغیرہ ہے۔

تیسرا احتمال:

یہ نسبی بمعنی بھولنا سے مشتق ہے اصل میں ناسی تھا (بھولنے والے) حذف یا کے بعد ط ناس ہوگا۔

نوٹ: الناس کا لفظ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جمع کا صیغہ نہیں بلکہ اسم جمع ہے۔ کیونکہ اس کا وزن فعال ہے اور یہ وزن جمع کے اوزان میں استعمال نہیں ہوتا گویا یہ رُحال کے وزن پر ہے۔

اس کا مادہ اشتقاق:

اس کا مادہ اشتقاق میں تین احتمال ہیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1- یہ انس بمعنی محبت والفت سے مشتق ہے چونکہ انسان کا ہر فرد ایک دوسرے سے محبت والفت کرتا ہے، اس لئے اس کا معنی ہوگا، محبت والفت کرنے والا۔

2- یہ موآنسہ بمعنی ہمدردی اور غم خواری کرنے سے مشتق ہے تو ناس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کرنے والے ہیں۔

3- یہ انس سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دیکھنا۔ دیکھی وہی چیز جاتی ہے جو ظاہر ہوتی ہے جو کہ انسان بھی ظاہر ہوتا ہے اور وہ دیکھا جاتا ہے اس لئے انہیں اناس کہا جاتا ہے۔

جس طرح جنوں کو جن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پوشیدہ اور مخفی ہوتے ہیں اور انسان کو بشر کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کیونکہ بشر ظاہری جلد اور کھال کو کہتے ہیں البتہ پیر کرم شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بشر کو بشر کہنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ بشر کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانا ہے جو کہ انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے دست قدرت سے ہوئی اس لئے اسے بشر کہتے ہیں۔
الناس سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کے متعلق دو قول ذکر کئے گئے ہیں۔

(1) یا تو اس سے مراد وہ کافر ہیں جن کا ذکر الذین کفروا۔ الخ میں کیا گیا ہے جو مصر علی الکفر تھے۔ یا ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے نفاق اور کفر پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے تھے اگرچہ ان میں کچھ زائد خبیث اوصاف بھی پائے جاتے تھے جیسے دھوکہ، چال بازی وغیرہ جیسے عبد اللہ بن ابی ربیع السلفین اور ان کے ساتھی تھے، اور ان میں ان گندے زائد اوصاف کا پایا جانا ان کو مصر علی الکفر میں داخل ہونے سے نہیں روکتا کیونکہ اجناس کے تحت مختلف انواع ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں زائد اوصاف بھی ہوتے ہیں اور ان میں زائد اوصاف کا ہونا انہیں ان اجناس میں داخل ہونے سے نہیں روکتا، جب الناس کی یہ تاویل کی جائے گی تو پھر انسانوں کی دوسری قسم یعنی مصر علی الکفر کی تقسیم ہوگی۔

من

اس میں بھی دو احتمال ہیں یا تو یہ اسم موصول ہے اور ما بعد کلام اس کا صلہ ہے۔

(2) یا یہ من نکرہ کے حکم میں ہے اور موصوفہ ہے اور بعد والا جملہ اس کی صفت ہے اصل عبارت اس طرح تھی ومن الناس ناس یقول امنا لوگوں کی جنس سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو امنا کہتے ہیں۔

یقول یہ مضارع کا صیغہ ہے اور قول سے مشتق ہے اس کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔

1- ایسے کلمات کا تلفظ کرنا جو کسی معنی کا فائدہ دیتے ہوں اس اعتبار سے اس کا اطلاق مکمل جملہ پر بھی ہوگا۔

2- اس کا اطلاق ایسے مفرد الفاظ پر بھی ہوتا ہے جو کسی معنی اور نسبت حکمیہ پر دلالت کرتے ہیں۔

3- اس کا اطلاق اس معنی پر بھی ہوتا ہے جو ذہب میں ابھر رہا ہوتا ہے اور اسے الفاظ کے ساتھ بیان کئے جانے والا ہوتا

4۔ رائے اور مذہب کو بھی قول کہتے ہیں۔ مذہب سے مراد وہ اعتقاد ہے جس کو مجتہدین میں سے کوئی اختیار کر لے اور جب اسے کوئی قوی دلیل مل جائے اور وہ زائل ہو جائے۔

اعتراض:

اس مذکورہ بالا آیت کریمہ میں جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے صرف دو کو ذکر فرمایا۔

ایک ایمان باللہ اور

دوسرا ایمان بالآخرۃ

اور باقی ایمانیاں کو ذکر نہیں فرمایا مثلاً رسالت، نبوت، ملائکہ وغیرہ تو ان دونوں کو ذکر کر کے ساتھ خاص کیوں کیا؟
جواب: ایمان سے مراد صرف دو چیزیں نہیں بلکہ اس سے مراد تمام ایمانیاں ہیں مگر ان دو کو ذکر کرنے کی چند وجوہات ہیں۔

1۔ ایمان سے مقصود اعظم ہے یعنی اللہ کی ذات پر ایمان لانا اور یوم آخرت پر، اس کو ذکر کر دیا۔

2۔ یہودی اللہ تعالیٰ پر، یوم آخرت پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے تو انہیں یہ بتلانا مقصود تھا کہ جن دو چیزوں پر ایمان لانے میں تم مخلص ہونے کا دعویٰ کرتے ہو وہ بالکل باطل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ اس نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اور وہ مخلوق میں سے کسی کی مثال ہو سکتا ہے حالانکہ نہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثل ہے اور اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور نہ اسے اولاد کی ضرورت ہے وہ ہر اس نقص سے منزہ اور پاک ہے جو جسم کے خواص سے ہو، تو یہود کا توحید پر ایمان لانے کا دعویٰ بالکل جھوٹا افتراء ہے اور آخرت کے متعلق عجیب و غریب نظریات تھے جو اخلاص و ایمان کے دعویٰ کے مخالف تھے وہ کہتے تھے کہ جنت میں سوائے یہود کے کوئی داخل نہیں ہوگا اور انہیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اگر انہیں عذاب دیا بھی گیا تو وہ صرف چند دن ہوگا جن میں وہ بچھڑنے کی عبادت کرتے رہے اور جنت کی نعمتوں کے متعلق بھی وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے کبھی کہتے وہ نعمتیں ابدی ہوں گی اور کبھی کہتے کہ وہ فانی ہیں اور کبھی کہتے کہ وہاں خشبو سونگھنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا تو ان کے یہ لغویات ایسے ہیں جو ایمان نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں خصوصاً جبکہ ان کا اظہار ایمان نفاق اور دھوکے کے لئے تھا۔

اس مذکورہ بالا بحث سے ثابت ہو گیا کہ ان کا اللہ کریم پر اور آخرت پر ایمان لانے کا دعویٰ بالکل باطل ہے۔

3۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے مبداء (اللہ کی ذات) اور معاد یعنی آخرت پر ایمان لا کر مکمل ایمان حاصل کر لیا

ہے۔ اور اللہ کریم نے ان کے اسی دعویٰ کی تردید فرمادی۔

4۔ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جن چیزوں پر ایمان کے اخلاص کا ان کا دعویٰ ہے اس میں بھی وہ منافق ہیں وغیرہ وغیرہ

باکو دو بارہ ذکر کرنے کی وجہ:

باکو مکرر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودیہ دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ کی ذات پر اور یومِ آخرت پر ان کا ایمان مستقل ہے کسی دوسرے کے تابع نہیں، حالانکہ ان کا یہ دعویٰ باطل تھا جس کو اللہ کریم نے،

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ

کے ساتھ رد فرما دیا۔ حرف جر کو مکرر ذکر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ ان دونوں پر ان کا ایمان پختہ ہے، اس کو ظاہر کرنے کے لئے حرف جر کو مکرر ذکر کیا گیا ہے۔

لفظ یوم کی تحقیق:

(یوم) یوم (Day)

یہ لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ مطلق وقت، جس میں دن رات کی کوئی قید نہیں۔ (لغوی معنی)

2۔ صبح صادق کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کا وقت، اصطلاح شرح میں ہے۔

3۔ سورج کے طلوع ہونے سے لے کر، سورج کے غروب ہونے تک وقت عرف عام میں۔

مگر یہاں اس سے مراد حشر سے لے کر نہ ختم ہونے والا وقت ہے یا جنتوں کے جنت میں داخل ہونے اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے کا وقت مراد ہے۔

متن:

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ اِنْكَارِ مَا ادْعُوهُ وَنَفْيِ مَا اتَّحَلَّوْا اِثْبَاتَهُ، وَكَانَ اَصْلُهُ وَمَا اٰمَنُوا لِيَطَابِقَ قَوْلُهُمْ فِي التَّصْرِيحِ بِشَأْنِ الْفِعْلِ دُونَ الْفَاعِلِ لَكِنَّهُ عَكْسٌ تَأْكِيدًا. أَوْ مِبَالِغَةً فِي التَّكْذِيبِ، لِأَنَّ اِخْرَاجَ فَوَاتِهِمْ مِنْ عِدَادِ الْمُؤْمِنِينَ اَبْلَغُ مِنْ نَفْيِ الْاِيْمَانِ عَنْهُمْ فِي مَاضِي الزَّمَانِ، وَلِذَلِكَ اَكَّدَ النَّفْيَ بِالْبَاءِ وَاَطْلَقَ الْاِيْمَانَ عَلٰى مَعْنٰى اَنَّهُمْ لَيْسُوْا مِنَ الْاِيْمَانِ فِي شَيْءٍ، وَيَحْتَمِلُ اَنْ يَقِيْدَ بِمَا قَيَّدُوْا بِهِ لِأَنَّهُ جَوَابُهُ.

والآية تدل على أن من ادعى الإيمان وخالف قلبه لسانه بالاعتقاد لم يكن مؤمناً، لأن من تفوه بالشهادتين فارغ القلب عما يوافق أو ينافيه لم يكن مؤمناً. والخلاف مع الكرامية في العاني فلا ينهض حجة عليهم.

اللہ کریم کا یہ ارشاد کہ منافق مومن نہیں یہ ان کے ایمان کے دعویٰ کا انکار ہے اور جس چیز کو جھوٹے طریقہ پر (یعنی ایمان

کو) انہوں نے ثابت کرنے کی نسبت اپنی طرف کی تھی، اس کی نفی ہے اور اصل میں اس مقام پر وہاں ہونا چاہئے تھا تاکہ منافقین نے صراحتاً اپنی طرف جس فعل کی نسبت کی تھی، کلام اس کے مطابق ہو جاتا لیکن یہاں ماضی کے صیغہ کے ساتھ نفی کرنے کی بجائے اسم فاعل کا صیغہ استعمال فرما کر ان سے ایمان کی نفی کی ہے تاکہ ان کے جھوٹا ہونے میں مبالغہ اور تاکید کا اظہار کیا جائے کیونکہ ماضی کے صیغہ کے ساتھ ان سے زمانہ ماضی میں ایمان کی نفی کرنے کی بجائے اسم فاعل کا صیغہ ذکر فرمانا زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ ان سے ایمان کی نفی کرنا ان کو مؤمنین کے شمار سے خارج کرنا ہے کیونکہ اس انداز تکلم میں تینوں زمانوں میں ان سے ایمان کی نفی ہو جاتی ہے اور تکذیب میں مبالغہ اور انکار میں تاکید پیدا کرنے کے لئے خبر پر باکا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جس شخص نے ایمان کا دعویٰ کیا اور اعتقاد میں اس کا دل اس کی زبان کے اقرار کے مخالف ہو (یعنی زبان سے وہ ایمان کا اقرار کرے لیکن تصدیق قلبی حاصل نہ ہو) وہ مومن نہیں ہو گا یہ آیت پاک اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ جو شخص زبانی شہادتین کا اقرار کرے اور اس کا دل زبان کی مخالفت اور موافقت دونوں سے خالی ہو یعنی نہ وہ اس کی تصدیق کرے اور نہ ہی تکذیب تو وہ مومن نہ ہوگا۔

اور کرامیہ کے ساتھ جو اختلاف ہے وہ دوسری بات میں ہے یعنی اس کا دل تصدیق اور تکذیب سے خالی ہو اس لئے یہ آیت اس کے خلاف حجت نہ ہوگی کیونکہ منافقین کا دل زبانی اقرار کے مخالف ہوتا ہے۔

لفظ الناس کی اصل:

(ن و س) الناس (People)

بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل اناس ہے۔ ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض الف لام لایا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک نسی سے مقلوب ہے اور اس کی اصل انسیان بروزن افعلان ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں ناسینوس سے ہے جس کے معنی مضطرب ہوتے کے ہیں۔

قرآن میں ہے: "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" (سورۃ الناس آیت نمبر ۱)

تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب۔

تحقیق لفظ قول:

(ق و ل) القول (Affair)

القول اور القیل کے معنی بات کے ہیں قرآن میں ہے:

"وَمَنْ أَضْدَقُّ مِنَ اللَّهِ قِيلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر ۱۲۲)

اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

نوٹ: ایمان، ما اور لفظ اللہ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 9]

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يُخَدَعُونَ إِلَّا أَنفُسُهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (۹)

ترجمہ:

”فریب دیا جاتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں۔“

متن:

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا

الخدع أن توهم غيرك خلاف ما تخفيه من البكروة لتنزله عما هو فيه، وعما هو بصدده من قولهم: خدع الضب. إذ توارى في جحرة، وضب خادع وخدع إذا أوهم الحارث إقباله عليه. ثم خرج من باب آخر وأصله الإخفاء ومنه المخدع للخزانة. والاختدعان لعرقين خفيين في العنق، والمخادعة تكون بين اثنين. وخداعهم مع الله ليس على ظاهرة لأنه لا تخفى عليه خافية، ولأنهم لم يقصدوا خديعته. بل المراد إما مخادعة رسوله على حذف المضاف، أو على أن معاملة الرسول معاملة الله من حيث إنه خليفته كما قال تعالى: مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ. إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ. وإما أن صورة صنيعهم مع الله تعالى من إظهار الإيمان واستبطان الكفر، وصنع الله معهم بإجراء أحكام المسلمين عليهم، وهم عنده أخيب الكفار وأهل الدرك الأسفل من النار، استدراجاً لهم وامتنال الرسول صلى الله عليه وسلم والمؤمنين أمر الله في إخفاء حالهم، وإجراء حكم الإسلام عليهم مجازاة لهم بمثل صنيعهم صورة صنيع المتخادعين.

ويحتمل أن يراد بـ يُخَادِعُونَ يُخَدَعُونَ لأنه بيان ليقول، أو استئناف بذكر ما هو الغرض منه، إلا أنه أخرج في زنة فاعل للمغالبة، فإن الزنة لما كانت للمغالبة والفعل متى غولب فيه، كان أبلغ منه إذا جاء بلا مقابلة معارض ومبار استصحب ذلك، ويعضده قراءة من قرأ يُخَدَعُونَ. وكان غرضهم في ذلك أن يدفعوا عن أنفسهم ما يطرق به من سواهم من الكفرة، وأن يفعل بهم ما يفعل بالمؤمنين من الإكرام

والإعطاء، وأن يختلطوا بالمسلمين فيطلعوا على أسرارهم ويذيعوها إلى منابذهم إلى غير ذلك من الاغراض والمقاصد.

وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ قراءۃ نافع وابن کثیر وأبی عمرو. والمعنى: أن دائرة الخداع راجعة إليهم وضررها يحمي بهم. أو أنهم في ذلك خدعوا أنفسهم لها غروها بذلك. وخدعهم أنفسهم حيث حدثهم بالاماني الفارغة وحملهم على مخادعة من لا تخفى عليه خافية.

وقرأ الباقر وما يَخْدَعُونَ، لأن المخادعة لا تتصور إلا بين اثنين وقرء و يَخْدَعُونَ من خدع و خَدَعُونَ بمعنى يخذعون و يَخْدَعُونَ و يَخَادَعُونَ على البناء للمفعول، ونصب أنفسهم بنزع الخافض، والنفس ذات الشيء وحقيقته، ثم قيل للروح لأن نفس الحي به، وللقلب لأنه محل الروح أو متعلقه، وللدن لأن قوامها به، وللنساء لفرط حاجتها إليه، وللرأى في قولهم فلان يؤامر نفسه لأنه ينبعث عنها أو يشبه ذاتاً تأمرة وتشير عليه. والمراد بالانفس هاهنا خواصهم ويحتمل حملها على أرواحهم وآرائهم.

وَمَا يَشْعُرُونَ لَا يَحْسُونَ لذلك لتمادي غفلتهم. جعل لحوق وبال الخداع ورجوع ضرره إليهم في الظهور كالمحسوس الذي لا يخفى إلا على مؤوف الحواس. والشعور: الإحساس، ومشاعر الإنسان حواسه، وأصله الشعر ومنه الشعار.

ترجمہ:

عرف میں خداع کا معنی یہ ہے کہ اپنے مد مقابل کو خفیہ تدبیر کے ساتھ اس مقصد سے ہٹا دیا جائے جس کو وہ حاصل کر چکا ہے یا حاصل کرنے کے قریب ہے اسی لئے عرب لوگ گوہ کو ضرب خادع کہتے ہیں دھوکہ دینے والی گوہ کیونکہ وہ اپنی بل میں چھپ کر شکاری کو باہر آنے کا چکمہ دیتی ہے اور دوسرے سوراخ سے بھاگ جاتی ہے۔

یہاں پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بخادعون باب مفاعله سے ہے جس کی وجہ سے ظاہر معنی یہ نکلتا ہے کہ اللہ کریم اور مومنین، منافقوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ وہ اللہ کریم کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے تھے بلکہ وہ مومنین اور رسول کریم ﷺ کو دھوکہ دینا چاہتے تھے اس لئے اصل عبارت کچھ یوں ہوئی بخادعون رسول اللہ لفظ اللہ سے پہلے مضاف کو حذف کر دیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو دھوکہ دینا اللہ ہی کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے کیونکہ اللہ اور رسول ﷺ کا معاملہ ایک ہی جیسا ہے جس پر قرآن

کریم بھی دال ہے،

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ.

جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ (سورۃ النساء آیت نمبر 80)

اور

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ.

وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ (سورۃ فتح آیت نمبر 10)

2۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم جو برتاؤ منافقین کے ساتھ کر رہا ہے یہ ظاہری طور پر ایک دوسرے کو دھوکہ دینے والوں کی طرح ہی بنتا ہے کیونکہ اللہ کریم منافقوں کو بھی وہی مراعات دے رہا ہے جو مومنین کو دے رہا ہے جو مومنین کو دی جا رہی ہیں ان کے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو اپنی خصوصی نوازشات سے نوازا رہا ہے انہیں احکام اسلام پر عمل پیرا ہونے کا مکلف بنا رہا ہے اور انہیں فوراً کفر اور نفاق کی سزا نہیں دے رہا ہے حالانکہ وہ اللہ کریم کے نزدیک بدترین عذاب کے مستحق ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں آہستہ آہستہ جہنم کے راستے پر چلا رہا ہے اور انہیں مومنین کی صفوں سے خارج نہیں فرما رہا؟

مال غنیمت وغیرہ میں انہیں باقاعدہ حصہ عطا کر رہا ہے ان کے مال و جان کی حفاظت کرنے کا حکم دے رہا ہے اور منافقین ایمان کے اظہار کے باوجود مومنین کو تکلیف پہنچانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور ان کو ناکام کرنے کی طرح طرح کی سازشیں کرتے ہیں تو ان تمام مذکورہ بالا چیزوں کی بظاہر ایسی صورت بنتی ہے جس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دیا جاتا ہے اس لئے باب مفاعلہ کا صیغہ ذکر فرمایا جو حقیقت میں دھوکہ دینے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے سزا ہے۔

3۔ بعض دفعہ باب مفاعلہ ذکر کر کے اس سے مشارکت مراد نہیں ہوتی بلکہ اس فعل میں مبالغہ کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے یہاں بھی ان کی حد درجہ دھوکہ دینے کی تدبیریں کرنے کو بیان کرنے کے لئے باب مفاعلہ کا صیغہ ذکر کیا، تاکہ ان کے اس برے فعل میں مبالغہ کا اظہار ہو۔

بعض قاریوں نے یخدعون کی جگہ یخادعون۔ یخدعون، یخدعون، یفتحون، یفتحون، یضمون، یضمون اور دال کی تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ یہاں مبالغہ مقصود ہے نہ کہ مشارکت۔ کیونکہ جب مفاعلہ کا صیغہ بلا مقابل اور معارض ذکر کیا جائے تو اس کو مبالغہ لازم ہوتا ہے۔

ایک اور اشکال یہ کہ منافقوں کا اہل اسلام کے ساتھ ایسی دوزخی پالیسی اختیار کرنے کا مقصد کیا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے کئی مقاصد ہیں،

1۔ تاکہ وہ اس طرح اپنے اموال اور جانوں کی حفاظت کر سکیں اور جزیہ، جو ان کی جان و مال کی حفاظت کے لئے ان سے

لیا جاتا تھا، اس سے بچ جائیں کیونکہ جو شخص کافر ہو اس کے ساتھ جہاد کرنا فرض ہے اور ان کے مال غنیمت اور ان کے بچوں اور عورتوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت تھی، اس لئے وہ ایمان کا اظہار کرتے تاکہ وہ ان سزاؤں سے اپنے آپ کو بچالیں۔

2- ان کے ایمان کے اظہار کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مومنین کی طرح مال غنیمت سے اپنا حصہ وصول کریں اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جائیں، ایمان کے ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے وہ اس سے محروم ہو جاتے،

3- یہ کہ وہ مومنین کے رازوں سے آگاہی حاصل کریں اور ان کو کفار تک پہنچائیں تاکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں اور اسی قسم کے ان کے فاسدن اغراض و مقاصد تھے۔

انفس اس کا مفرد نفس ہے جس کا معنی کسی چیز کی حقیقت اور اس کی ذات ہے اور مجازاً اس کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔

- (1) روح اور خون، کیونکہ کسی چیز کی ذات ان دونوں کے ساتھ ہی قائم رہتی ہے۔
- (2) دل کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ وہ روح کا محل ہوتا ہے، پانی کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ اس کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔
- (3) رائے کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ وہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مذکورہ بالا آیت میں انفسہم سے منافقین کی ذاتیں اور ان کی ارواح اور باطل آراء مراد ہیں۔

یشعرون یہ شعور سے نکلا ہے جس کا معنی محسوس کرنا ہے وہ کپڑا جو انسان کے جسم کو مس کرتا ہے اسے شعار کہتے ہیں اور وہ کپڑا جو اوپر ہوتا ہے اسے دثار کہتے ہیں (یعنی جو جسم سے مس نہیں کرتا یہاں شعور سے مراد ظاہری حواس کے ساتھ کسی چیز کا ادراک کرنا ہے اسی لئے انسانی حواس کو مشاعرہ کہتے ہیں جو ادراک کرنے کا آلہ ہوتے ہیں۔

نوٹ: آیت کا معنی یہ ہوگا کہ منافقین نہ تو اللہ کو دھوکہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی مومنین کو بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں لیکن انہیں ان کا احساس ہی نہیں اور انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اس دھوکے کا وبال اور نقصان انہی کو پہنچ رہا ہے یا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ اپنے آپ کو دھوکہ پر جری بنا کر خود اپنے نفسوں کو فریب دیا اور ان کے اپنے نفوس نے ان کے اندر جھوٹی اور بے فائدہ امیدیں پیدا کر کے انہیں مغرور بنا دیا اور انہیں اس ذات پاک سے دھوکے دینے پر ابھارے جس پر کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں باقی قاریوں نے اس میں کچھ اور لغات پڑھی ہیں اور وہ یہ ہیں، یا تو یہ خداع سے مشتق ہیں اور یخدعون کے معنی میں ہیں یا یخدعون بمعنی یخندعون پڑھا گیا ہے اور یخدعون اور یخدعون مجہول کے صیغے کے ساتھ ہی پڑھا گیا ہے۔ اور مجہول پڑھنے کی صورت میں انفسہم کی نصب حرف جبر کو اس سے پہلے حذف کر دیئے جانے کی وجہ سے ہوگی۔

لفظ خدع کی مفصل تحقیق:

(خدع) الخداع (Deception)

کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کر کے کسی کو اس چیز سے پھیر لینا جس کے علاوہ درجے ہو اور آیت

کریمہ:

"يُخَدِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 9)

فریب دیا جاتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو۔

میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے اس کے رسول اور اولیاء کو فریب دینا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کوئی سا معاملہ کرنا گو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا:

"إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 10)

وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

اور ان کے اس فعل کی شناخت اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے خدا سے تعبیر کیا ہے۔ اور بعض اہل لغت کا یہ کہنا کہ یہاں (مضاف محذوف ہے اور اصل میں یخادعون رسول اللہ ہے۔ پھر مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق یہ جان لیتا ضروری ہے کہ مضاف محذوف کو ذکر کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ایک تو یہاں ان کی فریب کاریوں کی شناخت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ بتانا ہی کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ آیت

"إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ... الْآيَةَ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 10) میں بیان ہو چکا ہے۔

اور آیت کریمہ:

"إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَدِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَدِيعُهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 142)

بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دیا جاتے ہیں۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہیں ان کی فریب کاریوں کا بدلہ دے گا اور بعض نے کہا ہے کہ مقابلہ اور مشاکلہ

کے طور پر یہ کہا گیا ہے جیسا کہ آیت

"وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 54)

اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی۔ میں ہے۔

گوہ اور بچھو:

خدع الضب گوہ کا اپنے بل میں داخل ہو جانا اور گوہ کے بل میں چھپ جانے کے لئے خدع کا استعمال اس بنا پر ہے کہ اس کی بل کے دروازے پر ہمیشہ ایک بچھوتیا بیٹھا رہتا ہے۔ جو بل میں ہاتھ ڈالنے والے کو ڈس دیتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے العقرب بواب الضب کو بچھو گوہ کا دربان ہے۔ چونکہ اہل عرب کے ہاں ضب کی مکاری ضرب المثل تھی اس لئے کہا گیا ہے

(مثل) هو اخذع من الضب کہ وہ ضب سے زیادہ مکار ہے طریق خادع و خیدع گمراہ کرنے والا راستہ گویا وہ مسافر کا دھوکا دیتا ہے۔ الہذع بڑے کمرے کے اندر چھوٹا کمرہ۔ گویا اس بڑے کمرے سے چیز اٹھانے والے کو دھوکا دینے کے لئے بنایا ہے۔ خذع الریق منہ میں تھوک کا خشک ہونا اس میں بھی دھوکے کا تصور پایا جاتا ہے۔ الاخذعان گردن کی دو رگیں کیونکہ وہ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے خذعنتہ میں نے اس کی اخذع رگ کو کاٹ دیا۔

حدیث شریف میں ہے:

بین یدی الساعة سنون خداعة

کہ قیامت کے قریب دھوکا دینے والے سال ہوں گے کیونکہ وہ بھی خشک سالی اور خوشحالی سے رنگ بالتے ہوں گے۔

حرف الا کا استعمال:

الا

الایہ حرف استفاح ہے (یعنی کلام کے ابتداء میں تنبیہ کے لئے آتا ہے۔

الایہ حرف استثناء ہے اولاء (اولا) یہ اسم مبہم ہے جو جمع مذکر مؤنث کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے اس کا مفرد من لفظ نہیں آتا (کبھی اس کے شروع میں ہائنبیہ بھی آجاتا ہے) قرآن مجید میں ہے:

"هَآ اَنْتُمْ اَوْلَآءٌ تُحِبُّوْنَهُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۱۹)

سننے ہو یہ جو تم ہو تم تو انہیں چاہتے ہو۔

"اَوْ لَيْسَ لَكَ عَلٰی هٰذٰی مِّنْ تَرْبِيْمٍ"

وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۵)

اور کبھی اس میں تصرف (یعنی بحذف ہمزہ آخر) بھی کر لیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

هٰؤلآئِم هٰؤلآءِ كَلَّا اعطيتہ ت نوالا محذوۃ بمشال

ان سب لوگوں کو میں نے بڑے بڑے گرانقدر عطیے دیے ہیں۔

مفہوم نفس:

(ن ف س) النفس (Respiration, Breath, Self)

کے معنی روح کے آتے ہیں چنانچہ اللہ کریم نے فرمایا:

"اٰخِرِ جُؤا اَنْفُسِكُمْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر ۹۳) کہ لگا لگا اپنی جانیں۔

"وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ فَآخِذُوْهُ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۳۵)

اور جان لو کہ اللہ تمہارے دل کی جانتا ہے تو اس سے ڈرو۔
اور ذیل کی دونوں آیتوں۔

"تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۱۱۶)

تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے۔

"وَيُحَدِّثُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 30)

اور اللہ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔

اس میں نفس بمعنی ذات ہے اور یہاں نفسہ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوائی سے پاک ہے بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی اضافت اضافت ملک ہے اور اس سے ہمارے نفوس امارہ مراد ہیں جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

معرفت شعور:

شعور حواس کو کہتے ہیں، لہذا آیت کریمہ:

"وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 2)

اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم حواس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔

یشعرون اور یعقلون میں فرق:

اور اکثر مقامات میں جہاں لایشعرون کا صیغہ آیا ہے اس کی بجائے۔ لایعقلون کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بہت کچھ چیزیں ایسی ہیں جو محسوس تو نہیں ہو سکتی لیکن عقل سے ان کا ادراک ہو سکتا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 10]

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (10)

ترجمہ:

"ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا۔"

متن:

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا

المرض حقيقة فيما يعرض للبدن فيخرجه عن الاعتدال الخاص به ويوجب الخلل في أفعاله. ومجاز في الاعراض النفسانية التي تخل بكمالها كالجهل وسوء العقيدة والحسد والضغينة وحب المعاصي، لأنها مانعة من نيل الفضائل، أو مؤدية إلى زوال الحياة الحقيقية الابدية. والآية الكريمة تحتلها فإن قلوبهم كانت متألّمة تحرقاً على ما فات عنهم من الرياسة، وحسداً على ما يرون من ثبات أمر الرسول صلى الله عليه وسلم واستعلاء شأنه يوماً فيوماً، وزاد الله غمهم بما زاد في إعلاء أمره وإشادة ذكره ونفوسهم كانت موصوفة بالكفر وسوء الاعتقاد ومعاداة النبي صلى الله عليه وسلم ونحوها، فزاد الله سبحانه وتعالى ذلك بالطبع. أو بازدياد التكليف وتكرير الوحي وتضاعف النصر، وكان إسناد الزيادة إلى الله تعالى من حيث إنه مسبب من فعله وإسنادها إلى السورة في قوله تعالى فزادتهم رجساً ليكونها سبباً.

ويحتمل أن يراد بالمرض ما تداخل قلوبهم من الجبن والخور حين شاهدوا شوكة المسلمين وإمداد الله تعالى لهم بالملائكة، وقذف الرعب في قلوبهم وبزيادته تضعيفه بما زاد لرسول الله صلى الله عليه وسلم نصرة على الأعداء وتبسطاً في البلاد.

ترجمہ:

ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی۔

مرض کے لفظ کا حقیقت میں اس عارضہ پر اطلاق ہوتا ہے جو بدن انسانی کو لاحق ہوتا ہے اور اس اعتدال سے خارج کر دیتا ہے جو اس کا خاصہ ہے اور اس کے افعال میں خلل کا باعث بنتا ہے مجازاً اس کا اطلاق ان تمام عوارض نفسانیہ پر ہوتا ہے جو نفس کے کمال کے لئے نخل ہوتے ہیں جیسے جہالت، بد اعتقادی، حسد کینہ اور گناہوں کی محبت وغیرہ کیونکہ یہ تمام ایسے عوارض ہیں جو فضائل و کمالات حاصل کرنے سے مانع ہوتے ہیں اور یا وہ حقیقی، دائمی اور ابدی زندگی کے زوال تک پہنچاتے ہیں اور اس آیت طیبہ میں مرض کے دونوں معنی حقیقی اور مجازی مراد ہو سکتے ہیں حقیقی معنی اس لئے مراد ہو سکتا ہے کہ ان سے ریاست اور سرداری فوت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ان کے دل پریشان ہو گئے تھے وہ غصہ میں تھے اور حسد کی آگ میں جلتے رہے اور جب وہ دیکھتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دن بدن ترقی کر رہا ہے اور اس سے آپ کی شان بھی بلند ہو رہی ہے تو وہ اس سے جلتے تھے اور جب یہ دیکھتے کہ اللہ کریم ان کو عزتیں عطا کر رہا ہے تو ان کی اس مرض میں اور اضافہ ہو جاتا چونکہ ان کے نفوس کفر و الحاد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عناد میں مبتلا تھی اور اسی طرح وہ دوسرے گناہوں کے مرتکب بھی ہوتے تھے جس کی وجہ سے ان کے قلوب پر مہر ثبت کر دی گئی تھی اور اللہ کریم نے ان کو شرعی احکام کا مکلف بنانے میں اضافہ کر دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

پر سلسلہ وحی نازل فرماتا رہا اور آپ کی مدد کرتا رہا اور اس کی وجہ سے ان کے حسد اور خباثت میں اضافہ ہو گیا اسی بات کو اللہ کریم نے

فَزَادَهُمْ اللَّهُ مَرَضًا

کے ساتھ تعبیر کیا جیسے فرمادیا

فَزَادَهُمْ رَجْسًا أَلِيًّا رَجْسَهُمْ -

اور یہ بھی احتمال ہے کہ مرض سے مراد وہ بزدلی اور ضعف ہو جو منافقین کے دلوں میں اس وقت پیوست ہو گیا تھا جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا کہ مومنین کی عظمت اور شوکت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور اللہ کریم، ملائکہ کے ذریعے ان کی مدد کر رہا ہے اور منافقین کے دلوں میں رعب ڈالنے کے سبب پیدا کر رہا ہے اور مرض کے اضافہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ کریم اپنے رسول ﷺ کو دشمنوں پر غلبہ عطا فرمانے اور دائرہ اسلام کو وسعت عطا کرنے میں اضافہ فرما رہا ہے، جو ان کی بزدلی اور ضعف میں اضافہ کا سبب بن رہا ہے۔

نیز آیت طیبہ میں حقیقی اور مجازی دونوں معنی معانی مراد ہو سکتے ہیں۔

متن:

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ أَى:

مؤلم یقال: ألم فهو أليم كوجع فهو وجيع، وصف به العذاب للبالغه كقوله:

تَحِيَّةٌ بَيْنَهُمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ عَلَى طَرِيقَةِ قَوْلِهِمْ: جَد جَدًا. بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ قَرَأَهَا عَاصِمٌ وَحَمْزَةٌ وَالْكَسَائِيُّ وَالْمَعْنَى بِسَبَبِ كَذِبِهِمْ، أَوْ بِبَدَلِهِ جَزَاءٌ لَهُمْ وَهُوَ قَوْلُهُمْ آمَنَّا. وَقَرَأَ الْبَاقُونَ يَكْذِبُونَ مَنْ كَذَبَهُ لِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْذِبُونَ الرَّسُولَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ بِقُلُوبِهِمْ، وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ. أَوْ مَنْ كَذَّبَ الَّذِي هُوَ لِلْبَالِغَةِ أَوْ لِلتَّكْثِيرِ مَثَلُ بَيْنَ الشَّيْءِ وَمَوْتِ الْبَهَائِمِ. أَوْ مَنْ كَذَّبَ الْوَحْشَى إِذَا جَرَى شَوْطًا وَقَفَ لِيَنْظُرَ مَا وَرَاءَ فَإِنَّ الْمُنَافِقَ مُتَحِيرٌ مُتَرَدِّدٌ.

والكذب: هو الخبر عن الشيء على خلاف ما هو به. وهو حرام كله لأنه علة به استحقاق العذاب حيث

رتب عليه. وما روى أن إبراهيم عليه الصلاة والسلام كذب ثلاث كذبات فالمراد التعريض. ولكن لما شابه الكذب في صورته سمى به.

ترجمہ:

الیم یہاں پر مؤلم اسم مفعول کے معنی میں ہے بمعنی درد مند، جیسے کہا جاتا ہے کہ

الم هو الیم کو جمع فهو وجیع

یعنی جس طرح وجع سے وجیع فعل کے وزن پر صفت مشبہ بمعنی اسم مفعول آتا ہے اسی طرح الم سے الیم صفت مشبہ کا صیغہ بمعنی اسم مفعول ہے اس کو مبالغہ کے لئے عذاب کی صفت بنایا گیا ہے اور الیم کی نسبت عذاب کی طرف مجازی ہوگی جس طرح جد جده میں جد کی نسبت جدہ کی طرف مجازی ہے۔

یما کائوا ینکذبون بدلہ ان کے جھوٹ کا۔

اس جگہ ینکذبون کو عاصم، حمزہ اور کسائی نے ینکذبون کو بالتخفیف ذ پڑھا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان کو عذاب بسبب ان کے جھوٹ بولنے کے ہے۔ اور ان کے جھوٹ بولنے کے بدلے میں ہے اس صورت میں ما مصدریہ ہوگا اور ینکذبون بمعنی کذب ہوگا باسویہ یا بمعنی بدل اور عوض ہوگا اور ان کا وہ جھوٹ امانا کہنا ہے اور باقی قراء نے اس کو باب تفعیل سے ینکذبون پڑھا ہے اس صورت میں اس میں چار احتمال ہیں۔

1- یہ کذبہ بمعنی اس نے اسی کو جھٹلایا ہوگا تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ وہ نبی کریم ﷺ کو اپنے دلوں سے جھٹلاتے ہیں اور جب وہ اپنے شیطان صفت سرداروں کی ساتھ ہوتے ہیں تو تو پھر زبان سے بھی تکذیب کرتے ہیں۔

2- یا یہ اس کذب سے مشتق ہوگا جو مبالغہ اور کثرت کے معنی میں ہوتا ہے یعنی وہ بہت ہی زیادہ اور بکثرت جھوٹ بولتے تھے جیسے بین الشی (وہ چیز جو خوب واضح ہوگئی) اور ماتت البہائم (کثرت سے جانور مر گئے) یعنی یہ شدید ترین عذاب انہیں شدت تکذیب کی وجہ سے ہوگا۔

3- یا یہ جذب الوحشی سے مشتق ہوگا اس صورت میں یہ لازم معنی میں استعمال ہوگا معنی یہ ہوگا کہ منافقین جنگلی درندے کی طرح حیران اور متردد ہیں تو گویا جس طرح جنگلی جانور چند قدم چلنے کے بعد رک جاتا ہے اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور وہ اسی شش و پنج میں ہوتا ہے کہ شکار آ کر اسے دبوچ لیتا ہے بعینہ اسی طرح منافقین ایمان میں متردد اور حیران ہونے کی وجہ سے شدید ترین عذاب میں مبتلا کر دیئے گئے چونکہ منافق اسی شک و شبہ میں مبتلا تھے اس لئے یہ معنی ان پر منطبق ہو جاتا ہے۔

والکذب: هو الخبیر عن الشیء علی خلاف ما ہو بہ... الخ

واقع کے خلاف بات کرنے کو کذب کہتے ہیں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک ہر قسم کا کذب حرام ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کذب پر عذاب الیم کو مرتب فرمایا اور اسی جھوٹ کو عذاب کی علت اور سبب قرار دیا۔ اور روایات میں جو مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ خلاف واقع بات کہی یعنی وہ تین بار حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔ العیاذ بآ

اللہ۔

اس لئے اس کا یہ معنی ہو گیا کہ یہ تعریف تھی چونکہ وہ کذب کے مشابہ تھے اس لئے انہیں کذب کہا گیا حالانکہ وہ کذب نہ تھے۔

معنی قلب:

(قلب) قلب (Turn, Change)

الشنی کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قلب الثوب (کپڑے کو الٹنا) اور قلب الانسان کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ وَإِلَيْهِ تُقَلَّبُونَ" (سورة العنكبوت آیت نمبر 21)

عذاب دیتا ہے جسے چاہے اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہے اور تمہیں اسی کی طرف پھرنا ہے۔

لفظ مرض کی تحقیق:

(مرض) مرض (Sickness, Disease)

المرض کے معنی ہیں انسان کے مزاج خصوصی کا اعتدال اور توازن کی حد سے نکل جانا اور یہ دو قسم پر ہے۔ مرض جسمانی جیسے فرمایا:

"وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ" (سورة النور آیت نمبر 61) اور نہ بیمار پر روک۔

"لَيْسَ عَلَى الضَّعْفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى" (سورة التوبة آیت نمبر 91)

ضعیفوں پر کچھ حرج نہیں اور نہ بیماروں پر۔

دوم مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بولا جاتا ہے اور اس سے جہالت بزدلی، بخل، نفاق وغیرہ جیسے اخلاق رزلیہ مراد ہوتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: "فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا" (سورة البقرة آیت نمبر 10)

ان کے دلوں میں کفر کا مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔

"أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَمْ ارْتَابُوا" (سورة النور آیت نمبر 50)

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے، یا شک رکھتے ہیں۔

"وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ رِجْسًا إِلَى رِجْسِهِمْ" (سورة التوبة آیت نمبر 125)

اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں نجسٹ پر نجسٹ زیادہ کیا۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

"وَلَيَزِيدَنَّ كُفْرًا مِنْهُمْ مَا أُتُوا بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 64)
اور اے محبوب یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا اس سے ان میں بہتوں کو شرارت اور کفر میں
ترقی ہوگی۔

اور نفاق، کفر وغیرہ اخلاق رذیلہ کی (مجاز) بطور تشبیہ مرض کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لئے کہ اس قسم کے اخلاق کسب فضائل
سے مانع بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ بیماری جسم کو کامل تصرف سے روک دیتی ہے۔ اور یا اس لئے اخروی زندگی سے محرومی کا سبب
 بنتے ہیں۔

جس قسم کی زندگی کا، کہ آیت کریمہ:

"وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)
اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے کاش کہ یہ لوگ سمجھتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یا رذائل کو اس چونکہ ایسے اخلاق بھی ایک طرح کا مرض ہی ہیں اس لئے قلب و صدر میں کینہ و
کدورت پیدا ہونے کے لئے دوی صدر فلان و بخل قلبہ وغیر محاورات استعمال ہوتے ہیں

ایک حدیث میں ہے: وای داء ادواء من البخل

اور بخل سے بڑھ کر کوئی بیماری ہو سکتی ہے۔ اور شمس مریضۃ اس وقت کہتے ہیں جب گردہ غبار یا کسی اور عارضہ سے
اس کی روشنی ماند پڑ جائے۔ امرض فلان فی قولہ کے معنی تعریض اور کناہیہ سے بات کرنے کے ہیں۔ المتربض تیمارداری
کرنا۔ اصل میں تعریض کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ۔ تقذیبة کی طرح سے جس کے معنی آنکھ سے خاشاک دور
کرنا کے ہیں۔

زیادۃ کی تعریف:

(زید) (الزیادۃ) (Too much, More)

اس اضافہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے پورا کرنے کے بعد بڑھا جائے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ زد تہ میں نے اسے بڑھایا چنانچہ
وہ بڑھ گیا۔

اور آیت: "وَلَيَزِيدَنَّ كُفْرًا مِنْهُمْ مَا أُتُوا بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا" (سورۃ یوسف آیت نمبر 65) اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ پائیں۔

عذاب کا معنی:

(عذب) (العذاب) (Torture)

سخت تکلیف دینا عذوبہ تعذیباً سے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔
قرآن مجید میں ہے:

"لَا عَذَابَ لَهُ عَذَاباً شَدِيداً" (سورۃ النمل آیت نمبر 21)

ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا۔

لفظ عذاب کے معنی میں اختلاف:

لفظ عذاب کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے،

بعض کہتے ہیں کہ یہ عذاب (ض) الرجل کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پراس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عاذب و عذوب کہا جاتا ہے لہذا تعذیب کے اصل معنی ہیں کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا۔

لفظ ألم کا مفہوم:

(الم) الألم (Pain, Sorrow)

کے معنی سخت درد کے ہیں کہا جاتا ہے۔

الم یالم (س) أَلَمْ يَأْلَمْ أَلْمًا فَهُوَ أَلْمٌ۔

قرآن میں ہے:

"فَاتَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ" (سورۃ النساء آیت نمبر 104)

تو جس طرح تم شدید درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں۔

المت فلانا میں نے فلاں کو سخت تکلیف پہنچائی۔

اور آیت کریمہ: "وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 10)

اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

میں الیم بمعنی مؤلم ہے یعنی دردناک۔ دکھ دینے والا۔ اور آیت:

"أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبُؤُا الَّذِیْنَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ" (سورۃ التغابن آیت نمبر 5)

کیا تمہیں ان کی خبر نہ آئی جنہوں نے تم سے پہلے کفر کیا۔

میں الف استفہام کا ہے جو لم پر داخل ہوا ہے۔ (یعنی اس مادہ سے نہیں ہے)

استعمال کذب:

(کذب) الكذب (Lie, false-hood)

قول اور فعل دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔

”إِنَّمَا يَتَّبِعِي الْكَلْبُ الْبَيْتَ لَا يُؤْمِنُونَ بِأَنبِيَائِهِمْ أُولَئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ“ (سورۃ المل آیت نمبر 105)
جھوٹ بہتان وہی ہمارے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی جھوٹے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 11]

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (۱۱)

ترجمہ:

”اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں۔“

مقن:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ

عطف علی یکنیونَ أو یقولُ. وما روی عن سلمان رضی اللہ عنہ أن أهل هذه الآية لم یأتوا بعد فعله أراد به أن أهلها ليس الذين كانوا فقط، بل وسيكون من بعد من حاله حالهم لأن الآية متصلة بما قبلها بالضمير الذي فيها. والفساد: خروج الشيء عن الاعتدال. والصلاح ضده وكلاهما يعبان كل ضار ونافع.

وكان من فسادهم في الارض هيج الحروب والفتن، بمخادعة المسلمين، وممالة الكفار عليهم بإفشاء الاسرار اليهم، فإن ذلك يؤدي إلى فساد ما في الارض من الناس والدواب والحراث.

ومنه إظهار المعاصي والإهانة بالدين فإن الإخلال بالشرائع والإعراض عنها مما يوجب الهرج والمرج ويخل بنظام العالم. والقائل هو الله تعالى، أو الرسول صلى الله عليه وسلم، أو بعض المؤمنين، وقرأ الكسائي وهشام (قيل) بإشمام الضم الاول:

قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ جواب ل إذا رد لناضع على سبيل المبالغة، والمعنى أنه لا يصح مخاطبتنا بذلك، فإن شأننا ليس إلا الإصلاح، وإن حالنا متمحضة عن شوائب الفساد، لأن (إنما) تفيد قصر ما دخلت عليه على ما بعده، مثل: إنما زيد منطلق، وإنما ينطلق زيد، وإنما قالوا ذلك: لأنهم تصوروا الفساد بصورة الإصلاح لما في قلوبهم من البرض كما قال الله تعالى: أَلَمْ تَرَ لَهٗ سُوءَ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا.

ترجمہ:

اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو۔

یہ مکمل جملہ شرط اور جزاء مل کر یا تو یہ کذبوں پر معطوف ہے یا بقول الی آخرہ پر اور حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے کہ اس آیت کے جو مصداق ہیں، وہ ابھی تک نہیں آئے شاید آپ کی اس سے مراد یہ ہو کہ اس آیت کے مصداق صرف وہی منافق نہیں جو عہد نبوت میں تھے بلکہ آپ کی مراد یہ ہے کہ بعد میں بھی ایسے لوگ آتے رہیں گے کہ جن کا حال وہی ہوگا جو ان منافقوں کا تھا جو عہد نبوت میں تھے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تاویل اس لئے کرنا پڑی کہ اس آیت میں ہم ضمیر مذکور ہے جو اس آیت کے ما قبل کلام سے متصل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اور اگر اس کا عطف بقول الی آخرہ پر کیا جائے تو اعراب میں اس آیت کا کوئی محل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا عطف من موصولہ کے ضلہ پر ہوگا کیونکہ ضلہ کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوتا اس لئے اس کا بھی اعراب میں کوئی محل نہیں ہوگا۔

فساد کی تحقیق:

(فساد) (Quarrel, Disturbance)

فساد کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کا اعتدال کی حد سے خارج ہو جانا، اور اس کے برعکس کسی چیز کا اپنے حد پر رہنا صلاح کہلاتا ہے اور اصطلاح میں فساد سے مراد ہر قسم کی نقصان دہ چیز ہے۔ اور صلاح سے مراد ہر قسم کی نفع مند چیز ہے اور منافقین کا زمین میں فساد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی مخالفت کرتے تھے اور ان کے خلاف کفار کی مدد کرتے تھے اور مسلمانوں کے راز کفار تک پہنچاتے تھے جن کی وجہ سے وہ جنگوں اور فتنوں کو بھڑکاتے تھے۔ اور ان کا یہ طرز عمل زمین میں فساد برپا کرنے کا سبب اور اس تک پہنچانے کا سبب تھا کیونکہ اس طرح لوگ اور چوپائے تباہ ہو جاتے اور کھیتیاں برباد ہو جاتیں اور ان کا یہ بھی فساد تھا کہ وہ کھلے بندوں بر ملا گناہ کا ارتکاب کرتے اور دین و مذہب کی توہین کرتے جو فساد کے قبیلہ سے ہے کیونکہ شرعی احکام میں رخنہ اندازی کرنا، ان کو عملی جامہ پہنانے سے منہ موڑ لینا یہ بھی ان چیزوں سے ہے جو فتنہ و فساد کا باعث بنتی ہیں اور نظام کائنات کو بگاڑ دیتی ہیں منافقین کو فساد سے رکنے کا حکم دینے والا یا تو اللہ تعالیٰ ہے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین ہیں۔

ہم تو سنوارنے والے ہیں۔

قَالُوا لَئِن لَّمْ يَكُنْ مُصْلِحًا وَنُصَلِّحُوا

یہ مکمل جملہ اذا کا جواب شرط ہے اور منافقین کا یہ کہنا ہے کہ ہم سر اپا اصلاح کرنے والے ہیں ان کے نقطہ نظر کے مطابق فساد سے رکنے کی نصیحت کرنے والے کی بھرپور اور مبالغہ کے ساتھ تردید ہے۔ گویا منافقین نے یوں کہا کہ ہمیں فساد کی کہنا سرے سے درست ہی نہیں کیونکہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اور ہماری حالت فساد کے شاہوں سے بھی پاک ہے کیونکہ

یہاں انما کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس پر وہ داخل ہوتا ہے اس کو اپنے مابعد کے ساتھ خاص کر دیتا ہے۔ جیسے انما زید منطلق بے شک زید چلنے کے ساتھ خاص ہے یا انما ینطلق زید کہ چلنا زید کے ساتھ خاص ہے۔ منافقین کا اپنے آپ کو سراپا اصلاح لئے تھا کہ وہ فساد کو ہی اصلاح تصور کرتے تھے کیونکہ ان کے دل مریض تھے اور جس کی طبیعت خراب ہو اسے ہر ایک چیز خراب لگتی ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ،

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا. (سورۃ فاطر آیت نمبر 8)

تو کیا وہ جس کی نگاہ میں اس کا بڑا کام آراستہ کیا گیا کہ اس نے اسے بھلا سمجھا ہدایت والے کی طرح ہو جائے گا۔
تو کیا ایسا آدمی مومن مخلص کے برابر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

حرف اذا کا معنی:

(اذا) اذا

(ظرف زماں) زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے کبھی جب اس میں شرطیت کا مفہوم پایا جاتا ہے تو فعل مضارع کو جزم دیتا ہے اور یہ عام طور پر لظم میں آتا ہے اور اذا (ظرف) ماضی کے لئے آتا ہے اور جب ما کے ساتھ مرکب ہو (اذما) تو معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا،

اذما اتيت على الرسول فقل له

جب تو رسول اللہ کے پاس جائے تو ان سے کہنا۔

اذا کی مختلف صورتیں:

اذا کی مختلف صورتیں ہیں:

(1) یہ ظرف زمان ہے۔ (زجاج، ریاشی)

(2) یہ ظرف مکان ہے۔ (مبرد، سیبویہ)

(3) اکثر و بیشتر اذا شرط ہوتا ہے۔

مفسرین نے تینوں معنوں میں اس کا استعمال کیا ہے۔

(1) ظرف زمان: اور جب تو وہاں (کی نعمتیں) دیکھے گا۔ تو تجھ کو وہاں بڑی نعمت اور شاہی ساز و سامان نظر آئے گا۔

(تفسیر حسانی)

(2) ظرف مکان: اور جدھر بھی تم وہاں دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور وسیع مملکت نظر آئے گی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

(3) اذا شرطیہ۔ اور اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھے بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھائی دے۔ (تفسیر ماجدی)

نوٹ: حرف لا کی مفصل تفصیل گزر چکی ہے۔

فساد کا معنی:

(فساد) الفساد (ن) (Quarrel, Disturbance)

یہ فساد الشئی فہو فساد کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ قرآن مجید میں ہے:

"لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ" (سورة المؤمن آیت نمبر 71)

توضو و آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے۔

ارض کا صیغہ:

(ارض) الارض (Earth, Ground, Land)

(زمین) سماء (آسمان) کے بالمقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع ارضون ہے۔ جس کا صیغہ قرآن میں نہیں ہے کبھی ارض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔

صلح کا مفہوم:

(صلح) الصلاح (Peace)

اور الصلح کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کر کے (امن و سلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے) چنانچہ

اصطلحوا و تصالحوا

کے معنی باہم امن و سلامتی سے رہنے کے ہیں قرآن میں ہے:

"أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" (سورة النساء آیت نمبر 128)

کہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح خوب ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 12]

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ (12)

ترجمہ:

"سنہا ہے وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔"

متن:

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ

ردلما ادعوه ابلغ رد للاستئناف به وتصديرة بحرفي التأكيد:
 (ألا) المنبهة على تحقيق ما بعدها، فإن همزة الاستفهام التي للإنكار إذا دخلت على
 النفي أفادت تحقيقاً، ونظيرة (أليس ذلك بقادر)، ولذلك لا تكاد تقع الجملة بعدها إلا
 مصدرة بما يتلقى به القسم، وأختها أما التي هي من طلائع القسم: وإن المقترنة
 للنسبة، وتعريف الخبر وتوسيط الفصل لرد ما في قولهم (إنما نحن مصلحون) من
 التعريض للمؤمنين، والاستدراك ب لا يَشْعُرُونَ.

ترجمہ:

یہ آیت منافقین کے اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے جو وہ کرتے تھے کہ وہ تو سراپا مصلح ہیں منافقین نے جس بلوغ انداز میں
 دعویٰ اصلاح کیا تھا اس کی تردید کے لئے اس سے کہیں زیادہ بلوغ انداز کلام اختیار کیا گیا ہے اور اس انداز بلاغت کی چند درج
 ذیل وجوہات ہیں۔

1- ان کے دعویٰ کی تردید کے لئے جملہ متانفہ ذکر کیا گیا ہے جو کسی پوشیدہ سوال کا جواب ہوتا ہے۔

2- اس سے پہلے دو حرف تاکید ذکر کئے گئے، لا حرف تشبیہ، ان حرف تحقیق

حرف الا:

یہ مخاطب کو اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے لایا جاتا ہے جو بعد حکم بیان ہونے والا ہے اسے چونکہ اور خبردار ہو کر سماعت
 کریں، اور یہ اثبات کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ جب لا حرف نفی سے پہلے ہمزه استفہام انکاری آجاتا ہے تو وہ اثبات کا ہی فائدہ دیتا
 ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ،

اليس ذالك بقادر کیا اللہ اس پر قادر نہیں یعنی وہ قادر ہے۔ (سورۃ قیلۃ آیت نمبر 40)

اسی وجہ سے اس کے بعد ایسا جملہ آتا ہے جس کے آغاز میں ایسے حروف آتے ہیں جو قسم کے مقدمات میں سے ہیں اور
 اسی کا ہم معنی لفظ اما ہے جو جملہ قسمیہ کے طلائع میں سے ہے۔

اس جملہ کے آغاز میں ان حروف مشبہ بالفعل ہے جو نسبت حکمیہ کو ثابت کرنے کے لئے آتا ہے۔

خبر کو معرفہ ذکر کیا اور مبتداء اور خبر ہم ضمیر فصل ذکر فرمائی جو خبر اور صفت کے درمیان فرق کرنے کے ساتھ ساتھ خبر کو مبتداء
 کے ساتھ خاص کرنے کا فائدہ بھی دیتی ہے۔ یہ تاکید بالائے تاکید اسی لئے لگائی گئی ہے کہ منافقین کے دعویٰ اصلاح کی بھرپور
 انداز میں تردید کی جائے کیونکہ انہوں نے

إنما نحن مصلحون

کہا تھا جس سے ان کا مقصد اصلاح کے دعویٰ کے ساتھ تعریفاً مومنین کو فساد ہی شمار کرنا تھا اور لیکن کالفظ ذکر فرما کر اس وہم کا ازالہ کر دیا جو مومنوں کے فساد ہونے کا پیدا ہوتا تھا اور لایشعرون کا جملہ ذکر کر کے ان سے احساس ہی کی نفی فرمادی کہ انہیں اپنے فساد ہونے کا احساس تک نہیں۔ (جبکہ ان کا فساد بالکل ظاہر تھا)

نوٹ:

فساد و شعور کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 13]

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ
السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ (13)

ترجمہ:

”اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنا ہے؟ وہی احمق ہیں مگر جانتے نہیں۔“

متن:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا مِنْ تَمَامِ النَّصِيحِ وَالْإِرْشَادِ فَإِنَّ كِبَالَ الْإِيمَانِ بِمَجْمُوعِ الْأَمْرَيْنِ:
الْإِعْرَاضِ عَمَّا لَا يَنْبَغِي وَهُوَ الْمَقْصُودُ بِقَوْلِهِ: لَا تُفْسِدُوا، وَالْإِتْيَانِ بِمَا يَنْبَغِي وَهُوَ
الْمَطْلُوبُ بِقَوْلِهِ: آمِنُوا.

كَمَا آمَنَ النَّاسُ فِي حَيْزِ النَّصَبِ عَلَى الْمَصْدَرِ، وَمَا مَصْدَرِيَّةٌ أَوْ كَافَةٌ مِثْلَهَا فِي رِبْعِهَا،
وَاللَّامُ فِي النَّاسِ لِلْجِنْسِ وَالْمُرَادُ بِهِ الْكَامِلُونَ فِي الْإِنْسَانِيَّةِ الْعَامِلُونَ بِقَضِيَّةِ الْعَقْلِ،
فَإِنَّ اسْمَ الْجِنْسِ كَمَا يَسْتَعْبِلُ لِمَسَابَةِ مَطْلَقاً يَسْتَعْبِلُ لَهَا يَسْتَجْمَعُ الْبَعَائِي الْبِخْصُوصَةَ
بِهِ وَالْمَقْصُودَةُ مِنْهُ، وَلِذَلِكَ يَسْلُبُ عَنْ غَيْرِهِ فَيُقَالُ: زَيْدٌ لَيْسَ بِإِنْسَانٍ، وَمِنْ هَذَا الْبَابِ
قَوْلُهُ تَعَالَى: صُحِّمُكُمْ عُمِّيٌّ وَنَحْوَهُ وَقَدْ جَمَعَهَا الشَّاعِرُ فِي قَوْلِهِ:

إِذِ النَّاسُ نَاسٌ وَالزَّمَانُ زَمَانٌ أَوْ لِلْعَهْدِ، وَالْمُرَادُ بِهِ الرَّسُولُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ
مَعَهُ، أَوْ مَنْ آمَنَ مِنْ أَهْلِ جَلْدَتِهِمْ كَابْنِ سَلَامٍ وَأَصْحَابِهِ،

وَالْبَعْنَى آمَنُوا إِيمَاناً مَقْرُوناً بِالْإِخْلَاصِ مَتَّبِعِضاً عَنْ شَوَائِبِ النِّفَاقِ مِمَّا ثَلَا لِلْإِيمَانِ،
وَاسْتَدِلُّ بِهِ عَلَى قَبُولِ تَوْبَةِ الزَّنَدِيقِ وَأَنَّ الْإِقْرَارَ بِاللِّسَانِ إِيمَانٌ وَإِنْ لَمْ يَفِدِ التَّقْيِيدَ.

ترجمہ:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا... الخ

کے ساتھ منافقوں کو مخاطب کیا گیا ہے تاکہ وعظ ارشاد اور نصیحت کو مکمل کیا جائے کیونکہ ایمان دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

1- ان تمام چیزوں کی تصدیق کرتے ہوئے ان کو عملی جامہ پہنانا، جو مناسب ہوں اللہ کریم کے فرمان کا بھی یہی مقصد

ہے۔

2- ان تمام چیزوں سے پرہیز کرنا جو غیر مناسب اور غلط ہیں اور اللہ کریم کے ارشاد لا تفسدوا سے بھی یہی مراد ہے اور کما امن الناس میں کاف بمعنی مثل ہے۔ اور مایا تو مصدر یہ ہے اور یا کافہ ہے جیسے رما میں ما کافہ ہے اور کاف بمعنی مثل اپنے مابعد کے ساتھ مل کر بتاویل مصدر ہو کر بحیثیت مفعول مطلق منصوب ہے۔ اور الناس سے پہلے الف لام یا تو جنسی ہے اور الناس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان اوصاف سے متصف ہیں جن کا کامل انسانوں میں پایا جانا ضروری ہوتا ہے تو دریں صورت آیت کریمہ کا یہ معنی ہوگا کہ اے ایمان والو ایسے ایمان لے کر آؤ جیسے کامل انسانیت ایمان لے کر آئے اور عقل و شریعت کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح مطلق اسم بول کر اس سے کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت مراد لی جاسکتی ہے اسی طرح اس سے وہ ذات بھی مراد لی جاتی ہے کہ جس میں اس جنس کے وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جو اس کے کمال کا تقاضا کرتے ہیں اور جو اوصاف اس جنس سے مقصود ہوتے ہیں اسی وجہ سے جس میں وہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں اس سے اس جنس کی نفی ہی کر دی جاتی ہے اور یوں کہا جاتا ہے کہ وہ انسان ہی نہیں یعنی اس میں انسانیت کے اوصاف ہی نہیں پائے جاتے اللہ کریم کا یہ ارشاد اسی پر دل ہے،

صم بکم عمی

یعنی وہ قوت لفظ، قوت سماعت اور قوت بصارت کے ہونے کے باوجود نہ ہی حق کی باتیں سنتے ہیں اور نہ ہی زبان سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ تو گویا وہ دیکھنے، سننے اور بولنے سے بے بہرہ ہیں۔ اور کسی شاعر نے اس کی وضاحت کے لئے جنس مطلق اور مخصوص اوصاف سے متصف جنس کو ایک ہی شعر میں جمع کر دیا۔

دیار بھا کنا نحب مزارھا اذا الناس ناس والزمان زمان

ان شہروں کا دیکھنا ہمیں اس وقت محبوب تھا جب لوگ لوگ تھے اور زمانہ زمانہ تھا۔

پہلے ناس سے مطلق جنس مراد ہے اور دوسرے ناس سے وہ انسان مراد ہیں جو انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ اسی طرح پہلے زمانہ سے مراد مطلق زمانہ ہے اور دوسرے زمانہ سے مراد خاص زمانہ ہے یا الناس سے پہلے الف لام عہد خارجی کی ہے۔ یعنی خارج میں مخصوص لوگ مراد ہیں۔ اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہیں کیونکہ وہی ہستیاں انسانیت کے اعلیٰ

درجے پر فائز تھیں۔ یا اسی سے یہود کے وہ افراد مراد ہوں گے جو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی، تو مطلب یہ ہوگا کہ اے منافقین تم اس طرح نفاق سے پاک ایمان لاؤ جس طرح وہ ایمان لائے تھے جو کامل الانسیت تھے وہ نفاق جیسے تمام شائبوں سے پاک تھے۔ اور اے یہودیو تم اس طرح اخلاص کے ساتھ ایمان لے آؤ جس طرح تمہاری قوم سے کچھ افراد ایمان لائے ہیں۔

توبہ زندیق:

اور اس آیت طیبہ میں اس بات پر دلیل قائم کی گئی ہے کہ زندیق کی توبہ قبول ہے زندیق وہ شخص ہے جو نبوت، توحید اور اسلامی عقائد کا بھی زبان ہے اقرار کرتا ہے اور ایسے عقائد کا بھی متحمل ہے جو بالاتفاق کفریہ عقائد ہیں اور معتزلہ کے نزدیک یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی کہ صرف زبان سے اقرار کر لینا خواہ اسے تصدیق قلبی حاصل نہ ہو، ایمان ہے ورنہ

کما امن الناس کی قید کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

نوٹ: ناس اور ایمان کی تحقیق گزر چکی ہے۔

سفاہت کا مفہوم:

(س ف ہ) السفة (Fool)

اس کے اصل معنی جسمانی ہلکا پن کے ہیں اسی سے بہت زیادہ مضطرب رہنے والی مہار کو زمام سفید کہا جاتا ہے اور ثوب سفید کے معنی ردی کپڑے کے ہیں۔ پھر اسی سے یہ لفظ نقصان عقل کے سبب خفت نفس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے سفہ نفسہ جو اصل میں سفہ نفسہ ہے پھر اس سے فعل کے نسبت قطع کر کے بطور تمیز کے اسے منصوب کر دیا ہے جیسے بطرت معشیتہ کہ یہ اصل میں بطرت معیشہ ہے۔ اور سفہ کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے چنانچہ امور دنیوی میں سفاہت کے متعلق فرمایا:

"وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 5)

اور بے عقلوں کو ان کے مال نہ دو۔

اور سفاہت اخروی کے متعلق فرمایا:

"وَأَنَّهُ كَانَ يَفْقُولُ سَفِيهًا عَلَى اللَّهِ سَطَطًا" (سورۃ الجن آیت نمبر 4)

اور یہ کہ ہم میں کا بے وقوف اللہ پر بڑھ کر بات کہتا تھا۔

یہاں سفاہت دینی مراد ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے اور آیت کریمہ:

"أَتُومِنٌ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ إِلَّا أَنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 13)

تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنا ہے؟ وہی احمق ہیں۔
میں ان سفیہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ ان کا مؤمنین کو سفہاء کہنا بنا بر حماقت ہے اور خود ان کی نادانی کی دلیل ہے۔
اسی معنی میں فرمایا:

"سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَا لَهُمْ عَنْ قِبَلِهِمُ الْبَيِّنَاتُ كَانُوا عَلَيْهَا" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 142)
اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے۔

علم کا معنی:

(علم) العلم (Knowledge)

کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا۔

متن:

قَالُوا اتُّؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ الْهَمْزَةُ فِيهِ لِلْإِنكَارِ وَاللَّامُ مَشَارٌ بِهَا إِلَى النَّاسِ، أَوْ
الْجِنْسِ بِأَسْرَةٍ وَهِيَ مِنْدَجُونَ فِيهِ عَلَى زَعْمِهِمْ، وَإِنَّمَا سَفَّهُوهُمْ لِاعْتِقَادِهِمْ فَسَادَ
رَأْيِهِمْ، أَوْ لِتَحْقِيرِ شَأْنِهِمْ، فَإِنَّ أَكْثَرَ الْمُؤْمِنِينَ كَانُوا فَقَرَاءَ وَمِنْهُمْ مَوَالِي: كَصَهْبِيبِ
وَبِلَالٍ، أَوْ لِلتَّجَلُّدِ وَعَدَمِ الْمِبَالَاةِ بِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ إِنْ فَسَّرَ النَّاسُ بَعْدَ إِذْ بَنَى سَلَامًا
وَأَشْيَاعَهُ، وَالسَّفَهُ: خُفَّةٌ وَسَخْفٌ رَأْيٍ يَفْتَضِيهِمَا نَقْصَانُ الْعَقْلِ، وَالْحَلْمُ يُقَابَلُهُ.
أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لِأَيُّ يَغْلَبُونَ رَدًّا وَمِبَالِغَةً فِي تَجْهِيلِهِمْ، فَإِنَّ الْجَاهِلَ بِجَهْلِهِ
الْجَازِمُ عَلَى خِلَافِ مَا هُوَ الْوَاقِعُ أَكْثَرُ طَبَاقًا لِدُكْرِ السَّفَهُ، وَإِنَّمَا فَصَلَتِ الْآيَةُ لِأَيُّ يَغْلَبُونَ وَالَّتِي
بِجَهْلِهِ، فَإِنَّهُ رُبَّمَا يَعْتَدُ وَتَنْفَعُهُ الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ، وَإِنَّمَا فَصَلَتِ الْآيَةُ لِأَيُّ يَغْلَبُونَ وَالَّتِي
قَبْلُهَا لِأَيُّ يَشْعُرُونَ لِأَنَّهُ أَكْثَرُ طَبَاقًا لِدُكْرِ السَّفَهُ، وَلِأَنَّ الْوُقُوفَ عَلَى أَمْرِ الدِّينِ
وَالْتَمْيِيزَ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ مِمَّا يَفْتَقِرُ إِلَى نَظَرٍ وَفِكْرٍ، وَأَمَّا النِّفَاقُ وَمَا فِيهِ مِنَ الْفِتَنِ
وَالْفَسَادِ فَإِنَّمَا يَدْرِكُ بِأَدْنَى تَفْطِنٍ وَتَأْمَلٍ فِيمَا يُشَاهَدُ مِنْ أَقْوَالِهِمْ وَأَفْعَالِهِمْ.

ترجمہ:

یہاں انومن سے مراد ہمزہ استفہام انکاری ہے اور السفہاء سے پہلے جو سوال مذکور ہے اس کا اشارہ الناس کی طرف
ہے یا اس کا اشارہ جس سفہاء کی طرف ہے اور منافقین کے زعم باطل کے مطابق مؤمنین بھی سفہاء کی اس جنس میں داخل ہیں،
ان کا مؤمنین کو بیوقوف کہنے کی وجہ یہ تھی، ان کے اعتقاد کے مطابق مؤمنین کی رائے درست نہ تھی بلکہ وہ انہیں نادان سمجھتے تھے یا

مومنین کو بیوقوف کہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ انہیں حقیر سمجھتے تھے کیونکہ مومنین میں سے اکثر فقراء اور آزاد کردہ غلام تھے جیسے حضرت صہیب رومی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے اور اگر الناس سے مراد عبد اللہ بن سلام اور آپ کے ساتھی لئے جائیں تو انہیں بیوقوف کہنے کی وجہ یہ ہوگی کی منافقین اپنا تعصب اور مضبوطی ظاہر کرتے تھے اور وہ ان کی قوم سے ایمان لانے والو کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور سفہاء سفہاء سے مشتق ہے جس کا مطلب کمزوری اور ضعف عقل ہے اور یہ کمزوری ضعف عقل کا تقاضا کرتی ہے اور علم اس کے مقابلہ میں ہے۔

اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السَّفَهَاءُ وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُوْنَ

جان لو وہی نے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں۔

یہ منافقین کے دعویٰ کا جواب ہے اور تردید ہے کیونکہ ان کے باطل گمان کے مطابق مومن بے وقوف تھے اور ان کی حماقت اور بے وقوفی میں مبالغہ کا اظہار کرنا مقصود ہے کیونکہ وہ شخص جو اپنی جہالت سے ناواقف ہو اور اپنی جہالت کے خلاف کا یقین رکھتا ہو وہ اس شخص سے کہیں جاہل اور گمراہ ہوتا ہے جس کو اپنی جہالت اور گمراہی کا علم ہو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایسے شخص کو معذور سمجھ لیا جائے اور تیہہات اور ذراوے اس کے لئے مفید ثابت ہوں جبکہ اس کے مخالف کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اور اس آیت کے آکر میں لا یعلمون کا ذکر کر کے فاصلہ کیا گیا ہے۔ جبکہ ما قبل آیت طیبہ میں جس میں منافقین کے فساد اور فتنہ پردازوں کا ذکر ہے، کا فاصلہ لا یسرعون کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سفہاء کا ذکر کر کے مناسب لا یعلمون میں صنعت طباق زیادہ ہے اور دین کے معاملہ میں آگاہی حاصل کرنا اور حق و باطل میں تمیز کرنا غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں اس لئے ان کی سفہاءت کے ثبوت کے بعد لا یعلمون ذکر فرما دیا لیکن ان کا فتنہ اور فساد محسوس چیز کی طرح تھا جس میں تھوڑا سا غور و فکر کر کے ادراک حاصل کیا جاسکتا تھا اور ان کے اقوال و افعال کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہو جاتا تھا اس لئے فرمایا کہ انہیں شعور و احساس ہی نہیں کہ وہ اپنے فتنوں اور فسادات کو محسوس کر سکیں گویا اس کے حواس ناکارہ ہو چکے ہیں جن سے وہ احساس کر سکتے تھے۔

[سورة البقرة (2) : آية 14]

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنُوا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ

مُسْتَهْزِؤُونَ (14)

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یونہی ہنسی کرتے ہیں۔“

متن:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنُوا بَيَانٍ لِّمَعَامِلِهِمُ الْبُؤْسَيْنِ وَالْكَفَّارِ، وَمَا صَدَرَتْ بِهِ

القصة فمساقة لبيان مذهبهم وتمهيد نفاقهم فليس بتكرير.

روى أن ابن أبي وأصحابه استقبلهم نفر من الصحابة، فقال لقومه:

انظروا كيف أُرِدُّ هؤُلاءِ السفهاءِ عنكم، فأخذ بيدي أبي بكر رضي الله عنه فقال: مرحباً بالصديق سيد بني تميم، وشيخ الإسلام وثاني رسول الله في الغار البازل نفسه وماله لرسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم أخذ بيد عمر رضي الله عنه فقال: مرحباً بسيد بني عدى الفاروق القوي في دينه، البازل نفسه وماله لرسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم أخذ بيد علي رضي الله عنه فقال: مرحباً يا ابن عم رسول الله صلى الله عليه وسلم، وختنه سيد بني هاشم، ما خلا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فنزلت.

واللقاء المصادفة يقال لقيته ولاقيته، إذا صادفته واستقبلته، ومنه ألقيته إذا طرحته فإنك بطرحه جعلته بحيث يلقى.

وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ مِنْ خُلُوتِ بَفْلَانٍ وَإِلَيْهِ إِذَا انْفَرَدَتْ مَعَهُ. أو من خلاك ذم أي عداك ومضى عنك، ومنه القرون الخالية. أو من خلوت به إذا سخرت منه، وعدى بالي لتعيس معنى الإنهاء، والمراد بشياطينهم الذين ماثلوا الشيطان في تمردهم، وهم المظهرون كفرهم، وإضافتهم إليهم للمشاركة في الكفر. أو كبار المنافقين والقائلون صغارهم. وجعل سببويه نونه تارة أصلية على أنه من شطن إذا بعد فإنه بعيد عن الصلاح، ويشهد له قولهم: تشيطن. وأخرى زائدة على أنه من شاط إذا بطل، ومن أسمائه البياطل.

قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ أَى فِي الدِّينِ وَالْإِعْتِقَادِ، خَاطَبُوا الْمُؤْمِنِينَ بِالْجُمْلَةِ الْفَعْلِيَّةِ. وَالشَّيَاطِينَ بِالْجُمْلَةِ الْإِسْمِيَّةِ الْمُؤَكَّدَةِ بِأَنَّ لَأَنَّهُمْ قَصَدُوا بِالْأَوَّلَى دَعْوَى إِحْدَاثِ الْإِيمَانِ، وَبِالْثَانِيَةِ تَحْقِيقِ ثَبَاتِهِمْ عَلَى مَا كَانُوا عَلَيْهِ، وَلَأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ بَاعِثٌ مِنْ عَقِيدَةٍ وَصِدْقِ رَغْبَةٍ فِيمَا خَاطَبُوا بِهِ الْمُؤْمِنِينَ، وَلَا تَوَقُّعَ رَوَاجِ ادْعَاءِ الْكِبَالِ فِي الْإِيمَانِ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْإِنصَارِ بِخِلَافِ مَا قَالُوهُ مَعَ الْكُفَّارِ.

إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِؤُونَ تَأْكِيدٌ لَهَا قَبْلَهُ، لِأَنَّ الْمُسْتَهْزَأَ بِالشَّيْءِ الْمُسْتَخَفُّ بِهِ مُصَوِّرٌ عَلَى خِلَافِهِ. أَوْ بَدَلٌ مِنْهُ لِأَنَّ مِنْ حَقْرِ الْإِسْلَامِ فَقْدَ عَظْمِ الْكُفْرِ. أَوْ اسْتِثْنَاءٌ فَكُنَ الشَّيَاطِينَ قَالُوا لَهُمْ لَهَا (قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ) إِنْ صَحَّ ذَلِكَ فَمَا بِالْكُمْ تَوَافِقُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَتَدْعُونَ

الإيمان فأجابوا بذلك، والاستهزاء السخرية والاستخفاف يقال:
هزئت واستهزأت بمعنى كأجبت واستجبت، وأصله الخفة من الهزاء وهو القتل السريع
يقال: هزأ فلان إذا مات على مكانه، وناقته هزأ به أي تسرع وتخف.

ترجمہ:

اس آیت مقدسہ میں منافقین کا جو طرز عمل مومنین اور کفار سے تھا اس کا ذکر کیا گیا ہے، اور

ومن الناس من يقول الى آخرة

جہاں سے منافقین کے قصے کا آغاز ہوا ہے اس کا مقصد ان کا مذہب اور عقیدہ بیان کرنا تھا اور وہ ان کے نفاق کی تمہید تھی

جب انہوں نے یہ کہا

امنا بالله وباليوم الآخر

تو اللہ کریم نے یہ فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں اس میں ان کے ایمان کے دعویٰ کی موکد نفی ہے لہذا زیر بحث آیت کا ذکر کرنا

قصے کا تکرار نہیں بلکہ ان کے برتاؤ کا بیان ہے۔

اس آیت کریمہ کے شان نزول میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی رئیس
المنافقین اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا رہا تھا کہ اس کی ملاقات صحابہ کرام کی اس جماعت سے ہوئی جس میں حضرت ابو بکر
صدیق، حضرت عمر فاروق، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم تھے تو اس نے کہا کہ دیکھو میں ان بیوقوفوں (اللہ کی پناہ) کو تم سے کیسے
نالتا ہوں اس نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا میں بنی تیم کے سردار، شیخ الاسلام، غار میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھی اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سب کچھ قربان کرنے والے صدیق اکبر کو خوش آمدید کہتا ہوں، اور پھر اس نے
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا کہ میں بنو عدی کے سردار الفاروق، دین اسلام کے لئے اپنا جان و مال
قربان کرنے والے عمر فاروق کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا کہ اے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی، آپ کے داماد، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بنو ہاشم کے سردار علی رضی اللہ عنہ کو خوش آمدید
کہتا ہوں۔ اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی۔

نیز یہ روایت محدثین کے نزدیک پایہ صحت تک نہیں پہنچی۔

لقوایہ لقاء سے مشتق ہے اس کا معنی کسی چیز کو پالینا اور ملاقات کرنا ہے لقیثہ اور لاقیثہ تو اس وقت کہے گا جب تو کسی
سے ملاقات کرے گا کہ میں نے اس سے ملاقات کی اور اسے میں نے پالیا اور لقاء سے جب باب افعال القاء بنا لیا جائے تو
اس کا معنی پھینکانا ہو جاتا ہے جیسا کہ تو کہے القیثہ بمعنی طرحتہ (کہ میں نے اسے پھینک دیا) کیونکہ جب تو اسے پھینکے گا تو وہ
دوسری چیز سے مل جائے گی۔

وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ

اور جب وہ اپنے شیطانوں جیسے سرداروں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔
خلو مشتق ہے خلوة سے۔ جو تین معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

1. اگر اس کے بعد حرف جارہ میں سے با یا الی آجائے تو اس کا معنی تنہا ہونا، الگ ہونا ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے خلوت بفلان والیہ (کہ میں اس کے ساتھ علیحدہ ہوا) تو اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جب وہ اپنے شیطانوں جیسے سرداروں کے ساتھ علیحدہ ہوتے ہوتے ہیں۔ تو انہیں کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم مومنین کے ساتھ تو مذاق کر رہے تھے۔
2۔ اور جب خلاق ذم سے مشتق ہو یا صرف خلاق سے مشتق مانا جائے تو اس کا معنی ہوگا گزر یعنی مذمت تجھ سے تجاوز کر گئی اسی لئے گزشتہ صدیوں کو قرون خالیہ کہتے ہیں۔

3۔ یا اگر خلوت بہ سے مشتق مانا جائے تو معنی مذاق کرنا ہوگا اس معنی کے اعتبار سے خلوا کے بعد الی کا لفظ اسی لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اپنے ضمن میں انتہاء کا معنی لئے ہوئے ہے، اور شیاطین سے مراد ان کے وہ سردار ہوں گے جو اپنی سرکشی اور ہٹ دھرمی میں شیطان کے ہم مثل ہیں اور اس صورت میں یا تو ان سے مراد وہ کفار ہوں گے جو اپنے کفر کا برملا اظہار کرتے تھے اور منافقین کو کفار میں شمار کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ کفر میں ان کے ساتھ شریک تھے یا ان میں سے ایک چیز ہونی چاہئے شیاطین سے بڑے بڑے گبر منافق مراد ہوں گے اور انہیں معکم کہنے والے ان کے چھوٹے منافق ہوں گے شیاطین کا مفرد شیطان ہے جو سیبویہ کے نزدیک شطن بمعنی بعد سے ماخوذ ہے اور اس کا نون اصلی ہوگا اور معنی ہوگا کہ وہ اصلاح سے بہت ہی دور ہیں۔ اور بعض کا تشیطن پڑھنا بھی اسی کی تائید کرتا ہے اور یہ شاطن بمعنی بطل سے مشتق ہے، جس کا معنی جھوٹا اور باطل ہونا ہے اور شیطان کے ناموں میں سے ایک نام باطل بھی ہے جو اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

قالوا انا معکم ...

منافقوں کا کہنا ہے کہ ہم بلا شک و شبہ تمہارے ساتھ ہیں، اعتقاد اور دین میں۔ تو منافقین نے جب مومنین کو خطاب کیا تو جملہ فعلیہ ذکر کیا جو تہجد اور حدوٹ پر دلالت کرتا ہے اور جب اپنے شیطان جیسے سرداروں سے ملاقات کی تو ان کے ساتھ خطاب میں جملہ اسمیہ، ان کے ساتھ مؤکد کر کے استعمال کیا جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے تھے کہ اب وہ نئے سرے سے ایمان لا رہے ہیں جس میں اخلاص ہے اور اپنے سرداروں کے ساتھ ملاقات میں جملہ اسمیہ مؤکدہ پیش کیا جو ثبات، تحقیق اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، تاکہ وہ انہیں یقین دلا سکیں کہ وہ اپنے سابقہ دین اور کفر پر مضبوط اور پختہ ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ایمان کے اظہار میں نہ تو ان کے اندر سچی رغبت تھی اور نہ ہی انہیں یہ توقع تھی کہ کامل فی الایمان کا، ان کا دعویٰ ان پر اثر انداز ہوگا۔ اسی لئے محض تصنع اور بناوٹ ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے امانا کہہ دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ مومنین کا تعلق مہاجرین اور انصار سے تھا جو فراست ایمانی کے نور سے دیکھتے تھے، بخلاف کفار کے ساتھ خطاب میں جس کا انہوں نے دعویٰ کیا

تھا کیونکہ اس میں انہیں صرف توقع ہی نہ تھی بلکہ پختہ یقین تھا کہ ان پر اثر انداز ہوگا اور وہ اسے تسلیم کر لیں گے۔

إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِؤُنَ

بے شک ہم ان سے (مومنین سے) استہزاء کر رہے ہیں۔

اس جملہ کے ماقبل کلام سے تین اعرابی احتمال مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) اپنے ماقبل کلام کی تاکید ہے۔

(2) یا یہ اپنے ماقبل سے بدل اشتہال ہے، اسی لئے اس کے درمیان واو عاطفہ ذکر نہیں کی گئی کیونکہ جو کسی کے ساتھ

استہزاء کرتا ہے اور اسے حقیر سمجھتا ہے تو وہ اسی کے خلاف پر مصر ہوتا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوگا کہ منافقین مومنین کا مذاق اڑا کر

اور انہیں حقیر سمجھ کر اپنے مذہب یہودیت پر قائم رہنے کو ثابت کر رہے ہیں کیونکہ جو اسلام کو حقیر سمجھتا ہے وہ کفر کی تعظیم کرتا ہے۔

(3) یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کا ماقبل سے اعرابی تعلق نہیں ہے اور آپکو پتہ ہے کہ جملہ مستانفہ سوال مقدر کا جواب ہوتا

ہے تو گویا منافقین ان سے پوچھتے کہ اگر تم ہمارے ساتھ ہو تو جیسے تم نے انا معکم کہا تو مومنین کے ساتھ موافقت کیوں کرتے ہو؟

اور ایمان کا دعویٰ کرنے کی وجہ کیا ہے؟

تو جواب دیتے ہیں کہ وہ ان کا مذاق اڑا رہے تھے اور انہیں بے وقوف بنا رہے تھے۔

مُسْتَهْزِؤُنَ

مشتق ہے استہزاء سے، جس کا معنی ہے خفیف سمجھنا اور مذاق کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے ہزات و استہزات میں نے مذاق کیا

اور حقیر سمجھا۔ یہ دونوں ہم معنی ہیں جیسے اجبت اور استجبت ہم معنی ہیں کہ میں نے قبول کیا۔ دراصل استہزاء ہزاء سے بنا

ہے جس کا معنی جلدی قتل کرنا ہے اور جب کوئی بندہ فوراً موقع پر ہلاک ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے ہزاء فلان کہ فلاں اسی جگہ مر گیا

اور جب کوئی اونٹنی کسی چیز کو اٹھا کر تیز اور سبک رفتاری سے چلے تو کہتے ہیں۔

ناقتہ تہزابہ

کہ اونٹنی اسے سبک اور تیز رفتاری سے لئے جا رہی ہے۔

لفظ لقوا کی تحقیق:

وتلقى السماحة منه والندی خلقا سخاوت اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ لقیبت بكذا۔ میں فلاں

چیز کے ساتھ اس کے سامنے پہنچا۔ قرآن میں ہے:

"وَيُلْقُونَ فِيهَا تِجْيَةً وَسَلَامًا" (سورة الفرقان آیت نمبر 75)

اور وہاں مجرے اور سلام کے ساتھ ان کی پیشوائی ہوگی۔

"وَلَقَاهُمْ نَصْرًا وَسُرُورًا" (سورة الانسان آیت نمبر 11)

اور فرشتے ان کی پیشوائی کو آئیں گے۔

تلقاہ کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے ہیں۔

جیسے فرمایا: "وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 103)

اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے۔

"وَإِنَّكَ لَتَلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنِّ حَكِيمٍ عَلِيمٍ" (سورۃ النمل آیت نمبر 6)

اور بیشک تم قرآن سکھائے جاتے ہو حکمت والے علم والے کی طرف سے۔

تحقیق لفظ خلا:

(خلو) الخلاء (Vacancy, Empty, Cavity)

خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور الخلو کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں ماضی (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت خلا الزمان کے معنی زمانہ گزر گیا کر لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول ہو چکے۔

"وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثَلَاتُ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 6)

اور ان سے اگلوں کی سزائیں ہو چکیں۔

"تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 141)

تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں۔

"إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 24)

سب میں ایک ڈرسانے والا گزر چکا۔

"مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 214)

تم پر اگلوں کی سی روداد نہ آئی۔

"وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمْ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 119)

اور اکیلے ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے۔

اور آیت کریمہ: "يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 9)

کہ تمہارے باپ کا منہ صرف تمہاری ہی طرف رہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے۔ رہ جائے گی۔ خلا الانسان۔ تنہا ہونا۔

خلا فلان بفلان کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔ خلا الیہ کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن میں ہے:

"وَإِذَا تَخَلَّوْا إِلَىٰ شِيَاطِينِهِمْ" (سورة البقرة آیت نمبر 14)

اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں۔

خلت فلانا کے اصل معنی کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔

فرمایا:

"فَقَلُّوا سُبُغِيْلَهُمْ" (سورة التوبة آیت نمبر 5) تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

ناقة خلیتہ اونٹنی کو دودھ دہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔ امراءة خلیتہ مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی اور

جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خلیتہ کہا جاتا ہے۔ الخلی جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مطلقۃ کا لفظ سکون و اطمینان

کے معنی میں آجاتا ہے۔ چنانچہ شاعر کا قول،

تطلقة طورا طورا تراجع

میں (کسی سے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ دو) عود کر آتی ہے) میں تطلقة کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ الخلاء،

خشک گھاس۔ کہا جاتا ہے: خلیت الخلاء۔ میں نے خشک گھاس کاٹی۔ خلیت الدابتہ جانور کو خشک گھاس ڈالی۔ سیف

یختلی۔ تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

الی حرف جار کی تحقیق:

الی۔ حرف (جر) (Upto, Till)

حرف جر ہے اور جہات ستہ میں سے کسی جہت کی نہایت حد بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ (ال و) الوت فی الامر کے

معنی ہیں کسی کام میں کوتاہی کرنا گویا کوتاہی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس امر کی انتہا یہی ہے۔ اور الوت فلانا کے معنی اولیتہ

تقصیرا (میں نے اس کو تاہی کا والی بنا دیا) کے ہیں جیسے کسبتہ ای اولیتہ کسبا (میں نے اسے کسب کا ولی بنا دیا)

مالوتہ جہدا میں نے مقدر پھر اس سے کوتاہی نہیں کی اس میں جہد آمیز ہے جس طرح مالوتہ نصحا میں نصحا ہے۔

قرآن میں ہے:

"لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبَأًا" (سورة آل عمران آیت نمبر 118)

یعنی یہ لوگ تمہاری خرابی چاہنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ" (سورة النور آیت نمبر 22)

اور قسم نہ کھائیں وہ جو تم میں فضیلت والے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ الوت سے باب افتعال ہے اور بعض نے الیت بمعنی حلفت سے مانا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی تھی جب کہ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ مسطح کی مالی امداد نہیں کریں

گے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ فعل (مجرد) سے بنایا جاتا ہے جیسے:

کبت سے اکتسبت اور صنعت سے اصطنعت اور رایت سے ارتایت اور روایت لا دریت ولا انتلیت میں بھی مالوتہ شنیہا سے افتعال کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے معنی ولا استطعت کے ہیں (یعنی تونے نہ جانا اور نہ تجھے اس کی استطاعت ہوئی۔

نوٹ: لفظ شیطان کی بحث گزر چکی ہے۔

مفہوم استہزاء:

الاستہزاء

اصل میں طلب ہزع کو کہتے ہیں اگرچہ کبھی اس کے معنی مزاق اڑانا بھی آجاتے ہیں جیسے استجابة کے اصل معنی طلب جواب کے ہیں اور یہ اجابة جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"قُلْ اَبَانِللهِ وَاٰیٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 65)

کہو کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کرتے تھے۔

"وَحٰقُّ بِهٖمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ" (سورۃ ہود آیت نمبر 8)

اور جس چیز کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے۔ تھے وہ ان کو گھر لے گی۔

"مَا يٰۤاْتِيْهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 11)

اور ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔

"اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزٰٓءُ بِهَا" (سورۃ النساء آیت نمبر 140)

جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جاتا اور ان کی ہنسی بنائی جاتی ہے۔

"وَلَقَدْ اَسْتَهْزِءُوْا بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 10)

اور ضرور اے محبوب تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ٹھٹھے کیا گیا۔

استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسا؟

حقیقی معنی کے لحاظ سے استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے جیسا کہ لہو و لعب کا استعمال باری تعالیٰ کے حق میں جائز نہیں ہے لہذا آیت:

"اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهٖمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيٰنِهِمْ يَعْمَهُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 15)

اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

میں یستہزیء کے معنی یا تو استہزاء کی سزا تک مہلت دی اور پھر انہیں دفعۃً پکڑ لیا یہاں انہوں نے ہزع کی طرح دھوکا

کھا یا پس یا اس مارچ کے ہم معنی ہے جیسے فرمایا: ان کو بتدریج اس طرح سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔ اور آہت کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر وہ استہزار اڑا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے استہزار سے باخبر ہے تو گو یا اللہ تعالیٰ بھی ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو دھوکہ دے۔ اور وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہو کر اسے اطلاع دینے بغیر اسے سے احتراز کرنے تو کہا جاتا ہے۔ خدعند یعنی وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

ان للستهزبين في الدنيا الفتح لهم باب من المجدته فيسر عون لمحوه فاذا انهر اليه سد عليهم۔

کہ جو لوگ دنیا میں دین الہی کا مذاق اڑاتے ہیں قیامت کے دن ان کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جائیگا جب یہ لوگ اس میں داخل ہونے کے لئے سرپ دوڑ کر وہاں پہنچیں گے تو وہ دروازہ بند کر دیا جائیگا۔

چنانچہ آیت: "فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ" (سورۃ المطففين آیت نمبر 34)

تو آج ایمان والے کافروں سے ہنستے ہیں۔

اس میں بعض کے نزدیک ضحک سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت

"سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 79)

اللہ ان کی ہنسی کی سزا دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

میں بھی اسی قسم کی تاویل ہو سکتی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 15]

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (15)

"اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔"

متن:

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ

يجازيهم على استهزائهم، سمي جزاء الاستهزاء باسمه كما سمي جزاء السيئة سيئة، إما لمقابلة اللفظ باللفظ، أو لكونه مماثلاً له في القدر، أو يرجع وبال الاستهزاء عليهم فيكون كالمستهزء بهم، أو ينزل بهم الحقارة والهوان الذي هو لازم الاستهزاء، أو الغرض منه، أو يعاملهم معاملة المستهزء: أما في الدنيا فبإجراء أحكام المسلمين عليهم، واستندراجهم بالإمهال والزيادة في النعمة على التماذي في الطغيان، وأما في

الآخرة: فبأن يفتح لهم وهم في النار باباً إلى الجنة فيسرعون نحوه، فإذا صاروا إليه سد عليهم الباب، وذلك قوله تعالى: **قَالِيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ** وإنما استؤنف به ولم يعطف ليدل على إن الله تعالى تولى مجازاتهم، ولم يحوج المؤمنين إلى أن يعارضوهم، وأن استهزاءهم لا يؤبه به في مقابلة ما يفعل الله تعالى بهم ولعله لم يقل: الله مستهزاء بهم ليطابق قولهم، إيماء بأن الاستهزاء يحدث حالاً فحالاً ويتجدد حيناً بعد حين، وهكذا كانت نكايات الله فيهم كما قال تعالى: **أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ**.

ترجمہ:

اللہ يستهزئ بهم

کا معنی یہ ہے کہ اللہ کریم ان منافقین کو ان کے استهزاء کی سزا دیتا ہے۔ یہاں استهزاء کی سزا کو مجازاً اسی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے سبباً، برائی کی سزا کو کہا جاتا ہے حالانکہ برائی کی سزا برائی نہیں ہوتی بلکہ انصاف ہوتا ہے۔ یہ تو بطور مشاکلہ یعنی ایک لفظ کے انجام کو اسی لفظ کے ساتھ تعبیر کرنا ہے

یا جو سزا منافقین کو دی جائے گی وہ مقدار میں ان کے نفاق کے مماثل ہوگی۔

یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کریم ان کے وبال انہیں کی طرف لوٹائے گا جس کو مجازاً استهزاء کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے ساتھ استهزاء کر دیا جائے۔

یا ان کے استهزاء کی وجہ سے ان پر حقارت اور ذلت نازل فرمائے گا کیونکہ ذلت وحقارت، استهزاء کو لازم ہیں اس لئے ملزوم بول کر لازم مراد لیا اور استهزاء کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے۔

یا اللہ کریم منافقین کے ساتھ ایسا معاملہ فرما رہا ہے جیسا ان لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے جن سے استهزاء کیا جاتا ہے۔ یا تو معاملہ دنیا میں ہوگا وہ اس طرح کہ دنیا میں ان کو اسلامی احکام کا مکلف بنایا جا رہا ہے اور ان پر فوری عذاب نازل نہیں کیا جا رہا۔ بلکہ انہیں مہلت دے کر آہستہ آہستہ جہنم کی طرف لے جا رہا ہے، اور ان کی سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے کے باوجود ان پر نعمتوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

یا یہ معاملہ آخرت میں ہوگا وہ اس طرح کہ جب وہ دوزخ کی آگ میں جل رہے ہوں گے تو ان کے سامنے جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جائے گا وہ اس میں داخل ہونے کے لئے تیزی کے ساتھ دوڑیں گے تو جب وہ اس کے نزدیک پہنچیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا، اور اللہ کریم کا یہ ارشاد گرامی اس کی تائید کرتا ہے فرمایا،

قَالِيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ

کہ آج ایمان والے کافروں پر نہیں گے۔

اللہ يستهزؤ بہم کو بطور جملہ متانفہ ذکر کیا گیا ہے اور اس کا ماقبل کلام پر عطف نہیں کیا گیا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ اللہ کریم مومنین کی طرف سے منافقین کو سزا دینے کا متولی ہے اور اس نے مومنین کو اس سے بے پرواہ کر دیا ہے کہ وہ ان کا مقابلہ کریں اور یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ ایمان والے ان کے استہزاء کی پرواہ نہ کریں کیونکہ اللہ کریم جو ان سے معاملہ کرنے والا ہے وہ بہت ہی شدید عذاب ہے۔
اور شاید اسی وجہ سے اللہ کریم نے،

اللہ يستهزؤ بہم

نہیں فرمایا کہ عبارت منافقین کی کہی ہوئی عبارت کے مطابق ہو جاتی بلکہ اس کی جگہ،

اللہ يستهزؤ بہم

مضارع کا صیغہ ذکر فرمایا تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ یہ سزا دن بدن نئے انداز میں پیدا ہوتی رہے گی، اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہے گی اور منافقین کے حق میں اللہ کریم کی سزائیں اس طرح شدید ترین ہوتی ہیں۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کریم انہیں سال میں ایک یا دو مرتبہ آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔

متن:

وَيَمْتَدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْتَهُونَ

من مد الجبیش وأمدہ إذا زادة وقواہ، ومنہ مددت السراج والارض إذا استصلحتہما بالزیت والساد، لا من المد فی العبر فإنه یعدی باللام کأملی له. ویبدل علیہ قراءة ابن کثیر (ویمدہم). والمعزلة لها تعذر علیہم إجراء الكلام علی ظاہرہ قالوا: لها مدعہم اللہ تعالی الطافة التي یمنحها المؤمنین وخذلہم بسبب کفرہم وإصرارہم، وسدہم طرق التوفیق علی أنفسہم فتزایدت بسببہ قلوبہم ریناً وظلمة، تزاید قلوب المؤمنین انشراحاً ونوراً، وأمكن الشیطان من إغوائہم فزادہم طغیاناً، أُسِنَدَ ذلك إلى اللہ تعالی إسناد الفعل إلى السبب مجازاً، وأضاف الطغیان إلیہم لئلا یتوہم أن إسناد الفعل إلیہ علی الحقیقة، ومصداق ذلك أنه لها أسند المد إلى الشیاطین أطلق الغی وقال وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ، أو أصلہ یمد لهم بمعنی یملی لهم ویمد فی أعمارہم کی یتنبہوا ویطیعوا، فما زادوا إلا طغیاناً وعمہاً، فحذفت اللام وعدی الفعل بنفسہ کما فی قوله تعالی: وَاخْتَارَ مُوسَى قَوْمَهُ، أو التقدير یمدہم

استصلاحاً، وهم مع ذلك يعمّهون في طغيانهم. والطغيان بالضم والكسر كلقيان والطغيان: تجاوز الحد في العتو، والغلو في الكفر، وأصله تجاوز الشيء عن مكانه قال تعالى: إِنَّا لَنَاطِقِي الْمَاءِ حَمَلْنَاكُمْ. والعبه في البصيرة كالعمى في البصر، وهو: التحير في الامر يقال رجل عامه وعمه، وأرض عمها لا منار بها، قال:

أَعْمَى الْهُدَى بِالْجَاهِلِينَ الْعَبَهُ

ترجمہ:

یہاں یعد کا مادہ اشتقاق مد الجیش و امده ہے اور یہ فقرہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب سپہسالار لشکر کے افراد میں اضافہ کر دے اور اسے رسد پہنچا کر طاقتور بنا دے، اس طرح مددت السراج والارض جس کا معنی یہ کہ میں نے چراغ میں تیل ڈال کر اور زمیں میں کھا دھو پھینک کر ان کی اصلاح کر دی۔ یہ مد فی العمر سے مشتق نہیں جس کا معنی عمر دراز کرنا اور مہلت دینا ہے کیونکہ جب یہ عمر دراز کرنے اور مہلت دینے کے معنی میں ہو تو اس وقت یہ لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ اُملیٰ لہ کہ میں اسے مہلت دیتا ہوں اور جو معنی اوپر مذکور ہوا ابن کثیر کی قرأت بھی اس کی تائید کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے یعدہم کی جگہ یعدہم بضم باو اور بکسرہ میم پڑھا ہے اس کا معنی ہے کہ وہ ان کی مدد کرتا ہے۔

جب معتزلہ نے ان اللہ کریم کے اس ارشاد کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرنا معتذر سمجھا کیونکہ ان کے نزدیک سرکشی میں بھٹکنے کی مہلت دینا اللہ کریم کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ یہاں اس کا حقیقی معنی مراد لینا جائز نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے اور وہ معنی یہ ہے کہ جب اللہ کریم نے وہ اپنی نوازشات روک لیں جو وہ مومنین پر فرما رہا ہے، اور منافقین کو کفر و اصرار کی وجہ سے ذلیل و رسوا کر دیا اور انہوں نے اپنے اوپر راہ راست کو بند کر لیا تو اللہ کریم نے اپنی غیبی مدد ان سے روک لی جس کی وجہ سے منافقین کے دلوں پر ظلمت اور میل کا اضافہ ہو گیا جس طرح مومنین کے دلوں میں ایمان کے نور اور انشراح قلب کا اضافہ ہو گیا۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کریم نے شیطان کو منافقین کے ہمراہ کرنے کی قدرت عطا فرمادی تو اس نے ان کی سرکشی میں اضافہ کر دیا اور اس کو اللہ کریم کی طرف اسی طرح مجازاً منسوب کیا جس طرح کسی فعل کی نسبت اس کی سبب کی طرف کر دی جاتی ہے اور سرکشی کی نسبت منافقین کی طرف ہی برقرار رکھی تاکہ یہ وہم پیدا نہ ہو کہ اس فاعل کی نسبت اللہ کریم کی طرف حقیقی ہے اور اس معنی کی تصدیق اس بات سے ہوئی ہے کہ دوسری آیت میں اللہ کریم نے مدد کی نسبت یعدوہم فی الغی میں ان کے سرداروں کی طرف کی ہے اور غی کا لفظ مطلق ذکر فرمایا اور اس کو ہم ضمیر کی طرف مضاف نہیں کیا اور فرمایا،

وَإِخْوَانِهِمْ يَمْدُونَهُمْ فِي الْغِي

کہ ان کے بھائی ان کی گمراہی میں اضافہ کر رہے ہیں اور بعض معتزلہ نے یہ کہا ہے کہ اصل میں یعدلہم تھا اور یہ یعدلی لہم کے معنی میں ہے کہ اللہ کریم انہیں مہلت دیتا ہے اور ان کی عمر لمبی کرتا ہے اور یہ مہلت اور عمر میں اضافہ اس لئے ہے کہ وہ

بیدار ہو جائیں اور اطاعت کریں لیکن انہوں نے سرکشی اور طغیان میں اضافہ کے سوا کچھ نہ کیا یہاں لام کو حذف کر دیا ہے اور فاعل کو بلا واسطہ حرف جرہم ضمیر کی طرف منسوب کر دیا جس طرح،

واختار موسى قومه

میں قومہ سے پہلے حرف جار کو حذف کر کے اختار کو قومہ کی طرف بلا واسطہ منسوب کر دیا ہے اصل میں،

واختار موسى قومه

تھا۔ یا اصل میں عبارت اس طرح تھی یمدھم استصلاحا کہ اللہ کریم نے اس لئے مہلت دی تھی کہ وہ اپنی اصلاح کریں لیکن انہوں نے اس کے برعکس اپنی گمراہی اور سرکشی میں بھٹکتے رہنے کو ہی پسند کیا۔

اور لفظ طغیان کو بضم ط اور بکسرہ ط یعنی طغیان دونوں طرح پڑھا ہے جس طرح لقیان کے لام کو ضمہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور طغیان کو معنی سرکشی میں اور کفر میں حد سے متجاوز ہونا اور ان میں غلو کرنا ہے اس کا لغوی معنی کسی چیز کا اپنے محل سے تجاوز کرنا ہے جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے،

إِنَّا لَنَاطِقِي الْمَاءِ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ

بے شک جب پانی حدود سے تجاوز کر گیا تو ہم نے تمہیں کشتی پر سوار کر لیا۔ اور یمھون یہ مشتق ہے عمھ سے جس کا معنی ہے بصیرت کا نہ ہونا جیسے عمی کا معنی قوت سے محروم ہونا ہے۔ جو کہ عمھ کے معنی میں حیران و ششدر ہونا ہے اس لئے کہا جاتا ہے رجل، عامہ، عمہ سرگرداں آدمی اور ارض عمہاء اس زمیں کو کہتے ہیں جو بے نشان اور بے علامت ہو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رو بہ کے شعر کو اس کی تائید میں ذکر کیا ہے،

أَعْمَى الْهُدَى بِالْجَاهِلِينَ الْعَمَةَ

کامل شعر اس طرح ہے،

وَمَهْمِهِ اطرافه في مهمة أَعْمَى الْهُدَى بِالْجَاهِلِينَ الْعَمَةَ

بہت سے جنگل ایسے وسیع ہیں جن کے اطراف دوسرے جنگلوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں ان کے نشان ہائے، راستے ان

مسافروں پر مخفی ہیں جو راستوں سے ناواقف اور ان پر حیران اور ششدر ہوتے ہیں۔

اس شعر میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ دلیل قائم کی ہے کہ عمکا لفظ عدم بصیرت اور حیران و ششدر کے معنی

میں بھی مستعمل ہے۔

مدّ کا معنی اور استعمال:

(ورد مد) المد (Extension, wine)

کے اصل معنی (سہائی میں) کھینچنا اور بڑھانے کے ہیں اسی سے عرصہ دراز کو مدّة کہتے ہیں اور مدّة الجرح کے معنی زخم کا

گندہ مواد کے ہیں۔ مد النہر در کا چڑھاؤ۔ مدہ نہر اخر۔ دوسرا در یا اس کا معاون بن گیا۔ قرآن میں ہے:

"أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 45)

تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارا رب سائے کو کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے۔

مددت عینی الی کذا کسی کی طرف حریصانہ اور لپجائی ہوئی نظروں سے دیکھنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" (سورۃ ط آیت نمبر 131)

اور اے سننے والے اپنی آنکھیں نہ پھیلا اس کی طرف جو ہم نے کافروں کے جوڑوں کو برتنے کے لئے دی ہے جیتی دنیا کی تازگی۔

مدد تہ فی غید۔ گمراہی پر مہلت دینا اور فوراً گرفت نہ کرنا۔ مددت الابل اونٹ کو مدید پلایا۔ اور مدید اس بیج اور آٹے

کو کہتے ہیں جو پانی میں بھگو کر باہم ملا دیا گیا ہو امددت الجیش بمدد کا مدینا۔ کمک بھیجنا۔ امددت الانسان بطعام کسی کی طعام (غلم) سے مدد کرنا قرآن پاک میں عموماً امد (افعال) اچھی چیز کے لئے اور مد (ملائی مجرد) بری چیز کے لئے استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَأَمَّا دَنَا هُمْ بِفَأَكْهَةِ وَنَحْمٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ" (سورۃ الطور آیت نمبر 22)

اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہے گا ہم ان کو عطا کریں گے۔

"أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَّالٍ وَبَنِينَ" (سورۃ المؤمن آیت نمبر 55)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں۔

"وَيُمْدِدُّكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ" (سورۃ نوح آیت نمبر 12)

اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

"يُمْدِدُّكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ الْآيَةِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 125)

تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔

"أَتُمْدِدُّونَ بِمَالٍ" (سورۃ النمل آیت نمبر 36)

کیا تم مجھے مال سے مدد دینا چاہتے ہو۔

"وَيُمْدِدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا" (سورۃ مريم آیت نمبر 79)

اور اسے خوب لمبا عذاب دیں گے۔

"وَيُمْدِدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 15)

اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

"وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ" (سورة الاعراف آیت نمبر 202)

اور وہ جو شیطانوں کے بھائی ہیں، شیطان انہیں گمراہی میں کھینچتے ہیں۔

لیکن آیت کریمہ: "وَالْبَحْرُ يَمُدُّكَ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةَ أَمْجُرٍ" (سورة لقمان آیت نمبر 27)

اور سمندر اس کی سیاہی ہو اس کے پیچھے سات سمندر۔

میں یمددہ کا صیغہ مدہ نہرا اخر کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور یہ امداد یا مدد سے نہیں ہے جو کسی محبوب یا مکروہ وہ چیز کے متعلق استعمال ہوتے ہیں بلکہ یہ مددت الداواة امدھا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوات میں روشنائی ڈالنا کے ہیں اسی طرح آیت کریمہ:

"وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا" (سورة الكهف آیت نمبر 109) اگرچہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لے آئیں۔

میں مدد یعنی روشنائی کے معنی مراد ہیں۔ المد۔ غلہ ناپنے کا ایک مشہور پیمانہ۔۔۔

مفہوم طغیان:

(ط غ ی) طغوت و طغیت طغوانا و طغیانا (To go Astray)

کے معنی طغیان اور سرکشی کرنے کے ہیں اور اَطْفَاة (انفال) کے معنی ہیں اسے طغیان سرکشی پر ابھارا اور طغیان کے

معنی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"إِنَّهُ طَغَى" (سورة النازعات آیت نمبر 17) وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔

یعمہون کا معنی:

(ع م ہ) العمة (To be misled)

کے معنی حیرانگی کی وجہ سے کسی کام میں تردد سے کام لینا کے ہیں۔ عمد (س) صیغہ صفت فاعل عمد و عامد اور عامد کی

جمع عمد ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

"فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ" (سورة الاعراف آیت نمبر 186)

وہ اپنی شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ" (سورة النمل آیت نمبر 4)

ان کے کو تک ان کی نگاہ میں بھلے کر دکھائے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 16]

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (16)

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔“

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ

اختاروها عليه واستبدلوها به، وأصله بذل الثمن لتحصيل ما يطلب من الاعيان، فإن كان أحد العوضين ناضاً تعين من حيث إنه لا يطلب لعينه أن يكون ثمناً وبذله اشتراء، وإلا فأى العوضين تصورته بصورة الثمن فبأذله مشتري وأخذة بائع، ولذلك عدت الكلمتان من الاضداد، ثم استعير للإعراض عما في يده محصلاً به غيره، سواء كان من المعاني أو الاعيان، ومنه قول الشاعر:

أخذت بالجُملة رأساً أزعراً... وبالثنائيا الواضحات الدررا

وبالطويل العمر عمرا جيدرا... كما اشتري المسلم إذ تنصرا

ثم اتسع فيه فاستعمل للرغبة عن الشيء طمعاً في غيره، والمعنى أنهم أخلوا بالهدى الذي جعله الله لهم بالفطرة التي فطر الناس عليها محصلين الضلالة التي ذهبوا إليها، أو اختاروا الضلالة واستحبوها على الهدى.

فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ. ترشيح للمجاز، لئلا استعمل الاشتراء في معاملتهم أتبعه ما يشاكله تمثيلاً لخسارتهم، ونحوه:

ولما رأيت النسر عزّ ابن دأية... وعشش في وكريه جاش له صدري

والتجارة: طلب الربح بالبيع والشراء. والربح: الفضل على رأس المال، ولذلك سمي شفاً، وإسنادة إلى التجارة وهو لأربابها على الاتساع لتلبسها بالفاعل، أو لمشايتها إياه من حيث إنها سبب الربح والخسران.

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ لطرق التجارة، فإن المقصود منها سلامة رأس المال والربح، وهؤلاء قد أضاعوا الطلبتين لأن رأس مالهم كان الفطرة السليمة، والعقل الصرف، فلما اعتقدوا هذه الضلالات بطل استعدادهم، واختل عقلهم ولم يبق لهم رأس مال يتوسلون به إلى درك الحق، ونيل الكمال، فبقوا خاسرين آيسين من الربح فاقدين للأصل.

ترجمہ:

منافقین نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی اور گمراہی کو ہدایت کے بدلے لے لیا۔

اشتراک یہ اشتراء سے مشتق ہے اس کا لغوی معنی ٹمن کو اس لئے خرچ کرنا کہ اعیان میں سے جو چیز مطلوب ہو اس کو حاصل کیا جائے اور اگر دونوں عوضوں یعنی ٹمن اور بیع سے کوئی ایک نقدی ہو تو متعین ہو جاتا ہے کہ وہ ہی ٹمن ہے۔ کیونکہ وہ بذات خود مطلوب نہیں ہوتا بلکہ کاسب ہوتا ہے اور اس کا خرچ کرنا اشتراء کہلاتا ہے اور اگر ان دونوں عوضوں میں سے کوئی بھی نقدی نہ ہو تو جس کو نقدی کی صورت میں تصور کر لیا جائے اس کو خرچ کرنے والا مشتری ہوگا اور اسکو لینے والا بائع کہلائے گا۔ اسی لئے ان دونوں کھموں یعنی بیع اور اشتراء کو اعضاء میں شمار کیا جاتا ہے یعنی یہ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بطور استعارہ یہ لفظ اس چیز سے اعراض کرنے کے لئے، جو کسی کے قبضہ میں ہو، اس سے ایسی چیز حاصل کرنا جو اس کے قبضہ میں نہ ہو خواہ اس کا تعلق صفات اور معانی سے ہو یا اعیان سے ہو ابوالنجم کے شعر کا تعلق اسی قبیلہ سے ہے۔ وہ اپنی بیوی کے بڑھاپے پر مرثیہ کہتے ہوئے کہتا ہے،

أَخَذْتُ بِالْجُمْلَةِ رَأْسًا أَزْعَرَا... وَبِالْثَنَائِيَا الْوَاضِحَاتِ الدُّدْرَا

وَبِالظُّوِيلِ الْعَمْرِ عَمْرًا جِيدًا... كَمَا اشْتَرَيْتُ الْمُسْلِمَ إِذْ تَنَصَّرَا

اس نے پورے گھنے بالوں والے سر کے بدلے میں گنجا سر لے لیا اور مضبوط، خوبصورت، چمکدار دانتوں کے بدلے پیلاپین اور لمبی زندگی کے بدلے چھوٹی عمر لے لی تو اس کا یہ لین دین اس طرح تھا جس طرح جلد بن اسم غسانی نے اسو مچھوڑ کر نضارینت اختیار کر لی۔

پھر اشتراء کا لفظ کسی چیز سے اعراض کرنے کے علاوہ اور معنی میں استعمال ہونے لگا اور اس کے معنی میں وسعت یا آمدی گئی اور ہر اس چیز کے حصول میں استعمال ہونے لگا جس میں کسی چیز سے اعراض اور دوسری چیز کے حصول میں طمع نہ ہو خواہ وہ چیز اس کے قبضہ میں ہو یا نہ ہو۔ یہ معنی پہلے معنی سے عام ہے اس معنی کے مناسب فقہارِ رحمت پہ تو دوسری صورت آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اس ہدایت کو ضائع کر دیا جو ان کو اللہ کریم نے فطرتی طور پر عطا کی تھی۔ اور پران کی تخلیق بھی ہوئی تھی۔

اور یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کیا۔ تو اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ ان کی یہ تجارت ان کے لئے فائدہ مند نہ ہوئی، قرآن کریم کی آیت کا یہ حصہ،

فَمَارِبِحَتِ تِجَارَتُهُمْ

اشتراک کے معنی مجازی کو مزین و مضبوط کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ، قبل حکام میں ان کے باہمی معاملہ اور لین دین میں اشتراء کا لفظ استعمال فرمایا ہے تو اس کے پیچھے وہ لفظ ذکر فرمایا جو اشتراء کے مناسبت تھا، یعنی اس خرید و فروخت میں ان کے خسارہ کو بیان کرنے کے لئے اس لفظ کو بطور استعارہ و مرثعہ ذکر فرمایا یعنی ان کو تجارت سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

فما ربحت تجارتهم

یہ استعارہ اور تشریح دونوں کا فائدہ دے رہا ہے لغت عرب میں یہ عام استعمال ہے، جیسے شاعر کا قول

وَلَمَّا رَأَيْتُ النَّسْرَ عَزَّابِنَ دَائِبَةً... وَعَشَقَشَ فِي وَكْرِيهِ جَاشَ لَهُ صَدْرِي

جب میں نے سفید بالوں کو، جو گدھ کی مانند تھے دیکھا کہ وہ سیاہ بالوں پر، جو کوئے کی مانند تھے غالب آگئے اور انہوں نے کوئے کے دونوں گھونسلوں یعنی سر اور داڑھی میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں تو میرا سینہ کھول اٹھا۔

تجارت کا مقصد نفع حاصل کرنا ہوتا ہے اور نفع اس مال کو کہتے ہیں جو اصل مال یعنی پونجی سے زائد کمایا جاتا ہے یعنی زیادتی اور آیت میں خسارہ کی نسبت تجارت کی طرف کی گئی ہے حالانکہ نفع و نقصان تاجر کو ہوتا ہے تو یہ نسبت مجازی ہے کیونکہ تجارت باعث نفع ہوتی ہے اور تجارت تاجر کے ساتھ ملتبس ہوتی ہے کیونکہ تاجر کے بغیر تجارت ناممکن ہے اور یہاں سبب بول کر مسبب مراد کیا گیا ہے۔ اور منافقین کے خسارہ اٹھانے کو اللہ کریم نے

وَمَا كَانُوا مَهْتَدِينَ
یعنی وہ تجارت کے طریقوں سے ہی ناواقف تھے۔

کے ذکر کے ساتھ فرمایا کیونکہ تجارت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاجر اپنا اس المال بھی محفوظ رکھے اور اس پر منافع بھی لے تو منافقین نے دونوں مطلوب چیزیں ضائع کر دیں ان کا اس المال اور سرمایہ خالص عقل اور فطرت سلیمہ تھی تو جب انہوں نے ان گمراہیوں کو اختیار کیا تو ان کی فطرتی صلاحیتیں بھی باطل ہو گئیں اور ان کی عقلیں بھی محفل ہو گئیں اور ان کے پاس وہ سرمایہ ہی نہ رہا جس کو وہ حق تک پہنچنے اور کمال حاصل کرنے کا وسیلہ بناتے اس لئے وہ خائب و خاسر ہیں اور منفعت سے مکمل ناامید ہو چکے ہیں۔

بیع اور شراء کا مفہوم:

(ش ری) شراء (Buying and Selling)

اور بیع دونوں لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ مشتری کے معنی قیمت دے کر اس کے بدلے میں کوئی چیز لینے والے کے ہیں۔ اور بائع اسے کہتے ہیں جو چیز دے کہ قیمت لے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری طرف سے سامان ہو لیکن جب خرید و فروخت جنس کے عوض جنس ہو۔ تو دونوں میں سے ہر ایک کو بائع اور مشتری تصور کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیع اور شراء کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر شریعت بمعنی بیعت اور ابتعت بمعنی اشتريت آتا ہے قرآن میں ہے۔

"وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ" (سورہ یوسف آیت نمبر 20)

اور بھائیوں نے اسے کھوٹے داموں گنتی کے روپوں پر بیچ ڈالا۔

نوٹ: ضلال اور ہدایت کی بحث گزر چکی ہے۔

لفظ تجارت کی تحقیق:

(تاجر) تِجَار (ن) (Commerce, Trade)

تاجر اور تجارت کے معنی لفع کمانے کے لئے المہال کو کاروبار میں لگانے کے ہیں۔ صیغہ صفت تاجر و تاجور جیسے صاحب وصحت یاد رہے۔ کہ عربی زبان میں اس کے سوا اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے۔ جس تاء (اصل) کے بعد جم ہو۔ رہا تاجا تو اصل میں وجاہ ہے اور تاجوب وغیرہ میں تاء اصل نہیں ہے بلکہ فعل مضارع کی ہے۔ اور آیت کریمہ:-

"هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ" (سورۃ القف آیت نمبر 10)

کیا میں بتا دوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے۔

میں لفظ تاجارہ کی تفسیر خود قرآن نے بعد کی آیت:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ" (سورۃ القف آیت نمبر 11)

اے ایمان والو کیا میں بتا دوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے۔

میں بیان فرمادی ہے۔ نیز فرمایا:

"اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِّحْتُمْ بِتِجَارَتِكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 16)

جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا۔

"إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 29)

مگر یہ کہ کوئی سودا تمہاری باہمی رضامندی کا ہو۔ (اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے)

"تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ تَدِيرُ وَتَهَا بَيْنَكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 282)

مگر یہ کہ کوئی سردست کا سودا دست بدست ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر گناہ نہیں۔

ابن لاعربی کہتے ہیں کہ فلان تاجر بکذا کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز میں ماہر ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔

تحقیق لفظ ربح:

(ربح) الربح (Profet, Advantage)

وہ فائدہ جو خرید و فروخت سے حاصل ہو مجازاً ثمرہ اعمال کو بھی ربح کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کبھی سامان تجارت کی طرف

ہوتی ہے۔ اور کبھی صاحب سامان کی طرف۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

"فَمَا رَبِّحْتُمْ بِتِجَارَتِكُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 16)

تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سوئے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

قروا اذیبا فہم ربحا بیع بعض نے کہا ہے کہ ربح ایک پرندے کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ربح بمعنی چربی سے لیکن ہمارے خیال میں ربح سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو ربح سے حاصل ہوئی ہو جیسا کہ نقص سے جو اثر ظاہر ہوتا ہے اسے نقص کہا جاتا ہے اور ربح قرعہ اندازی یا قمار بازی کے تیر کو کہتے ہیں۔ تو شعر کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی مہمانداری سے تعریف کا بہت بڑا فائدہ حاصل کیا۔

جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فأوسعني حمدا وأوسعته قري... وأرخص بحمد كان كاسبه الاكل
اس نے میری تعریف میں فروگذاشت نہ کی اور میں نے بھی اس کی خوب مہمان نوازی کی۔ وہ تعریف کتنی سستی ہے جو چند لقموں سے حاصل ہو جائے۔

اہتداء کی تحقیق:

الاهتداء (Instruction) (ہدایت پانا)

کالفظ خاص کرا اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو دینی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ التُّجُورَ لِتَهْتَدُوا بِهَا" (سورة الانعام آیت نمبر 97)

اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تارے بنائے کہ ان سے راہ پاؤ۔

"إِلَّا الْمُسْتَضْعِفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا" (سورة النساء آیت نمبر 98)

مگر وہ جو دبا لئے گئے مرد اور عورتیں اور بچے جنہیں نہ کوئی تدبیر بن پڑے، نہ راستہ جانیں۔

لیکن کبھی اہتداء کے معنی طلب ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورة البقرة آیت نمبر 53)

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا کہہ نہیں تم راہ پر آؤ۔

"فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَمَّ نِعْمِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورة البقرة آیت نمبر 150)

تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ۔

"فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا" (سورة آل عمران آیت نمبر 20)

پس اگر وہ گروں رکھیں جب تو راہ پا گئے۔

"فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا" (سورة البقرة آیت نمبر 137)

پھر اگر وہ بھی یونہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے۔

المہتدی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتدا کر رہا ہے ہو چنانچہ آیت:

"أُولَئِكَ كَانَ أَبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئاً وَلَا يَهْتَدُونَ" (سورة المائدة آیت نمبر 104)

جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانیں نہ راہ پر ہوں۔

میں تعبیر کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔

اور آیت:

"فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ" (سورة النمل آیت نمبر 92)

تو جس نے راہ پائی اس نے اپنے بھلے کو راہ پائی اور جو بھکے تو فرما دو کہ میں تو یہی ڈرسانے والا ہوں۔

میں اہتداء کا لفظ طلب ہدایت اقتدا اور تحری ہدایت تینوں کو شامل ہے،

اس طرح آیت:

"وَزَيَّنَّ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ" (سورة النمل آیت نمبر 24)

اور شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں سنوار کر ان کو سیدھی راہ سے روک دیا تو وہ راہ نہیں پاتے۔

میں بھی سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے اور آیت:

"وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ" (سورة طہ آیت نمبر 82)

اور بیشک میں بہت بخشنے والا ہوں اسے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھا کام کیا پھر ہدایت پر رہا۔

میں اہتدی کے معنی لگا تا ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے

کے ہیں۔

اور آیت: الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ

مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ.

کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا، یہ لوگ ہیں جن پر ان

کے رب کی ڈرودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔ (سورة البقرة آیت نمبر 156، 157)

یہاں مہتدون سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت الہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لئے کوشش کی اور اس کے

مطابق عمل بھی کیا چنانچہ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

"وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاجِدُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّا لَمُهْتَدُونَ" (سورة الزخرف آیت نمبر 49)

اور بولے کہ اے جا دو گر ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر اس عہد کے سبب جو اس کا تیرے پاس ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 17]

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ (17)

”ان کی کہادت اسی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا۔“

متن:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا

لما جاء بحقيقة حالهم عقبها بضر المثل زيادة في التوضيح والتقرير، فإنه أوقع في القلب وأتمع للخصم الالذ، لأنه يريك المتخيل محققاً والمعقول محسوساً، ولأمر ما أكثر الله في كتبه الامثال، وفشت في كلام الانبياء والحكماء. والمثل في الاصل بمعنى النظر يقال: مَثَلٌ وَمِثْلٌ وَمَثِيلٌ كشيء وشبهه وشيبه، ثم قيل للقول السائر الممثل مضر به بموردة، ولا يضرب إلا ما فيه غرابة، ولذلك حوفظ عليه من التغيير، ثم استعير لكل حال أو قصة أو صفة لها شأن وفيها غرابة مثل قوله تعالى: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ وقوله تعالى: وَيَللَّهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَى.

والمعنى حالهم العجيبة الشأن كحال من استوقد ناراً، والذي: بمعنى الذين كما في قوله تعالى:

وَحُضُّتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا إِنْ جَعَلَ مَرَجَ الضمير في بنورهم، وإنما جاز ذلك ولم يجر وضع القائم موضع القائم لأنه غير مقصود بالوصف، بل الجملة التي هي صلته وهو وصلة إلى وصف المعرفة بها لأنه ليس باسم تام بل هو كالجزم منه، فحقه أنه لا يجمع كما لا تجمع أخواتها، ويستوى فيه الواحد والجمع وليس الذين جمعه المصحح، بل فوز زيادة زيدت لزيادة المعنى ولذلك جاء بالياء أهدأ على اللغة الفصيحة التي عليها التنزيل، ولكونه مستطالاً بصلته استحق التخفيف، ولذلك بولغ فيه فحذف ياءه ثم كسرتة ثم اقتصر على اللام في أسماء الفاعلين والمفعولين، أو قصد به جنس المستوقدين، أو

الفوج الذي استوقد. والاستيقاد: طلب الوقود والسعي في تحصيله، وهو سطوع النار وارتفاع لهبها. واشتقاق النار من: نار يدور نوراً إذا لشر لأن فيها حركة واضطراباً.

ترجمہ:

اس سے ما قبل آیات میں منافقین کی حقیقت ان کے خبیث اوصاف اور ان کی عقیدہ بیان ہوا، اب اس کی مزید وضاحت کے لئے ضرب المثل ذکر فرمائی تاکہ ان کے حالات کی مزید وضاحت بھی ہو جائے اور سننے والے کے دل میں بات راسخ ہو جائے کیونکہ ضرب المثل مخاطب کے دل میں زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور جھگڑا دشمن کو خاموش کرنے کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ یہ خیالی چیز کو خارج اور معقول چیز کو محسوس شکل میں پیش کرتی ہے۔ اور اس عظیم الشان فائدہ کے پیش نظر اللہ کریم نے اپنی الہامی کتابوں میں کثرت سے ضرب المثل بیان فرمائیں ہیں اور انبیائی کرام اور حکماء کے کلام میں بھی بکثرت ان کا ذکر آتا ہے۔

مثل کی تحقیق:

اس کا لغوی معنی نظیر اور مثل ہے اور مثل کے لفظ کو عربی زبان میں تین طرح پڑھا جاتا ہے۔

مثل، مثل اور مثیل جیسے شَبَّ، شَبَّتَ اور شَبَّيْتَهُ بروزن فعل اور فعل اور فَعِيل اس لفظ کا اطلاق اور مشہور و معروف کہاوت پر ہوتا ہے جو زبان زد عام ہو اور اس کے محل ورود کے ساتھ اس موقع کو تشبیہ دی گئی ہو جس میں وہ اب استعمال ہو رہا ہے۔ اور یہ ضرب المثل صرف اس واقع کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس میں غرابت اور ندرت ہو اسی وجہ سے اس کے الفاظ میں تغیر و تبدل نہیں کیا جاتا یعنی وہ الفاظ جو کسی نے کسی موقع پر پیش کئے ہوں۔ بعینہ وہی الفاظ اس عجیب و غریب واقعہ کو بیان کرنے کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔ جس کو اصل مورد کے ساتھ تشبیہ دی گئی پھر بطور استعارہ ہر اس حالت، قصہ یا صفت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کی عجیب و غریب شان ہو اور اس میں غرابت بھی ہو جیسے اللہ کریم اس جنت کی صفت کو بیان فرماتا ہے جس کا متقین کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے جیسے فرمایا،

مثل الجنة التي وعدت للمتقين

اس میں مثل بمعنی صفت ہے اور دوسرے مقام پر فرمایا،

ولله المثل الاعلى

بلند و بالا شان اللہ کریم ہی کے لئے ہے معنی یہ ہوگا کہ منافقوں کی عجیب و غریب کی حالت اس آدمی کی حالت کی مثل ہے جس نے روشنی حاصل کرنے کے لئے آگ جلائی تو جب اس کی آگ خوب روشن ہو گئی تو اللہ کریم نے اس کے نور کو ختم کر دیا اور وہ گہپ اندھیرے میں حیران و ششدر ہو کر رہ گیا۔

والذی بمعنی الذین یہاں الذی اسم موصول بمعنی الذین ہے اور یہ استعمال عام ہے جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے،

وخصتم كالذی خاضوا

میں الذی بمعنی الذین ہے۔ زیر بحث آیت میں الذی بمعنی الذین اس وقت ہوگا جب بنور ہم کی ضمیر کا مرجع الذی کو بنایا جائے۔

الذی کو الذین کے معنی میں استعمال کرنا جائز ہے لیکن القانم کو القانمین کی جگہ ذکر کرنا جائز نہیں کیونکہ الذی محض واسطہ ہوتا ہے، جملہ کو اسم معرفہ کی صفت بنانے کا، یہ مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ مقصود بالذات وہ جملہ ہوتا ہے جو اس کا صلہ بن رہا ہوتا ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اسم تام نہیں ہوتا بلکہ وہ کلمہ کی جزء کی مانند ہوتا ہے اس لئے اس کا حق یہی ہے کہ اس کو جمع ذکر نہ کیا جائے جیسے اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ من، ما اور ای وغیرہ کو جمع ذکر نہیں کیا جاتا اس کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ الذین جمع مذکر سالم نہیں کیونکہ جمع مذکر سالم جس اسم سے بنی ہے اس کی شرائط اس میں نہیں پائی جاتیں بلکہ اس کے معنی کو زیادتی کے لئے کچھ الفاظ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے ن اسی لئے یہ فصیح لغت میں ہمیشہ الذین ہی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی مقام پر بھی الذون استعمال نہیں ہوا یعنی حالت رفعی میں اُس کے آخر واؤ اور نون نہیں آتے اور قرآن کریم میں بھی الذین ہی استعمال ہوتا ہے اور یہ کلام میں اپنے صلہ کے ساتھ مل کر کلام کو طویل کر دیتا ہے اس لئے یہ تخفیف کا مستحق ہے اس لئے اس سے نون اور یا کو حذف کر دیا جاتا ہے بلکہ اسم فاعل اور اسم مفعول سے جب یہ پہلے آتا ہے تو اس کی "ذ" کو بھی حذف کر کے صرف ال پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ ان بمعنی الذی ہوگا یا اس سے پہلے الفوج موصوف محذوف ہے اور یا اس سے جنس مستوقدین مراد ہے۔

والاستيقاد طلب الوقود

استيقاد کا معنی روشنی حاصل کرنے کے لئے ایندھن طلب کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرنا ہے اور اس سے مراد آگ کا بھڑکنا اور اس کے شعلوں کا بلند ہونا ہے۔

نار یہ نار بنور، نور اُسے مشتق ہے جس کا معنی بھاگنا اور بدکنا ہے آگ میں اضطراب و حرکت کی وجہ سے اس کو نار لفظ کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔

متن:

فَلْتَبَا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ

أى: النار، ما حول المستوقد إن جعلتها متعدية، وإلا أمكن أن تكون مسندة إلى ما، والتأنيث لأن ما حوله أشياء وأما كن أو إلى ضمير النار، وما: موصولة في معنى الإمكانة، نصب على الظرف، أو مزيدة، وحوله ظرف وتأليف الحول للدوران، وقيل للعام حول لأنه يدور.

ذَهَبَ اللَّهُ يَنْوِرُهُمْ جَوَابَ لِمَا، وَالضَّمِيرُ لِلذِّي، وَجَمَعَهُ لِلْحَمْلِ عَلَى الْمَعْنَى، وَعَلَى هَذَا إِذَا

قال:

بِنُورِهِمْ وَلَمْ يَقُلْ: بِنَارِهِمْ لِأَنَّهُ الْمُرَادُ مِنْ أَيْقَادِهَا، أَوْ اسْتِثْنَاءُ أَجِيبَ بِهِ اعْتِرَاضَ سَائِلٍ يَقُولُ: مَا بِالْهَمِّ شَبَهَتْ حَالَهُمْ بِحَالِ مُسْتَوْقِدِ النَّطْفَاتِ نَارَةً؛ أَوْ بَدَلٌ مِنْ جَمَلَةِ التَّمَثِيلِ عَلَى سَبِيلِ الْبَيَانِ، وَالضَّمِيرُ عَلَى الْوَجْهِينِ لِلْمِنَافِقِينَ، وَالْجَوَابُ مَحْذُوفٌ كَمَا فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ لِلْإِيحَازِ وَأَمِنَ الْإِلْتِبَاسَ، وَإِسْنَادُ الذَّهَابِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى إِمَّا لِأَنَّ الْكُلَّ بِفَعْلِهِ، أَوْ لِأَنَّ الْإِطْفَاءَ حَصَلَ بِسَبَبِ خَفِيٍّ، أَوْ أَمْرٍ سَمَاوِيٍّ كَرِيحٍ أَوْ مَطَرٍ، أَوْ لِلْمِبَالِغَةِ وَلِذَلِكَ عَدِيَ الْفِعْلُ بِالْبَاءِ دُونَ الْهَمْزَةِ لِمَا فِيهَا مِنْ مَعْنَى الْإِسْتِصْحَابِ وَالْإِسْتِمْسَاكِ، يَقَالُ: ذَهَبَ السُّلْطَانُ بِمَالِهِ إِذَا أَخَذَهُ، وَمَا أَخَذَهُ اللَّهُ وَأَمْسَكَهُ فَلَا مَرْسَلَ لَهُ، وَلِذَلِكَ عَدَلَ عَنِ الضُّوءِ الَّذِي هُوَ مُقْتَضَى اللَّفْظِ إِلَى النُّورِ، فَإِنَّهُ لَوْ قِيلَ: ذَهَبَ اللَّهُ بِضَوْعِهِمْ أَحْتَمِلُ ذَهَابَهُ بِمَا فِي الضُّوءِ مِنَ الزِّيَادَةِ وَبِقَاءِ مَا يُسَمَّى نُورًا، وَالْغَرَضُ إِزَالَةُ النُّورِ عَنْهُمْ رَأْسًا أَلَّا تَرَى كَيْفَ قَرَّرَ ذَلِكَ وَأَكْدَاهُ بِقَوْلِهِ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ فَذَكَرَ الظُّلْمَةَ الَّتِي هِيَ عَدَمُ النُّورِ، وَانْطَبَاسَهُ بِالْكَلِيَّةِ، وَجَمْعَهَا وَنَكَرَهَا وَوَصَفَهَا بِأَنَّهَا ظُلْمَةٌ خَالِصَةٌ لَا يَتَرَاءَى فِيهَا شَبْحَانُ.

ترجمہ:

اور جب آگ لگانے والے کے ارد گرد کی چیزوں کو آگ نے روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ ان کے نور کو لے گیا۔
اضاءت کو مؤنث ذکر کرنا اس وجہ سے ہوگا کہ ما حوله سے اشیاء اور اماکن مراد لی جائیں یا اضاءت کا قائل ہی ضمیر ہو
گی جس کا مرجع النار ہے اس صورت میں ما موصولہ بمعنی امکانہ ہوگا اور بحیثیت مفعول فی محل نصب میں ہوگا۔
یا یہ مازاندہ ہوگا اور حوله اضاءت کی طرف ہوگی اور جن کلمات سے حول کا لفظ مرکب ہے یہ دوران بمعنی گردش کرنا ہوگا۔
اسی لئے سال کو حول کہتے ہیں کیونکہ وہ کرتا رہتا ہے، اور

ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ

کامل جملہ لما کی شرط کا جواب ہے۔ اس صورت میں ہم ضمیر کا مرجع الذی ہوگا اور ہم ضمیر جمع کی الذی کی طرف اس کے لئے لوٹائی گئی ہے کہ وہ الذین کے معنی میں ہے جیسے خضتم کا الذی خاضوا میں ہے۔ کلام کے سیاق و سباق کے مطابق بنارہم ذکر نہیں فرمایا بلکہ اس کی جگہ بنورہم ذکر کیا ہے۔ جس کے وجہ یہ ہے کہ آگ جلانے والے کا مقصود نور ہی ہوتا ہے۔ یا

ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ

لما کی شرط کا جواب نہیں بلکہ جملہ مستانفہ ہے اور یہ اس سائل کے جواب میں ہوگا کہ منافقین کی حالت کو اس آگ

جلانے والے حالت کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی ہے جس کی آگ بجھ جاتی ہے۔

یہ جملہ ماقبل کلام میں پورے جملہ تمثیلیہ سے بدل ہوگا اور اس کو عطف کے طریقہ پر ذکر کیا گیا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں بنورہم کی ہم ضمیر کا مرجع منافقین ہوں گے اور جواب شرط اختصار اور التباس سے امن میں ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا ہوگا جیسے اللہ کریم کے اس ارشاد گرامی میں جواب شرط محذوف ہے سورۃ یوسف میں ہے،

فما ذهبوا به

یہاں

فعلوا به ما فعلوا من الاذواء

محذوف ہے۔ اس آیت کریمہ میں ہے ذہاب نور کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ ہر فعل کا فاعل حقیقی وہی ہے یا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آگ کسی مخفی سبب یا کسی آسمانی حادثہ کی وجہ سے بجھ گئی۔ جیسے بارش، ہوا وغیرہ۔ اور جس فعل کا سبب مخفی ہوا، اس کی نسبت اللہ ہی کی طرف کر دی جاتی ہے۔

یا یہ نسبت مبالغہ پر دلالت کرنے لے لئے اللہ کریم کی طرف کی گئی ہے اور اسی وجہ سے ذہب کے فاعل کو با کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے اور اس سے پہلے ہمزہ کا اضافہ کر کے باب افعال نہیں بنایا گیا کیونکہ باء کے ساتھ متعدی کرنے سے معنی یہ ہو گا کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ اور اس نے ہی اسے روک لیا۔ اگر کسی شخص کا بادشاہ مال پکڑ لے تو کہا جاتا ہے۔

ذہب السلطان بمالہ

کہ بادشاہ اس کا مال بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ تو جس چیز کو اللہ تعالیٰ اپنی گرفت میں لے لے اور اسے روک لے تو اسے کوئی چھٹا نہیں سکتا۔ مبالغہ ظاہر کرنے کے ہی یہاں لفظ ضوء ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ نور ذکر کیا گیا حالانکہ ماقبل کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں

ذہب اللہ بضوئہم

کہا جاتا، کیونکہ بضوئہم ذکر کیا جاتا تو اس میں یہ احتمال تھا کہ ضوء کے لفظ میں جو زیادتی ہوتی ہے اسے تو ختم کر دیا گیا۔ لیکن جسے نور کہا جاتا ہے وہ باقی رہ گیا، حالانکہ مقصد یہ تھا کہ ان سے بالکل نور سلب کر لیا جائے۔ ذرا آپ غور فرمائیں کہ اللہ کریم نے ان کے ذہاب نور میں کس قدر مبالغہ فرمایا ہے اور اس کو بہت ہی مؤکد انداز میں ذکر کیا ہے اور اسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے اللہ کریم نے فرمایا۔

وَتَوَّكَّهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ

چونکہ یہاں ظلمات جمع کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ اس کا واحد ظلمة ہے اور اس کا معنی ہے روشنی۔ اور نور کا نہ ہونا اور اس کا بالکلیہ مٹ جانا اور پھر اسے نکرہ ذکر کیا ہے۔ جو اپنے مدلول کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور اس کی صفت لایبصرون ذکر فرمائی، گویا وہ ایسی تہہ در تہہ اور خالص تاریکیوں میں ہے جن میں دو شکلیں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتیں اور یہ انداز تحاطب بھی

ذہاب نور میں مبالغہ اور تاکید پر دلالت کرتا ہے یہ تاکید بالائے تاکید اس لئے ذکر کی گئی کہ منافقین کے پاس نور نام کی کوئی چیز بھی نہیں بلکہ وہ گھپ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔

متن:

وترك في الاصل بمعنى طرح وخلق، وله مفعول واحد فظن معنى صير، فحري مجري
أفعال القلوب كقوله تعالى: وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ.

وقول الشاعر:

فتركته جزر السباع ينشئه... يقضن حسن بنائه والبعضم
والظلمة مأخوذة من قولهم: ما ظلمك أن تفعل كذا، أي ما منعك، لأنها تسد البصر
وتمنع الرؤية.

وظلماتهم: ظلمة الكفر، وظلمة النفاق، وظلمة يوم القيامة يوم ترى المؤمنين
والمؤمنات يسعى نورهم بين أيديهم وبأيمانهم. أو ظلمة الضلال، وظلمة سخط الله،
وظلمة العقاب السرمدي، أو ظلمة شديدة كأنها ظلمة متراكمة، ومفعول لا يبصرون
من قبيل المطروح المتروك فكان الفعل غير متعد.

ترجمہ:

ترک اصل میں خلی اور ترک کے معنی میں ہے جس کا معنی اس نے چھوڑ دیا، اس نے پھینک دیا، ہے اور یہ متعدی بیک
مفعول ہے اور یہ اپنے ضمن میں صیر کا معنی لئے ہوئے ہے اسی وجہ سے یہ افعال قلوب کے قائم مقام ہوتا ہے جو دو مفعولوں
کو نصب دیتے ہیں۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ

وَتَرَكَهُمْ فِي الظُّلُمَاتِ يٰهَا اس کا ایک مفعول ہم ضمیر منصوب متصل ہے اور دوسرا،

فی ظلمات مستوقداً

کے متعلق ہو رہا ہے۔ اور شاعر کا قول ہے،

فتركته جزر السباع ينشئه... يقضن حسن بنائه والبعضم

میں نے مدح کو اس وقت مار گرایا جب اس کے سارے حمایتی بھاگ کھڑے تھے اور لاش کو اس بے بسی کے عالم میں
چھوڑ گئے تھے کہ درندے بڑے مزے سے اس کا گوشت، اس کے سر کی کھوپڑی اور موٹی کلائی سے نچوڑ رہے تھے۔
اس شعر میں ترک بمعنی صیرت ہے اور اس کے دو مفعول ہیں ایک ضمیر منصوب متصل اور دوسرا جزء السباع ہے۔

اور ظلمات جمع ہے ظلمت کی جو عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے،

مَا ظَلَمْتَكَ ان تَفْعَلْ كَذَا

کہ تجھ کو کس چیز نے اس طرح کرنے سے روکا ہے کیونکہ ظلمت نظر کے آڑے آجاتی ہے اور دیکھنے سے روک دیتی ہے اور اب ظلمتوں سے درج ذیل ظلمات ہیں۔

1- کفر کی ظلمت 2- نفاق کی ظلمت 3- قیامت کے دن کی ظلمت

یہ وہ دن ہے جس دن آپ دیکھیں گے کہ مومنین کے آگے دائیں اور بائیں جانب نور دوڑ رہا ہوگا یا ان سے یہ ظلمات مراد ہیں۔

گمراہی کی ظلمت اللہ کریم کی ناراضگی کی ظلمت عذاب سردی کی ظلمت

یا اس سے شدید ترین ظلمات مراد ہیں گویا متعدد ظلمتیں تہہ در تہہ جمع ہوں گی اور لایبصرون کے مفعول کو ذکر نہ کرنا بھی اس قبیلہ سے ہے گویا یہاں مفعول کو حذف کر کے اس کو بالکل نسیا منسیا کر دیا ہے اور یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہ فعل متعدی نہیں بلکہ فعل لازم ہے۔

متن:

وَالْآيَةُ مَثَلٌ ضَرَبَهُ اللَّهُ لِمَنْ آتَاهُ ضَرْبًا مِّنَ الْهُدَىٰ فَأَضَاعَهُ، وَلَمْ يَتَوَصَّلْ بِهِ إِلَىٰ نَعِيمٍ الْآبِدِ
فَبَقِيَ مَتَحِيرًا مَّتَحَسِّرًا، تَقْرِيرًا وَتَوْضِيحًا لِمَا تَضَمَّنَتْهُ الْآيَةُ الْأُولَىٰ، وَيَدْخُلُ تَحْتِ عُمُومِهِ
هُؤُلَاءِ الْمُنَافِقُونَ فَإِنَّهُمْ أَضَاعُوا مَا نَطَقَتْ بِهِ أَلْسِنَتُهُمْ مِنَ الْحَقِّ بِاسْتِبْطَانِ الْكُفْرِ،
وَإِظْهَارِهِ حِينَ خَلَوْا إِلَىٰ شَيْطَانِيهِمْ، وَمِنْ أَثَرِ الضَّلَالَةِ عَلَى الْهُدَى الْمَجْعُولِ لَهُ بِالْفِطْرَةِ،
أَوْ ارْتِدَاعِ دِينِهِ بَعْدَ مَا آمَنَ، وَمِنْ صَحِّحِ لَهُ أَحْوَالِ الْإِرَادَةِ فَادْعَى أَحْوَالِ الْمَحَبَةِ فَأَذْهَبَ
اللَّهُ عَنْهُ مَا أَشْرَقَ عَلَيْهِ مِنْ أَنْوَارِ الْإِرَادَةِ، أَوْ مَثَلٌ لِإِيمَانِهِمْ مِنْ حَيْثُ إِنَّهُ يَعُودُ عَلَيْهِمْ
يُحَقِّنُ الدَّمَاءَ، وَسَلَامَةَ الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ، وَمِشَارَكَةَ الْمُسْلِمِينَ فِي الْمَغَانِمِ، وَالْأَحْكَامِ
بِالنَّارِ الْمَوْقُودَةِ لِلْإِسْتِزَاءِ، وَلِذَهَابِ أَثَرِهِ وَانْطِبَاسِ نُورِهِ بِأَهْلَاكِهِمْ وَإِفْشَاءِ حَالِهِمْ
بِإِطْفَاءِ اللَّهِ تَعَالَىٰ إِيَّاهَا وَإِذْهَابِ نُورِهَا.

ترجمہ:

اس آیت میں اللہ کریم نے ہر اس شخص کی مثال بیان کی ہے جس کو اللہ کریم نے کسی بھی قسم کی ہدایت کا حصہ عطا کیا ہو، اس شخص نے اس ہدایت کو ضائع کر دیا ہو اور اسے ابدی نعمتوں کا ذریعہ نہ بنایا ہو تو وہ حیرت اور حسرت میں رہ جائے اس ضرب المثل کے بیان کا مقصد اس مضمون کو ثابت کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ہے جس کو ما قبل آیت،

الذَّكَاءِ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهَدٰى... الخ
 اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اگرچہ یہ آیت طیبہ عام ہے لیکن اس کے عموم میں وہ منافق بھی داخل ہوں گے جن کا اس سے ما قبل آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی کفر کو بچا کر اپنی زبانوں سے حق پر ہونے اور مومن ہونے کا دعویٰ کیا اور ان لوگوں کے سامنے اپنے کفر کا اظہار کیا جو گمراہی اور سرکشی میں شیاطین کی مثل تھے، اور وہ ان سے علیحدگی میں ملاقات کرتے۔ اور وہ شخص بھی اسی تشبیہ کے عموم میں داخل ہوگا جس نے گمراہی کو اس ہدایت پر ترجیح دی جو اس کو فطرت سلیمہ کی صورت میں عطا کی گئی تھی اور وہ آدمی بھی اس میں داخل ہوگا جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گیا اور وہ شخص بھی اس تشبیہ کے عموم میں داخل ہوگا جو ابھی ارادت کے احوال کی منزل میں ہو تو وہ محبت کا دعویٰ کر کر دے تو اس کے اس جھوٹے دعویٰ کی وجہ سے اللہ کریم نے اس سے ارادت کے احوال بھی چھین لئے جو اس پر ظاہر ہوئے تھے۔ اور ان لوگوں کے ایمان کو اس آگ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو روشنی حاصل کرنے کے لئے جلائی گئی ہو، جس سے آگ جلانے والے نے کچھ نفع حاصل کیا ہو، پھر وہ بھسم ہو گئی۔ اسی طرح منافقین کے اظہار ایمان نے انہیں دنیاوی فائدہ دیا کہ ان کی جانیں اور مال محفوظ ہو گئے اور قتل ہونے سے بھی بچ گئے نیز ان کی اولادیں غلام بننے اور جائیدادیں مال غنیمت بننے سے بھی بچ گئیں۔ اور مال غنیمت میں بھی حصہ دار بن گئے اور شریعت پر عمل کرنے میں بھی مسلمانوں کے ساتھ برابر شریک رہے، اور اسی نور ایمان کے ضائع ہونے اور اس کے بالکل مٹ جانے کو ان کی ہلاکت کے ساتھ تشبیہ دی اور ان کے کفر کے ظاہر کرنے کو آگ کے بجھنے اور روشنی کے ختم ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

مثل کی تعریف:

(مر مثل) مثل (ك) (Similar, Like)

المثل کے معنی ہیں ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔ اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہو جاتا ہو۔ اور معاملہ کی شکل سامنے آ جاتی ہو۔ مثلاً عین ضرورت پر کسی چیز کو کھودینے کے لئے الصیف ضیعت اللبَنِ کا محاورہ وہ ضرب المثل ہے۔ چنانچہ قرآن میں امثال بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنَظَرٍ لِّبِهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ" (سورة الحشر آیت نمبر 21)

اور یہ مثالیں لوگوں کے لئے ہم بیان فرماتے ہیں کہ وہ سوچیں۔

وقود کا معنی:

(وقد) (ض) (To kindle, To ignite)

وقدت النار وقودا۔ ووقدا آگ روشن ہونا۔ الوقود۔ ایندھن کی لکڑیاں جن سے آگ جلائی جاتی ہے۔ اور آگ

کے شعلہ کو بھی وقود کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

"وَقُودَهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 24)

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

"أُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 10)

اور وہی دوزخ کے ایندھن ہیں۔

"النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ" (سورۃ البروج آیت نمبر 5)

وہ اس بھڑکتی آگ والے۔

نار کا معنی:

(نور) نار (Fire, Flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"أَفْرِأَيْتُمْ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 71)

تو بھلا بتاؤ تو وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو۔

لما کا معنی اور استعمال:

(لما) (حرف)

یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے زمانہ ماضی میں کسی فعل کی نفی اور اس کے قریب الوقوع ہونے کے لئے جیسے فرمایا:

"وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الظَّالِمِينَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 142)

اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر والوں کی آزمائش کی۔

اور کبھی یہ اسم ظرف ک طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن میں بکثرت آیا ہے۔ جیسے فرمایا:

"فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 96)

پھر جب خوشی سنانے والا آیا۔

ضياء ہے کیا؟:

(ضوء) الضوء (Light, Illumination)

کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضائت النار و اضائت: آگ روشن ہو گئی اور اضائت (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی

آتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں ہے۔

" اَفَلَمْ نَأْتِ بِمِثْلِ مَا جَعَلَهُ دَهَبًا لَّهُ بِدُورِهِمْ " (سورة البقرة آیت نمبر 17)

تو جب اس سے آس پاس سب جگہ کا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا۔

" كَلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ " (سورة البقرة آیت نمبر 20)

جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے۔

" مَنْ أَلَّهُ اللَّهُ نُورًا يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ " (سورة القصص آیت نمبر 71)

تو اللہ کے سوا کون خدا ہے جو تمہیں روشنی لاوے۔

اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہیں ضیاء سے تعبیر فرمایا ہے۔

چنانچہ (تورات کے متعلق) فرمایا:

" وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ " (سورة الانبياء آیت نمبر 48)

اور بیشک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اجالا اور پرہیزگاروں کو نصیحت۔

لفظ حول کا معنی:

(حول) الحوال (ن) (All around, Round about)

دراصل اس کے معنی کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیزوں سے الگ ہونا کے ہیں۔ معنی تغیر کے اعتبار سے حال الشئی بحول حول کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کی شے کے متغیر ہونے کے ہیں۔ اور استعمال کے معنی تغیر پذیر ہونے کے لئے مستعد ہونے کے اور معنی انفصال کے اعتبار سے حال بینی و بینک کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی میرے اور اس کے درمیان فلاں چیز حائل ہوگئی۔

اور آیت کریمہ:

" يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ " (سورة الانفال آیت نمبر 24)

اللہ کا حکم آدمی اور اس کے دلی ارادوں میں حائل ہو جاتا ہے۔

لفظ ذہب کا معنی:

(ذہب) الذهب (ف) (convey)

ذہب بالشیء واذہبتہ لے جانا۔ یہ اعیان و معانی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

" اِنِّي ذَاهِبٌ اِلَى رَبِّي " (سورة الصافات آیت نمبر 99)

کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔

نور کا مفہوم:

(نور) النور (Light)

وہ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔

اور یہ دو قسم پر ہے دینی اور اخروی۔

نور دینی پھر دو قسم پر ہے معقول

جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے یعنی امور الہیہ کی روشنی جیسے عقل یا قرآن کی روشنی۔

دوم محسوس جس کا تعلق بصر سے ہے جیسے چاند سورج ستارے اور دیگر اجسام نیز چنانچہ نور الہی کے متعلق فرمایا:

"قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 15)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب۔

"وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا"

(سورۃ الانعام آیت نمبر 122)

اور اس کے لئے ایک نور کر دیا جس سے لوگوں میں چلتا ہے وہ اس جیسا ہو جائے گا جو اندھیریوں میں ہے۔

لفظ ترک کا معنی:

(تارك) ترك (Desertion, Leaving)

ترک الشیء کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینا کے ہیں خواہ وہ چھوڑنا ارادہ اختیار سے ہو اور خواہ مجبوراً چنانچہ ارادہ اور اختیار کے ساتھ چھوڑنے کے متعلق فرمایا:

"وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 99)

اور اس دن ہم انہیں چھوڑیں گے کہ ان کا ایک گروہ دوسرے پر ریلا آوے گا۔

"وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا" (سورۃ الدخان آیت نمبر 24)

اور دریا کو یونہی جگہ جگہ سے کھلا چھوڑ دے۔

اور بحالت مجبوری چھوڑنے کے متعلق فرمایا:

"كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 25)

کتنے چھوڑ گئے باغ اور چشمے۔

لفظ ظلم کی تحقیق:

(ظالم) الظلمة (Cruelty)

کے معنی میں روشنی کا معدوم ہونا اس کی جمع ظلمات ہے۔ قرآن میں ہے:

"أَوْ كُظُمَاتٍ فِي بَحْرٍ مُّجْتَمِعٍ" (سورۃ النور آیت نمبر 40)

یا جیسے اندھیریاں کسی گنڈے کے دریا میں۔

"ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" (سورۃ النور آیت نمبر 40)

اندھیرے ہیں ایک پر ایک۔

"أَمْنَ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ وَالْبَحْرِ" (سورۃ النمل آیت نمبر 63)

یا وہ جو تمہیں راہ دکھاتا ہے اندھیریوں میں خشکی اور تری کی۔

"وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالتُّورِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 1)

اور اندھیریاں اور روشنی پیدا کی۔

اور کبھی ظلمۃ کا لفظ بول کر جہالت شرک اور فسق و فجور کے معنی مراد لئے جاتے ہیں جس طرح کہ نور کا لفظ ان کے اضداد

یعنی علم و ایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 257)

اندھیریوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔

"وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 5)

اور بیشک ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں لے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیریوں سے اجالے میں لا۔

نوٹ: لفظ بصر کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 18]

مَّمَّنَّا بِكُمْ عَمَىٰ فَهَمْ لَا يَرَوْنَ (18)

"بہرے کو ننگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔"

متن:

مَّمَّنَّا بِكُمْ عَمَىٰ لَهَا سَدُوا مَسَامِعَهُمْ عَنِ الْإِصَاخَةِ إِلَى الْحَقِّ وَأَبَوْا أَنْ يَنْطِقُوا بِهِ أَلْسِنَتِهِمْ

وَيَتَّبِعُوا الْآيَاتِ بِأَبْصَارِهِمْ، جُعِلُوا كَأَمَّا أَيْفَتِ مَشَاعِرَهُمْ وَانْتَفَتِ قَوَاهِمُ كَقَوْلِهِ:

مَّمَّنَّا إِذَا سَمِعُوا خَيْرًا ذُكِرَتْ بِهِ... وَإِنْ ذُكِرَتْ بِسُوءٍ عِنْدَهُمْ أَذْنُوا

و كقوله:

أَصَمُّ عَنِ الشَّيْءِ الَّذِي لَا أُرِيدُهُ... وَأَسْمَعُ خَلْقِ اللَّهِ حِينَ أُرِيدُ
 وإطلاقها عليهم على طريقة التشبيل، لا الاستعارة إذ من شرطها أن يطوى ذكر
 المستعار له، بحيث يمكن حمل الكلام على المستعار منه لولا القرينة كقول زهير:
 لَدَى أَسَدٍ شَاكِيَ السِّلَاحِ مُقَدِّفٍ... لَهُ لِبَدٌ أَظْفَارُهُ لَمْ تُقْلَمِ
 ومن ثم ترى المفلقين السحرة يضربون عن توهم التشبيه صفعاً كما قال أبو تمام
 الطائي:

وَيَصْعَدُ حَتَّى يَظُنَّ الْجَهْلُ... بِأَنَّ لَهُ حَاجَةً فِي السَّمَاءِ

وها هنا وإن طوى ذكره بحذف المبتدأ لكنه في حكم المنطوق به، ونظيره:

أَسَدٌ عَلِيٌّ وَفِي الْحُرُوبِ نَعَامَةٌ... فَتُخَاءُ تَنْفِرُ مِنْ صَفِيرِ الصَّافِرِ

هَذَا إِذَا جَعَلْتَ الضَّيْرَ لِلْمَنَافِقِينَ عَلَى أَنَّ الْآيَةَ فَذَلِكَ التَّشْبِيلُ وَنَتِيجَتُهُ، وَإِنْ جَعَلْتَهُ
 لِلْمُسْتَوْقِدِينَ، فَهِيَ عَلَى حَقِيقَتِهَا. وَالْمَعْنَى: أَنَّهُمْ لَمَّا أَوْقَدُوا نَاراً فَذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ،
 وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ هَائِلَةٍ أَدْهَشَتْهُمْ بِحَيْثُ اخْتَلَتْ حَوَاسِهِمْ وَانْتَقَصَتْ قَوَاهِمُ.
 وَثَلَاثَتُهَا قُرِئَتْ بِالنَّصْبِ عَلَى الْحَالِ مِنْ مَفْعُولٍ تَرَكَهُمْ. وَالصِّمُّ: أَصْلُهُ صَلَابَةٌ مِنْ
 اِكْتِنَازِ الْأَجْزَاءِ، وَمِنْهُ قَبِيلُ حَجْرٍ أَصَمٌ وَقِنَاةُ سَمَاءٍ، وَصَمَامُ الْقَارُورَةِ، سُمِّيَ بِهِ فَقْدَانُ
 حَاسَةِ السَّبْعِ لِأَنَّ سَبَبَهُ أَنْ يَكُونَ بَاطِنُ الصَّبَاخِ مَكْتَنِزاً لَا تَجْوِيفَ فِيهِ، فَيَسْتَمِيلُ عَلَى
 هَوَاءٍ يَسْبَعُ الصَّوْتِ بِتَمُوجِهِ. وَالبِكْمُ الخرس. وَالْعَمَى: عَدَمُ الْبَصْرِ عَمَّا مِنْ شَأْنِهِ أَنْ
 يَبْصُرَ وَقَدْ يُقَالُ لِعَدَمِ الْبَصِيرَةِ.

فَهُمْ لَا يَرِجْعُونَ لَا يَعُودُونَ إِلَى الْهُدَى الَّذِي بَاعَوْهُ وَضَيَعُوهُ. أَوْ عَنِ الضَّلَالَةِ الَّتِي
 اشْتَرَوْهَا، أَوْ فَهْمٍ مُتَحِيرُونَ لَا يَدْرُونَ أَيَتَقَدِّمُونَ أَمْ يَتَأَخَّرُونَ، وَإِلَى حَيْثُ ابْتَدَأُوا مِنْهُ
 كَيْفَ يَرْجِعُونَ. وَالْفَاءُ لِلدَّلَالَةِ عَلَى أَنَّ اتِّصَافَهُمْ بِالْأَحْكَامِ السَّابِقَةِ سَبَبٌ لِتَحْيِرِهِمْ
 وَاحْتِبَاسِهِمْ.

ترجمہ:

وہ منافقین بہرے، گوئے اواندھے ہیں جب کہ انہوں نے اپنے کانوں کے سوراخوں کو حق بات سننے سے بند کر لیا ہے
 اور اپنی زبانوں سے حق اقرار کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی آنکھوں کو اللہ کریم کی نشانیاں دیکھنے سے روک دیا۔ ان کو ظاہری
 اس ناکارہ ہو گئے ان کی قوتیں بیکار ہو گئیں یعنی کہ درحقیقت نہ تو وہ بہرے، گوئے اور اندھے ہیں بلکہ ان کو حق بات سننے

سے روک دیا گیا اور انہوں نے اپنی زبانوں کو حق سے روک رکھا ہے۔ اسی حقیقت کو شاعر نے بیا کیا ہے،
 صُمْ إِذَا سَمِعُوا خَيْرًا أَذْكَرْتُ بِهِ... وَإِنْ ذُكِرْتُ بِسُوءٍ عِنْدَهُمْ أَذْنُوا
 وہ بہرے ہیں، جب ان کے کے ہاٹنے میری خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اور جب میری برائی کی جائے تو وہ بغور
 سنتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور شعر میں ہے،

أَصَمُّ عَنِ الشَّيْءِ الَّذِي لَا أُرِيدُهُ... وَأَسْمَعُ خَلْقِي اللَّهُ حِينَ أُرِيدُ

میں ہر اس چیز کو سننے سے بہرا ہوں جس کو سننے کا میں ارادہ نہیں رکھتا اور جب میں سننے کا ارادہ کرتا ہوں تو اللہ کریم کی
 ساری مخلوق سے زیادہ سننے والا ہوں۔

منافقوں کی یہ تینوں صفات بطور تشبیہ ذکر کی گئی ہیں نہ کہ بطور استعارہ، کیونکہ استعارہ کی شرط یہ ہے کہ مستعار لہ (مشبہ) کا
 ذکر بالکل ہی لپیٹ دیا جاتا ہے اس حیثیت سے اگر وہاں کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جو اس کا حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہو تو اس کو حقیقی
 معنی پر محمول کرنا ممکن ہوتا ہے لیکن یہاں مشبہ اگرچہ محذوف ہے لیکن ذہن میں اس کا تصور موجود ہے کہ وہ ہم ضمیر ہے جو راجع
 الی المنافقین ہے۔

زہیر شاعر کہتا ہے:

لَدَى أُسْدٍ شَاكِي السِّلَاحِ مُقَدِّفٍ... لَهُ لِبَدٌ أَظْفَارُهُ لَمْ تُقْلِمِ

(میں نے موت کے گھر) ایسے شیر پر حملہ کر دیا جس نے ہتھیار سونٹے ہوئے تھے وہ بڑا ہی بہادر جنگجو تھا۔ اس کی گردن
 کے ارد گرد تہہ در تہہ بال جمے ہوئے تھے۔ جس کے ناخن بھی نہیں کاٹے ہوئے تھے۔

یہاں لفظ اسد بطور استعارہ استعمال ہوا ہے اگر شاکی السلاح کا قرینہ موجود نہ ہوتا تو لفظ اسد کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرنا
 ممکن تھا، چونکہ استعارہ میں مشبہ کا ذکر بالکل نہیں ہوتا اسی لئے وہ لوگ قادر الکلام بن جاتے ہیں، اسی لئے جہاں تشبیہ کا وہم ہو
 ، وہاں سے اعراض کر جاتے ہیں، ایک شاعر ابو تمام کہتا ہے،

وَيَصْعَدُ حَتَّى يَنْظُرَ الْجَهْلُ... بِأَنَّ لَهُ حَاجَةً فِي السَّمَاءِ

کہ میرا مدوح مکان اور بلند مرتبہ کی طرف عروج کر جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے مرتبہ سے بے خبر لوگ گمان کرتے ہیں
 کہ اسے آسمان میں کوئی کام ہے۔

صم بکم عمی

سے پہلے اگر مبتداء کو حذف کر کے مشبہ کا ذکر لپیٹ دیا گیا ہے لیکن وہ منطوقہ کے حکم میں ہے۔ او محذوف مذکور کی طرح
 ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح عمران بن خطان خارجی اپنے شعر میں کہتا ہے،

أَسَدٌ عَلَىٰ وَفِي الْحَرْوِبِ نَعَامَةٌ... فَتُخَاءُ تَنْفِرُ مِنْ صَفِيرِ الصَّافِرِ

(کہ حجاج بن یوسف میرے خلاف تو) شیر کی طرح ہے، لیکن وہ اس شتر مرغ کی طرح ہے جو جنگوں میں پر پھیلائے ہوئے ہے، جو سیٹی بجانے والے کی سیٹی کی آواز سن کر بھاگ جاتا ہے۔

اس مقام پر اسد سے پہلے مبتداء محذوف ہے اس لئے یہ بھی تشبیہ ہے۔ اور مندرجہ بالا آیت میں تمثیل اور تشبیہ کا قول اس وقت ہی درست ہو سکتا ہے جب کہ ضمیر محذوف کا مرجع منافقین کو بنایا جائے تو یہ تمثیل اور تشبیہ اس سے ما قبل کلام میں بیان کی ہوئی حقیقت کا خلاصہ اور نتیجہ ہوگی۔ اور اگر ضمیر کا مرجع مستوقدین النار کو بنایا جائے تو پھر یہ الفاظ اپنے حقیقی معنی میں ہی استعمال ہوں گے اور آیت کا معنی یہ ہوگا کہ آگ جلانے والوں نے جب آگ جلائی اور اس نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ کریم نے ان کا نور سلب کر لیا اور انہیں گھپ اندھیروں میں چھوڑ دیا تو ان ظلمتوں نے ان کو ایسا دہشت زدہ کر دیا کہ وہ حواس باختہ ہو گئے اور ان کے حواس ناکارہ ہو گئے اور ان کی دیکھنے، سننے اور بولنے کی قوتیں کمزور ہو گئیں۔ ان تینوں صفات کو منسوب بھی پڑھا گیا ہے اس وقت یہ ترکہم کے مفعول سے حال ہوں گے۔

الصمم کا معنی:

صمم کا لغوی معنی وہ سختی اور صلابت ہے جو مختلف اجزاء کے جمع اور متحد ہونے سے بنتی ہے اور اسی سے اصمم کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جو حجر اور قناتہ کی صفت بنتا ہے کہا جاتا ہے، حجر اصمم (سخت پتھر) اور قناتہ اصماء (ٹھوس اور مضبوط لکڑی کا نیزہ) اور بوتل کے ڈھکنا کو بھی صمام القارورة کہتے ہیں۔ اب اس لفظ کا اطلاق سماعت کے حاسہ کے فقدان پر ہوتا ہے۔ کیونکہ قوت سماعت کے نہ ہونے کے سبب یہ ہوتا ہے کہ کان کے سوراخ کے اندر سے اس قدر ٹھوس ہو جاتے ہیں کہ اس میں ذرا برابر بھی خلا باقی نہیں رہتا جو اس ہوا پر مشتمل ہو جس کے کانوں کے پردہ سے ٹکرانے کی وجہ سے آواز سنائی دیتی ہے۔

بکم قوت گویائی کے نہ ہونے کو کہتے ہیں اور عمی اس وقت بولتے ہیں کہ جب کسی ایسی چیز میں بینائی نہ ہو جس کی شان یہ ہو کہ بصیر ہو سکے اور کبھی عمی کے لفظ کا اطلاق عدم بصیرت پر بھی ہوتا ہے جو کہ ان کے یہ حواس ان کی گمراہی کی وجہ سے مختل ہو چکے تھے اس لئے اللہ کریم نے فرمایا کہ وہ اس ہدایت کی طرف نہیں لوٹیں گے جس کو انہوں نے فروخت اور ضائع کر دیا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس گمراہی سے واپس نہیں پلٹیں گے جسے انہوں نے ہدایت کے بد کے خرید لیا ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس حد تک حیران اور ششدر ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ انہوں نے آگے کیسے بڑھنا ہے یا پیچھے ہٹنا ہے کہ وہ اس جگہ کی طرف لوٹ جائیں جہاں سے انہوں نے ابتداء کی تھی تو جب انہیں اپنی منزل کا علم ہی نہیں تو وہ کیسے پلٹ سکتے ہیں۔

فاء کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کا سابقہ اوصاف سے متصف ہونا ان کی رکاوٹ اور ان کی حیرت انگیزی کا

سبب ہے۔

صم کا معنی:

(ص م م) الصمم (Deaf)

کے معنی حاسہ سماعت ضائع ہو جانا کے ہیں (مجاز) اس کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوتا ہے جو نہ تو حق کی آواز سنے اور نہ ہی اسے قبول کرے (بلکہ اپنی مرضی کرتا چلا جائے) قرآن میں ہے:

"صُمُّ بَكْمٌ عُمِي فَهَمْ لَا يَزِجُوعُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 18)

بہرے گوئے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔

بکم کا معنی:

(ب ک م) الابکم (Dumb, Speechless)

پیداہنگی گونگا اور آخرس عام گوئے کو کہے ہیں لہذا بکم عام اور آخرس خاص ہے قرآن میں ہے۔

"وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمٌ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ" (سورۃ النحل آیت نمبر 76)

اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں گونگا اور دوسرے کی ملک (ہے بے اختیار و ناتوان) کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اور ابکم کی جمع بکم آتی ہے چنانچہ فرمایا:

"صُمُّ بَكْمٌ عُمِي فَهَمْ لَا يَزِجُوعُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 18)

بہرے گوئے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔

اور جو شخص ضعف عقلی کے سبب گفتگو نہ کر سکے اور گوئے کی طرح چپ رہے تو اس کے متعلق بکم عن الکلام کہا جاتا ہے

یعنی وہ کلام سے عاجز ہو گیا۔

عمی کا معنی:

(ع م ی) العمی (Blindness)

یہ بصارت اور بصیرت دونوں قسم اندھے پن کے لئے بولا جاتا ہے لیکن جو شخص بصارت کا اندھا ہو اس کے لئے صرف

اعمی اور جو بصیرت کا اندھا ہو اس کے لئے اعمی و عم دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

"أَنْ جَاءَكَ الْأَعْمَى" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 2)

کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔

میں الاعمی سے مراد بصارت کا اندھا ہے مگر جہاں کہیں قرآن نے العمی کی مذمت کی ہے وہاں دوسرے معنی یعنی

بصیرت کا اندھا پن مراد لیا ہے جیسے فرمایا:

"صُمُّكُمْ عَمِّي فَهُمْ لَا يَزُجَعُونَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 18)

بہرے گوئے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔

"فَعَمُوا وَصَمُوا" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 71)

تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔

بلکہ بصیرت کے اندھا پن کے مقابلہ میں بصارت کا اندھا پن۔ قرآن کی نظر میں اندھا پن ہی نہیں ہے

رجوع کا اصل معنی:

(رجوع) الرجوع (To Return Back)

اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے مدار حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز کے اور یا باعتبار فعل کے ہو الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رجوع کے معنی لوٹانے کے ہیں۔

[سورة البقرة (2): آية 19]

أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ

الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ (19)

"یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔"

متن:

أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ عطف على الذي استوقد أي: كمثل فوى صيب لقوله: يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَأَوْ فِي الاصل للتساوي في الشك، ثم اتسع فيها فأطلقت للتساوي من غير شك مثل:

جالس الحسن أو ابن سيرين، وقوله تعالى: وَلَا تُطْعَمُ مِنْهُمْ أُمَّةٌ أَوْ كَفُورًا. فإنها تفيد التساوي في حسن المجالسة ووجوب العصيان ومن ذلك قوله: أَوْ كَصَيِّبٍ وَمَعْنَاهُ أَنْ قِصَّةَ الْمَنَافِقِينَ مِشْبَهَةٌ بِهَاتَيْنِ الْقِصَّتَيْنِ، وَأَنَّهَا سَوَاءٌ فِي صِحَّةِ التَّشْبِيهِ بِهِمَا، وَأَنَّ خَيْرَ فِي التَّمْثِيلِ بِهِمَا أَوْ بِأَيِّهَا شئت. وَالصَّيْبُ: فَيَعْلَمُ مِنَ الصَّوْبِ، وَهُوَ النُّزُولُ، يُقَالُ

للمطر وللسحاب قال الشماخ:

وَأَشْحَمَ دَانَ صَادِقِ الرَّغْدِ صَيِّبٍ وَفِي الْآيَةِ يَحْتَمِلُهُمَا، وَتَنْكِيرُهُ لِأَنَّهُ أُرِيدَ بِهِ نَوْعٌ مِنَ الْمَطَرِ شَدِيدٍ، وَتَعْرِيفُ السَّمَاءِ لِلدَّلَالَةِ عَلَى أَنَّ الْغِيَامَ مَطْبِقٌ أَخَذَ بِأَفَاقِ السَّمَاءِ كُلِّهَا فَإِنَّ كُلَّ أَفْقٍ مِنْهَا يُسَمَّى سَمَاءً كَمَا أَنَّ كُلَّ طَبَقَةٍ مِنْهَا سَمَاءٌ، وَقَالَ:

وَمِنْ بَعْدِ أَرْضٍ بَيْنَنَا وَسَمَاءٍ

أُمد به ما في الصيب من المبالغة من جهة الاصل والبناء والتنكير، وقيل المراد بالسحاب السحاب فاللام لتعريف الباهية.

فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ إِنْ أُرِيدَ بِالصَّيْبِ الْمَطَرُ، فَظُلُمَاتُهُ ظَلِمَةٌ تَكَثَّفُهُ بِتَتَابُعِ الْقَطْرِ، وَظَلِمَةٌ غَمَامُهُ مَعَ ظَلِمَةِ اللَّيْلِ وَجَعَلَهُ مَكَانًا لِلرَّعْدِ وَالْبَرْقِ لِأَنَّهَا فِي أَعْلَاهُ وَمُنْحَدَةٌ مَلْتَبِسِينَ بِهِ، وَإِنْ أُرِيدَ بِهِ السَّحَابُ، فَظُلُمَاتُهُ سَمَاتُهُ وَتَطْبِيقُهُ مَعَ ظَلِمَةِ اللَّيْلِ.

ترجمہ:

اس عبارت میں لفظ او حرف عطف ہے اور کصیب کا عطف الذي استوقد ناراً پر ہے تو معنی یہ ہوگا کہ منافقین موسلا دھار برسنے والی بارش میں چلنے والوں کی طرح ہے کیونکہ اس کے مابعد آیت میں اللہ کریم فرماتا ہے کی وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت واقع ہونے کے خوف سے ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ کریم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس جگہ او حرف عطف ذکر کیا گیا ہے جو اصل میں تساوی فی الشک کے لئے وضع کیا گیا ہے اس میں وسعت پیدا کر دی گئی ہے اور مجازاً صرف تساوی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں شک نہیں ہوتا، جیسے کوئی کہتا ہے کہ

جالس الحسن او ابن سیرین

چاہئے۔ (حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلس میں بیٹھا کرو اور چاہے ابن سیرین، دونوں کی محفل میں جانا خیر و برکت

میں مساوی ہے)

اسی طرح دوسری آیت طیبہ میں فرمایا:

اے مخاطب گناہگار یا ناشکرے کی اطاعت نہ کر۔

ولا تطع منهم أثماً او كفوراً

اطاعت نہ کرنے میں دونوں مساوی، اسی طرح او کصیب میں او کا لفظ ہے تشبیہ دینے کی مساوات پر دلالت کر رہا ہے

یعنی چاہئے تو آپ منافقین کو مستوقدین کے ساتھ تشبیہ دیں اور چاہے اصحاب صیب سے کیونکہ دونوں کے ساتھ تشبیہ دینا صحیح اور درست ہے۔ آپ کو اختیار ہے کہ منافقین کی حالت اصحاب صیب اور مستوقدین دونوں کے قصوں سے تشبیہ دیں اور چاہے ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دیں۔

اصیب صفت مشہ کا صیغہ ہے بروزن فعیل۔ اور یہ صوب سے مشتق ہے۔ (برسنا) اور صیب کے لفظ کا اطلاق بارش اور بادل دونوں پر ہوتا ہے۔ شاخ کہتا ہے،

وَأَشْعَمَ دَانَ صَادِقِي الرِّعْدِ صَيْبٍ

کہ وہ کالے کالے بارش سے جو جھل بادل کڑک کے سچے، برسنے والے ہیں۔

اس مصرع میں صیب کا لفظ بادل کے معنی میں ہے اور زیر بحث آیت طیبہ میں صیب سے دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں۔ (بادل اور بارش) اور اس کو نکرہ ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے شدید قسم کی بارش مراد ہے اور السماء کو معرف باللام ذکر کرنا بھی معنی پر دلالت ہے، یعنی بادل آسمان کے تمام گوشوں پر چھایا ہوا ہے۔ کیونکہ سماء کے لفظ کا اطلاق آسمان ہر افرقہ کے لئے کیا جاتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ السماء پر الف لام استغراقی، شاعر کہتا ہے۔

وَمِنْ بَعْدِ أَرْضٍ بَيْنَنَا وَسَمَاءٍ

میری محبوب کے درمیان اور میرے درمیان اتنی دوری ہے جتنی دوری قطعہ زمیں اور قطعہ آسمان کے درمیان ہے۔ اور صیب کے لفظ میں کئی طرح مبالغہ پایا جاتا ہے۔ وہ بھی بارش یا بادل میں مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ اصل معنی اور صیغہ کے اعتبار سے بھی اور اس کو نکرہ ذکر کرنے کے اعتبار سے بھی مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ صوب سے مشتق ہے اور حروف شدیدہ سے مرکب ہے جو بارش کے نزول کی شدت پر دلالت کرتا ہے اور یہ صفت مشہ کا صیغہ ہے جو دوام اور استمرار کے معنی کو ظاہر کرتا ہے اور نکرہ ہونا بھی اس کے مدلول کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض نے کہا کہ یہاں سماء سے مراد آسمان نہیں، بادل مراد ہے اور اس پر ال کا دخول اس کی حقیقت اور ماہیت کی تعریف کے لئے ہے۔

وہ بادل یا بارش ایسے ہیں، جن کے ظلمتیں بجلی کی کڑک اور چمک ہے۔

اگر صیب سے مراد بارش لی جائے تو اس کی ظلمتیں یہ ہوں گی۔

☆ بارش کے موسلا دھارا اور تسلسل سے برسنے سے پیدا ہوتی ہے۔

☆ رات کی ظلمت: جس کے ساتھ بادل کے چھا جانے کی ظلمت بھی ہو، بارش کو کڑک اور چمک کا محل بنانے کی وجہ کیا

ہے؟

حالانکہ یہ دونوں چیزیں بادل میں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ دونوں بارش کے اوپر اس کے برسنے کے محل کے ساتھ ملتبس ہوتی ہے اس لئے اس کا اطلاق مجازاً بارش پر کر دیا گیا ہے۔

اور اگر صیب سے مراد بادل لیا جائے تو ظلمات سے یہ ظلمتیں مراد ہوں گی۔

متن:

وارتفاعها بالظرف وفاقاً لأنه معتد على موصوف. والرعد: صوت يسمع من السحاب. والمشهور أن سببه اضطراب أجرام السحاب واصطكاكها إذا حدها الريح من الارتعاد. والبرق ما يلمع من السحاب. من برق الشيء بريقاً، وكلاهما مصدر في الاصل ولذلك لم يجمعاً.

ترجمہ:

یہاں پر فیہ جار اور مجرور، شبہ فعل کے متعلق ہو کر خبر مقدم ہے اور ظلمات، و رعد و برق معطوف اور معطوفات علیہ مل کر مبتداء مؤخر ہے۔ ان کے مرفوع ہونے میں ان کے عامل میں اختلاف ہے۔

بصریوں کا کہنا ہے کہ یہ عامل معنوی کے ساتھ بحیثیت مبتداء ہونے کے مرفوع ہیں۔

اور کو فیوں کا کہنا ہے کہ ان کا عامل شبہ فعل ہے، جار مجرور مل کر اس کے متعلق ہیں۔ اور امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس مؤخر الذکر قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس پر تمام علمائے نحو کا اتفاق ہے کہ جب ظرف سے پہلے موصوف مبتداء اور اسم موصول وغیرہ ہوں تو ان پر اعتماد کرتے ہوئے ظرف کو عامل بنانا جائز ہے۔ اس مقام پر فیہ کا اعتماد ماقبل کلام میں صیب کے لفظ پر ہے جو موصوف ہے اور یہ اس کی صفت ہے۔

الرعد یہ ارتعاد بمعنی کانپنا سے مشتق ہے اور رعد اس آواز کو کہتے ہیں جو بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور مشہور یہ ہے کہ اس آواز اور کڑک کے پیدا ہونے کا سبب اجرام سماویہ کا اضطراب اور ان کا آپس میں ٹکرانا ہے۔ جب کہ ہوا انہیں ہانک کر لے جا رہی ہو۔ اور برق اس چمک کا نام ہے جو بادلوں کی ملاقات سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ مشہور ہے برق الشيء بريقاً بمعنی وہ چیز خوب چمکی۔ چونکہ اصل میں برق اور رعد مصدر ہیں اس لئے ظلمات کی مطابقت کی وجہ سے ان کو جمع ذکر نہیں کیا جاتا۔

متن:

يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ... الخ

الضمير لأصصاب الصيب وهو وإن حذف لفظه وأقيم الصيب مقامه لكن معناه باق فيجوز أن يعول عليه كما عول حسان في قوله:

يَسْقُونَ مَنْ وَرَدَ الْبَرِيصَ عَلَيْهِمْ... بَرْدِي يَصِفُّ بِالرَّجِيحِ السَّلْسَلِ

حيث ذكر الضمير لأن المعنى ماء بردي، والجملة استئناف فكأنه لما ذكر ما يؤذن

بأشدة والهول قيل:

فكيف حالهم مع مثل ذلك؛ فأجيب بها، وإنما أطلق الاصابع موضع الأنامل للبالغه.

من الصواعق متعلق بيجعلون أى من أجلها يجعلون. كقولهم سقاء من الغيبة. والصاعقة قصفة رعد

هائل معها نار لا تمر بشيء إلا أتت عليه، من الصعق وهو شدة الصوت، وقد تطلق على كل هائل مسوع أو مشاهد، يقال صعقته الصاعقة إذا أهلكته بالإحراق أو شدة الصوت، وقرء من «الصواعق» وهو ليس بقلب من الصواعق لاستواء كلا البناءين في التصرف يقال صعق الديك، وخطيب مصقع، وضقعت الصاعقة، وهى فى الاصل إما صفة لقصفة الرعد أو للرعد. والتاء للبالغه كما فى الرواية أو مصدر كالعافية والكاذبة.

خَلَدَ الْمَوْتُ نَصَبَ عَلَى الْعَلَّةِ كَقَوْلِهِ:

وَأَغْفَرُ عَوْرَاءَ الْكَرِيمِ إِدْخَارَةً... وَأَصْفَحُ عَنْ شَتْمِ اللَّئِيمِ تَكْرُمًا

والموت: زوال الحياة، وقيل عرض يضادها لقوله: خَلَقَ الْمَوْتُ وَالْحَيَاةَ، وَرُدَّ بَأَنَّ الْخَلْقَ بِمَعْنَى التَّقْدِيرِ، وَالْإِعْدَامِ مَقْدَرَةٌ.

وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ

لا يفوتونه كما لا يفوت المحاط به المحيط، لا يخلصهم الخداع والحيل، والجملة اعتراضية لا محل لها.

ترجمہ:

،،اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے،،
یجعلون کی ضمیر مرفوع متصل کا مرجع اصحاب صیب ہیں، اگرچہ وہ لفظاً محذوف ہے لیکن معنا موجود ہے۔ اس کے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اس ضمیر کا مرجع بنانا جائز ہے، اور عربوں میں یہ استعمال عام مروج تھا جیسے حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہا مانہ جاہلیت میں عنسان کے بادشاہوں کے پاس جاتے اور ان کی مدح میں اشعار کہتے۔ ان کا ایک شعر بطور دلیل ملاحظہ ہو، جس میں مضاف محذوف کو ضمیر کا مرجع بنایا گیا ہے۔

يَسْقُونَ مِنْ وَرْدِ الْبَرِيصِ عَلَيْهِمْ... بَرَدَى يَصْفَقُ بِالرَّجِيحِ السَّلْسَلِ

میرے مدد میں اس آدمی کو بریس کے مقام پر، جو ان کے پاس آتا ہے، تو اسے بردی نہر کا پانی ایسی شراب میں ملا کر پلاتے ہیں جو آسانی سے گلے سے اتر جاتی ہے۔

اس شعر میں یصفق مذکر غائب کا صیغہ ہے جس کی ضمیر کا مرجع ماء ہے جو بردی سے پہلے محذوف ہے اصل میں ماء بردی تھا۔ اگرچہ ماء لفظوں میں مذکور نہیں لیکن اس کے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے یصفق کی ضمیر مذکر کا اسے مرجع بنایا گیا ہے ورنہ یہاں تصفق ہوتا۔

یجعلون الی آخرہ مکمل جملہ متانفہ ہے جس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ چونکہ جملہ متانفہ کسی سوال کا جواب ہوتا ہے تو یہاں یہ اس سوال کا جواب ہے کہ ان تمام ہولناکیوں کے باوجود بارش میں چلنے والوں کا حال کیا ہوگا تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ بجلی کی زبردست کڑک اور چمک کی وجہ سے موت کے خوف سے وہ اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنا انہیں موت سے بچا نہیں سکتا، اور اس مقام پر ان کی دہشت میں مبالغہ ظاہر کرنے کے لئے اصابعہم کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ کانوں کے سوراخوں میں ساری انگلیاں داخل نہیں کی جاتیں بلکہ ان پر صرف انگلیوں کے پورے رکھے جاتے ہیں۔

اور من الصواعق جار اور مجرور مل کر یجعلون کے متعلق ہیں اور من سببہ ہے اور من سبب کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے:

سقاہ من العیمة اس نے دودھ شدت شوق کی وجہ سے پلایا۔

الصواعق

یہ صاعقہ کی جمع ہے جو صعق بمعنی شدت خوف سے مشتق اور صاعقہ کا معنی ہے۔ ایسی شدید کڑک، جس کے ساتھ آگ ہو اور جس پر پڑے اسے جلا کر ہلاک کر دے اور صاعقہ کے لفظ کا اطلاق اس ہولناک چیز پر بھی ہوتا ہے جسے سنا جائے یا اسے دیکھ کر دہشت طاری ہو جائے اور اسے دیکھنے یا سننے والا ہلاک ہو جائے۔

صواعق کو صواعق بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ صواعق کا مقلوب نہیں کیونکہ قلب کا معنی ہوتا ہے کسی حرف کو مقدم یا مؤخر کرنا۔

کیونکہ یہ دونوں لفظ یعنی صواعق اور صواعق کثیر الاستعمال اور فصیح لفظ ہیں اور ان سے تمام مشتقات استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے صعق الیدیک (مرغ نے آذان دی)، خطیب مصقع (جمہوری آواز والا خطیب) اور اسی طرح صعقته الصاعقة (کہ اسے بجلی کی گرج دار کڑک نے ہلاک کر دیا)۔

اور صاعقة اصل میں اسم فاعل کا صیغہ ہے اور یہ یا تو صفة الرعد کی صفت ہے، اس لئے یہ مؤنث ہے اور یا یہ رعد کی صفت ہے اس صورت میں اس کے آخر تائے تائید نہیں ہوگی بلکہ مبالغہ کے لئے ہوگی جیسے راویہ اور علامۃ کے آخر میں تا

داخل ہوگئی اور موٹ کی تانکھیں ہے جیسے عافیۃ بمعنی علو اور کاذبۃ بمعنی کذب کے آخر میں تا ہے۔

حذ الموت

اس مقام پر حذر کو موت کی طرف مضاف کر کے منصوب پڑھا گیا ہے کیونکہ یہ مفعول لہ ہے اور لغت عرب میں معرفہ کی طرف مضاف کر کے مفعول لہ کے طور پر پڑھنا جائز ہے۔ جیسا کہ حاتم طائی کا قول،

وَأَغْفِرُ عَوْرَاءَ الْكُرَيْمِ إِذْ تَخَارَهُ... وَأَصْفَحُ عَنْ شَتْمِ اللَّثِيمِ تَكْرُمًا

اور میں سخی آدمی کی تاپسندیدہ بات کو معاف کر دیتا ہوں۔ اس کی محبت ذخیرہ کرنے کے لئے اور کمینہ فطرت کو گالی دینے سے اپنی شرافت و بزرگی کی وجہ درگزر کرتا ہوں۔

اس شعر میں اذخارہ الی الضمیر کے باوجود مفعول لہ ہے۔

والله محيط بالكافرين

یعنی تمام کافر اس کے علم میں ایسے گھرے ہوئے ہیں کہ وہ اس سے کسی طرح فوت یعنی مخفی نہیں ہوتے۔ جس طرح وہ چیز جسے گھیرا گیا ہو وہ گھیرنے والے سے فوت نہیں ہوتی۔ اس لئے کافروں اور منافقوں کے حیلے اور دھوکے بازیاں اس سے انہیں چھٹکارہ نہیں دلائیں گی اور یہ جملہ معترضہ ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔

صیب خاص کر صاب یصوب سے فعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بارش کا گرنا اوپر سے نیچے آنا شاعر نے کہا ہے۔

فكانهم صابت عليهم سبلة

گویا اس پر (زور کا) بادل برسا ہے۔

اور آیت کریمہ: "أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۹)

یاجیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک۔

اس میں بعض نے کہا ہے کہ صیب کے معنی بادل ہیں۔ اور بعض نے بارش مراد لی ہے۔ اور بارش کو مجازاً صیب کہا جاتا ہے

جیسا کہ اسے سحاب کہہ دیتے ہیں اصاب السهم تیرٹھیک نشانہ پر جاگا۔

مفہوم سماء:

(س م و) سماء (The Sky)

ہر شے کے بالائی حصہ کو سماء کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سماء ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔

اور آیت:

"اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 12)
 اللہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انہی کی برابر زمینیں۔
 کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

مفہوم ظلم:

(ظلم) الظلمة - (Cruelty)

کے معنی میں روشنی کا معدوم ہونا اس کی جمع ظلمات ہے۔

قرآن میں ہے: "أَوْ كُظُمَاتٍ فِي بَحْرٍ مُّجْتَبِيٍّ" (سورۃ النور آیت نمبر 40)
 یا جیسے اندھیریاں کسی کنڈے کے دریا میں۔

"ظُلُمَاتٍ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" (سورۃ النور آیت نمبر 40)
 بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک۔

"أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (سورۃ النمل آیت نمبر 63)
 یا وہ جو تمہیں راہ دکھاتا ہے اندھیریوں میں خشکی اور تری کی۔

"وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالتُّورِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 1)
 اور اندھیریاں اور روشنی پیدا کی۔

اور کبھی ظلمة کا لفظ بول کر جہالت شرک اور فسق و فجور کے معنی مراد لئے جاتے ہیں جس طرح کہ نور کا لفظ ان کے اضداد یعنی علم و ایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے: "يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 257)
 ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔

"أَنْ أَخْرِجَ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 5)
 کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ۔

رعد کا معنی:

(رعد) رعد (Thunder)

الرعد (اسم) بمعنی بادل کی گرج۔

رعد، فرشتے کا نام:

مروی ہے کہ انہ ملک یسوق السحاب کہ رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے کہا جاتا ہے۔ بادل گرجا اور چمکا۔ اور یہی معنی ارعد و ابرقت کے ہیں اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ تہدید یعنی ڈرانے اور دھمکانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور صلف (مثل) ضرب المثل ہے جو اس شخص کے حق میں بولی جاتی ہے جو زبانتونی ہو کچھ کر کے نہ دکھاتا ہو الرعدید بزولی کی وجہ سے کانپنے والا نیز محاورہ ہے ارعد فوائضه خوفاً یعنی مارے خوف کے اس کے بیٹھے کانپنے لگے۔

برق کا مفہوم:

(برق) البرق

کے معنی بادل کی چمک کے ہیں قرآن میں ہے:

"فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَبَرْقٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 19)

اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک۔

جعل کا معنی:

(جعل) جعل (ف)

یہ لفظ ہر کام کرنے کے لئے بولا جاسکتا ہے اور فعل و صنع وغیرہ افعال کی نسبت عام ہے۔

اصبع کیا ہے؟

(اصبع) اصبع (Finger)

الاصبع (انگلی) کا لفظ انگلی کی ہڈی ناخن بالائی سرانم اور جوڑ کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ اور بطور استعارہ ظاہری احسان کے معنی میں آتا ہے چنانچہ لک علیہ ید کی طرح لک علی فلان اصبع کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔

اذن کا معنی:

(اذن) الاذن (Ear)

کے معنی کان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر ہنڈیا کی کوروں کو اذن القدر کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر اذن کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔

چنانچہ فرمایا:

"وَيَقُولُونَ هُوَ أذُنٌ قُلُّ أذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ" (سورۃ التوبۃ آت نمبر 61)

اور کہتے ہیں وہ تو کان ہیں تم فرماؤ تمہارے بھلے کے لئے کان ہیں۔

اور آیت کریمہ: "وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا" (سورۃ الانعام 25)

اور انکے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔

کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بہرے ہو گئے ہیں بلکہ اس سے انکی جہالت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

تحقیق لفظ صاعقہ:

(ص ع ق) الصاعقة (Explosion)

اور صاعقہ دونوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ۔ لیکن صقع کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا

ہے اور صقع اجسام علوی کے بارے میں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صاعقتن قسم پر ہے

صاعقہ کی اقسام:

اول بمعنی موت اور ہلاکت

جیسے فرمایا: "فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 68)

تو بے ہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں۔

"فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 153)

تو انہیں کڑک نے آیا۔

دوم بمعنی عذاب جیسے فرمایا: "أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ" (سورۃ حم سجدہ آیت نمبر 13)

تمہیں ڈراتا ہوں ایک کڑک سے جیسی کڑک عاد اور ثمود پر آئی تھی۔

سوم بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک)

جیسے فرمایا: "وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 13)

اور کڑک بھیجتا ہے تو اسے ڈالتا ہے جس پر چاہے۔

لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صاعقہ کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں پھر کبھی تو

اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز

ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

حذر کا معنی:

(ح ذ ر) الحذر (س) (To Frighten, To Fear)

خوف زدہ کرنے والی چیز سے دور رہنا کہا جاتا ہے حذر حذرا و حذرتہ میں اس سے دور رہا۔

قرآن میں ہے: "يَخَذُوا الْآخِرَةَ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 9)
آخرت سے ڈرتا ہو۔

وَأَنَا لَجَمِيعٍ حَذِرُونَ، وحاذِرُونَ اور ہم سب باساز و سامان ہیں۔ ایک قرأت میں حذرون ہے
"هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرُوهُمْ" (سورۃ المنافقون آیت نمبر 4)
یہ تمہاری دشمن میں ان سے محتاط رہنا۔

"إِنَّ مِنْ أَرْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ" (سورۃ التغابن آیت نمبر 14)
تمہاری کچھ بیبیاں اور بچے تمہارے دشمن ہیں تو ان سے احتیاط رکھو۔
حذر۔ کسی امر سے محتاط رہنے کے لئے کہنا۔

قرآن میں ہے: "وَيُحَذِرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 28)
اور اللہ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے۔

الْحَذِرُ بَجَاؤٍ۔ اور آیت کریمہ: "خُذُوا حِذْرَكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 71)
جہاد کے لئے ہتھیار لے لیا کرو۔

میں حذر سے مراد اسلحہ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن سے بجاؤ حاصل ہوتا ہے حذار (اسم فعل بمعنی امر) بچو جیسے
مناع بمعنی امنع۔

خوف کا معنی:

(خوف) الخوف (س) (Fear, Dread)

کے معنی ہیں قرآن و شواہد سے کسی آنے والے کا خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ کالفظ قرآن و شواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر
بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیاوی اور آخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے:

قرآن میں ہے: "وَيَذُجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ" (سورۃ
اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

موت کا معنی۔

(موت) الموت (Death, Calamity)

یہ حیات کی ضد ہے،

موت کی اقسام:

لہذا حیات کی طرح موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

1- اول قوت نامیہ:

(جو کہ انسان حیوانات اور نباتات (سب میں پائی جاتی ہے) کے زوال کو موت کہتے ہیں جیسے فرمایا:

"يُنْفِخُ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (سورۃ الروم آیت نمبر 19)

اور زمین کو جلاتا ہے اس کے مرے پیچھے۔

"وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلَدًا مَّيْتًا" (سورۃ ق آیت نمبر 11)

اور ہم نے اس سے مردہ شہر جلا یا۔

2- حس و شعور کے زائل ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: "قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا" (سورۃ مریم آیت نمبر 23)

بولی ہائے کسی طرح میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی۔

"إِذَا مَا مِثُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 66)

جب میں مر جاؤں گا تو ضرور عنقریب جلا کر نکالا جاؤں گا۔

3- قوت عاقلہ کا زائل ہو جانا اور اسی کا نام جہالت ہے۔

چنانچہ فرمایا: "أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 122)

اور کیا وہ کہ مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ کیا۔

اور آیت کریمہ: "إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى" (سورۃ النمل آیت نمبر 80)

پیشک تمہارے سنائے نہیں سنتے مردے۔

4- غم جو زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیتا ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ: "وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 17)

اور اسے ہر طرف سے موت آئے گی اور مرے گا نہیں۔

اس میں موت سے یہی معنی مراد ہیں۔

5- موت بمعنی نیند ہوتا ہے۔

اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ النوم موت خفیف والموت نوم ثقیل کہ نیند کا نام ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو

توفی سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 60)

اور وہی ہے جو رات کو تمہاری رو میں قبض کرتا ہے۔

الحائط کا مطلب:

(ح و ط) الحائط۔ (Wall)

دیوار جو کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور

احاطة (افعال) کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) اجسام کے متعلق جیسے۔ احطت بمكان كذا یہ کبھی بمعنی حفاظت کے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ" (سورۃ فصلت آیت نمبر 54)

من رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یعنی وہ ہر جانب سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔

(2) دوم احاطہ بالعلم ہے جیسے فرمایا:

"أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 12) اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

کفر کے معانی:

(ک ف ر) الکفر (Unbelief, Infidelity)

اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی

طرح کا شکار چونکہ زمین کے اندر بیچ کو چھپاتا ہے۔ اس لئے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔

کفر کا اصطلاحی معنی:

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔

پھر کفر ان کا لفظ زیادہ نعمت کا انکار کرنے کے معنی ہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار دین کے معنی میں اور کفور کا

لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَأَبَى الظَّالِمُونَ إِلَّا كُفُورًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 99)

تو ظالم نہیں مانتے بے ناشکری کئے۔

[سورة البقرة (2) : آية 20]

يَكَادُ الْبَرْقُ يَكْطِفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ

شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (20)

دوبجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب

اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا، بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

متن:

يَكَادُ الْبَرُّقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ اسْتِثْنَاءُ ثَانٍ كَأَنَّهُ جَوَابُ لِمَنْ يَقُولُ: مَا حَالَهُمْ مَعَ تِلْكَ الصَّوَاعِقِ؟ وَكَادَ مِنْ أَعْمَالِ الْمَقَارِبَةِ، وَضَعْتَ لِمَقَارِبَةِ الْخَبَرِ مِنَ الْوُجُودِ لِعَرُوضِ سَبَبِهِ لَكِنَّهُ لَمْ يُوْجَدْ، إِمَّا لِفَقْدِ شَرْطٍ، أَوْ لَوْجُودِ مَانِعٍ وَعَسَى مَوْضُوعَةٌ لِرَجَائِهِ، فَهِيَ خَبْرٌ مُحْضٌ وَلِذَلِكَ جَاءَتْ مَتَصَرِّفَةً بِخِلَافِ عَسَى، وَخَبَرٌ هَا مَشْرُوطٌ فِيهِ أَنْ يَكُونَ فِعْلًا مُضَارِعًا تَنْبِيهًا عَلَى أَنَّهُ الْمَقْصُودُ بِالْقُرْبِ مِنْ غَيْرِ أَنْ، لِتَوْكِيدِ الْقُرْبِ بِالدَّلَالَةِ عَلَى الْحَالِ، وَقَدْ تَدَخَّلَ عَلَيْهِ حَمَلًا لَهَا عَلَى عَسَى، كَمَا تَحْمِلُ عَلَيْهَا بِالْحَذْفِ مِنْ خَبَرِهَا لِمَشَارِكْتِهَا فِي أَصْلِ مَعْنَى الْمَقَارِبَةِ.

وَالْخَطْفُ الْإِخْذُ بِسُرْعَةٍ وَقَرَأَ (يَخْطِفُ) بِكَسْرِ الطَّاءِ وَيَخْطَفُ عَلَى أَنَّهُ يَخْتَطِفُ، فَنَقَلْتُ فَتْحَةَ التَّاءِ إِلَى الْخَاءِ ثُمَّ ادْغَمْتُ فِي الطَّاءِ، وَيَخْطِفُ بِكَسْرِ الْخَاءِ لِالتَّقَاءِ السَّاكِنِينَ وَاتِّبَاعِ الْيَاءِ لَهَا، وَيَخْطِفُ وَيَتَخَطَفُ.

ترجمہ:

بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی۔

یہ ما قبل کلام میں پیدا شدہ سوال کا جواب اور جملہ مستأنفہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ بجلیوں کی چمک، گرج اور ہولنا کیوں کے وقت ان کی حالت کیا ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب بارش میں چلنے والا اچانک گرج اور چمک دیکھتا ہے تو اس کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ ڈر جاتا ہے، بالکل اسی طرح منافقین کی نگاہیں بھی اسلام کی سر بلندی اور عظمت کو دیکھ کر خیرہ ہو جاتی ہیں۔

یکاد فعل مضارع کا صیغہ ہے اور افعال مقاربہ میں سے ہے اور یہ زمانہ حال میں خبر کے قریب ہی واقع ہونے پر دلالت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ یعنی آنکھوں کے اچکنا وقوع پذیر ہونے کے بالکل قریب ہے۔ مگر وہ ابھی تک اچکی نہیں گئیں کیونکہ شرط مفقود ہے۔ یا کوئی ایسا مانع موجود ہے جو خبر کو واقع ہونے سے روک رہا ہے۔ اور وہ مانع اور شرط اللہ کریم کا ارادہ ہے، جو ابھی تک اس کے متعلق نہیں ہوا۔

کاد یہ خبر کے زمانہ حال میں قریب ہی واقع ہونے کی امید پر دلالت کرتا ہے جب کہ عسی انشائیہ ہے زمانہ مستقبل میں قریب ہی واقع ہونے کی امید پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی خبر پر اکثر ان آتا ہے جب کہ کاد کی خبر اکثر ان کے بغیر ہی ہوتی ہے۔ اور کاد فعل متصرف اور محض خبریہ ہے جب کہ عسی انشائیہ غیر متصرف ہے۔

نوٹ: عسی کی خبر سے ان اس وقت حذف کیا جاتا ہے جب کہ وہ کاد کے معنی میں ہوتا ہے اور کاد کی خبر پر اس وقت ان لگایا جاتا ہے جب کہ وہ عسی کے معنی میں ہو۔

"یخطف" واحد مذکر غائب فعل مضارع کا صیغہ ہے یہ مشتق ہے خطف سے جس کا معنی پکڑ لینا یا اچک لینا ہے۔ اور یخطف میں پانچ لگتیں پڑھنا جائز ہے،

طاء کے فتح اور کسرہ کے ساتھ یخطف یرخطف

طاء مشدود بفتحہ حاء کے کسرہ کے ساتھ۔

اصل میں یخطف تھا تاء کے فتح کو نقل کر کے خاء کو دیا اور پھر اس کو دوسری طاء میں ادغام کر دیا اور اس صورت میں خاء کے فتح کو دور ہٹا کر اسے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے کیونکہ جب دو ساکن جمع ہوتے ہیں تو پہلے حرف ساکن کو کسرہ ہی دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یاء کی اتباع کی وجہ سے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور اس کو باب تفعیل سے یرخطف بھی پڑھا گیا ہے۔

متن:

كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا...

استثناف ثالث كأنه قيل: ما يفعلون في تارقي خفوق البرق، وخفيتها؛ فأجيب بذلك. وأضاء إما متعد والمفعول محذوف بمعنى كلما نور لهم ممشى أخذوة، أو لازم بمعنى كلما لمع لهم مشوا في مطرح نورة، وكذلك أظلم فإنه جاء متعدياً منقولاً من ظلم الليل، ويشهد له قراءة أظلم على البناء للمفعول، وقول أبي تمام:

هُمَا أَظْلَمَا حَالِي نَمَّةٍ أَجْلِيَا... ظَلَامَتِيهِمَا عَن وَجْهِ أَمْرٍ دَأْشِيْبٍ

فإنه وإن كان من المحدثين لكنه من علماء العربية، فلا يبعد أن يجعل ما يقوله بمنزلة ما يرويه. وإنما قال مع الإضاءة كُلمًا ومع الإظلام إذا لأنهم حراس على المشي فكلما صادفوا منه فرصة انتهزوها ولا كذلك التوقف. ومعنى (قاموا) وقفوا، ومنه قامت السوق إذا ركبت، وقام الماء إذا جمد. وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَنَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ أَى وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَنْهَبَ بِسَمْعِهِمْ بِقَصِيفِ الرَّعْدِ وَأَبْصَارِهِمْ بِوَمِيضِ الْبَرْقِ لَنَهَبَ بِهِمَا فَحَذَفَ الْمَفْعُولَ لِلدَّلَالَةِ الْجَوَابِ عَلَيْهِ. وَلَقَدْ تَكَثَّرَ حَذْفُهُ فِي شَاءَ وَأَرَادَ حَتَّى لَا يَكَادِ يَذْكَرُ إِلَّا فِي الشَّيْءِ الْمَسْتَعْرَبِ كَقَوْلِهِ:

فَلَوْ شِئْتُ أَنْ أَبْكِي دَمًا لَبَكَيْتُهُ

(ولو) من حروف الشرط، وظاهرها الدلالة على انتفاء الاول لانتفاء الثاني، ضرورة انتفاء الملزوم عند انتفاء لازمه، وقرء: لأذهب بأسماعهم، بزيادة الباء كقوله تعالى: وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ.

وفائدة هذه الشرطية إبداء المانع لذهاب سمعهم وأبصارهم مع قيام ما يقتضيه، والتنبيه على أن تأثير الاسباب في مسيبتها مشروط بمشيئة الله تعالى، وأن وجودها مرتبط بأسبابها واقع بقدرته وقوله.

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ كالتصريح به والتقرير له.

ترجمہ:

"جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا، بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

یہ تیسرا جملہ مستأنف ہے اور یہ اس سوال کا جواب ہے جو ما قبل کلام سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بارش میں چلنے والوں کی اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہے جب بجلی چمکتی اور بجھتی ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب بجلی چمکتی ہے تو وہ چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو رک جاتے ہیں۔ اور فعل اضاء جو کہ اضاء سے مشتق ہے، یہ دونوں معنوں لازم اور متعدی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ متعدی ہو تو اس کا مفعول محذوف ہو گا۔ جو موشی ہے بمعنی گزرگاہ۔ مطلب جب بھی بجلی کو بندتی ہے تو وہ اس راستہ پر چلنے لگتے ہیں۔ اور اگر یہ لازم معنی میں ہو تو معنی ہو گا کہ ج بھی بجلی چمکتی ہے تو وہ راستے پر چلنے لگتے ہیں۔

اور اسی طرح اظلم کا فعل ہے جو اظلام سے مشتق ہے جس کا معنی تاریک کرنا ہے۔ یہ بھی لازم و متعدی دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ متعدی ہو تو ظلم اللیل سے جو لازم ہے، سے باب افعال ہو گا جو لازم کو متعدی بنا دیتا ہے اور جو اسے اظلم صیغہ مجہول سے پڑھتے ہیں وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ جیسا کہ ابو تمام کا شعر ہے،

هُمَا أَظْلَمَا حَالِي ثَمَّةَ أَجْلِيَا ... ظَلَامِيَهُمَا عَنِ وَجْهِ أَمْرَدَ أَشْيَبِ

ان دونوں (عقل و زمانہ) نے میری دو حالتیں تاریک کر دیں پھر ان دونوں نے ایک جسمانی اور عمر کے اعتبار سے

نوجوان اور تجربہ کے اعتبار سے عمر رسیدہ شخص سے اپنی تاریکیاں دور کر دیں۔

ابو تمام شاعروں کے اس اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو محدثین کہلاتے ہیں۔ اور یہ آغاز اسلام کے شعراء میں سے ہے

اگرچہ الفاظ کے ثبوت کے لئے ان کا کلام پیش نہیں کیا جاتا مگر معانی کے ثبوت کے لئے بطور دلیل ان کے کلام کو سابقہ شعراء کے

کلام پر محمول کرتے ہوئے دلیل بنانا جائز ہے چونکہ ابو تمام محدثوں میں سے ہے، لیکن تھاوہ عربی علماء میں سے، اسی وجہ سے اس

کے کلام سے دلیل پکڑنا جائز ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اضعاء کے ساتھ کلمہ ذکر کیا گیا جبکہ اظلم کے ساتھ اذا، اس کی وجہ کیا ہے؟
تو جواباً عرض ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلمہ تکرار کا فائدہ دیتا ہے چونکہ اصحاب صیب چلنے کے بڑے حریص تھے تو
جب بھی فرصت پاتے اس کو غنیمت سمجھتے ہوئے چلنا شروع کر دیتے اور اس حالت میں انہیں رکنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس وجہ سے
اظلم سے پہلے وہ لفظ ذکر کیا جو تکرار کا فائدہ نہیں دیتا۔ اور وہ اذا ہے، یہ صرف شرط اور جزاء کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔
قاموا کا لفظ اس جگہ وقفوا کے معنی میں ہے یعنی وہ رک جاتے ہیں یہ قعود کی ضد نہیں جس کا معنی بیٹھنا ہے بلکہ قاموا
کا معنی مطلقاً رک جانا ہے، اسی سے قامت السوق، اور قام الماء ہے۔ (بازار بے رونق ہو گیا، پانی جم گیا)

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَبْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ

"اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا"

لو حرف شرط ہے جو فعل ماضی پر داخل ہوتا ہے اور شاء اگرچہ فعل متعدی ہے لیکن اس کا مفعول عموماً محذوف ہوتا ہے اور اس
کے حذف پر جواب شرط دلالت کرتا ہے اسی طرح اراد فعل متعدی ہے لیکن اس کا بھی بکثرت مفعول محذوف ہوتا ہے یہاں تک
اگر کوئی ایسا مفعول نہ ہو جو عجیب و غریب معنی پر دلالت کرتا ہو تو ان دونوں کا مفعول بالکل ذکر نہیں کیا جاتا گویا ان کا مفعول کا
ذکر کرنا بہت کم ہے، قول شاعر،

فَلَوْ شِئْتُ أَنْ أَبْكِي دَمًا لَبَكَيْتُهُ

اگر میں (تیرے وصال پر) خون کے آنسوؤں رونا چاہتا تو رو سکتا تھا۔

خون کے آنسوؤں رونا نادر ہے اسی لئے ان ابکی دما ذکر کر دیا۔

لو حرف شرط میں سے ہے اور یہ اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے جزاء کے منشی ہونے کی وجہ سے شرط کے منشی ہونے
کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ بوجہ اس کے کہ جب لازم منشی ہوتا ہے تو ملزوم بھی منشی ہو جاتا ہے یہاں شرط یہ ہے کہ اگر اللہ کریم
چاہتا تو ان کی بصارت و سماعت سلب ہو جاتی تو ان تو توں کا سلب نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مشیت الہی اس کے متعلق نہیں
ہوئی۔

بعض قراء نے لذهب بسمعہم کو لا ذهب باسماعہم پڑھا ہے۔ اور اس میں باء کا اسی طرح اضافہ ہے جیسے اللہ کریم عز
وجل کے اس ارشاد گرامی میں،

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ.

ایدیکم سے پہلے بازائدہ ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں نہ پھینکو۔

زیر بحث آیت میں جملہ شرطیہ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ مانع ذکر کیا جائے جو ان کی بصارت و سماعت کو سلب کرنے

سے روک رہا ہے۔ حالانکہ انہیں سلب کرنے کے اسباب مہیا ہیں۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس بات پر متنبہ کیا جائے کہ اسباب کا مسببات میں مؤثر ہونا اللہ کریم کی مشیت کے ساتھ

مشروط ہے۔

اس کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ بات واضح کی جائے کہ مسببات کا وجود اسباب کے ساتھ مربوط ہونے کے باوجود اللہ کریم

کی قدرت کے بغیر واقع نہیں ہوتا یعنی ان کا واقع ہونا اللہ کریم کی قدرت کے تحت ہے اور ارشاد باری تعالیٰ،

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

اس کی تصریح اور تاکید کر رہا ہے۔

متن:

والشئ يختص بالوجود، لأنه في الاصل مصدر شاء أطلق بمعنى شاء تارة، وحينئذ يتناول البارء تعالى كما قال: قُلْ أَتَىٰ شَيْءٌ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ وَمَعْنَىٰ مَشَىٰ أُخْرَىٰ، أَيْ مَشَىٰ وَجُودُهُ وَمَا شَاءَ اللَّهُ وَجُودُهُ فَهُوَ موجودٌ فِي الْجَمَلَةِ وَعَلَيْهِ قَوْلُهُ تَعَالَىٰ: إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَهِيَ عَلَىٰ عَمُومِهَا بِلَا مَثْنَوِيَّةٍ. وَالْمَعْتَزَلَةُ لِمَا قَالُوا الشَّيْءُ مَا يَصِحُّ أَنْ يُوْجَدَ وَهُوَ يَعْمُ الْوَاجِبَ وَالْمُمْكِنَ، أَوْ مَا يَصِحُّ أَنْ يَعْلَمَ وَيَخْبُرَ عَنْهُ فَيَعْمُ الْمَبْتَنِعَ أَيْضًا، لَزِمَهُمُ التَّخْصِيصُ بِالْمُمْكِنِ فِي الْمَوْضِعَيْنِ بِدَلِيلِ الْعَقْلِ.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں اختلاف اس بات میں ہے کہ شئی لفظ کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کی وضاحت میں اشاعرہ کا موقف بیان کرتے ہیں کہ شئی کا اطلاق موجود کے ساتھ

خاص ہے کیونکہ شئی شاء یشاء کا مصدر ہے جو کبھی اسم فاعل بمعنی شاء استعمال ہوتا ہے۔ جس کا معنی وہ ذات ہے جس کے ساتھ مشیت اور ارادہ کا فعل قائم ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کا اطلاق باری تعالیٰ پر بھی ہوگا۔ جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے،

قُلْ أَتَىٰ شَيْءٌ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ (ای اللہ شئی شہید)

کیونکہ وہ ارادہ اور مشیت کی صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور کبھی لفظ شئی اسم مفعول مشئی کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ

ذات جس کے وجود کو چاہا جائے اور جس کے وجود کو اللہ کریم چاہے وہ موجود ہی ہوتی ہے۔ اور اللہ کریم کے یہ ارشاد اس معنی پر

دال ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ

یعنی اللہ کریم ہر چیز پر قادر ہے جس کے وجود کو وہ چاہے۔ اس معنی کے اعتبار سے دونوں آیات اپنے عموم پر ہوں گی اور

واجب الوجود اور محال اور متعین کو مستثنیٰ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ورنہ ان دونوں آیات کو ممکن کے ساتھ مقید کرنا پڑے گا، جو بلا ضرورت جائز نہیں۔

اور معتزلہ کا یہ کہنا ہے کہ شئی کا اطلاق اس ذات پر ہوگا جس کا پایا جانا صحیح ہو تو اس صورت میں شئی کا لفظ واجب اور ممکن دونوں کو شامل ہوگا۔ یا ان کے خیال کے مطابق اگر شئی سے مراد وہ ذات لی جائے جس کا علم حاصل کرنا اور خبر دینا صحیح ہو تو عقلی دلیل کے تقاضا کے مطابق ان دونوں آیات کو ممکن کے ساتھ خاص کرنا لازم ہوگا۔

متن:

والقدرة: هو التمكن من إيجاد الشيء. وقيل صفة تقتضي التمكن. وقيل قدرة الإنسان هيئة بها يتمكن من الفعل وقدرة الله تعالى: عبارة عن نفي العجز عنه. والقادر هو الذي إن شاء فعل وإن لم يشاء لم يفعل. والقدير الفعال لما يشاء على ما يشاء ولذلك قلما يوصف به غير الباري تعالى واشتقاق القدرة من القدر لأن القادر يوقع الفعل على مقدار قوته أو على مقدار ما تقتضيه مشيئته. وفيه دليل على أن الحادث حال حدوثه والممكن حال بقائه مقدوران وأن مقدور العبد مقدور لله تعالى لأنه شيء وكل شيء مقدور لله تعالى.

ترجمہ:

قدیر یہ مشتق ہے قدرت سے، اور قدرت کا معنی کسی چیز کو وجود عطا کرنے کا ممکن حاصل ہونا ہے بعض مفسرین کے نزدیک قدرۃ ایسی صفت کا نام ہے۔ جو ممکن و قدرت کا تقاضا کرتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسان کی قدرت اس ہیئت و کیفیت کو کہتے ہیں، جن سے وہ کسی فعل کو کرنے پر قادر ہوتا ہے اور اللہ کریم کی قدرت کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی کام کے کرنے سے عاجز نہیں اور نہ ہی اسے کسی کام کے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

قادر اور قدیر میں فرق:

لفظ قادر اور قدیر کے معنی میں فرق یہ ہے کہ قادر وہ ہوتا ہے جو اپنے اندازے کے مطابق جو چاہے اسے کر ڈالتا ہے اور اگر چاہے تو اسے نہ کرے اور قدیر یہ مبالغہ کا صیغہ ہے بروزن فعل جس کا معنی ہے بہت ہی زیادہ قدرت والا یعنی جو چاہے، جب چاہے، جس طرح چاہے اسے کر ڈالتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ کریم کی ذات کے علاوہ یہ کسی اور کی صفت بہت ہی کم واقع ہوتی ہے۔ اور یہ قدرت سے مشتق ہے جس کا معنی اندازہ لگانا ہے چونکہ قادر اپنی قوت اور اندازے کے مطابق کسی فعل کو واقع کرتا ہے یا جس کا اس کی مشیت تقاضا کرتی ہے اسی کی مقدار کے مطابق اس فعل کو انجام دیتا ہے اسی لئے اسے قادر کہتے ہیں۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حادث اپنی حالت حدوث میں اور ممکن اپنی حالت بقاء میں مقدر ہیں اور بندے کا مقدر اللہ کریم کا مقدر ہے کیونکہ یہ شیء ہے اور شیء اللہ کریم کی قدرت کے تحت ہے۔

متن:

والظاهر أن التمثيلين من جملة التمثيلات المؤلفة، وهو أن يشبه كيفية منتزعة من مجموع تضامات أجزاء وتلاصقت حتى صارت شيئاً واحداً بأخرى مثلها، كقوله تعالى: مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا الْآيَةَ، فإنه تشبيه حال اليهود في جهلهم بما معهم من التوراة، بحال الحبار في جهله بما يحمل من أسفار الحكمة. والغرض منها تمثيل حال المنافقين من الحيرة والشدة، بما يكابد من انطفأت ناره بعد إيقادها في ظلمة، أو بحال من أخذته السهائم في ليلة مظلمة مع رعد قاصف وبرق خاطف وخوف من الصواعق. ويمكن جعلها من قبيل التمثيل المفرد، وهو أن تأخذ أشياء فرادى فتشبهها بأمثالها كقوله تعالى:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وَقَوْلِ امْرِءِ الْقَيْسِ:

كَأَنَّ قُلُوبَ الطَّيْرِ رَطْبًا وَيَابِسًا... لَدَى وَكِرْهَا الْعَنَابُ وَالْحَشْفُ الْبَالِي

بأن يشبه في الاول: ذوات المنافقين بالمستوقدين، وإظهارهم الإيمان باستيقاد النار وما انتفعوا به من حقن الدماء وسلامة الاموال والاولاد وغير ذلك بإضاءة النار ما حول المستوقدين، وزوال ذلك عنهم على القرب بإهلا كههم وبإفشاء حالهم وإبقائهم في الخسار الدائم، والعذاب السرمد بإطفاء نارهم والذهاب بنورهم.

وفي الثاني: أنفسهم بأصحاب الصيب وإيمانهم المخالط بالكفر والخداع بصيب فيه ظلمات ورعد وبرق، من حيث إنه وإن كان نافعا في نفسه لكنه لها وجد في هذه الصورة عاد نفعه ضراً ونفاقهم حذراً عن نكايات المؤمنين، وما يترقون به من سواهم من الكفرة يجعل الاصابع في الاذان من الصواعق حذر الموت، من حيث إنه لا يرد من قدر الله تعالى شيئاً، ولا يخلص مما يريد بهم من المضار وتحيرهم لشدة الامر وجهلهم بما يأتون، ويندرون بأنهم كلما صادفوا من البرق خفقة انتهبوها فرصة مع خوف أن تخطف أبصارهم فخطوا خطي يسيرة، ثم إذا خفي وفتربعت بقوا متقيدين لا حراك

بہم. وقیل: شبه ایمان والقرآن وسائر ما أوتی الإنسان من المعارف التي هي سبب الحياة الابدية بالصيب الذي به حياة الارض. وما ارتكبت بها من شبه المبطلة. واعترضت دونها من الاعتراضات المشككة بالظلمات. وشبه ما فيها من الوعد والوعيد بالرعد، وما فيها من الآيات الباهرة بالبرق، وتصامهم عما يسمعون من الوعيد بحال من يهوله الرعد فيخاف صواعقه فيسد أذنيه عنها مع أنه لا خلاص لهم منها وهو معنى قوله تعالى: **وَاللَّهُ مُخِيطٌ بِالْكَافِرِينَ.**

واهتزازهم لما يلمع لهم من رشد يدر كونه، أو فرد تطيح إليه أبصارهم بمشيهم في مطرح ضوء البرق كلما أضاء لهم، وتخيرهم وتوقفهم في الامر حين تعرض لهم شبهة، أو تعن لهم مصيبة بتوقفهم إذا أظلم عليهم.

ونبه سبحانه بقوله: **وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ عَلَى أَنَّهُ تَعَالَى جَعَلَ لَهُم السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ لِيَتَوَسَّلُوا بِهَا إِلَى الْهُدَى وَالْفَلَاحِ، ثُمَّ إِنَّهُمْ صَرَفُوهَا إِلَى الْحُضُوظِ الْعَاجِلَةِ، وَسَدُّوهَا عَنِ الْفَوَائِدِ الْآجِلَةِ، وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ بِالْحَالَةِ الَّتِي يَجْعَلُونَهَا لَأَنْفُسِهِمْ، فَإِنَّهُ عَلَى مَا يَشَاءُ قَدِيرٌ.**

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں تشبیہات

مثلہم کمثل الذی استوقد ناراً

اور

کصیب من السماء... الخ

تمثیل مرکب کے قبیلہ سے ہیں اور تشبیہ مرکب ہوتی ہے جس سے متعدد امور سے اخذ کردہ مجموعہ کو اسی قسم کی متعدد اشیاء سے اخذ کردہ مجموعہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے جس طرح،

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ كَفَرُوا أَمْثَلُ الَّذِي يَأْتِيكُمُ الْفُلُّ فَأخذوا فيه أثقالاً ثقالاً

یہودی جن کو توراہ کا مکلف بنایا گیا تو انہوں نے اس پر عمل کرنے سے انحراف کیا وہ اس گدھے کی طرح ہیں جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے لیکن کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ یہاں پر یہود، تورات اور اس پر عمل نہ کرنا تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اور ہمارا اس پر کتابوں کا لادنا اور اس کا ان سے کوئی نفع نہ اٹھانا مشبہ بہ ہے، اس کو تمثیل اور تشبیہ مرکب کہتے ہیں۔

ان دونوں تمثیلات کا مقصد یہ ہے کہ منافقین کی حیرانگی، تردد اور شدت امر میں مبتلاء ہونے کی حالت کو اس آدمی کی

حالت کے ساتھ تشبیہ دی جائے جو آگ جلاتا ہے اور وہ اس کے ماحول کو روشن کر دیتی ہے پھر وہ اچانک بجھ جاتی ہے۔ اس اندھیرے اور ظلمت میں وہ جس پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہی حالت منافقین کی ہے اور دوسری تمثیل میں منافقین کو اس آدمی کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ٹار یک اور اندھیری رات میں چل رہا ہے، اس میں اس کو سخت گھسنے بادلوں نے آلیا ہو جن میں سخت قسم کی گرج، کڑک اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چمک بھی ہو اور اسی کڑک کی وجہ سے ہلاکت اور موت کا خوف بھی ہو، یہی حالت منافقین کی ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں تمثیلات مفرد تمثیل کے قبیلہ سے ہو اور مفرد تمثیل وہ ہوتی ہے جو کسی مفرد چیز کو مفرد کے ساتھ تشبیہ دی جائے مرکب چیزوں کے مجموعہ کو کسی دوسری چیز سے اخذ کردہ مجموعہ کے ساتھ تشبیہ نہ دی گئی ہو۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظُّلُّ وَلَا الْحُرُورُ

کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں ہوتے اور نہ ہی تاریکیاں اور نور برابر ہوتے ہیں اور نہ ہی سایہ اور دھوپ ایک

جیسے ہوتے ہیں۔

یہاں کافر کو اعمیٰ کے ساتھ اور مومن بصیر کے ساتھ، کافر کو تاریکیوں کے ساتھ ایمان کو نور کے ساتھ اور ثواب کو سایہ کے ساتھ اور کافر پر عذاب کو دھوپ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اسی طرح امراء اقیس جو کہ بہت بڑا فصیح و بلیغ شاعر تھا اس نے اپنے شعر میں تشبیہ دی ہے اس کا قول ملاحظہ ہو،

كأنَّ قلوبَ الطيرِ رطباً ويا بساً... لَدَىٰ و كِرْهَا العنَابُ والحشْفُ البَالِي

گویا شاہین کے گھونسلے کے ارد گرد تازہ شکار کر دیا، پرندوں کے دل جو عناب کی طرح ہیں اور باسی دل جو خشک ردی

کھور کے مانند ہیں، بکھرے پڑے ہیں۔

آیت کریمہ میں پہلی تشبیہ منافقین کی ذاتوں کو آگ جلانے والوں کے ساتھ اور مخلوط ایمان کے اظہار کو آگ کے روشن کرنے کے ساتھ اور جو انہوں نے جانوں کی حفاظت اور اموال کی سلامتی اور ان کے علاوہ منافع حاصل کئے ہیں۔ ان کو آگ جلانے والوں کے ماحول کو روشن ہونے کے ساتھ اور قریب ہی ان کی آگ کے بجھ جانے کو ان کی ہلاکت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور ان کے نفاق والی حالت کو ظاہر کرنے، ان کے دائمی خسارہ میں باقی رہنے کو اور ابدی عذاب میں مبتلا ہونے کو آگ کے بجھنے اور نور کے سلب ہونے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

اور دوسری آیت یعنی او کصیب من السماء... الخ

میں منافقین کے نفوس، اصحاب صیب اور ان کے کفر اور دھوکے کے ساتھ مخلوط ایمان کو ایسی بارش کے ساتھ تشبیہ دی گئی

ہے جس میں اندھیرے، گرج اور چمک ہو اس حیثیت سے کہ اگرچہ بارش بذات خود نفع کا باعث ہوتی ہے لیکن جب وہ اس صورت میں پائی جائے مذکور ہوئی۔ تو اس بارش کا نفع نقصان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور مومنین کی طرف سے انہیں دی جانے والی سزاؤں کے ڈر اور ان کے علاوہ انہیں جن تکالیف میں مبتلا کیا گیا ہے اور ان کے مومنین کے خوف نفاق، موت کے ڈر کو بادلوں کی کڑک کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ حالانکہ ان کو ایسا کرنا اللہ کریم کی تقدیر میں سے کسی چیز کو بھی ٹال نہیں سکتا، اور اگر وہ انہیں نقصان پہنچانا چاہے تو ان کا یہ بزدلانہ عمل انہیں نہ بچا سکتا ہے اور اس شدت امر کی وجہ سے ان کا حیران ہونا اور ان کا ان کاموں کے انجام سے بے خبر ہونا، جن کو وہ کرتے ہیں۔ یا جس کو وہ چھوڑتے ہیں، کو تشبیہ دی گئی اس بات کے ساتھ کہ جب بجلی چمکتی ہے تو اس کو غنیمت تصور کرتے ہیں حالانکہ انہیں یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں بجلی کی سخت چمک کی وجہ سے اچک لی جائیں گی۔ پس وہ چند ہی قدم چلتے ہیں اور جب بجلی کی چمک ختم ہوتی ہے تو وہ اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں جیسا کہ وہ مقید ہیں اور حرکت تک نہیں کرتے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ایمان، قرآن اور ان کے علاوہ جو بھی معارف انسان کو عطا کئے گئے ہیں جو حقیقت میں ابدی زندگی کے سبب ہیں، کو اس بارش کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کے ساتھ بنجر زمیں میں زندگی حاصل ہوتی ہے اور ہدایت قبول کرنے کے راستہ میں جو انہیں باطل شبہات اور شک میں ڈالنے والے اعتراضات لاحق ہوتے ہیں، ان ظلمات کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور قرآنی آیات میں جو وعدے اور وعیدیں ہیں، ان کو وعدے کے ساتھ اور جو اس میں واضح آیات ہیں، ان کو برق کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ان کا دانستہ ان وعیدوں کو سننے سے بہرہ ہونا، کو اس آدمی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کو بادل کی کڑک خوفزدہ کر دیتی ہے اور اسے بجلی کی وجہ سے ہلاکتوں کا خوف بھی ہوتا ہے اس وجہ سے وہ اپنے کان بند کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان ہلاکتوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی انہیں کوئی امید بھی نہیں ہوتی۔ اور اللہ کریم کے فرمان کا یہی معنی ہے۔

وَاللَّهُ مُخِيطٌ بِالْكَافِرِينَ.

اور اللہ کریم اپنے علم کے ساتھ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

اور جب ان کے لئے بجلی چمکتی ہے نفع اور عطیہ کے حصول میں وہ آگے بڑھتے ہیں اور للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہیں ان کی اس حالت کو اس آدمی کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بارش میں بجلی کے پڑنے کی جگہ میں چلنے لگتا ہے۔ اور جب انہیں دین کے معاملہ میں شبہات لاحق ہوتے ہیں یا انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے جس کی وجہ سے وہ حیران ہوتے ہیں اور توقف کرتے ہیں۔ اس کو اندھیرا چھانے کی وجہ سے ان کے توقف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

تشبیہ:

اللہ کریم نے اپنے اس ارشاد گرامی کے ساتھ اس بات پر تمبیہ فرمائی ہے، کہ اس نے کان اور آنکھیں انہیں اس لئے عطا فرمائیں تھیں۔ کہ وہ انہیں فلاح اور ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے لیکن انہوں نے ان کو دنیاوی نعمتوں کے حصول کی

طرف پھیر دیا اور آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے حصول سے انہیں روک دیا اور اگر اللہ کریم چاہتا تو انہیں اس حالت میں کر دیتا جو انہوں نے خود اپنے لئے تیار کر لیں۔ کیونکہ اللہ کریم ہر اس چیز پر قادر ہے جسے وہ چاہتا ہے۔

کاد کی تحقیق:

(کود) کاد (س)

فعل مقارب ہے یعنی کسی فعل کے قریب الوقوع ہونے کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے مثلاً کاد يفعل قریب تھا وہ اس کام کو گزرتا یعنی کرنے والا تھا مگر کیا نہیں قرآن میں

"لَقَدْ كِدْتُمْ تَرَ كُنَّ إِلَيْهِمْ شَيْئاً قَلِيلاً" (سورة الإسراء آیت نمبر 74)
تو تم کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے۔

"وَأَنْ كَادُوا يَفْتِنُونَكَ" (سورة الاسراء آیت نمبر 73)
اور وہ تو قریب تھا کہ تمہیں کچھ لغزش دیتے۔

"تَكَادُ السَّمَاوَاتُ" (سورة مریم آیت نمبر 90)
قریب ہے کہ (اس فتنہ) سے آسمان پھٹ پڑیں؛

"يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ" (سورة البقرة آیت نمبر 20)
بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی۔

"يَكَادُونَ يَسْطُونَ" (سورة الحج آیت نمبر 72)
قریب ہے کہ لپٹ پڑیں۔

"إِنْ كِدْتُمْ لَتُؤَدِّبُنَّ" (سورة الصافات آیت نمبر 56)
کہا خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دے۔

اور اگر ان کے ساتھ حرف نفی آجائے تو اثباتی حالت کے برعکس فعل وقوع کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے جو وقوع کے قریب نہ ہو اور حرف نفی اس پر مقدم ہو یا متاخر دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ" (سورة البقرة آیت نمبر 71)
اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔

"لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ" (سورة النساء آیت نمبر 78)
کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اور کاد کے بعد ان کا استعمال صرف ضرورت شعری کے لئے ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

قد کاد من طول البلی ان یمصحا
 قریب تھا کہ زیادہ بوسیدہ گی کے باعث وہ مٹ جائے۔

خطف کی تحقیق:

(خ ط ف) خطف یخطف خطفا و اختطف اختطافا

کے معنی کسی چیز کو سرعت سے اچک لینا کے ہیں۔ یہ باب (س ض) دونوں سے آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"إِلَّا مَنْ خَطَفَ الْخَطْفَةَ" (سورۃ صافات آیت نمبر 10)

مگر جو ایک آدھ بار اچک لے چلا۔

ظاہر فتح اور کسرہ دونوں منقول ہیں اور اس سے مراد وہ شیاطین ہیں جو چوری چھپے ملا اعلیٰ کی گفتگو سنا کرتے تھے۔

نیز فرمایا: "فَتَخَطَفُهُ الظَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ" (سورۃ الحج آیت نمبر 31)

پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

"يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں (کی بصارت) کو اچک لے جائے۔

"وَيَتَخَطَفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 67)

اور لوگ ان کے گرد نوان سے اچک لئے جاتے ہیں۔

یعنی ان کے گرد نوان میں تھمتھمت کا سلسلہ جاری ہے۔

(1) ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ جو پرواز کرنے میں کسی چیز کو جھپٹ لیتا ہے۔

(2) آہن کج جس کے ذریعے کنوئیں سے ڈول نکالا جاتا ہے گویا وہ ڈول کو اچک کر باہر لے آتا ہے۔

(3) وہ لوہا جس پر کنوئیں کی چرغی گھومتی ہے۔ خطاطیف باز مخطف۔ باز جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ الخطیف۔ تیز

رقاری۔ الخطف الحشاو مختطفتمہ مرد باریک شکم جس کے وبلا پن کی وجہ سے ایسا معلوم ہو کہ اس کی انٹریاں اچک لی گئی ہیں۔

تشبیہ:

لفظ بصر کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

مفہوم ضوء:

(ضوء) (ضوء)۔ (Light, Lamp)

کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضائت النار و ضائت: آگ روشن ہوگئی اور ضائت (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی آتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں ہے: "أَفَلَيْتَ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 17)
جب آگ نے اس کے ارد گرد کی چیزیں روشن کر دیں۔

"كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

"يَأْتِيَكُمْ بِضِيَاءٍ" (سورۃ القصص آیت نمبر 71) جو تم کو روشنی لادے۔

اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہیں ضیاء سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ تورات سے متعلق

فرمایا:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرَ الْاَلْمُتَّقِينَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

"وَذِكْرَ الْاَلْمُتَّقِينَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

اور بیشک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اجالا اور پرہیزگاروں کو نصیحت۔

مشی کا معنی:

(مشی) المشی (ج) (To walk, To move)

کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف قصد اور ارادہ کے ساتھ منتقل ہونے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:

"كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

"فِيئَهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَى بَطْنِهِ" (سورۃ النور آیت نمبر 45)

ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔

"يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 63)

جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

"فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا" (سورۃ الملک آیت نمبر 15) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور کنایہ مشی کا لفظ چمکی کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"هَمَّازٌ مَشَاءٍ بِنَمِيمٍ" (سورۃ القلم آیت نمبر 11)

بہت طعنے دینے والا بہت ادھر کی ادھر لگاتا پھرنے والا۔

اور کنایہ کے طور پر مثنیٰ کے معنی سہل پینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: شربت مشیا و مشوا میں نے سہل دوا پی الماشیة موشی یعنی بھیڑ بکری کے ریوڑ کو کہتے ہیں اور امراة ماشیة اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے بہت ہوں۔

نوٹ:

اذا، لو اور ظلم کی تفصیل گزر چکی ہے۔

شنی کی عمدہ تحقیق:

(ش ی ء) الشیعی

المشیئة اکثر متکلمین کے نزدیک مشیت اور ارادہ ایک ہی صفت کے دو نام ہیں لیکن بعض کے نزدیک دونوں میں فرق

ہے۔

(۱) مشیت کے اصل معنی کسی چیز کی ایجاد یا کسی چیز کو پالنے کے ہیں۔ اگرچہ عرف میں مشیت ارادہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی مشیت کے معنی اشیاء کو موجود کرنے کے ہیں اور لوگوں کی مشیت کے معنی کسی چیز کو پالنے کے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو چاہنا چونکہ اس کے وجود کو مقتضی ہوتا ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ ماشاء اللہ کان و مالہ تشألم یکن کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا ارادہ کرنا اس کے حتمی وجود کو نہیں چاہتا چنانچہ قرآن میں ہے:

"يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمْ الْعُسْرَ" (سورة البقرة آیت نمبر 185)

اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔

"وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلْمًا لِّلْعِبَادِ" (سورة مؤمن آیت نمبر 40)

اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں چاہتا۔

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں میں عسرة اور ظلم پائے جاتے ہیں۔

(۲) اور ارادہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کا ارادہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر ہو سکتا ہے مثلاً انسان چاہتا ہے کہ اسے

موت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مار لیتا ہے۔ لیکن مشیت انسانی مشیت الہی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی جیسے فرمایا:

"وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ" (سورة الدھر آیت نمبر 30)

اور تم کیا چاہو مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

ایک روایت ہے کہ جب آیت: "لَئِنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ" (سورة التکویر آیت نمبر 28)

اس کے لئے جو تم میں سیدھا ہونا چاہے۔

نازل ہوئی تو کفار نے کہا ہے یہ معاملہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہیں تو استقامت اختیار کریں اور چاہیں تو انکار کر دیں اس پر آیت کریمہ۔

"وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ"

نازل ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال اس پر معلق اور منحصر نہ ہوتے تو لوگ تمام افعال انسانیہ میں انشاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ قرآن میں ہے:

"سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ" (سورة الصافات آیت نمبر 102)

خدا نے چاہا تو قریب ہے کہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔

"قَالَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا" (سورة الكهف آیت نمبر 69)

کہا عنقریب اللہ چاہے تو تم مجھے صابر پاؤ گے۔

"يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ" (سورة قهود آیت نمبر 33)

اگر اس کو خدا چاہے گا تو نازل کرے گا۔

"ادْخُلُوا مِصْرًا إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ" (سورة يوسف آیت نمبر 99)

مصر میں داخل ہو اللہ چاہے تو امان کے ساتھ،

"قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ" (سورة الاعراف آیت نمبر 188)

تم فرماؤ میں اپنی جان کے بھلے بُرے کا خود مختار نہیں مگر جو اللہ چاہے۔

"وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا" (سورة الاعراف آیت نمبر 89)

اور ہم مسلمانوں میں کسی کا کام نہیں کہ تمہارے دین میں آئے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

"وَلَا تَقُولَنَّ لِيْ شَيْءٌ اِئْتِيْ فَاِعْلُ ذَلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللَّهُ" (سورة الكهف آیت نمبر 24)

اور ہرگز کسی بات کو نہ کہنا کہ میں کل یہ کر دوں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

تنبیہ:

سمع اور ذہب کا ذکر ہو چکا ہے۔

ان اور ان کی تحقیق:

(ان حرف) ان وان

(حرف) یہ دونوں اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ ان جملہ مستقل پر آتا ہے اور ان کا مابعد

ایسے مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو اسم مرفوع، منصوب اور مجرور کی جگہ پر واقع ہوتا ہے جیسے اعجبنی انک تخرج و عجبیت انک تخرج اور تعجب من انک تیخرج جب ان کے بعد ما (کافہ) آجائے تو یہ عمل نہیں کرتا اور کلمہ حصر کے معنی دیتا ہے۔
فرمایا:

"إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 28) مشرک زرعے ناپاک ہیں۔

یعنی نجاست تامہ تو مشرکین کے ساتھ مختص ہے۔ نیز فرمایا:

"إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالذَّمَّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 173)

اس نے یہی تم پر حرام کئے ہیں مردار اور خون۔

یعنی مذکورہ اشیاء کے سوا اور کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا اس میں تشبیہ ہے کہ معلومات میں سے جو چیزیں اصول شریعت میں

حرام ہیں ان میں سے یہ چیزیں سب سے بڑھ کر ہیں۔

(أَنْ) یہ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے:

(1) أَنْ مصدریہ۔

یہ ماضی اور مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے اور اس کا مابعد تاویل مصدر میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضارع کو

نصب دیتا ہے جیسے:

اعجبنی ان تخرج وان خرجت۔ ان المخففہ من المثقلۃ یعنی وہ ان جو ثقیلہ سے خفیفہ کر لیا گیا ہو (یہ کسی شے کی تحقیق

اور ثبوت کے معنی دیتا ہے جیسے۔ اعجبنی ان زید منطلق ان (زانکہ) جو لما کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا،

"فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 96)

جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا۔

(2) أَنْ مفسرہ۔

یہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جو قول کے معنی پر مشتمل ہو، خواہ وہ لفظ ہو یا معنی جیسے فرمایا:

"وَأَنْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ" (سورۃ ص آیت نمبر 6)

اور ان کے سردار چلے کہ اس کے پاس سے چل دو۔

ان امشوا اور ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو،

یہاں ان امشوا، قالوا کے معنی کو متضمن ہے ان کی طرح یہ بھی چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ ان شرطیہ جیسے فرمایا:

"إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ" (سورۃ السائدۃ آیت نمبر 118)

اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔

ان مخففہ جو ان ثقیلہ سے مخفف ہوتا ہے (یہ تاکید کے معنی دیتا ہے اور) اس کے بعد لام (مفتوح) کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا:

"إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 42)
(تو) یہ ضرور ہم کو بہکا دیتا ہے۔

(3) ان نافیہ

اس کے بعد اکثر الآتا ہے جیسے فرمایا: "إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا" (سورۃ المجاہدۃ 32)
ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔

"إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ" (سورۃ المدثر آیت نمبر 25)
یہ نہیں مگر آدمی کا کلام۔

"إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ" (سورۃ ہود آیت نمبر 54)

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے۔ ان (زانہ) جو (ما) نافیہ کی تاکید کے لئے آتا ہے جیسے: ما ان یخرج زید۔ زید باہر نہیں نکلے گا۔
شئی کی بعض کے نزدیک تعریف:

(ش ی ء) الشئی

بعض کے نزدیک شئی وہ ہوتی ہے جس کا علم ہو سکے اور اس کے متعلق خبر دی جاسکے اور اس کے متعلق خبر دی جاسکے اور اکثر متکلمین کے نزدیک یہ اسم مشترک ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ماسوا پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور موجودات اور معدوم سب کو شے کہہ دیتے ہیں۔

قدیر کسے کہتے ہیں؟

القدیر (Power full)

اسے کہتے ہیں جو اقتضائے حکمت کے مطابق جو چاہے کر سکے اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دے۔ لہذا اللہ کے سوا کسی کو قدیر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن میں ہے:

اور وہ جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر قادر ہے۔

اور یہی معنی تقریباً مقتدر کے ہیں جیسے فرمایا:

"عِنْدَ مَلِيكَ مُقْتَدِرٍ" (سورۃ القمر آیت نمبر 55)

ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔

”قَالَا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُونَ“ (سورۃ الزمر آیت نمبر 42) ہم ان پر قابو رکھتے ہیں۔

لیکن مقتدر کے ساتھ کبھی انسان بھی متصف ہو جاتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق مقتدر کا لفظ استعمال ہو تو یہ قدیر کے ہم معنی ہوتا ہے اور جب انسان کا وصف واقع ہو تو اس کے معنی تکلیف سے قدرت حاصل کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے:

قدرت علی کذا قدرة کہ میں نے فلاں چیز پر قدرت حاصل کر لی۔

قرآن مجید میں ہے: (اسی طرح یہ ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ نہیں لے سکیں گے۔

[سورة البقرة (2) : آية 21]

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (21)

”اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے انگوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔“

متن:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ

لما عدد فرق المكلفين وذکر خواصهم ومصارف أمورهم، أقبل عليهم بالخطاب على سبيل الالتفات هزاً للسامع وتنشيطاً له واهتماماً بأمر العبادۃ، وتفخيماً لشأنها، وجبراً لكلفة العبادۃ بلذۃ المخاطبة. و (يا) حرف وضع لنداء البعيد، وقد ينادى به القريب تنزيلاً له منزلة البعيد، إما لعظمته كقول الداعي: يا رب، ويا الله، هو أقرب إليه من جبل الوريد، أو لغفلته وسوء فهمه، أو للاعتناء بالمدعو له وزيادة الحث عليه. وهو مع المنادى جملة مفيدة، لأنه نائب مناب فعل. وأى: جعل وصلة إلى نداء المعروف باللام، فإن إدخال «يا» عليه متعذر لتعدد الجمع بين حرفي التعريف فإنهما كبثلين وأعطى حكم المنادى وأجرى عليه المقصود بالنداء وصفاً موضعاً له، والتزام رفعه إشعاراً بأنه المقصود، وأقمت بينهما هاء التنبيه تأكيداً وتعويضاً عما يستحقه، أى من المضاف إليه، وإنما كثر النداء على هذه الطريقة في القرآن لاستقلاله بأوجه من التأكيد، وكل ما نادى الله له عبادة من حيث إنها أمور عظام، من حقها أن يتفطنوا إليها، ويقبلوا بقلوبهم عليها، وأكثرهم عنها غافلون، حقيق بأن ينادى له بالأكد

الابلغ والجموع وأسمائها المحلاة باللام للعبوم حيث لا عهد ويدل عليه صفة الاستثناء منها. أو التأكيد بما يفيد العبوم كقوله تعالى:

فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ

واستدلال الصحابة بعبومها شائعاً وذائعاً، فالناس يعم الموجودين وقت النزول لفظاً ومن سيوجد، لما تواتر من دينه عليه الصلاة والسلام أن مقتضى خطابه وأحكامه شامل للقبيلين، ثابت إلى قيام الساعة إلا ما خصه الدليل.

ترجمہ:

اللہ کریم نے ماقبل آیات میں ان فرقوں کا ذکر کیا جن کو احکام کا مکلف بنایا جاتا ہے، اور ان کی خصوصیات اور امور کا ذکر کیا تو بطور التفات اس آیت میں ان کی طرف خطاب کے صیغوں کے ساتھ توجہ فرمائی تاکہ سننے والے کو تمبیہ اور خوشی دی جائے اور عبادت کی اہمیت کو ظاہر کیا جائے اور اس کی عظمت شان کو بیان کیا جائے۔ اور بوجہ عبادت مشقت کو کو لذت و خطاب کے ساتھ مکمل کرنے کے لئے یا یہاں الناس سے خطاب فرمایا۔

یا حرف نداء منادئی بعید کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اور کبھی منادئی قریب کو منادئی بعید کی جگہ رکھ کر اس کے ساتھ بھی اسے نداء کی جاتی ہے۔ منادئی قریب کو منادئی بعید کی جگہ رکھنے کی مندرجہ ذیل چند وجوہات ہیں۔

☆ اس کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے جیسا کہ دعا کے موقع پر کہا جاتا ہے، یا رب، یا اللہ جبکہ اللہ کریم دعا کرنے والے کی شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

☆ منادئی کے سوء فہم اور غفلت کی وجہ سے۔

☆ مدعولہ (جس کی طرف نداء کی جاتی ہے) کی اہمیت ظاہر کرنے اور کام کرنے پر ابھارنے کے لئے اسے بعید کے

قائم مقام رکھا جاتا ہے۔

جب حرف نداء اپنے منادئی کے ساتھ ملتا ہے تو جملہ مفیدہ ہوتا ہے۔ بوجہ فعل کے قائم مقام ہونے کے، جو ادعوا

ہے۔ منادئی اس فعل محذوف کا مفعول بہ ہوتا ہے جیسے یا زید معنی ادعوزیداً ہے۔ اور ای کے لفظ کو منادئی معرف باللام کے ندا

کرنے کا وسیلہ بنایا جاتا ہے، کیونکہ منادئی معرف باللام بغیر کسی فاصلہ کے حرف نداء پر داخل کرنا صحیح ہوتا ہے کیونکہ اگر حرف

نداء اور منادئی معرف باللام کے درمیان فاصلہ نہ ہو تو دو اداة تعریف جمع ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی مقصد کے لئے دو اداة

تعریف جمع کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس طرح تحصیل حاصل لازم آتا ہے، جو کہ ناجائز ہے۔ اور لفظ ای کو منادئی کا حکم دیا جاتا

ہے۔ اور مقصود بالنداء کو اسی پر محمول کیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ شعور دلایا جائے کہ گویا مقصود بالنداء یہی ہے۔ اور منادئی معرف باللام

کو بحیثیت صفت موصحہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور لفظ ای کو رفع دیا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ حقیقت میں مقصود بالنداء یہی

ہے۔ اور حرف نداء اور منادئی کے درمیان ہاء کا لفظ بطور تشبیہ تاکید کے لئے لایا جاتا ہے۔ اور ای کا لفظ چونکہ مضاف الیہ کا مستحق ہوتا ہے یہ حرف تشبیہ اس کا عوض ہو جائے۔ اور ہر وہ حکم جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اللہ کریم اپنے بندوں کو نداء کرتا ہے۔ قرآن میں اکثر یہی انداز اختیار کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ امور جو بہت ہی عظیم ہوتے ہیں ان کا حق یہ ہوتا ہے، وہ انہیں سمجھا جائے اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف متوجہ کیا جائے۔ حالانکہ اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں اس لئے یہ چیز اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اس کو اسی طرح بلیغ اور مؤکد انداز کے ساتھ ندا کی جائے۔

متن:

وما روى عن علقمة والحسن أن كل شيء نزل فيه يا أيها الناس فمكى ويا أيها الذين آمنوا فمدنى، إن صح رفعه فلا يوجب تخصيصه بالكفار، ولا أمرهم بالعبادة، فإن البأمر به هو القدر المشترك بين بدء العبادة، والزيادة فيها، والمواظبة عليها، فالمطلوب من الكفار هو الشروع فيها بعد الإتيان بما يجب تقديمه من المعرفة والإقرار بالصانع، فإن من لوازم وجوب الشيء وجوب ما لا يتم إلا به، وكما أن الحدث لا يمنع وجوب الصلاة، فالكفر لا يمنع وجوب العبادة، بل يجب رفعه والاشتغال بها عقبيه. ومن المؤمنين ازديادهم وثباتهم عليها وإنما قال: رَبَّكُمْ تنبيهاً على أن الموجب للعبادة هي الربوبية.

ترجمہ:

اور حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جو روایت کی گیا کہ قرآن مجید ہر وہ آیت جس میں یا ایہا الناس کے ساتھ خطاب کیا گیا، وہ سورۃ مکی ہے۔ اور جس میں یا ایہا الذین آمنوا کے ساتھ خطاب ہے، وہ مدنی ہے۔ تو پھر یہ حکم بعد میں آنے والوں کو کیسے شامل ہوگا؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اگر اس روایت کا مرفوع ہونا بھی ثابت ہو جائے تو یہ اس حکم کو کفار کے ساتھ خاص کرنے کا موجب نہیں بنتا اور نہ ہی عبادت کے حکم کی تخصیص کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ جس حکم پر عمل پیرا ہونے کا حکم فرمایا ہے وہ قدر مشترک ہے۔ جو عبادت کے ابتداء کرنے، اس میں اضافہ کرنے اور اس پر ہمیشگی کرنے کو شامل ہے۔ توجب کفار کو یہ خطاب ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان چیزوں کو تسلیم کریں جن کا عبادت کرنے سے پہلے اپنا نالازم ہے۔ یعنی وہ پہلے ایمان لائیں، اس کے بعد عبادت کو اپنائیں کیونکہ کسی چیز کے وجوب کے لوازمات سے ہے کہ جس کے بغیر وہ چیز مکمل نہ ہو تو وہ بھی واجب ہوتی ہے۔ جس طرح حدث کا لاحق ہونا وجوب صلوة کے منافی نہیں۔

لہذا معلوم ہوا کہ کفر عبادت کے وجوب کے مانع نہیں، بلکہ پہلے کفر کو دور کیا جائے۔ اور اس کے بعد عبادت میں مشغول ہوا جائے، تو اس اعتبار سے مومنین سے یہ مطلوب ہوگا کہ وہ اپنی عبادت میں اضافہ کریں اور وہ اس بات پر ڈٹے رہیں۔ یہاں اللہ کریم نے ربکم کا لفظ ذکر کیا ہے یہ اس بار پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ تربیت، عبادت کے واجب ہونے کی علت ہے۔

متن:

الَّذِي خَلَقَكُمْ

صفة جَرَتْ عَلَيْهِ تَعَالَى لِلتَّعْظِيمِ وَالتَّعْلِيلِ، وَيَحْتَمِلُ التَّقْيِيدَ وَالتَّوْضِيحَ إِنْ خَصَّ الْخُطَابَ بِالْمُشْرِكِينَ، وَأُرِيدَ بِالرَّبِّ أَعْمَ مِنَ الرَّبِّ الْحَقِيقِيِّ، وَالْأَلِهَةِ الَّتِي يَسْمُونَهَا أَرْبَابًا. وَالْخَلْقُ إِيجَادُ الشَّيْءِ عَلَى تَقْدِيرٍ وَاسْتِوَاءٍ، وَأَصْلُهُ التَّقْدِيرُ يُقَالُ: خَلَقَ النَّعْلَ إِذَا قَدَرَهَا وَسَوَاهَا بِالْمِقْيَاسِ.

وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ مَتَنَاوَلْ كُلُّ مَا يَتَقَدَّمُ الْإِنْسَانَ بِالذَّاتِ أَوْ بِالزَّمَانِ. مَنْصُوبٌ مَعْطُوفٌ عَلَى الضَّمِيرِ الْمَنْصُوبِ فِي خَلَقَكُمْ. وَالْجَمَلَةُ أُخْرِجَتْ مَخْرَجَ الْمَقْرَرِ عِنْدَهُمْ، إِمَّا لِاعْتِرَافِهِمْ بِهِ كَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ

أَوْ لِتَمَكُّنِهِمْ مِنَ الْعِلْمِ بِهِ بِأَدْنَى نَظَرٍ! وَقَرَأْ مِنْ قَبْلِكُمْ عَلَى إِقَامِ الْبُوصُولِ الثَّانِي بَيْنَ الْأَوَّلِ وَصَلْتِهِ تَأْكِيدًا، كَمَا أَتَى جَرِيرٌ فِي قَوْلِهِ:

يَا تَيْمَ تَيْمَ عُدِّي لَا أَبَا لَكُمْو تَيْمًا، الثَّانِي بَيْنَ الْأَوَّلِ وَمَا أُضِيفَ إِلَيْهِ.

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ حَالٌ مِنَ الضَّمِيرِ فِي اعْبُدُوا كَأَنَّهُ قَالَ: اعْبُدُوا رَبَّكُمْ رَاجِينَ أَنْ تَنْخَرِطُوا فِي سَلَكِ الْمُتَّقِينَ الْفَائِزِينَ بِالْهُدَى وَالْفَلَاحِ، الْمَسْتُوجِبِينَ جِوَارِ اللَّهِ تَعَالَى. نَبَهَ بِهِ عَلَى أَنَّ التَّقْوَى مِنْهُيْ دَرَجَاتِ السَّالِكِينَ وَهُوَ التَّبَرُّيُّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سِوَى اللَّهِ تَعَالَى إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْعَابِدِينَ يَنْبَغِي أَنْ لَا يَغْتَرَّ بِعِبَادَتِهِ، وَيَكُونُ ذَا خَوْفٍ وَرَجَاءٍ قَالَ تَعَالَى:

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا يَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ.

أَوْ مِنْ مَفْعُولِ خَلَقَكُمْ وَالْمَعْطُوفِ عَلَيْهِ عَلَى مَعْنَى أَنَّهُ خَلَقَكُمْ وَمِنْ قَبْلِكُمْ فِي صُورَةٍ مِنْ يَرْجَى مِنْهُ التَّقْوَى لِتَرْجَحَ أَمْرُهُ بِاجْتِمَاعِ أَسْبَابِهِ، وَكَثْرَةِ الدَّوَاعِي إِلَيْهِ. وَغَلَبَ الْبِخَاطِبِينَ عَلَى الْغَائِبِينَ فِي اللَّفْظِ، وَالْمَعْنَى عَلَى إِرَادَتِهِمْ جَمِيعًا. وَقِيلَ تَعْلِيلٌ لِلْخَلْقِ أَيْ خَلَقَكُمْ

لَٰكِن تَتَّقُوا كَمَا قَالَ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. وَهُوَ ضَعِيفٌ إِذْ لَمْ يَثْبُتْ فِي اللِّغَةِ مِثْلَهُ.

والآية تدل على أن الطريق إلى معرفة الله تعالى والعلم بوحدهائيته واستحقاقه للعبادة، النظر في صنعه والاستدلال بأفعاله، وأن العبد لا يستحق بعبادته عليه ثواباً، فإنها لما وجبت عليه شكر ألبا عددة عليه من النعم السابقة فهو كأجير أخذ الاجر قبل العمل.

ترجمہ:

الَّذِي خَلَقَكُمْ.... الخ

یہ صفت مادہ ہے، ربکم کی۔ اور اس کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم کی عظمت اور عبادت کے حکم کی علت کو بیان کیا جائے۔ اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ربکم کی صفت مقید یا صفت موصحہ ہو، بشرطیکہ خطاب مشرکین کے ساتھ خاص ہو۔ اور رب سے اعم معنی مراد لیا جائے اور لفظ رب سے حقیقی رب مراد نہ ہو کیونکہ مشرک بھی اپنے باطل معبودوں کو بھی رب کہا کرتے تھے۔ اس لئے الذی خلقکم کی صفت نے ربکم کو رب حقیقی کے ساتھ خاص کر دیا۔

خَلَقَ يَه خَلَقَ سے مشتق ہے جس کا مطلب کسی چیز کو اندازہ کے مطابق صحیح اور برابر وجود عطا کرنا، خلق کا لغوی معنی اندازہ لگانا ہے۔ اور جب کوئی آدمی جو تا اندازے سے بنائے اور اس کے بعد اس کو فریم میں رکھ کر درست کر دے تو کہتے ہیں کہ خلق النعل، اس نے جو تا اندازے کے ساتھ برابر بنا دیا۔

اس کے بعد فرمایا: وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

کہ اس نے ان کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

آیت کریمہ کا یہ حصہ ان تمام اشیاء کو شامل ہے جو ذات اور زمانہ کے اعتبار سے ارواح اور مزاج مقدم ہیں اور زمانہ کے اعتبار سے آسمان، آباء، امہات اور زمین وغیرہ مقدم ہیں۔ اور

وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

کی ضمیر منصوب متصل پر معطوف کرنے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس جملہ کا ذکر کرنا اس اعتبار سے ہے کہ مشرکین خود اعتراف کرتے ہیں کہ آسمان و زمین ان کا خالق حقیقی اللہ کریم ہی ہے۔

فرمایا: وَلَمَّا سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لِيَقُولُنَّ اللَّهُ (سورۃ الزحرف آیت نمبر 87)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔

یا اس اعتبار سے ذکر کیا کہ وہ تھوڑا سا غور و فکر کرنے سے، اس کا علم و عمل حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور اس کو

الذی من قبلکم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ دریں صورت اسم موصول مقم ہوگا۔ جو پہلے اسم موصول اور اس کے صلہ کے درمیان تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ جریر نے اپنے شعر میں تیم کا لفظ مقم کر دیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

يَا تيمه تيمه عُدِّي لا ابا لكم تيماً، الثاني بين الاول وما اضيف اليه

دوسرا تیم پہلے تیم اور اس کے مضاف الیہ کے درمیان مقم ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ...

یہ حال ہے، اعبدوا کی ضمیر مرفوع متصل سے، جو فاعل ہے۔ گویا اللہ کریم نے یوں ارشاد فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ اس حال میں کہ تمہیں یہ امید ہو کہ وہ تمہیں ہدایت اور فلاح کے ساتھ کامیاب ہونے والے متقین میں شامل کر دے۔ وہ متقین جو اللہ کریم کے حریم قدس کے مستحق ہیں اور اس آیت کے ساتھ اللہ کریم نے متنبہ کیا ہے کہ سالکین کے درجات کی انتہاء تقویٰ ہے اور یہ وہ درجہ ہے کہ وہ اللہ کریم کے علاوہ ہر چیز سے براءت کرتے ہوئے اسی کی جناب میں پناہ حاصل کریں۔ اور یہ اس بات پر بھی تشبیہ ہے کہ عابد کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنی عبادت پر نازاں نہ ہو جائے اور خوف ورجا کی کیفیت کو اپنائے جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ وہ خوف اور لالچ سے اپنے رب کی بارگاہ میں التجاء کرتے ہیں۔ اس حال میں کہ وہ اپنے رب کریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے۔ اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اور یا یہ خلقکم کے مفعول اور جس کا اس پر عطف ہے اس سے حال ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو ایسی ذات کی صورت میں پیدا فرمایا ہے۔ جس سے تقویٰ کی امید کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ تقویٰ کے اسباب جمع ہونے کی وجہ سے اور اس کی طرف دعوت دینے والوں کی کثرت کی وجہ سے اس کا معاملہ رائج ہے۔ اور یہاں لفظ اور معنی کے اعتبار سے مخاطبین کو غائبین پر غلبہ دیا گیا ہے۔ اس ارادہ سے کہ یہ خطاب سب کو شامل ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ لعلکم تتقون یہ خلقکم فعل کی علت بیان کر رہا ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں

بیان کیا گیا ہے، سورة الذاریات آیت نمبر 56 میں ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (سورة الذاریات آیت نمبر 56)

اور میں نے جن اور آدمی اتنے ہی اسی لئے بنائے کہ میری بندگی کریں۔

لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ لغت میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ کریم کی معرفت اور وحدانیت کے علم کا اور اس کے عبادت کے مستحق ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی صنعت میں غور و فکر کیا جائے اور اس کے افعال سے دلیل قائم کی جائے۔ مزید اس بات کی دلالت بھی واضح ہے کہ بندہ اپنی عبادت کی وجہ سے کسی قسم کے ثواب کا مستحق نہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے عبادت کرنے سے پہلے جو نعمتیں عطا کیں اس کا شکر ادا کرنا اس پر واجب ہے تو گویا اس کی حیثیت اس مزدور جیسی ہے جس نے قبل از مزدوری اجرت وصول کر لی ہو۔ بلکہ یہ تو صرف اور صرف اللہ کا فضل ہے کہ وہ اپنے

بندوں کو بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے۔

خلق کا معنی:

(خلق) الخلق (People, Mankind)

اصل میں خلق کے معنی کسی چیز کو بنانے کے لئے پوری طرح اندازہ لگانا کے ہیں۔ اور کبھی خلق بمعنی ابداع بھی آجاتا ہے یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی کی تقلید کے پیدا کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

"خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ" (سورة الانعام آیت نمبر ۱)

اسی نے آسمانوں اور زمین کو جہنی برحمت پیدا کیا۔

اس میں خلق بمعنی ابداع ہی ہے

تحقیق لعل:

(لعل) لعل

(حرف) یہ طمع اور اشفاق (دڑتے ہوئے چاہنے) کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ اپنے لئے استعمال کرنے تو اس کے معنی میں قطعیت آجاتی ہے اس بنا پر بہت سی آیات میں لفظ کی سے اس کی تفسیر کی گئی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ کے حق میں توقع اور اندیشے کے معنی صحیح نہیں ہیں۔ اور گولل کے معنی توقع اور امید کے ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا تعلق مخاطب سے ہوتا ہے اور کبھی منکلم سے اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص سے ہوتا ہے۔ لہذا آیت کریمہ:

"لَعَلَّنَا تَتَّبِعُ السَّحَرَةَ" (سورة الشعراء آیت نمبر 40)

تا کہ ہم ان جادوگروں کے پیرو ہو جائیں۔ میں توقع کا تعلق قوم فرعون سے ہے۔

التقویٰ اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہوں کا موجب ہو۔ اور یہ بات مجھپورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لئے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔

الحلال بین و احرام بین ومن وقع حول الحمی فحقیق ان يقع فیہ

کہ حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور جو شخص چراگاہ کے ارد گرد چرائے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں داخل

ہو جائے (یعنی مشتبہ چیزیں اگرچہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن پاک میں ہے:

"فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 35)
تو جو پرہیزگاری کرے اور سنورے تو اس پر نہ کچھ خوف اور نہ کچھ غم۔

"إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا" (سورۃ النحل آیت نمبر 128)
کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اللہ ان کا مددگار ہے۔

"وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 73)
اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کو گروہ بنا کر بہشت کی طرف لے جائیں گے۔
پھر تقویٰ کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لئے آیات،

"وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 281)
اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم خدا کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے۔

"وَاتَّقُوا رَبَّكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 1)
اپنے پروردگار سے ڈرو۔

اور اس خدا سے ڈرو جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔

"اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 102)
اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقویٰ کا ایک خاص معنی مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے اور بعد بیان ہوگی۔ اتقی فلان بکذا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:

"أَفَمَنْ يَتَّقِ بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 24)
بھلا جو شخص قیامت کے دن اپنے منہ سے برے عذاب کو روکتا ہوا۔

میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:

"وَتَغْشَىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 50)
اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

"يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ" (سورۃ القمر آیت نمبر 48)

اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔

نوٹ: مندرجہ بالا آیت کریمہ میں مذکور خلق، عبادت، عبودیت ناس اور لفظ رب کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 22]

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (22)

”جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا، تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔“

متن:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا

صفة ثانية، أو مدح منصوب، أو مرفوع، أو مبتدأ خبره فلا تجعلوا وجعل من الافعال العامة يهيء على ثلاثة أوجه: بمعنى صار، وطفق فلا يتعدى كقوله:

فَقَدْ جَعَلْتُ قُلُوبَ بَنِي سُهَيْلٍ... مِنَ الْأَكْوَابِ مَرْتَعًا قَرِيبًا

والمعنى أوجد فيتعدى إلى مفعول واحد كقوله تعالى: وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ والمعنى صير، ويتعدى إلى مفعولين كقوله تعالى: جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا والتصيير يكون بالفعل تارة، وبالقول أو العقد أخرى.

ومعنى جعلها فراشاً أن جعل بعض جوانبها بارزاً ظاهراً عن الماء، مع ما في طبعه من الإحاطة بها، وصيرها متوسطة بين الصلاة واللطفة حتى صارت مهياًة لأن يقعدوا ويناموا عليها كالفرش المبسوط، وذلك لا يستدعي كونها مسطحة، لأن كرية شكلها مع عظم حجمها، واتساع جرمها لا تأتي الافتراض عليها.

وَالسَّمَاءَ بِنَاءً قبة مضروبة عليكم، والسماء اسم جنس يقع على الواحد والمتعدد كالدينار والدرهم، وقيل: جمع سماءة، والبناء مصدر، سمي به السبني بيتاً كان أوقبة أو خباء، ومينه بنى على امرأته، لأنهم كانوا إذا تزوجوا ضربوا عليها خباءً جديداً.

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ

عطف على (جعل)، وخروج الثمار بقدره الله تعالى ومشيثته، ولكن جعل الماء

المزوج بالتراب سبباً في إخراجها ومادة لها كالنطفة للحيوان، بأن أجرى عادته بإفاضة صورها وكيفيةها على البادة المستزجة منها، أو أودع في الماء قوة فاعلة وفي الأرض قوة قابلة يتولد من اجتماعها أنواع الثمار، وهو قادر على أن يوجد الأشياء كلها بلا أسباب ومواد كما أبدع نفوس الأسباب والهواد، ولكن له في إنشائها مدجاً من حال إلى حال، صنائع وحكم يحدد فيها لأولى الابصار عبثاً، وسكوناً إلى عظيم قدرته ليس في إيجادها دفعة، ومن الأولى للابتداء سواء أريد بالسماء السحاب فإن ما علاك سماء، أو الفلك فإن المطر يبتدئ من السماء إلى السحاب ومنه إلى الأرض على ما دلت عليه الظواهر. أو من أسباب سماوية تثير الاجزاء الرطبة من أعماق الأرض إلى جو الهواء فتتعد سحاباً مطراً. ومن الثانية للتبعيض بدليل قوله تعالى: فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ وَكَتَنَافِ الْمُنْكَرِينَ لَهُ أَعْنَى مَاءٍ وَرِزْقاً كَأَنَّهُ قَالَ: وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ بَعْضَ الْمَاءِ فَأَخْرَجْنَا بِهِ بَعْضَ الثَّمَرَاتِ لِيَكُونَ بَعْضُ رِزْقِكُمْ، وهكذا الواقع إذ لم ينزل من السماء الماء كله، ولا أخرج بالمطر كل الثمرات، ولا جعل كل المرزوق ثماراً. أو للتبيين، وريزقاً مفعول بمعنى المرزوق كقولك أنفقت من الدراهم ألفاً. وإنما ساغ الثمرات والموضع موضع الكثرة، لأنه أراد بالثمرات جماعة الثمرة التي في قولك أدركت ثمرة بستانه، ويؤيدة قراءة من قرأ: «من الثمرة» على التوحيد.

أو لأن الجموع يتعاور بعضها موقع بعض كقوله تعالى: كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَقَوْلِهِ: ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ. أو لأنها لما كانت محلاة باللام خرجت عن حد القلة. وَلَكُمْ صَفَةٌ رِزْقاً إِنْ أُرِيدَ بِهِ الْمَرْزُوقُ وَمَفْعُولُهُ إِنْ أُرِيدَ بِهِ الْمَصْدَرُ كَأَنَّهُ قَالَ: رِزْقاً أَيَاكُمْ.

فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَاداً مُتَعَلِّقِينَ بِعِبَادِهِ عَلَى أَنَّهُ نَهَى مَعْطُوفٌ عَلَيْهِ. أو نفى منصوب بإضمار أن جواب له. أو بلعل على أن نصب تجعلوا نصب فاطلع في قوله تعالى: لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ الْأَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَى إِلَهِ الْمُجْرِمِينَ أَلَمْ يَكُنْ لَهُ الْكُوفَةُ إِلَهًا لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِإِلَهِهِ إِلَّا تَتَّقُوا إِنْ تَتَّقُوا لِلَّهِ أَنْدَاداً، أو بالذي جعل، إن استأنفت به على أنه نهي وقع خبراً على تأويل مقول فيه: لا تجعلوا، والفاء للسببية أدخلت عليه لتضمن المبتدأ معنى الشرط والمعنى: أن من خصكم بهذه النعم الجسماء والآيات العظام ينبغي أن لا يُشْرَكَ بِهِ. والند: المثل المماثل، قال جرير:

أَتِيماً تَجْعَلُونَ إِلَىٰ نَدَا... وَمَا تَيْمُّ لِيذَى حَسْبَ نَدِيدٌ

من نديداً ندوداً: إذا نفر، وناددت الرجل مخالفته، خص بالمخالف المبائل في الذات كما خص المساوى بالمبائل في القدر، وتسمية ما يعبد المشركون من دون الله (أنداداً)، وما رُعموا أنها تساويه في ذاته وصفاته ولا أنها تخالفه في أفعاله لأهم لها تركوا عبادته إلى عبادتها، وسموها آلهة شابهت حالهم حال من يعتقد أنها ذوات واجبة بالذات، قادرة على أن تدفع عنهم بأس الله، وتمنحهم ما لم يرد الله بهم من خير، فتهم بهم وشنع عليهم بأن جعلوا أنداداً لمن يمتنع أن يكون له ند. ولهذا قال موحد الجاهلية زيد بن عمرو بن نفيل:

أَرَبًّا وَاحِدًا أَمَّ الْفَرْبَ... أَدِينُ إِذَا تَقَشَّيْتَ الْأُمُورُ

تَرَكْتَ اللَّاتَ وَالْعِزَّىٰ جَمِيعًا... كَذَلِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيرُ

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ حال من ضمير فلا تجعلوا، وبمفعول تعلمون مطروح أى: وحالكم أنكم من أهل العلم والنظر وإصابة الرأي، فلو تأملتكم أدنى تأمل اضطر عقلكم إلى إثبات موجد للممكنات منفرد بوجود الذات، متعال عن مشابهة المخلوقات، أو منوى وهو أنها لا تماثله ولا تقدر على مثل ما يفعله كقوله سبحانه وتعالى:

هَلْ مِنْ شَرِكَائِكُمْ مَنِ يَفْعَلُ مِنْ ذَلِكَ مِنْ شَيْءٍ وَعَلَىٰ هَذَا فَاَلْمَقْصُودُ مِنْهُ التَّوْبِيخُ وَالتَّثْرِيْبُ، لَا تَقْيِيْدُ الْحُكْمِ وَقَصْرُهُ عَلَيْهِ، فَإِنَّ الْعَالَمَ وَالْجَاهِلَ الْمِتِمَكِّنَ مِنَ الْعِلْمِ سِوَاءَ فِي التَّكْلِيْفِ.

واعلم إن مضمون الآيتين هو الأمر بعبادة الله سبحانه وتعالى، والنهي عن الإشراك به تعالى، والإشارة إلى ما هو العلة والمقتضى، وبيانه أنه رتب الأمر بالعبادة على صفة الربوبية إشعاراً بأنها العلة لوجوبها، ثم بين ربوبيته بأنه تعالى خالقهم وخالق أصولهم وما يحتاجون إليه في معاشهم من البقلة والمظلة والبطاعم والملابس، فإن الثمرة أعم من المطعوم، والرزق أعم من البأكول والمشروب، ثم لما كانت هذه الأمور التي لا يقدر عليها غيره شاهدة على وحدانيته تعالى، رتب تعالى عليها النهي عن الإشراك به، ولعله سبحانه أراد من الآية الأخيرة مع ما دل عليه الظاهر وسبق فيه الكلام، الإشارة إلى تفصيل خلق الإنسان وما أفاض عليه من النعماني

والصفات على طريقة التبعيل، فمثل البدن بالأرض، والنفس بالسماء، والعقل بالماء، وما أفاض عليه من الفضائل العملية والنظرية المحصلة بواسطة استعمال العقل للحواس، وازدواج القوى النفسانية والبدنية، بالثمرات المتولدة من ازدواج القوى السماوية الفاعلة والأرضية المنفصلة بقدرة الفاعل المختار، فإن لكل آية ظهراً وبطناً ولكل حد مطلقاً.

ترجمہ:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا

آیت کا یہ حصہ ربکم کی دوسری صفت ہے، یہ محل نصب میں ہے۔ اور یہ منصوب علی المدح ہے اور اس سے پہلے امدح مخذوف ہے۔ یا یہ محل رفع میں ہے اور مرفوع علی المدح ہے، یا یہ مبتداء ہے۔ اس کی خبر لا تجعلوا لله انداداً ہے۔ اور اس سے پہلے فاء جزائیہ ہے کیونکہ جب مبتداء اسم موصول ہو تو اس میں شرط کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے خبر سے پہلے فاء ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اور جعل افعال عامہ میں سے ہے۔ اور یہ تین معانی میں مستعمل ہے،

1۔ صار اور طفق کے معنی میں اس صورت میں یہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ یہ افعال شروع سے ہوتا ہے اور اپنے اسم خبر سے مل کر مکمل جملہ بن جاتا ہے۔ قول شاعر ملاحظہ ہو:

فَقَدْ جَعَلْتُ قُلُوبَ بَنِي سُهَيْلٍ ... مِنَ الْأَكْوَارِ مَرْتَعًا قَرِيبًا

اونٹوں کا گلہ جو کہ بنی سہیل کا تھا اپنی چراگاہ میں چرنے لگا۔

یہاں جعلت، بمعنی اخذت اور طفقت ہے۔

2۔ اور کبھی کبھار اوجد کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس وقت یہ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے۔ اور یہ افعال قلوب میں سے

بھی نہیں ہوتا، جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان ہے،

"وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ"

3۔ اور یہ صیغہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اس وقت یہ افعال تصییر میں سے ہوتا ہے۔ اور دو مفعولوں کو نصب دیتا

ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد ہے،

جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا

اور تصییر تین قسموں کی ہوتی ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

بالقول، تصییر بالفعل اور تصییر بالاعتقاد

☆ بالقول

جیسا کہ کوئی کہے، جعلت زیداً امیراً۔ میں نے زید کو امیر بنا دیا۔

☆ تصحیر بالفعل

جیسا کہ کوئی کہے، جعلت الثوب قمیصاً۔ میں نے کپڑے کو قمیص بنا دیا۔

☆ تصحیر بالاعتقاد

اور کبھی تصحیر بالاعتقاد بھی ہوتی ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان،

وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنِثَاءً

کہ مشرکین نے ان ملائکہ کو جو رحمان کے بندے ہیں ان کو مؤنث اعتقاد کیا۔

اور زمیں کو فرش بنانے کا معنی یہ ہوگا کہ زمیں کا کچھ حصہ پانی سے ظاہر کر دیا اور اس کو نرمی اور سختی کی درمیانی کیفیت عطا کر دی اور اسے اس قابل بنا دیا کہ انسان اس پر بیٹھ سکیں اور سو سکیں، گویا زمیں بچھا ہوا بستر اور فرش ہے۔ اور زمیں کا بچھے ہوئے بستر کی طرح ہونا اس کی سطح کے ہموار ہونے کا تقاضا نہیں کرتا اور یہ زمیں کے بیضاوی ہونے کے منافی نہیں کیونکہ اس کی سطح کا جرم بہت وسیع ہے اور اس پر ہر قسم کی آبادی درخت، پہاڑ وغیرہ ہیں اس لئے زمیں کے بیضوی اور کروی ہونے کے باوجود آبادی کے قابل ہے۔

والسماء ببناءً اور آسمان کو عمارت بنایا۔

ایسا گنبد بنایا جو ہم پر نصب ہے، سماء یا تو اسم جنس ہے جس کا اطلاق واحد اور متعدد پر ہتا رہتا ہے۔ جیسا سے دینار اور درہم یا یہ سمانہ کی جمع ہے اور اللہ کریم کا یہ فرمان اس کی تصدیق کرتا ہے۔

فسواهن سبع سموات کہ اس نے ان کو درست درست سات آسمان بنایا۔

بناء یہ مصدر ہے جو مفعول کے معنی میں ہے جیسا کہ لباس بمعنی ملبوس اور بساط بمعنی مبسوط اور یہ ایسے عمارت پر بھی دلالت کرتا ہے جس کو گھر بنایا گیا ہو۔ اسی طرح گنبد اور خیمہ کو بھی بناء کہتے ہیں بناء کو خیمہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عربوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ شادی کرتے تو دلہا اور دلہن کے لئے پہلی شب گزارنے کے لئے الگ خیمہ نصب کرتے اور یہ کہا جاتا تھی فلان علی امراتہ کہ فلاں نے اپنی دلہن کے ساتھ شب باسی کی۔

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ

اس کا عطف جعل پر ہے پھلوں کا اگنا اگرچہ اللہ کریم کی مرضی سے ہے لیکن اللہ کریم نے پانی و مٹی کو ان کے اگنے کا سبب بنایا ہے۔ جیسا کہ نطفہ، حیوان کی پیدائش کا سبب ہے۔ اللہ کریم نے اس کی فطرت یہ بنا دی ہے کہ پھلوں کی صورتیں اور ان کی کیفیات اس مادہ پر ڈال دی جاتی ہیں جو مٹی و پانی دونوں کا مرغوبہ ہوتا ہے۔ یا اللہ کریم نے پانی میں قوت فاعلہ اور زمیں میں قوت قابلہ رکھی ہے جن دونوں کے ملنے سے ہر قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کریم اس بات پر قادر ہے کہ وہ تمام

اشیاء کو بلا اسباب اور مادہ پیدا فرمادے جیسے اس نے بذات خود اسباب اور مواد کو بغیر ساقی مثال وجود عطا فرمایا۔ لیکن ان تمام چیزوں کو پیدا کرنے میں درجہ بدرجہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جانے میں بہت سی صنعتیں اور حکمتیں ہیں جن میں اہل علم اور اہل بصیرت لوگوں کی عبرتیں اور سکون نئے نئے انداز میں پیدا کئے جاتے ہیں جو اس کی عظیم قدرت پر دال ہیں اور اگر ان تمام اشیاء کو یکبارگی پیدا کیا جاتا تو ان میں یہ حکمتیں اور سکون نہ ہوتا۔

من الثمرات اور من السماء سے پہلے جو من مذکور ہے وہ من السماء میں ابتدائیہ ہے خواہ السماء سے مراد بادل لئے جائیں کیونکہ جو چیز سر کے اوپر ہو اس کو سماء کہتے ہیں۔ اور چاہے اس سے مراد فلک لیا جائے کیونکہ بارش کا آغاز آسمان کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ اور پھر وہ زمیں تک پہنچتی ہے۔ جس طرح ان آیات کا ظاہر اس پر دلالت کر رہا ہے یا بارش کا برسنا اسباب سماعیہ سے ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ زمین کی گہرائیوں سے تراجزاء اڑاتے ہیں جو فضاء کی وسعتوں میں پہنچ کر بارش برسانے والا بادل بن جاتے ہیں۔

اور من الثمرات سے پہلے من تعینیہ ہے جس کی دلیل اللہ کریم کا قول،

واخر جنا بہ ثمرات

اور ہم نے اس کے ساتھ کچھ پھل پیدا کئے اور اس کا دو ٹکروں کے درمیان آنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ من تعینیہ ہے اور وہ دونوں ٹکروں کے وسط میں من الثمرات ہے گویا کہ اللہ کریم نے یوں ارشاد فرمایا: ہم نے آسمان سے کچھ پانی نازل فرمایا اور اس کے ساتھ کچھ پھل پیدا فرمائے تاکہ وہ تمہارا کچھ رزق بن جائیں اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ نہ تو آسمان سے سارا پانی برسایا جاتا ہے اور نہ ہی بارش کے ذریعے سارے پھل اگائے جاتے ہیں اور نہ ہی تمام کا تمام پھل رزق ہیں۔

یا یہ من بیانیہ ہے اور رزقاً مرزوق کے معنی میں مفعول ہے جیسے تیرا قول ہے،

أنفقت من الدراهم ألفاً

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر من کا بیانیہ کہا جائے جو رزق کی وضاحت کر رہا ہے تو لازم آئے گا کہ مبین مؤخر ہے اور بیان مقدم ہے اور یہ جائز نہیں اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ مثال ذکر کی ہے کہ،

أنفقت من الدراهم ألفاً

اس مثال میں ألفاً مبین ہے اور من الدراهم بیان، اس سے معلوم ہوا کہ بیان کو مبین سے مقدم کرنا جائز ہے۔ اس جگہ الثمرات کا لفظ جو جمع قلت کے اوزان سے ہے جمع کثرت کی جگہ جائز ہے کیونکہ ثمرات سے مراد پھلوں کی ایک جماعت ہے اور جماعت کے اندر بہت سارے افراد جمع ہوتے ہیں، جس طرح تیرے قول میں مذکور ہے،

ادرکت ثمرۃ بستانہ

کہ اس کے باغ کے پھلوں کی ایک جماعت پک گئیں۔ اور قراء نے من الشمرات کی جگہ من الثمرۃ واحد پڑھنا بھی اس کی تاکید کرنا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز ہے کہ جمع قلت جمع کثرت کی جگہ اور جمع کثرت کا وزن جمع قلت کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے،

کہ تو کو امن جنات و عیون

یہاں پر عیون جمع قلت کی جگہ جمع کثرت کا صیغہ مذکور ہے اور بالکل اسی طرح ثلاثہ قروء جمع قلت اقراء کی جگہ جمع کثرت کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا معرف باللام ہونا اس کو جمع قلت سے نکال کر جمع کثرت میں داخل کر دیتا ہے اور لکم، رزقائی صفت ہے بشرطیکہ رزق سے مراد مرزوق اور مفعول ہو۔

اور اگر رزق مصدری معنی میں ہو تو لکم اس کا مفعول ہوگا۔ کو یا کہ اللہ کریم نے اس طرح ذکر فرمایا رزقاً ایاکم یہاں پر ایاکم رزقاً کا مفعول ہے۔

وَ انزل من السماء... الخ

اس کا عطف جعل پر ہے۔ اور اس آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی سبب ہے پھلوں کے اگنے کا، اب سوال یہ ہے کہ یہ اسباب حقیقی موثر ہیں یا اللہ کریم کی ذات پاک؟

اس کے جواب میں متکلمین کا اختلاف ہے مسلم متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ موثر حقیقی اللہ کریم کی ذات ہے اور باقی یہ اسباب محض تاثیر ہیں خود یہ موثر نہیں بلکہ پھلوں کا اگنا، اللہ کریم کی قدرت و مشیت سے ہے البتہ پانی اور زمین کو پھلوں کی شکلوں، ان کی خاصیتوں اور لذتوں کا صرف مادہ بنا دیا ہے۔ جیسا کہ حیوان کی تخلیق کا مادہ نطفہ منی کو بنا دیا ہے۔

بعض اہلسنت اور معتزلہ متکلمین کا نظریہ ہے کہ یہ اسباب اپنے مسببات میں موثر حقیقی ہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے پانی میں قوت فاعلی اور زمین میں قوت مفعولی پیدا فرمادی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے پھل نکلتے ہیں، چونکہ پانی میں قدرت فاعلی ہے وہ موثر حقیقی ہے حالانکہ اللہ کریم ان ساری اشیاء کو بغیر سبب و مواد بھی پیدا کرنے پر قادر ہے جیسا کہ اس نے بذات خود اسباب پیدا کئے ہیں۔

سوال: اسباب اور مسبب میں تدریج کا عمل کیوں جاری فرمایا؟

جواب: اس تدریج میں جو اللہ کریم کی حکمتیں اور صنعتیں ظاہر ہوتی ہیں وہ اہل بصیرت کے لئے عبرت اور سکون حاصل کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ جس کی ترجمانی قلندر لاہوری نے کچھ یوں فرمائی،

کون لایا کھینچ کر پچھتم سے باد سازگار کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب موسم کو کس نے سکھائی ہے خوئے انقلاب

فلا تجعلوا لله انداداً...

اس آیت کی ماقبل آیت سے اعرابی تعلق کی تین صورتیں ہیں،

پہلی صورت یہ کہ اس سے پہلے فاء عاطفہ ہے اور یہ فعل نہیں ہے۔ اور اس کا عطف اعبدا پر ہے۔

دوسری صورت یہ کہ یہ فاء سببیہ ہے اور یہ فعل نفی ہے چونکہ یہ امر کے جواب میں ہے لہذا فاء کے بعد ان مقدرہ ہے جس کی

وجہ سے یہ منصوب ہے۔

تیسری صورت یہ کہ یہ لعلن کے جواب میں ہے اور فاء کے بعد ان مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے اگرچہ لعلن کے جواب میں فعل مضارع آجائے اور اس سے قبل فاء سببیہ ہو تو اس کے بعد ان مقدرہ کے ساتھ نصب دینا جائز نہیں چونکہ یہ کلام کو غیر موجب بنانے میں ان چھ (6) چیزوں کے ساتھ شریک ہیں۔ جن کے بعد فعل مضارع کو ان مقدرہ کے ساتھ نصب دی جاتی ہے اس لئے ان کو اس کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے۔ اور وہ چھ کلمات مندرجہ ذیل ہیں،

امر، نہی، تمنی، استفہام، عرض اور نفی۔

جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں لعلن کے جواب میں فعل مضارع کو ان مقدرہ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔

لعل بابلغ الاسباب اسباب السموات فاطلع

شاید کہ میں ایسے اسباب تک پہنچ جاؤں جو آسمانوں کے اسباب ہیں۔ تو میں اس پر آگاہی حاصل کروں۔ اس آیت میں فاطلع لعل بمعنی لیل کے جواب میں ہے۔ اور منصوب ہے تو معنی یہ ہوگا اگر تم واقعی تقویٰ اختیار کرتے ہو تو اللہ کریم کے مد مقابل نہ بناؤ۔ اور یا یہ

الذی جعل لکم الارض۔۔۔ الخ

کی خبر ہے اور اس کے قبل فاء جزائیہ ہے اور جب مبتداء میں شرط کے معنی پائے جائیں تو شرط پر فاء جزائیہ ذکر کرنا جائز

ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہوگا جب

الذی جعل۔۔۔ الخ

سے آغاز کلام کیا جائے۔ اور اس کو جملہ متانفہ بنایا جائے تو اس کی تاویل یہ ہوگی۔ مقول فیہ لا تجعلوا۔ تو آیت کریمہ

کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ذات پاک جس نے تمہیں ان عظیم الشان نعمتوں اور عظیم آیات سے نوازا ہے وہی اس لائق ہے کہ اس کا شریک نہ بنایا جائے۔

اندا

یہ ند کی جمع ہے اور مد مقابل اور مخالف فی الذات کو کہتے ہیں۔ جیسی مساوی کا لفظ رتبہ میں مماثل کے لئے استعمال ہوتا

ہے۔

جیسا کہ جریر کا قول،

أَتِيماً تَجْعَلُونَ إِلَىٰ نَدَا... وَمَا تَيْمُّ لِيذَى حَسَبٍ نَدِيدٌ
کیا تم بنو تیم کو میرا مد مقابل بناتے ہو حالانکہ وہ تو کسی ذی حسب کا مد مقابل بننے کے اہل نہیں۔

ندیہ نذیرینڈ، ندود سے مشتق ہے،

جس کا معنی نفرت کرنا اور مخالفت کرنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے،

نَادَدْتُ الرَّجُلَ إِذَا خَالَفْتَهُ

کہ میں نے اس کی مخالفت کی لیکن اب اس کا استعمال اس مد مقابل کے لئے ہوتا ہے۔ جو ذات میں کسی کا مماثل ہو جیسے مساوی کا لفظ مرتبہ میں مماثل کے لئے خاص ہے مشرکین کے معبودان باطلہ کو جن کی وہ اللہ کریم کے علاوہ عبادت کرتے تھے، اندادا کہا گیا ہے حالانکہ وہ انہیں نہ تو اللہ کریم کی ذات میں اور نہ ہی صفات میں مساوی گمان کرتے تھے۔ اور نہ ہی اس کے افعال میں اس کے مخالف انہیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کریم کی عبادت کو ترک کر دیا اور ان معبودان باطلہ کی عبادت کرنے لگے اور انہیں الہ کہنے لگے تو ان کی حالت اس بندے جیسی ہوگی جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ واجب بالذات ذاتیں اور وہ اس بات قادر ہے کہ وہ ان کو اللہ کے عذاب سے بچالیں گے اگر وہ انہیں وہ کچھ دین گے جو بھلائی میں سے اللہ کریم انہیں عطا کرنے کی مشیت پہاں رکھتا،

پس اس لئے ان کے ساتھ استہزاء کیا گیا اور ان کے برے عقیدے پر ان کی مذمت کی گئی۔ کہ انہوں نے اس ذات پاک کے لئے کئی مد مقابل بنائے ہیں۔

جس کا ایک بھی مد مقابل نہیں ہو سکتا، اس لئے زمانہ جاہلیت کے موحد زید بن عمرو ابن نفیل نے کہا،

أَرَبًا وَاحِدًا أَمَّ أَلْفَ رَبٍّ... أَدِينٌ إِذَا تَقَسَّمَتِ الْأُمُورُ

تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعِزَّىٰ جَمِيعًا... كَذَلِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيرُ

کیا میں ایک رب یا ہزاروں ارباب کا دین اختیار کروں جب کہ امور تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ میں نے لات و عزئی تمام کو ترک کر دیا اور صاحب بصیرت شخص اس طرح کیا کرتا ہے۔

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

اور انتم تعلمون سے پہلے واؤ حال یہ ہے اور یہ فلا ت جعلوا کی ضمیر مرفوع متصل سے حال ہے اگرچہ تعلمون فعل متعدی ہے لیکن اس کے مفعول کو حذف کر دیا جاتا ہے، اور یہ ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ یہ فعل لازم ہے متعدی نہیں تو معنی یہ ہوگا کہ تم اہل علم و نظر اور درست رائے کے مالک ہونے کے باوجود ان پتھروں سے گڑھے ہوئے بتوں کے خدا کا مد مقابل سمجھتے ہو۔

اگر تم تھوڑا سا بھی غور و فکر کرتے تو تم موجد حقیقی اور واجب باللذات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے اور کسی کو اس کا شریک نہ بناتے۔ اور تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ کریم ایسی ذات ہے جو واجب الوجود ہے اور اس کا کوئی ہم مثل نہیں اور وہ مخلوق کی

مشابہت سے بلند ہے۔

یا تعلمون کا مفعول کو مقدر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا مماثل نہیں اور نہ ہی اس جیسے افعال کرنے پر یہ قادر ہے جیسے اللہ کریم

کا ارشاد ہے،

کیا وہ جن کو تم اللہ کریم کا شریک ٹھہراتے ہو، ان میں سے کوئی ایسے افعال انجام دے سکتا ہے جیسے ان نے دیئے ہیں اور یہاں اس حکم کو مقید کرنا مقصود نہیں بلکہ انہیں جھڑکنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ عالم اور وہ جاہل جو علم حاصل کر سکتا ہے وہ احکام کا مکلف بننے میں مساوی ہے لہذا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر تم عالم ہو تو اس کا مد مقابل نہ بناؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی ذی روح انسان کو اس کا مد مقابل بنانے کی اجازت نہیں۔

تشبیہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ان دنوں آیات کا مضمون یہ ہے کہ ان آیات میں اللہ کریم نے اپنی عبادت کا حکم دیا۔ اپنا شریک بنانے سے نبی و ادر کی اور عبادت کے حکم کی علت مقتضی کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اس نے عبادت کے حکم کو ربوبیت کی صفت پر مرتب کیا ہے۔ یہ شعور دلانے کے لئے کہ عبادت کے واجب ہونے کی علت اس کی صفت ربوبیت ہے۔ پھر اس کی ربوبیت کی وضاحت فرمائی کہ وہ ان کا بھی خالق ہے اور ان کے اصولوں کا بھی۔ اور وہ ان چیزوں کا بھی خالق ہے جن کے وہ اپنی معیشت میں محتاج ہے۔ مثلاً زمین کو بچھانا، آسمان سے پانی برسا کر پھل نکالنا، کھانے، پینے اور پہننے کا سارا سامان مہیا کرنا وغیرہ یہاں آیت میں صرف ثمرۃ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ملابس اور مطاعم کا ذکر نہیں فرمایا۔ کہ یہ مذکورہ بالا امور ایسے ہیں جن پر اللہ کریم کے علاوہ کوئی بھی قادر نہیں۔ یہ امور اس کی وحدانیت پر گواہی دے رہے ہیں۔ اسی لئے اللہ کریم نے نہی عن الشریک کو اس پر مرتب فرمایا ہے۔

اس دوسری آیت کی امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک اور توجیہ فرمائی ہے جس پر آیات کا ظاہر دلالت کرتا ہے اور جس کے لئے یہ کلام چلایا گیا ہے فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ کریم نے انسان کی تخلیق کی تفصیلات اور ان صفات اور معانی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس نے ان کو عطا فرمائی ہیں۔ اور یہ بطور تمثیل اور تشبیہ ذکر فرمایا ہے یعنی بدن انسانی زمین کی مانند نفس انسانی آسمان اور عقل پانی کی مانند اور جو کمالات اور نوازشات انسانوں کو عطا فرمائی وہ ثمرات کی مانند یعنی جس طرح زمین اور آسمانی قوتوں کے اجتماع سے ثمرات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح نفسانی اور جسمانی قوتوں کے ساتھ عقل کے ملنے سے وہ کمالات اور فضائل پیدا ہوتے ہیں جو خالق کائنات نے اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ اس کو عطا فرمائے ہیں، ان کا سبب عقل، جسم اور نفس کو بنا دیا ہے کیونکہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہوتا ہے اور ایک اس کا باطنی معنی ہوتا ہے اور ہر ایک سے آگاہ ہونے کا ایک ذریعہ ہے نبی پاک ﷺ نے فرمایا،

من عمل بما علم ورثه الله تعالى علم ما لا يعلم

کہ جس نے اس علم کے مطابق عمل کیا جو اس نے حاصل کر لیا تو اللہ کریم اسے ایسے علم کا وارث بنا دیتا ہے جو اس نے سیکھا نہیں ہوتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

لفظ فرش کی تحقیق عمیق:

(فرش) الفرش (نض)

کے اصل معنی کپڑے کو بچھانے کے ہیں لیکن بطور اسم ہر اس چیز کو جو بچھائی جائے فرش و فراش کہا جاتا ہے قرآن میں

ہے:

"الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا" (سورة البقرة آیت نمبر 22)

جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا۔

یعنی قابل رہائش بنایا اور اسے ابھرا ہوا نہیں بنایا جس پر سکونت ناممکن ہو اور الفراش کی جمع فرش آتی ہے۔ قرآن میں

ہے:

"وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ" (سورة الواقعة آیت نمبر 34)

اور بلند بچھونوں میں۔

"مُتَّكِنِينَ عَلَى فُرُشٍ بَطَّأْنُهَا مِنْ أَسْتَبْقَى" (سورة الرحمن آیت نمبر 54)

اور ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے جن کا آستر قنادیز کا۔

اور فرش سے مراد وہ جانور بھی ہوتے ہیں جو بار برداری کے قابل نہ ہوں جیسے فرمایا:

"حَمُولَةٌ وَفَرَشًا" (سورة الانعام آیت نمبر 142)

جو پاپیوں میں سے بڑی عمر کے جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور چھوٹی عمر جو بار برداری کا کام نہیں دیتے اور زمین میں

لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) بھی۔ اور کنایہ کے طور پر فراش کا لفظ میاں بیوی میں سے ہر ایک پر بولا جاتا ہے چنانچہ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الولد للفراش

کہ بچہ خاوند کا ہے۔

اور محاورہ ہے۔ فلان کریمہ المفارش یعنی اس کی بیگمات اعلیٰ مرتبہ کی ہیں۔ افرش الرجل صاحبہ اس نے اپنے

ساتھی کی غیبت اور بدگوئی کی۔ افرش عنہ کسی چیز سے رک جانا (الفرشہ پروانہ تلی وغیرہ اس کی جمع الفراش آتی ہے۔

قرآن میں ہے: "كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُورِ" (سورة القارعة آیت نمبر 4) جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔

اور تشبیہ کے طور پر تالے کے کندے کو بھی فراشة القفل کہا جاتا ہے نیز فراشة کے معنی برتن میں تھوڑا سا پانی کے بھی آتے

ہیں۔

معنی سماء:

(سم و) سماء (Sky)

ہر شے کے بالائی حصہ کو سماء کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سماء ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بننا۔ اور آیت:

"اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ" (سورة الطلاق آیت نمبر 12)
خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں۔ کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

لفظ بنی کی تحقیق:

(بنی) بنی (Construct)

بنیت ابنی بنا و بنیتہ و بنیا کے معنی تعمیر کرنے کے ہیں قرآن میں ہے۔

"وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا" (سورة النبا آیت نمبر 12)

اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

"وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ" (سورة الذاریات آیت نمبر 47)

اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا۔

"وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا" (سورة الشمس آیت نمبر 5)

اور آسمان اور اس ذات کی (قسم) جس نے اسے بنایا۔ البنیان یہ واحد ہے جمع نہیں ہے جیسا کہ آیات۔

"لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ" (سورة التوبة آیت نمبر 110)

یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (موجب) خلجان رہے گی۔

"كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُورٌ" (سورة الصاف آیت نمبر 4)

کہ گویا سیسا پلائی ہوئی دیوار ہیں:

"قَالُوا الْبُيُوتُ الَّتِي بُنِيَْنَا قَالُوا قَالُوا فِي الْحَجِيمِ" (سورة الصافات آیت نمبر 97)

وہ کہنے لگے کہ اس کے لئے ایک عمارت بناؤ۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بنیان تنکی جمع ہے اور یہ:

شعیر، شعیر و تمر و تمر و نخل و نخلتہ کی طرح ہے یعنی جمع اور مفرد میں تاکہ ساتھ فرق کرتے ہیں اور جمع کی اس قسم میں تذکر و تانیث دونوں جائز ہوتے ہیں۔

"لَهُمْ غُرْفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرْفٌ مَّبْنِيَةٌ" (سورۃ الامر آیت نمبر 20)
ان کے لئے اونچے اونچے محل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ بناء (مصدر بمعنی مفعول) عمارت جمع ابنیتہ البنیۃ سے بیت اللہ مراد لیا جاتا ہے۔
شمر کا اصل معنی:

(ثمر) الشمر
اصل میں درخت کے ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کو کھایا جاسکے اس کا واحد شمرۃ اور جمع شمار و ثمرات آتی ہے قرآن میں ہے:
"أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 22)
اور آسمان سے مینہ پرسا کر تمہارے کھانے کے لئے انواع و اقسام کے میوے پیدا کیے۔
مفہوم نزول:

(نزل) النزول (ض) (Descent)
اصل میں اس کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: نزل عن دابة وہ سواری سے اتر پڑا۔ نزل فی مکان کذا کسی جگہ پر ٹھہرنا نزل و افعال اتارنا قرآن میں ہے۔ عذاب کے متعلق انزال کا لفظ استعمال ہوا ہے قرآن اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق انزال اور تنزیل دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ تنزیل کے معنی ایک چیز کو مرہ بعد آخری اور متفرق طور نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور انزال کا لفظ عام ہے جو ایک ہی دفعہ مکمل طور کسی چیز نازل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ وہ آیات ملاحظہ ہو جہاں تنزیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

"نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 193)

اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔ ایک قرأت میں نزل ہے۔

"وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 106)

اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہو جہاں تنزیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

"نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 193)

اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔

ایک قرأت میں نزل ہے:

"وَتَزَلُّعًا تَلْوِيْلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 108) اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا۔

ماء کی اصل:

(م ی ہ) الماء (Water)

کے معنی پانی کے ہیں قرآن میں ہے:

"وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 30)

اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

"وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 48)

اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا پاک کرنے والا۔

پاک اور نٹھرا ہوا پانی اور محاورہ ہے: ماء بنی فلان قبیلے کا پانی یعنی ان کی آبادی ماء اصل میں موہ ہے کیونکہ اس کی

جمع امرأۃ اور میاہ آتی ہے۔ اور تصغیر مویہ پھر بسا کو حذف کر کے واؤ کو الف سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔

خرج کا معنی:

(خرج) (ن) (Emit)

خروجاً کے معنی کسی کے اپنی قرار گاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قرار گاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا

کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو۔ قرآن میں ہے:

"فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ" (سورۃ القصص آیت نمبر 21)

تو اس شہر سے نکلا ڈرتا ہوا اس انتظار میں کہ اب کیا ہوتا ہے۔

انداد کا معنی:

(ندد) (Relative, Partner)

ندید الشئی۔ وہ جو کسی چیز کی ذات یا جوہر میں اس کا شریک ہو اور یہ ممانعت کی ایک قسم ہے کیونکہ مثل کا لفظ ہر قسم کی

مشارکت پر بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہر ند کو مثل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر مثل ند نہیں ہوتا۔ اور ند، ندید ندیدہ تینوں ہم معنی ہیں۔

قرآن میں ہے:

"فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اٰنْدَادًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 22)

پس کسی کو خدا کا ہمسرنہ بناؤ۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَاداً" (سورة البقرة آیت نمبر 165)
اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں۔

"وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَاداً" (سورة فصلت آیت نمبر 9)
اور بتوں کو اس کا مد مقابل بناتے ہو۔

اور ایک قرأت میں یوم التناد تشدید دال کے ساتھ ہے اور یہ نذیند سے مشتق ہے جس کے معنی دور بھاگنے کے ہیں اور قیامت کے روز بھی چونکہ لوگ اپنے قرابتداروں سے دور بھاگیں گے جیسا کہ آیت کریمہ:

"يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ" (سورة عبس آیت نمبر 34)
اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی۔

میں مذکور ہے اس لئے روز قیامت کو یوم التناد بتشدید الدال کہا گیا ہے۔

علم کا معنی:

(ع ل م) العلم

کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا۔

نوٹ: مندرجہ بالا آیت کریمہ میں مذکور باقی الفاظ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 23]

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (23)

"اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ، اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلا لیا اگر تم سچے ہو۔"

متن:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ

لباقرر وجدانیتہ تعالیٰ و بین الطریق الموصل إلى العلم بها، ذکر عقیبہ ما هو الحجة على نبوة محمد صلى الله عليه وسلم، وهو القرآن المعجز بفصاحته التي بذت فصاحة كل منطق وإفحامه، من طولب بمعارضته من مصاقع الخطباء من العرب العرباء مع كثرتهم وإفراطهم في المضادة والبضارة، وتهيالكهم على البعازة والبعارة، وعرف ما

یتعرف به إعجازه ویتیقن أنه من عند الله كما يدعيه.

وإنما قال: **مِمَّا نَزَّلْنَا** لأن نزوله نجماً منجماً بحسب الوقائع على ما ترى عليه أهل الشعر والخطابة مما يريدونهم. كما حكى الله عنهم فقال **وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً** فكان الواجب تحديدهم على هذا الوجه إزاحة للشبهة والزاماً للحجة. وأضاف العبد إلى نفسه تعالى تنويهاً بذكره وتنبيهاً على أنه مختص به منقاد لحكمه تعالى، وقرء «عبادنا» يريد محمداً صلى الله عليه وسلم وأمته. والسورة الطائفة من القرآن المترجمة التي أقلها ثلاث آيات، وهي إن جعلت واوها أصلية منقولة من سور المدينة لأنها محيطة بطائفة من القرآن مفرزة محوزة على حيالها، أو محتوية على أنواع من العلم احتواء سور المدينة على ما فيها، أو من السورة التي هي الرتبة، قال النابغة:

وَلرَهْطِ حَرَابٍ وَقَدِ سُورَةٌ... فِي الْمَجْدِ لَيْسَ غَرَابُهَا بِمَطَارٍ

لأن السورَ كالمنازل والمراتب يترقى فيها القارئ، أولها مراتب في الطول والقصر والفضل والشرف وثواب القراءة. وإن جعلت مبدلة من الهزمة فمن السورة التي هي البقية والقطعة من الشيء. والحكمة في تقطيع القرآن سوراً: أفراد الأنواع، وتلاحق الأشكال، وتجاوب النظم، وتنشيط القارئ، وتسهيل الحفظ، والترغيب فيه. فإنه إذا ختم سورة نفّس ذلك عنه، كالمسافر إذا علم أنه قطع ميلاً أو طوي بربداً، والحافظ متى حذفها اعتقد أنه أخذ من القرآن حظاً تاماً، وفاز بطائفة محدودة مستقلة بنفسها، فعظم ذلك عنده وابتهج به إلى غير ذلك من الفوائد.

ترجمہ:

اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ۔ اس سے پہلی آیات میں اللہ کریم نے زبردست دلیلوں کے ساتھ اپنی وحدانیت کا ثابت کیا اور وہ طریقہ بھی بتا دیا جو اس کی وحدانیت کے علم تھ پہنچاتا ہے اور اس کے بعد اب وہ دلیل ذکر کی جا رہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر واضح دلیل ہے۔ اور وہ دلیل قرآن کریم ہے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے جس کی فصاحت زبردست گفتگو کرنے والے پر غالب آگئی اور اس نے خالص عرب کے فصیح و بلیغ خطباء کو اس کے مقابلے میں کلام لانے کا مطالبہ کیا اور انہیں خاموش کر دیا کیونکہ وہ اپنی کثرت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور آپ کو نقصان پہنچانے میں افراط کی حد تک پہنچنے کے باوجود اور آپ پر غالب آنے اور آپ کو

شرمندہ کرنے پر شدید حرص کے باوجود ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز اور خاموش ہو گئے اور اللہ کریم نے انہیں وہ راستہ بتایا جس سے وہ قرآن کریم کے اعجاز کو پہچان سکتے ہیں اور جس سے وہ یہ یقین کر سکتے تھے یہ اللہ کریم کا کلام ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے اس کا دعویٰ فرمایا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایسا کلام پیش نہ کر سکے اور اس کی یہ وعید بھی سنادی گئی کہ اگر وہ ایسا کلام پیش نہیں کریں گے تو انہیں اس دوزخ کے اندر پھینک دیا جائے گا جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے یہ اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے اور حضور ﷺ کی نبوت پر زبردست حجت بھی ہے۔

اس جگہ اللہ کریم نے نزلنا کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ جس کا معنی تھوڑا تھوڑا حسب واقعہ نازل کرنا ہے۔ اور ایسا کلام خطباء اور شعراء پیش کرتے ہیں۔ اور یہ چیز بھی عرب کے فصحاء کو قرآن کریم میں شک کا سبب بننے والی چیزوں میں سے تھی۔ جس طرح اللہ کریم نے خود ذکر فرمایا ہے،

وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملة واحدة
اور کافروں نے کہا کہ یہ قرآن یکبارگی نازل کیوں نہ کیا گیا۔

تو اس کی کیا وجہ ہے؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو ان کے شک کا منشاء تھا اسی کے مطابق ان کو چیلنج کرنا واجب تھا۔ تاکہ ان کے شبہ کا ازالہ ہو جائے۔ اور ان پر دلیل بن جائے اور یہاں اللہ کریم نے عبد کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے تاکہ اس کے ذکر کرنے سے آپ کی عظمت شان کا اظہار ہو اور اس بات پر تنبیہ ہو کہ اللہ کریم کے محبوب کا اس کی ذات کے ساتھ خاص تعلق ہے اور آپ اس کے حکم کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ اور بعض قراء نے یہاں پر عبادنا پڑھا ہے۔ جو عبد کی جمع ہے تو اس صورت میں اس سے مراد نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت ہیں اور قرآن کریم کا وہ حصہ جس میں جس میں کوئی خاص مضمون بیان کیا گیا ہو اور اس کو کسی عنوان کے ساتھ معنون بھی کیا گیا ہو اور اس میں کم از کم تین آیات ہوں۔ اور اس کے مادہ اشتقاق میں تین قول ہیں۔

(1) یہ سوزا المدینہ سے مشتق ہے جس کا معنی شہر کی فصیل اور مضبوط چار دیواری ہے یعنی جس طرح فصیل شہر اور جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے اس کو گھیر لیتی ہے۔ اسی طرح صورت بھی قرآن پاک کے ایک مستقل حصہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ اور مختلف علوم کو شامل ہوتی ہے۔

(2) یہ صورت بمعنی مرتبہ سے بنا ہوا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ قرآن پاک کے باعتبار عظمت مختلف درجات ہیں۔
نابغہ کی کہنا ہے،

وَلرَّهْطِ حَرَابٍ وَقَدْ سُوْرَةٌ... فِي الْمَجْدِ لَيْسَ غَرَابًا بِمَطَارٍ

کہ حراب اور قد کے گروہ کا بزرگی میں ایسا مرتبہ ہے، کہ ان کی فصلوں سے کوئے کو بھی نہیں اڑایا جاتا۔

کیونکہ سورتیں منازل اور مراتب کی طرح ہیں جن میں قاری ترقی حاصل کرتا جاتا ہے۔ یا ان سورتوں کے لمبا، چھوٹا، فضل، شرف اور قراءت کے ثواب میں مرتبے اور درجے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو سورۃ کہا گیا۔

(3) یہ سورۃ سے بنا ہے، بمعنی باقی ماندہ۔ تو معنی یہ ہوگا قرآن پاک کا وہ حصہ جو دوسرے حصہ سے الگ تھلگ اور باقی بچا ہوا ہے۔ وہ اس صورت سے ہے۔ اس صورت میں سورۃ کی واؤ ہمزہ سے بدلی ہوئی ہوگی۔ قرآن کریم کو الگ الگ سورتوں میں تقسیم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ مختلف قسم کے مضامین کا بیان علیحدہ علیحدہ کیا جائے اور ہم معنی و ہم شکل الفاظ کو یکجا ذکر کر کیا جائے، اور تلاوت کرنے والے کو خوشخبری سنائی جائے اور اس کو حفظ کرنا بھی آسان ہو جائے۔ اور ط حفظ کی ترغیب بھی دلائی جائے کیونکہ جب کوئی ایک صورت یاد کر لیتا ہے تو اس کا بوجھ کم ہو جاتا ہے، جیسا مسافر ایک میل سفر کے بعد سکون محسوس کرتا ہے کہ کچھ راستہ کم ہوا اور جب حافظ ایک سورۃ یاد کر لیتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس نے قرآن سے کچھ یاد کر لیا ہے۔ اور قرآن کا مستقل بنفہ حاصل کرنے میں کامران ہو گیا ہے۔ اور وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے اور اس کی تقطیع میں بے شمار فوائد ہیں جو اہل نظر پر چھپے ہوئے نہیں۔

متن:

مِنْ مِثْلِهِ صِفَةُ سُورَةِ أَى: بِسُورَةِ كَائِنَةٍ مِنْ مِثْلِهِ، وَالضَّمِيرُ لَهَا نَزَلْنَا، وَ (مِنْ) لِلتَّبَعِيضِ أَوْ لِلتَّبْيِينِ.

وَزَائِدَةٌ عِنْدَ الْإِخْفَاشِ أَى بِسُورَةٍ مِمَّا ثَلَّةَ لِلْقُرْآنِ الْعَظِيمِ فِي الْبَلَاغَةِ وَحَسَنِ النِّظْمِ. أَوْ لَعِبْدْنَا، وَ (مِنْ) لِلْإِبْتِدَاءِ أَى: بِسُورَةِ كَائِنَةٍ مِمَّنْ هُوَ عَلَى حَالِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنْ كَوْنِهِ بَشَرًا أَمْيَا لَمْ يَقْرَأِ الْكُتُبَ وَلَمْ يَتَعَلَّمِ الْعُلُومَ.

أَوْ صِلَةٌ فَأَتُوا، وَالضَّمِيرُ لِلْعَبْدِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالرَّدُّ إِلَى الْمَنْزِلِ أَوْجَهُ لِأَنَّهُ الْمَطَابِقُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: فَأَتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ

وَلِسَائِرِ آيَاتِ التَّحْدِي، وَلَأَنَّ الْكَلَامَ فِيهِ لَا فِي الْمَنْزِلِ عَلَيْهِ فَحَقُّهُ أَنْ لَا يَنْفَكَ عَنْهُ لِيَتَسَّقِ التَّرْتِيبَ وَالنِّظْمَ، وَلَأَنَّ مَخَاطَبَةَ الْجَمِّ الْغَفِيرِ بَأَنَّ يَأْتُوا بِمِثْلِ مَا أَتَى بِهِ وَاحِدٌ مِنْ أَهْبَاءِ جَلْدَتِهِمْ أَهْلُغَ فِي التَّحْدِي مِنْ أَنْ يُقَالَ لَهُمْ:

لِيَأْتِ بِنَحْوِ مَا أَتَى بِهِ هَذَا آخِرُ مِثْلِهِ، وَلَأَنَّهُ مُعْجَزٌ فِي نَفْسِهِ لَا بِالنِّسْبَةِ إِلَيْهِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: قُلْ لَئِنْ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ. وَلَأَنَّ رَدَّهُ إِلَى عِبْدِنَا يُوْهِمُ إِمْكَانَ صَدُورِهِ مِنْ لَمْ يَكُنْ عَلَى صِفَتِهِ، وَلَا يَلَامُهُ قَوْلُهُ تَعَالَى:

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ

فَإِنَّ أَمْرًا بَأَن يَسْتَعِينُوا بِكُلِّ مَن يَنْصُرُهُمْ وَيَعِينُهُمْ.

ترجمہ:

اس میں من جارہ مضاف ومضاف الیہ کے مثل مل کر کائنات کے مجرد ہو کر سورۃ کی صفت ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ تم ایسی سورۃ لاؤ جو حسن نظم اور عجیب اسلوب اور فصاحت و بلاغت میں قرآن پاک کی مثل ہو۔

اس سورۃ میں ضمیر کا مرجع ما نزلنا ہوگا یا من تبعیضہ یا بیانیہ ہوگا اور انفس کے قول کے مطابق من زائدہ ہے یا ضمیر کا مرجع عبدنا ہے اور من ابتدائیہ ہے تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ایسی سورت لاؤ جس کو ایسا آدمی پیش کرے جو امی ہونے میں ہمارے بندہ خاص جیسا ہو جو نہ تو کسی کا شاگرد ہو اور نہ ہی اس نے کسی سے لکھنا چڑھنا سیکھا ہو۔

یابہ من مثلیہ، فاتوا فعل کا صلہ ہوگا۔ اور اس صورت میں ضمیر سے مراد عبد خاص صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا۔ لیکن امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع منزل کو بنانا کئی وجوہات سے بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں وہ،

فاتوا بسورۃ من مثله

اور باقی ماندہ ان تمام آیات تحدی کے موافق ہوگا۔

اور ضمیر کا مرجع قرآن کو بنانے کی یہ بھی وجہ ہے کہ کلام اسی کے متعلق ہے، منزل علیہ کے متعلق نہیں ہو رہی تو اس کا حق یہ ہے کہ وہ اس سے جدا نہ ہوتا کہ ترتیب قرآن خراب نہ ہو۔

اور اس وجہ سے بھی کہ جم غفیر کو چیلنج کرنا کہ وہ اس جیسا کلام لائے جو انہیں میں سے ایک ہستی کر چکی ہے۔ چیلنج کا یہ انداز زیادہ بلیغ ہے۔ نسبت اس کے کہ انہیں کہا جائے کہ ان میں سے کوئی ایک شخص ایسا کلام لائے جیسا کہ وہ لے کر آئے ہیں۔

اور اس وجہ سے بھی ضمیر کا مرجع منزل کو بنانا زیادہ اولیٰ ہے کہ وہ بذات خود معجز ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان ہے،

قُلْ لِّمَن اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ

کہ آپ فرمادیجئے کہ اگر تمام جن وانس جمع ہو جائیں کہ وہ اس قرآن جیسا کلام لائیں تو وہ اس جیسا کلام نہیں لاسکتے۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع عبدنا کو بنانا یہ وہم پیدا کرتا ہے کہ کہ آدمی کے لئے ایسا کلام لانا ناممکن ہے جو آپ کی صفت پر نہ ہو یعنی وہ امی نہ ہو۔ آخری وجہ یہ ہے کہ اگر عبدنا کو ضمیر کا مرجع بنایا جائے تو یہ اللہ کریم کے اس فرمان کے مناسب نہیں رہتا جس میں اللہ کریم نے فرمایا کہ تم اللہ کے علاوہ تمام جہانوں کو بلاؤ۔ کیونکہ اس میں یہ حکم ہے کہ وہ ہر اس شخص سے مدد طلب کریں جو اس کے قابل ہے۔

متن:

وَادْعُوا الشُّهَدَاءَ كَمَا مَنَ دُونِ اللَّهِ

والشهداء جمع شهيد، معنى الحاضر، أو القائم بالشهادة، أو الناصر، أو الإمام. وكأنه سمي به لأنه يحضر النوادي وتبرم بمحضرة الامور، إذ التركيب للحضور، إما بالذات أو بالتصور، ومنه قيل: للمقتول في سبيل الله شهيد لأنه حضر ما كان يرجوه، أو الملائكة حضرة. ومعنى دُونَ أدنى مكان من الشيء ومنه تدوين الكتب، لأنه إثناء البعض من البعض، ودونك هذا أى: خذ من أدنى مكان منك، ثم استعير للترتب فقيل: زيد دون عمرو أى: فى الشرف، ومنه الشيء الدون، ثم اتسع فيه فاستعمل فى كل تجاوز حد إلى حد وتخطى أمر إلى آخر، قال تعالى:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

أى لا يتجاوزوا ولاية المؤمنين إلى ولاية الكافرين. قال أمية:

يَا نَفْسُ مَا لَكَ دُونَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ أَى إِذَا تَجَاوَزْتَ وَقَايَةَ اللَّهِ فَلَا يَقِيكَ غَيْرُهُ، وَمِنْ مَتَعَلِقَةٍ بَ ادْعُوا. وَالْمَعْنَى وَادْعُوا لِلْمَعَارِضَةِ مِنْ حَضْرِكُمْ، أَوْ رَجُوتُمْ مَعُونَتَهُ مِنْ إِنْسَكُم وَجَنَكُمْ وَالْهَتَكُمْ غَيْرَ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى، فَإِنَّهُ لَا يَقْدِرُ عَلَى أَنْ يَأْتِيَ بِمِثْلِهِ إِلَّا اللَّهُ. أَوْ: وَادْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُهَدَاءَ يَشْهَدُونَ لَكُمْ بِأَنْ مَا أَتَيْتُمْ بِهِ مِثْلَهُ، وَلَا تَسْتَشْهَدُوا بِاللَّهِ فَإِنَّهُ مِنْ دِيْدِنِ الْمَبْهُوتِ الْعَاجِزِ عَنِ إِقَامَةِ الْحُجَّةِ. أَوْ بَ شُهَدَاءَ كُمْ أَى الَّذِينَ اتَّخَذْتُمُوهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ وَأَلْهَةً، وَزَعَمْتُمْ أَنَّهَا تَشْهَدُ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. أَوِ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ لَكُمْ بَيْنَ يَدَى اللَّهِ تَعَالَى عَلَى زَعْمِكُمْ مِنْ قَوْلِ الْإِعْشَى: تُرِيكَ الْقَدَى مِنْ دُونِهَا وَهِيَ دُونُهُ لِيَعِينُوكُمْ وَفِي أَمْرِهِمْ أَنْ يَسْتَنْظِرُوا بِالْجِهَادِ فِي مَعَارِضَةِ الْقُرْآنِ الْعَزِيزِ غَايَةَ التَّبَكِيْتِ وَالتَّهْكَمِ بِهِمْ. وَقِيلَ: مِنْ دُونِ اللَّهِ أَى مِنْ دُونِ أَوْلِيَاءِهِ، يَعْنِي فَصْحَاءَ الْعَرَبِ وَوُجُوهَ الْمَشَاهِدِ لِيَشْهَدُوا لَكُمْ أَنْ مَا أَتَيْتُمْ بِهِ مِثْلَهُ، فَإِنَّ الْعَاقِلَ لَا يَرْضَى لِنَفْسِهِ أَنْ يَشْهَدَ بِصِحَّةِ مَا اتَّضَحَ فَسَادُهُ وَبَانَ اخْتِلَالُهُ.

ترجمہ:

شهداء:

شہید یہ شہادۃ اور شہود سے بنا ہے، جس کا معنی

الحضور مع المشاهدة أما بالبصر وأما بالبصيرة

یعنی شہادت کا معنی یہ ہے کہ انسان وہاں موجود بھی ہو اور اسے دیکھے بھی خواہ آنکھوں کی بینائی یا نور بصیرت سے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شہید کے پانچ معانی مع مناسبت کے بیان کئے ہیں۔

☆ حاضر مجلس

☆ گواہ

☆ مدد کرنے والا، حمایتی

☆ امام اور سردار

☆ المقتول فی سبیل اللہ

ان تمام میں شہید کے لفظ کو استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے ان میں سے کسی نہ کسی اعتبار سے حضور (موجودگی) کے معانی پائے جاتے ہیں۔

یعنی ان کی موجودگی میں فیصلے کئے جاتے ہیں اور معاملات طے ہوتے ہیں۔ اور فی سبیل اللہ مقتول کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جن نعمتوں کے حصول کی اسے امید ہوتی ہے وہ حاضر ہوتی ہیں یا ملائکہ اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔

من:

یہ اپنے مجرور سے مل کر ادعو فعل کے متعلق ہوگا اس صورت میں یہ من ابتداءً ہوگا۔ اور معنی یہ ہوگا کہ تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ لیکن اس بلاؤے کی ابتداء اللہ کریم کے علاوہ سے ہونی چاہئے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی مثل لانے پر قدرت نہیں رکھتا۔

یا یہ حال ہے ادعوا کے فاعل سے، دریں صورت اس کا معنی مددگار نہیں ہوگا بلکہ یہ گواہوں کے معنی میں ہوگا کہ تم اللہ کریم کے علاوہ ان گواہوں کو بلاؤ جو گواہی دیں کہ جو کلام تم لائے ہو وہ اللہ کے کلام کی مثل ہے۔ لیکن عاجزوں اور بدحواسوں کی طرح یہ نہ کہو کہ اللہ کریم ہمارا گواہ ہے کیونکہ ان کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے دلیل قائم نہ کر سکیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ ہمارا گواہ ہے۔ کہ ہم اس دعویٰ میں سچے ہیں لیکن درحقیقت وہ عاجز ہیں۔

یا یہ اپنے مجرور سے مل کر شہداء کے متعلق ہوگا۔ تو معنی یہ ہوگا کہ تم اپنے ان معبودوں اور دوستوں کو بلاؤ جن کے متعلق تمہارا خیال ہے کہ بروز قیامت اللہ کریم کے سامنے تمہاری گواہی دیں گے۔ اس صورت میں دون کا لفظ قدم کے معنی میں ہوگا جیسا کہ الاغشی کا قول

تُرِيكَ الْقَذَى مِنْ دُونِهَا وَهِيَ دُونَهُ

وہ شیشہ تجھے تنکا کو اپنے آگے اور سامنے دکھائے گا حالانکہ وہ خود اس کے سامنے ہے۔

انہیں اس لئے بلاؤ کہ وہ تمہاری مدد کریں۔

دون چار معانی میں مستعمل ہے،

1- جو چیز باعتبار مکان بہت قریب ہو اسے دون کہتے ہیں۔ اسی سے تدوین الکتب ہے کہ اس میں بھی کتابوں کے بعض اجزاء کو بعض دوسروں کے قریب کیا جاتا ہے۔ یہی اس کا حقیقی معنی ہے۔

2- اس کا اطلاق مرتبہ و درجہ پر بھی مجازاً ہوتا ہے جیسا کہ زید دون عمرو کہ زید درجہ و مرتبہ میں عمرو سے کم ہے۔ اور حقیر چیز کو شبیہ دون کہتے ہیں۔

3- اس کے بعد اس میں وسعت پیدا کر دی گئی اور ایک حد سے دوسری حد کی طرف تجاوز کرنے اور ایک امر سے دوسرے امر کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ،

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ
کہ وہ مومنین کی دوستی سے کافروں کی دوستی کی طرف تجاوز نہ کریں۔

امیہ کا قول ہے،

يَا نَفْسُ مَا لَكَ دُونَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ

اے نفس جب تو اللہ کی حفاظت سے تجاوز کرے گا تو تجھے اس کا غیر نہیں بچائے گا۔ بعض کا کہنا ہے کہ من دون اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کریم کے دوستوں اور حمایتوں کے علاوہ ان فضحاء عرب کو بلا لاؤ کہ وہ تمہارے لائے ہوئے کلام کی شہادت دیں کہ یہ اللہ کریم کے کلام کی مثل ہے مگر وہ یہ گواہی نہیں دیں گے کیونکہ جس کا فساد ظاہر ہو عقل مند آدمی ایسی چیز کی گواہی قطعاً نہیں دیتا۔ اور مشرکین کو یہ حکم دینا کہ قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کے لئے جمادات سے مدد حاصل کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بالکل خاموش کر دیا جائے اور ان کے ساتھ استہزاء کیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ معبودان باطلہ ان کی اس بارے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

متن:

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

اَنہ من کلام البشر، وجوابہ محذوف دل علیہ ما قبلہ. والصدق: الإخبار المطابق. وقيل: مع اعتقاد المخبر أنه كذلك عن دلالة أو أمانة، لأنه تعالى كذب المنافقين في قولهم: إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ، لما لم يعتقدوا مطابقتہ، ورد بصرف التکذیب إلی قولهم نَشْهَدُ، لأن الشهادة إخبار عما علمه وهم ما كانوا عالمين به.

ترجمہ:

اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں۔ کہ یہ قرآن کریم بشر کا کلام ہے (تو اس کی مثل کلام لائیں۔)

ان کنتم صادقین

یہ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے جس کے حذف پر مائل کلام وال ہے اور وہ

فاتوا بسورة من مثله... الخ

ہے۔ اصل عبارت اس طرح تھی۔

ان كنتم صادقين فاتوا بسورة من مثله وادعوا من يعينكم في ذلك

کہا اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ بشر کا کلام ہے تو اس کی مثل ایک صورت لاؤ اور ان لوگوں کو بلا لو جو تمہارے گمان

کے مطابق تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔

صادقین

یہ صدق سے مشتق ہے اس کے معنی کے متعلق جمہور کا قول یہ ہے اس کا معنی یہ ہے کہ خبر دینے والے کا واقعہ کے مطابق خبر

دینا خواہ وہ اس کے عقیدہ کے مطابق ہو یا نہ ہو، دوسرا قول جاہل کا یہ ہے کہ خبر صادق وہ ہوگی جو واقعہ کے مطابق بھی ہو اور

اعتقاد کے مطابق ہو۔ اور یہ عقیدہ بھی مدلل ہو جیسا کہ منافقین نے قسم اٹھا کر کہا،

نشهد انك رسول الله

تو اللہ کریم نے انکو اس خبر کے متعلق کاذب کہا۔

والله يشهد ان المنافقين لكاذبون۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ خبر، خبر کے اعتقاد کے مطابق نہ تھی جبکہ خبر واقعہ کے مطابق تھی۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اللہ کریم نے ان کو اس خبر کو شہادت کہنے کی وجہ سے جھوٹا

فرمایا کیونکہ شہادت قلبی یقین کے ساتھ ہوتی ہے۔ خواہ وہ یقین آنکھوں کے ذریعے حاصل ہو یا علم کے ساتھ، اور منافقین کو یہ

حاصل نہ تھا اس لئے ان کو جھوٹا کہا گیا۔

تحقیق لفظ عبد:

(عبد) العبد (Slave, Seervant)

بمعنی غلام کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(1) العبد بمعنی غلام یعنی وہ انسان جس کی خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ:

"الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 178) اور غلام کے بدلے غلام۔

"عَبْدٌ أَمْلُو كَأَلَا يَفْقِدُ عَلَى شَيْءٍ" (سورۃ النحل آیت نمبر 75)

ایک غلام ہے جو بالکل دوسرے کے اختیار میں ہے۔

اس میں عبد کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے

(2) العبد بالایجاد یعنی وہ بندے جسے اللہ نے پیدا کیا ہے اس معنی میں عبودیت اللہ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِيَ الرَّحْمَنَ عَبْدًا" (سورۃ مریحہ آیت نمبر 93)
آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب اس کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے۔
اس میں اسی معنی کی طرح اشارہ ہے۔

(3) عبد وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اس لحاظ سے جن پر عبد کا لفظ بولا گیا ہے وہ دو قسم پر ہیں:

ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:
"وَأَذْكُرُ عَبْدَنَا أَيُّوبَ" (سورۃ ص آیت نمبر 41) اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔

"إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 3)
بیٹک نوح (علیہ السلام) ہمارے شکر گزار بندے تھے۔

"نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 1)
جس نے اپنے بندے پر قرآن پاک میں نازل فرمایا:

"عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 1)
جس نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ کتاب نازل کی۔

"إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 42)
جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

"كُونُوا عِبَادًا لِّي" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 79)
کہ میرے بندے ہو جاؤ۔

"إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 40)
ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

"وَعَدَّ الرَّحْمَنُ عِبَادَةً بِالْغَيْبِ" (سورۃ مریحہ آیت نمبر 61)
جو وعدہ رحمن نے اپنے بندوں سے غیب میں کیا۔

"وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 63)
اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

"فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا" (سورة التوبة آیت نمبر 23)

ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ۔

"فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا" (سورة الكهف آیت نمبر 65)

(وہاں) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ دیکھا۔

(2) دوسرے اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ اور اسی کی طرف مائل رہتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی نبی

کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

تعس عبد الدرهم تعس عبد الدينار

درہم دینار کا بندہ ہلاک ہو عبید کے ان معانی کے پیش نظر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے۔ یعنی بندہ

مخلص نہیں ہے لہذا یہاں عبید کے معنی عابد یعنی عبادت گزار کے ہیں لیکن عبد عابد سے زیادہ بلیغ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ

تمام لوگ اللہ کے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے بلکہ تمام اشیاء کا یہی حکم ہے۔ بعض بعض عبید بالتسخیر ہیں اور بعض

عبید بالاختیار اور جب عبد کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اس کی جمع عبید یا عبد آتی ہے اور جب عبد بمعنی عابد یعنی عبادت

گزار کے ہو تو اس کی جمع عباد آئے گی لہذا جب عبید کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ عباد سے زیادہ عام ہوگا یہی وجہ ہے کہ

آیت:

"وَمَا أَنَا بِظَالِمٍ لِلْعَبِيدِ" (سورة ق آیت نمبر 29)

اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔

میں عبید سے ظلم کی نفی کر کے تعبیر کی ہے وہ کسی بندے پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا خواہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہو اور خواہ

عبد الشمس یا عبد اللات ہونے کا مدعی ہو۔ ہموار راستہ جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ بعیر معبد جس پر تار کول مل کر

اسے خوب بد صورت کر دیا گیا ہو عبیدت فلان میں نے اسے مطیع کر لیا محکوم بنا لیا قرآن میں ہے:

"أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ" (سورة الشعراء آیت نمبر 22)

کہ تم نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے۔

اتیان کی عمدہ تحقیق بالتفصیل:

(اتی) الاتیان۔ (ض)

کے معنی کسی چیز کے بسہولت آنا کے ہیں۔ اسی سے سیلاب کو اتی کہا جاتا ہے اور اس سے بطور تشبیہ مسافر کو اتاوی کہہ

دیتے ہیں۔ الغرض اتیان کے معنی "آنا" ہیں خواہ کوئی بذاتہ آئے یا اس کا حکم پہنچے یا اس کا نظم و نسق وہاں جاری ہو یہ لفظ خیر و شر

اور اعیان و اعراض سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"إِنَّ آتَاكُمْ عَذَابَ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ" (سورة الانعام آیت نمبر 40)

تو اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت قائم ہو۔

"أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ" (سورة النحل آیت نمبر 1) اب آتا ہے اللہ کا حکم۔

اور آیت کریمہ:

"فَأَتَىٰ اللَّهُ بُدْيَانَهُم مِّنَ الْقَوَاعِدِ" (سورة النحل آیت نمبر 26)

میں اللہ کے آنے سے اس کے حکم کا عمل نافذ مراد ہے جس طرح کہ آیت

"وَجَاءَ رَبُّكَ" (سورة الفجر آیت نمبر 22)

میں ہے اور شاعر نے کہا ہے:

"اتيت المروءة من بابها" تو جو انمروی میں اس کے دروازہ سے داخل ہوا۔

اور آیت کریمہ:

"وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ" (سورة التوبة آیت نمبر 54)

میں یا تون بمعنی يتعاطون ہے یعنی مشغول ہونا اور آیت کریمہ۔

"يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ" (سورة النساء آیت نمبر 15)

میں الفاحشہ (بدکاری) کے متعلق اتیان کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جس طرح کہ آیت کریمہ۔

"لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا" (سورة مريم آیت نمبر 27)

فری کے متعلق مجنی کا لفظ استعمال ہوا ہے (یعنی دونوں جگہ ارتکاب کے معنی ہیں) اور آیت (مذکورہ) میں ایک قرأت

باتی الفاحشہ دونوں طرح آتا ہے۔ چنانچہ (دودھ کے، مشکیزہ کو بلونے سے جو اس پر مکھن آجاتا ہے اسے اتوة کہا جاتا ہے

لیکن اصل میں اتوة اس آنے والی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے حاصل ہو کر آئے لہذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔ ارض

کثیرة الالباء۔ زرخیز زمین جس میں بکثرت پیداوار ہو۔

اور آیت کریمہ: "إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا" (سورة مريم آیت نمبر 61) بیشک اس کا وعدہ آیا ہوا ہے۔

میں ماتیا (فعل) اتیتہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں ماتیا بمعنی اتیا ہے (یعنی مفعول بمعنی

فاعل) ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ محاورہ میں اتیت الامر واتانی الامر دونوں طرح بولا جاتا ہے اتیتہ بكذا واتیتہ كذا۔

کے معنی کوئی چیز لانا یا دینا کے ہیں قرآن میں ہے۔

"وَأَتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا" (سورة البقرة آیت نمبر 25)

اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔

"فَلَنَأْتِيَنَّهُم بِجُنُودٍ لَّا قِبَلَ لَهُم بِهَا" (سورة البقرہ آیت نمبر 37)
 ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس سے مقابلہ کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔
 "مُلْكًا عَظِيمًا" (سورة النساء آیت نمبر 54) اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

جن مواضع میں کتاب الہی کے متعلق آتینا (صیغہ معروف متکلم) استعمال ہوا ہے وہ اتوا (صیغہ مجهول غائب) سے ابلغ ہے (کیونکہ) اتوا کا لفظ کبھی ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ جب دوسری طرف سے قبولیت نہ ہو مگر آتینا کا صیغہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت بھی پائی جائے اور آیت کریمہ،

"أَتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ" (سورة الكهف آیت نمبر 96)
 تو تم لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ۔

میں ہمزہ نے الف موصولہ (انتونی) کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی جیٹونی کے ہیں۔ الایتاء (افعال) اس کے معنی اعطاء یعنی دینا اور بخشنا ہے ہیں۔ قرآن بالخصوص صدقات کے دینے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ" (سورة البقرہ آیت نمبر 277)
 اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔

"وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآيَتَاءَ الزَّكَاةِ" (سورة الانبياء آیت نمبر: 73)
 اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا۔

"وَلَا يَجِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا بِمَا آتَيْتُمُوهُنَّ" (سورة البقرہ آیت نمبر 229)
 اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکے اس میں سے کچھ واپس لے لو۔

"وَلَمْ يُولَدِ سَعَةَ مِنَ الْمَالِ" (سورة البقرہ آیت نمبر: 247)
 اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔

لفظ سورۃ سے کیا مراد ہے؟

السورة

کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔ اور سورۃ المدینہ کے معنی شہر پناہ کے ہیں اور سورۃ القرآن (قرآن کی سورت) یا توسور المدینہ سے ماخوذ ہے کیونکہ سورۃ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے انہیں سورۃ القرآن کہا جاتا ہے اور یا سورۃ بمعنی مرتبہ سے مشتق ہے، اور سورۃ بھی منازل قمر کی طرح ایک منزلت ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور یہ دونوں اشتقاق اس وقت ہو سکتے ہیں جب اس میں واؤ کو اصلی مانا جائے لیکن اگر اسے اصل میں سورۃ مہوز مانا جائے تو یہ اسارت سے مشتق ہوگا جس کے معنی کچھ باقی چھوڑ دینے کے ہیں اور سورۃ بھی چونکہ قرآن ان کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہوتی ہے۔ اس

لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور آیت:

"سُورَةٌ أَنْزَلْنَاهَا" (سورۃ القور آیت نمبر ۱)

یہ ایک سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا۔

میں سورۃ سے مراد احکام و حکم ہیں۔

لفظ دعا کا معنی:

(دعویٰ) الدعاء (ن) (Blessing, Prayer)

کے معنی ندا کے ہیں مگر ندا کا لفظ کبھی صرف یا آیا وغیرہ ہا حروف ندا پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے بعد منادی مذکور نہ ہو لیکن دعاء کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب حرف ندا کے ساتھ اسم (منادی) بھی مذکور ہو جیسے یا فلان۔ کبھی یہ دونوں یعنی دعاء اور نداء ایک دوسرے کی جگہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"كَمْثَلِ الَّذِي يَنْتَعِقُ رِمًا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۷۱)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

تحقیق لفظ شہید:

شہید یہ بھی بمعنی شاہد یعنی گواہ آتا ہے چنانچہ آیت

"مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ" (سورۃ ق آیت نمبر ۲۱)

اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ۔

میں شہید بمعنی گواہ ہی ہے جو اس کے لئے یا اس پر گواہی دیگا۔

اسی طرح آیت کریمہ:

"فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا" (سورۃ النساء آیت نمبر ۴۱)

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو لوگوں کا حال بتانے کو

گواہ طلب کریں گے۔

میں بھی شہید بمعنی شاہد ہی ہے اور آیت کریمہ:

"أَوَلَمْ يَلْقَ السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ" (سورۃ ق آیت نمبر ۳۷) کان لگائے اور متوجہ ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں ان کے دل اس کی شہادت دیتے ہیں۔ بخلاف ان لوگوں کے جن کے متعلق فرمایا

"أُولَئِكَ يُنَادُونَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ" (سورۃ فصلت آیت نمبر 44)

ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

اور آیت کریمہ: "إِنَّمَا الصَّلَاةُ... إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا"

کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔

اس میں قرآن کے مشہود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قرأت کرنے والے پر شفاء رحمت، توفیق، سکینت اور ارواح

نازل ہوتی ہیں۔ جن کا کہ آیت:

"وَنُنزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 82)

اور ہم قرآن کے ذریعہ سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت:

"وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 23) اور جو تمہارے مددگار ہیں ان کو بلا لو۔

میں شہداء کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جن پر معنی شہادت مشتمل ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس

کے معنی اعوان یعنی مددگار کے کئے ہیں اور مجاہدہ نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ جو تمہارے حق میں گواہی دیں۔ اور بعض نے

شہداء سے وہ لوگ مراد لئے ہیں۔ جن کے موجود ہونے کو قابل قدر اور معتبر سمجھا جائے یعنی وہ ایسے لوگ نہ ہوں جن کے متعلق

کہا گیا ہے،

مخلفون ویقضی اللہ امرہم... وہم بغیب وفی عمیاء ما شعروا

وہ پیچھے رہتے ہیں اور لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے ہیں وہ غیر حاضر اور بے خبر ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کو

علم تک نہیں ہوتا۔

اور آیت کریمہ: "وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا" (سورۃ القصص آیت نمبر 75)

اور ہم امت میں سے گواہ نکال لیں گے۔

میں بھی شہید کا لفظ انہی معانی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ" (سورۃ العادیات آیت نمبر 7)

اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔

"إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" (سورۃ فصلت آیت نمبر 53)

کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے۔

"وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 79)

اور اللہ کافی ہے گواہ۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

"لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ" (سورۃ طہ آیت نمبر ۱۶)

اور کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی۔

"يَعْلَمُ الْغَيْبُ وَالْخَفِيُّ" (سورۃ طہ آیت نمبر ۷)

وہ تو چھپے بھید اور پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

علیٰ بذالقیاس متعدد آیات ایسی ہیں جو اس معنی (یعنی علم باری تعالیٰ کے محیط ہونے) پر دال ہیں۔ اور قریب المرگ

فخص کو بھی شہید کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں،

چنانچہ آیت کریمہ: "تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا... الْآيَةَ" (سورۃ فصلت آیت نمبر ۳۰)

ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ خوف نہ کرو۔

میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اور فرمایا: "وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ" (سورۃ الحديد آیت نمبر ۱۹)

اور اپنے پروردگار کے نزدیک شہید ہیں ان کے لئے ان کے اعمال کا صلہ ہوگا۔

اور شہداء کو شہداء یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان

کے لئے تیار کی ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے ارواح باری تعالیٰ کے ہاں حاضر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا

آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۶۹-۱۷۰)

اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے

ہیں۔ شاد ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا۔

اور آیت کریمہ: "وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ" (سورۃ الحديد آیت نمبر ۱۹)

گواہ اپنے رب کے یہاں ان کے لئے ان کا ثواب۔

بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَشَهِيدٍ وَمَشْهُودٍ" (سورۃ البروج آیت نمبر ۳)

اور اس دن کی جو گواہ ہے اور اس دن کی جس میں حاضر ہوتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مشہود سے یوم جمعہ مراد ہے اور بعض نے یوم عرفہ مراد لیا ہے۔ اور بعض نے یوم قیامت اور

شاهد سے ہر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جو اس روز میں حاضر ہوگا اور آیت کریمہ:

"يَوْمَ مَشْهُودٌ" (سورہ قہود آیت نمبر 103)

اور یہی وہ دن ہے جس میں خدا کے روبرو حاضر کئے جائیں گے۔

میں مشہود بمعنی مشاہد ہے اور اس میں تشبیہ ہے کہ وہ دن ضرور آکر رہے گا۔ التشہد کے معنی،

اشہدان لا الہ الا اللہ و اشہدان محمد رسول اللہ

پڑھنے کے ہیں اور عرف میں تشہد کے معنی التحیات اور ان اذکار کے ہیں جو حالت تشہد (جلسہ) میں پڑھے جاتے

ہیں۔

صدق کا معنی:

(صدق) الصدق۔ (Truth)

یہ ایک الکذب کی ضد ہے اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے۔ وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو۔ الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں پھر قول میں بھی صرف خبر کے لئے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے اسی لئے ارشاد ہے۔

"وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 122)

اور خدا سے زیادہ وہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

نوٹ: اس آیت میں مذکور باقی الفاظ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 24]

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (24)

"پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار رکھی ہے کافروں کے لئے۔"

متن:

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

لہا بین لہم ما یتعرفون بہ امر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم وما جاء بہ، ومیز لہم الحق عن الباطل، رتب علیہ ما ہو كالغذائکة لہ، وهو أنکم إذا اجتهدتم فی معارضتہ وعجزتم جمیعاً عن الإتيان بما یساویہ أویدانیہ، ظهر أنه معجز والتصديق به واجب،

فَأَمَنُوا بِهِ وَاتَّقُوا الْعَذَابَ الْمَعْدُومِينَ كَذِبٌ، فَعَبَّرَ عَنِ الْإِثْيَانِ الْمَكِيفِ بِالْفِعْلِ الَّذِي يَعْمُ الْإِثْيَانُ وَغَيْرُهُ إِيجَازًا، وَنَزَلَ لِأَزْمِ الْجِزَاءِ مَنْزِلَتَهُ عَلَى سَبِيلِ الْكِنَايَةِ تَقْرِيرًا لِلْمَكْنَى عَنْهُ، وَتَهْوِيلًا لِشَأْنِ الْعِنَادِ، وَتَصْرِيحًا بِالْوَعِيدِ مَعَ الْإِيجَازِ، وَصَدَرَ الشَّرْطِيَّةُ بِأَنَّ الَّتِي لِلشَّكِّ وَالْحَالِ يَقْتَضِي إِذَا الَّذِي لِلْوَجُوبِ، فَإِنَّ الْقَائِلَ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى لَمْ يَكُنْ شَاكًّا فِي عِزِّهِمْ، وَلِذَلِكَ نَفَى إِثْيَانَهُمْ مَعْتَرِضًا بَيْنَ الشَّرْطِ وَالْجِزَاءِ تَهْكِيمًا بِهِمْ وَخَطَابًا مَعَهُمْ عَلَى حَسَبِ ظَنِّهِمْ، فَإِنَّ الْعِزَّ قَبْلَ التَّأَمُّلِ لَمْ يَكُنْ مُحَقَّقًا عِنْدَهُمْ، وَتَفَعَّلُوا جَزْمًا لَمْ يَكُنْ لِأَنَّهَا وَاجِبَةٌ الْإِعْمَالِ مَخْتَصَةٌ بِالْمِضَارِعِ مُتَّصِلَةٌ بِالْمَعْمُولِ، وَلِأَنَّهَا لَهَا صِيرَتُهُ مَاضِيًا صَارَتْ كَالْجِزَاءِ مِنْهُ.

وَحَرْفُ الشَّرْطِ كَالدَّخْلِ عَلَى الْمَجْمُوعِ فَكَأَنَّهُ قَالَ: فَإِنَّ تَرَكْتُمُ الْفِعْلَ، وَلِذَلِكَ سَاغَ اجْتِمَاعُهَا. وَلَنْ كَلَّا فِي نَفْيِ الْمُسْتَقْبَلِ غَيْرِ أَنَّهُ أَبْلَغُ وَهُوَ حَرْفٌ مَقْتَضِبٌ عِنْدَ سَيَّبُوِيهِ وَالْخَلِيلِ فِي إِحْدَى الرَّوَايَتَيْنِ عَنْهُ، وَفِي الرَّوَايَةِ الْآخَرَى أَصْلُهُ لَا أَنْ، وَعِنْدَ الْفَرَّاءِ لَا فَأَبْدَلْتُ أَلْفَهَا نُونًا، وَالْوَقُودُ بِالْفَتْحِ مَا تَوَقَّدَ بِهِ النَّارُ، وَبِالضَّمِّ الْمَبْصُرُ وَقَدْ جَاءَ الْمَبْصُرُ بِالْفَتْحِ قَالَ سَيَّبُوِيهِ:

وَسَمِعْنَا مَنْ يَقُولُ وَقَدَّتِ النَّارُ وَقُودًا عَالِيًا، وَالْإِسْمُ بِالضَّمِّ وَلَعَلَّهُ مَبْصُرٌ سُمِّيَ بِهِ كَمَا قِيلَ: فَلَانَ فُحِرَ قَوْمُهُ وَزِينُ بَلَدِهِ، وَقَدْ قَرَأَ بِهِ وَالظَّاهِرُ أَنَّ الْمُرَادَ بِهِ الْإِسْمُ، وَإِنْ أُرِيدَ بِهِ الْمَبْصُرُ فَعَلَى حَذْفِ مُضَافٍ أَى: وَقُودُهَا احْتِرَاقُ النَّاسِ، وَالْحِجَارَةُ: وَهِيَ جَمْعُ حَجْرٍ. كَجِبَالَةٍ جَمْعُ جَمَلٍ وَهُوَ قَلِيلٌ غَيْرُ مَنْقَاسٍ، وَالْمُرَادُ بِهَا الْإِصْنَامُ الَّتِي نَحْتُوها وَقَرَنُوا بِهَا أَنْفُسَهُمْ وَعَبَدُوهَا طَمَعًا فِي شِفَاعَتِهَا وَالْإِنْتِفَاعِ بِهَا وَاسْتِدْفَاعِ الْمِضَارِ لِمَكَانَتِهِمْ، وَيَدُلُّ عَلَيْهِ قَوْلُهُ تَعَالَى: إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصْبُ جَهَنَّمَ. عَذِبُوا بِمَا هُوَ مَنْشَأُ جَرْمِهِمْ كَمَا عَذِبَ الْكَافِرُونَ بِمَا كَنَزُوهُ، أَوْ بِنَقِيضِ مَا كَانُوا يَتَوَقَّعُونَ زِيَادَةَ فِي تَحْسُرِهِمْ. وَقِيلَ: الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ الَّتِي كَانُوا يَكْنُزُونَهَا وَيَغْتَرُونَ بِهَا، وَعَلَى هَذَا لَمْ يَكُنْ لِتَخْصِيصِ إِعْدَادِ هَذَا النُّوعِ مِنَ الْعَذَابِ بِالْكَفَّارِ وَجْهٌ، وَقِيلَ: حِجَارَةُ الْكِبْرِيَّتِ وَهُوَ تَخْصِيصٌ بِغَيْرِ دَلِيلٍ وَإِبْطَالٌ لِلْمَقْصُودِ، إِذِ الْغَرَضُ تَهْوِيلُ شَأْنِهَا وَتَفَاقُمُ لَهَا بِحَيْثُ تَتَقَدُّ بِمَا لَا يَتَقَدُّ بِهِ غَيْرُهَا، وَالْكَبْرِيَّتُ تَتَقَدُّ بِهِنَّ كُلِّ نَارٍ وَإِنْ ضَعُفَتْ، فَإِنَّ صَحْحَ هَذَا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا فَلَعَلَّهُ عَنَى بِهِ أَنَّ الْأَحْجَارَ كُلَّهَا لِتِلْكَ النَّارِ كَالْحِجَارَةِ

الکبریت لسائر النيران، ولما كانت الآية مدنية نزلت بعد ما نزل بمكة قوله تعالى في سورة التحريم نارا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ، وسموه صمغ تعريف النار، ووقوع الجملة صلة «بازائها» فإنها يجب أن تكون قصة معلومة.

ترجمہ:

"پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں" ماقبل آیت کریمہ میں ایسی چیزوں کا بیان ہوا جن کے ذریعے وہ نبی کریم کی نبوت و شریعت کی پہچان کر سکتے ہیں۔ اور ان کی آسانی کے لئے حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا۔ اس آیت میں خلاصہ کلام پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے تمام مددگاروں کو بلا کو پوری کوشش کر لیں کہ اس کلام کی مثل لاؤ۔ پھر جب وہ عاجز آجائیں تو قرآن کریم کے حق ہونے کو تسلیم کر لو اور اس پر ایمان لاؤ۔ اور اس کلام کے پیش کرنے والے کو سچا نبی تسلیم کر لو۔ ورنہ اس عذاب کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جو کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اور وہ آگ کا عذاب اتنا شدید ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، ماقبل کلام کے تقاضا کے مطابق اس مقام پر،

فان لم تاتوا فلن تاتوا

ہونا چاہئے تھا لیکن اتیان کا وہ فعل جو بسورۃ کے ساتھ مقید ہے اس کو فعل کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔ جو عام ہے اتیان اور اس کے علاوہ وہ سب کو شامل ہے۔ اس کی حکمت ایجاز اور اختصار ہے اور اس مقام پر چاہئے تو یہ تھا جو جواب شرط،

فامنوا به واتر کو العناد

ذکر کیا جاتا لیکن یہاں،

لازم الجزاء فاتقوا النار التي الى آخرة

بطور کنایہ ذکر کیا گیا ہے اور وہ لازم سے ملزوم کی طرف انتقال ہے تاکہ کئی عنہ ثابت ہو جائے اور عناد کی ہولناکی ظاہر ہو جائے اور اختصار کے ساتھ وعید کی تصریح ہو جائے۔

یہاں جملہ شرطیہ کا آغاز اس حرف کے ساتھ کیا گیا ہے جو متکلم کے شک کو ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ ان ہے۔ حالانکہ سیاق و سباق کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں کہہ شرط اذا ذکر کیا جاتا۔ جو یقین کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ متکلم اللہ کریم کی ذات ہے جس کو ان کا اس کے مقابلے میں کلام نہ لانے میں ذرا برابر شک نہ تھا اور ان کا عجز مسلم تھا اس وجہ سے اللہ کریم نے شرط اور جزاء کے درمیان بطور جملہ معترضہ ان کے کلام نہ لانے کی نفی ذکر فرمادی ہے اس کی وجہ کفار کا مذاق اڑانا اور اس کے ساتھ طنز کرنا مقصود تھا۔ اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ کتنے جاہل اور نادان ہیں کہ وہ اس چیز کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کا وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اور اس کے انسانی کلام نہ ہونے کو بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ پھر بھی وہ اسے اللہ کریم کا کلام تسلیم نہیں کرتے۔

نوٹ: اس مقام پر کلمہ شرط ان ذکر فرمایا متکلم کے شک کو ظاہر کرتا ہے اور اذا ذکر نہیں فرمایا جو متکلم کے یقین کو ظاہر کرتا،

اس کی دو وجوہات تھیں۔

(1) یہ انداز تکلم بطور طنز اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ ایسے عقل کے اندھے ہیں کہ جس کلام کا حق ہونا ظہر

من الشمس ہے اسے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

(2) ان کا لفظ کفار کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے، نہ کہ متکلم کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے کیونکہ کافر

لوگ اس کی مثل کلام پیش کرنے سے عاجز آنے میں شک کر رہے تھے۔ اور انہوں نے ابھی تک اس میں تدبر ہی نہیں کیا تھا اسی

لئے وہ پریشان تھے کہ وہ ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں یا نہیں۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لم تفعلو کے جملہ

میں تفعلو کا عامل ان شرطیہ ہے۔ یا لم نافیہ ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ تفعلو کا عامل لم ہے ان نہیں

جس کی چند وجوہات درج ذیل ہیں۔

☆ لم تفعلو کے قریب ہے نسبت ان کے اور عامل قریب عمل کرنے کا زیادہ حق دار ہوتا ہے۔

☆ لم کا عمل واجب ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ فعل مضارع پر ہی داخل ہوتا ہے۔ جبکہ ان کا اپنے مابعد میں عمل جائز ہوتا

ہے اور وہ جملہ اسمیہ پر بھی داخل ہوتا ہے۔ اس لئے تفعلو کا عامل لم ہی ہوگا۔

☆ لم اپنے مابعد کے ساتھ مل کر فعل ماضی منفی کا معنی دیتا ہے۔

گویا کہ وہ فعل کا جزء ہے اس لئے حرف ان، لم اور اس کے مابعد فعل کے مجموعہ پر داخل ہوگا اور عبارت اس طرح ہوگی۔

ان ترکتہ الاتیان... الی اخرہ

اس لئے ان دونوں کا اجتماع جائز ہے۔ گویا ان دونوں کے مجموعہ پر داخل ہے۔

حرف لن کی تحقیق:

یہ لا کی طرح زمانہ مستقبل میں فعل کی نفی کرنے کے لئے اور اس میں تاکید پیدا کرنے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے اور یہ لا سے

زیادہ بلوغ ہے اس کی اصل میں دو قول ہیں، سیبویہ اور ظلیل نحوی کی ایک روایت کے مطابق یہ حرف مرتجل ہے (یعنی کسی سے ماخوذ

نہیں) اور ظلیل نحوی کے نزدیک یہ اصل میں لا ان تھا ان کے ہمزہ کو کثرت استعمال کی وجہ سے گرا دیا اور اجتماع ساکنین سے

الف کو بھی گرا دیا تو لن ہو گیا۔ فراء کے نزدیک اصل میں لام تھا الف کو نون سے بدل دیا تو لن ہو گیا۔

"النار"

یہاں اس کو معرفہ اس لئے ذکر کیا کہ سورۃ تحریم جو مکہ میں نازل ہوئی اس میں اس کا ذکر ہو چکا ہے اور اسی کی طرف اشارہ

کرنا مقصود ہے گویا یہ قصہ ان میں مشہور تھا۔

"وقود"

واؤ کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی ایندھن، اور واء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے جس کا مطلب آگ جلانا ہے۔

"الحجارة"

اس کا مفرد الحجر ہے اور اس کا معنی پتھر ہے۔ مگر یہاں اس سے مراد کفار کے معبودان باطلہ ہیں جن کو انہوں نے پتھروں سے تراش کر بنایا ہوا تھا۔ اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ اور انہی سے امیدیں بھی وابستہ کرتے تھے۔ اور ان کافروں کو ان کے معبودوں کے ساتھ عذاب دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ ان کے کفر و شرک کا سبب تھے۔ جس طرح سونے اور چاندی کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کو سونا اور چاندی پگھلا کر انہی کے ساتھ سزا دی جائے گی۔

کفار کے اس خیال کو رد کرنے کے لئے ان کے یہ خدا ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں یا انہیں عذاب سے بچا سکتے ہیں بلکہ یہ تو اللہ ان کے لئے شدید ترین عذاب ہوگا۔

حجارة کا دوسرا معنی سونا اور چاندی ہے لیکن اس صورت میں اس عذاب کی کفار کے ساتھ تخصیص نہیں ہوگی کیونکہ سونا اور چاندی کی زکوٰۃ نہ دینے والے مومنوں کو بھی اس کے ساتھ سزا دی جائے گی۔

گندھک والے پتھر جن کے ساتھ آگ روشن کی جاتی ہے، لیکن امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں اس کے ساتھ خاص کرنا بغیر دلیل کے ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور آیت کے مقصود کے خلاف ہے۔

متن:

أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ

هيئت لهم وجعلت عدة لعذابهم. وقرء: «أعدت» من العتاد بمعنى العدة، والجملة استئناف، أو حال بإضمار قد من النار لا الضمير الذي في وقودها، وإن جعلته مصدراً للفصل بينهما بالخبر. وفي الآيتين ما يدل على النبوة من وجوه:

الاول: ما فيها من التحدى والتحريض على الجذب والوسع في المعارضة بالتقريع والتهديد، وتعليق الوعيد على عدم الإتيان مما يعارض أقصر سورة من سور القرآن، ثم إنهم مع كثرتهم واشتبارهم بالفصاحة وتهالكهم على المضادة لم يتصدوا لمعارضته، والتجؤوا إلى جلاء الوطن وبذل البهج.

الثاني: أنها يتضمنان الإخبار عن الغيب على ما هو به، فإنهم لو عارضوه بشيء لامتنع خفاوة عادة سيما والطاعنون فيه أكثر من الذابيين عنه في كل عصر.

الثالث: أنه صلى الله عليه وسلم لو شك في أمره لما دعاهم إلى المعارضة بهذه المبالغة، مخافة أن يعارض فتدحض حجته.

وقوله تعالى: أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ دل على أن النار مخلوقة معدة الآن لهم.

ترجمہ:

اور وہ آگ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اور یہ کافروں کی سزا کا انتظام ہے۔ اور "أعدت" کو "اعتدت" کر کے بھی پڑھا گیا ہے۔ اس وقت یہ "عتاد" سے مشتق ہوگا جو "عدة" کے معنی میں ہے اور "عدة" اس ساز و سامان کو کہا جاتا ہے۔ جو مشکلات میں بچاؤ کے لئے تیار کیا جاتا ہے جیسے گھوڑا وغیرہ اور ترکیب کلام میں یہ یا تو جملہ متانفہ ہے یا "النار" سے حال ہے اگر اسے حال بنایا جائے تو اس سے پہلے "قد" محذوف ہوگا۔ "وقودها" کی "ها" ضمیر سے اسے حال بنانا جائز نہیں، جبکہ مصدر کو "وقود" کو مصدر کے معنی میں کیا جائے کیونکہ اس صورت میں حال اور ذوالحال کے درمیان خبر کے ساتھ فاصلہ لازم آتا ہے جو کہ "الناس" اور "الحجارة" ہے حال اور ذوالحال کے درمیان اجنبی چیز سے فاصلہ جائز نہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیات نبی کریم ﷺ کی نبوت پر کئی طرح سے دلالت کرتی ہے۔ ان میں سے تین یہ ہیں،

1- آپ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن پاک پیش کیا، اس کی مثل لانے کا چیلنج کیا۔ اور جماعتوں اور مددگاروں سے مدد حاصل کرنے کا بھی کہا گیا۔ لیکن جب وہ مثل لانے سے عاجز ہو گئے تو عذاب کی وعید سنائی گئی۔ جو ان کے لئے تیار کیا گیا تھا اور پھر مزید ڈرایا اور قرآن کی مثل چھوٹی سی بھی صورت نہ لانے کے ساتھ عذاب کو معلق کر دیا، لیکن وہ اپنی فصاحت و بلاغت میں ماہر ہونے اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت پر حریص ہونے کے باوجود ایسا کلام پیش نہ کر سکے۔ اور نبی کریم ﷺ پر ظلم و ستم اور شہید کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔

اس سے ثابت ہوا کہ کوئی بھی اس کلام کی مثل نہیں لاسکتا کیونکہ یہ کلام حق ہے اور اس کو نبی کریم ﷺ لے کر آئے جو کہ غائب تھا اور غائب کلام کا آپ پر نازل ہونا آپ کے نبی ہونے کی دلیل ہے۔

2- نبی کریم ﷺ نے "لن تفعلوا" کہہ کر غائب کی خبر دی اور یہ پیشین گوئی فرمادی کہ وہ ایسا کلام کبھی بھی نہیں لا سکتے، اور یہ چیلنج آج تک بھی موجود ہے جس کا کوئی بھی مقابلہ نہ کر سکا۔

3- اگر نبی کریم ﷺ کو ذرا برابر بھی شک ہوتا وہ اس کی زوردار انداز میں چیلنج نہ فرماتے اس ڈر سے کہ کہیں اس کے جواب میں کلام پیش کر کے آپ کی دلیل کو باطل ہی نہ کر دے۔

لہذا ثابت ہوا کہ جہنم اب مخلوق ہے اور وہ کفار کے لئے تیار کر دی گئی ہے۔

حرف لم کا استعمال:

(لم) حرف (لم)۔

کے بعد اگرچہ فعل مستقبل آتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے۔ اور اس پر ہمزہ استفہام تقریر کے

لے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"اَلَمْ نُوْتِرِكَ فِیْہَا وَّلِیْدًا" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 18)

کیا ہم نے لڑکپن میں تمہاری پرورش نہیں کی تھی۔

فعل کا معنی:

(فعل) الفعل (Verb)

کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصد کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دو سے حیوانات اور جمادات کی طرف سے ہو یہی معنی لفظ فعل کے ہیں۔

لفظ وقی کا مفہوم:

(وقی) وقی (ض) (Fear of ALLAH, Piety)

وقایتہ ووقاء کے معنی کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"قَوَّاهُمْ اللّٰهُ" (سورۃ الانسان آیت نمبر 11) تو خدا ان کو بچالیا۔

التقویٰ

اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک

دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"فَمَنْ اَتَّقَىٰ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 35)

جو شخص ان پر ایمان لا کر خدا سے ڈرتا رہے گا اور اپنی حالت درست رکھے گا۔ ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ

وہ غمناک ہوں گے۔

"وَوَقَّاهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 56)

اور اللہ نے انہیں آگ کے عذاب سے بچالیا۔

"وَمَا لَہُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَاقٍ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 34)

اور انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں۔

"مَا لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَلَا وَاقٍ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 37)

تو اللہ کے آگے نہ تیرا کوئی حمایتی ہوگا نہ بچانے والا۔

"قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا" (سورة البقرة آیت نمبر 6)

اپنے آپ کو اور اپنے اہل عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ۔

نار کی تعریف:

(نور) نار (Fire, Flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"أَفْرَأَيْتُمْ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ" (سورة الواقعة آیت نمبر 71)

تو بھلا بتاؤ تو وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو۔

حجر کے کہتے ہیں؟:

(حجر) الحجر (Stone)

سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع احجار و حجارة آتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَقَوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورة البقرة آیت نمبر 24)

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

تحقیق لفظ عدد:

(عدد) العدد (Number)

الاعداد تیار کرنا مہیا کرنا یہ عدد سے ہے جیسے سقی سے اسقاء اور اعدادت ہذا لک کے معنی ہیں کہ یہ چیز میں نے

تمہارے لئے تیار کر دی ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے ہو اور جس قدر چاہو اس سے حسب ضرورت لے سکتے ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" (سورة الانفال آیت نمبر 60)

اور ان کے لئے تیار رکھو جو قوت تمہیں بن پڑے۔

"أُولَئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا" (سورة النساء آیت نمبر 18)

ایسے لوگوں کے لئے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

"وَأَعْتَدْنَا لِلْمَن كَذَّب" (سورة الفرقان آیت نمبر 11)

اور ہم نے جھٹلانے والوں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا" (سورة يوسف آیت نمبر 31)

اور ان کے لئے ایک محفل مرتب کی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اعتدت بھی اسی (عد) سے ہے اور آیت کریمہ:

"وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 185) تم روزوں کا شمار پورا کر لو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کر لو۔

"اَيَّاماً مَّعْدُودَاتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 184)

گنتی کے چند روز میں ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 203)

اور اللہ کی یاد کرو گئے ہوئے دنوں میں۔

میں سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ایام
معدودۃ سے یوم النحر اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں اس صورت میں یوم النحر بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔
العداد اس مقرر وقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ما زالت امة خيبر تعادني که خيبر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار
بار عود کرتی رہی ہے عدان السنی کے معنی کسی چیز کے موسم یا زمانہ کے ہیں۔
نوٹ: کفر اور ناس کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 25]

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ
مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (25)

"اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں جب
انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا صورت دیکھ کر کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا
اور وہ (صورت میں) ملتا جلتا انہیں دیا گیا اور ان کے لئے ان باغوں میں ستھری بیاباں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ
رہیں گے۔"

متن:

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ

عطف علی الجملة السابقة، والمقصود عطف حال من آمن بالقرآن العظيم ووصف

ثوابہ، علی حال من کفر بہ، و کیفیتہ عقابہ علی ما جرت بہ العادة الإلهية من أن يشفع
الترغيب بالترهيب، تنشيطاً لا كتساب ما ينبغي، وتثبيتاً عن اقرار ما يردى لا
عطف الفعل نفسه حتى يجب أن يطلب له ما يشاكله من أمر أو نهي فيعطف عليه أو
على فاتقوا، لأنهم إذا لم يأتوا بما يعارضه بعد التحدى ظهر إعجازہ، وإذا ظهر ذلك فمن
كفر به استوجب العقاب، ومن آمن به استحق الثواب، وذلك يستدعي أن يخوف
هؤلاء ويبشر هؤلاء، وإنما أمر الرسول صلى الله عليه وسلم، أو عالم كل عصر، أو كل
أحد يقدر على البشارة بأن يبشرهم، ولم يخاطبهم بالبشارة كما خاطب الكفرة
تفخيماً لشأنهم وإيذاناً بأنهم أحقاء بأن يبشروا ويهنأوا بما أعد لهم.
وقرء «وَبَشِّرِ» على البناء للمفعول عطفاً على أعدت فيكون استئنافاً، والبشارة: الخبر
السار فإنه يظهر أثر السرور في البشارة، ولذلك قال الفقهاء بالبشارة: هي الخبر الأول
حتى لو قال الرجل لعبيدة: من بشرني بقدم ولدی فهو حر، فأخبروه فرادى عتق
أولهم، ولو قال: من أخبرني عتقوا جميعاً، وأما قوله تعالى:
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ فعلى التهكم أو على طريقة قوله: تَحِيَّةٌ بَيْنَهُمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ.

ترجمہ:

وبشر الذين آمنوا... الخ

کا عطف فاتقوا النار التي... الخ پر ہے۔ تو دریں صورت معنی یہ ہوگا کہ قرآن کریم کے مقابلے میں کلام لانے سے
عاجز ہونے اور اسلام نہ قبول کرنے کے سبب عذاب کے مستحق ہیں اور جنہوں نے اسلام قبول کر لیا وہ ثواب کے مستحق۔ اسی وجہ
سے کفار کو وعید اور مسلمانوں کو خوشخبری سنائی گئی اور یہ استحقاق مناسبت ہے معطوف و معطوف الیہ کے درمیان۔
ما قبل آیت میں حق قبول نہ کرنے والے بد بختوں کا ذکر و انجام بیان ہوا ہے۔ اللہ کریم کی یہ عادت و طریقہ ہے کہ جب
بھی کافروں کو عذاب کی وعید سناتا ہے تو اس کے بعد مومنین، اطاعت کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری بھی سناتا ہے اور انعامات
عطا کرنے کا وعدہ بھی کرتا ہے۔ تاکہ سامع کو دونوں کا انجام معلوم ہو جائے اور وہ عبرت حاصل کریں، یہاں پر بھی اللہ کریم نے
اول ڈر کا بیان کیا اور بعد میں خوشخبری کی نوید سنائی۔

بشریہ فعل امر کا صیغہ ہے اور بشیر سے مشتق ہے اس کا معنی خوشخبری دینا ہے، یہ بشارت سے اخذ ہے اور بشارت اس خبر کو
کہتے ہیں۔ جس کا اثر چہرے اور رخساروں پر ظاہر ہو اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جس آدمی نے اپنے غلاموں کو کہا

من بشرني بقدم ولدی فهو حر

تو آزاد وہی ہوگا جو سب سے پہلے خبر سنائے گا۔ اور جس نے ایسا کہا

من اخبرتنی هذا فهو حر

اس صورت میں جتنے بھی غلام خریدیں گے سب کے سب آزاد ہوں گے۔ کیونکہ خوشی کا اثر خبر اقول سے ہی واضح ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بشارت کا معنی خوشخبری دینا ہے تو اس آیت سے کیا مراد ہوگا؟

فبشرهم بعذاب الیم

کیونکہ عذاب کی خبر باعث مسرت نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کفار کو چڑانے اور بطور استہزاء ہے۔ بشارت کے دو معانی ہیں۔ متعارف و غیر متعارف

1- متعارف وہ ہے جس سے خوشی کا اثر ظاہر ہوتا ہے

2- غیر متعارف وہ ہے جو غم زدہ کرنے والی ہے جیسا کہ قول شاعر،

تَحِيَّةٌ بَيْنَهُمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ.

یعنی ہمارے درمیان پہلا سلام دردناک ضرب ہے۔ حالانکہ تحیہ سلامتی کی علامت ہے، نیز بشر کو بشر ماضی مجہول کا صیغہ

پڑھا گیا ہے اور اس صورت میں اس کا عطف،

أعدت للكافرين

پر ہی ہوگا اور اعدت۔۔ الخ کی مثل یہ بھی جملہ متانقہ ہے۔

متن:

وَالصَّالِحَاتِ جَمْعٌ صَالِحَةٌ وَهِيَ مِنَ الصِّفَاتِ الْغَالِبَةِ الَّتِي تَجْرِي مَجْرَى الْأَسْمَاءِ كَالْحَسَنَةِ
قَالَ الْخَطِيبِيُّ:

كَيْفَ الْهَجَاءِ وَمَا تَنَفَّكَ صَالِحَةٌ... مِنْ أَلٍ لِإِمْرٍ بظَهْرِ الْغَيْبِ تَأْتِيَنِي

وہی من الاعمال ما سوغه الشرع وحسنه، وتأنيثها على تأويل الخصلة، أو الخلة، واللام

فيها للجنس، وعطف العبل على الإيمان مرتباً للحكم عليهما إشعاراً بأن السبب في

استحقاق هذه البشارة مجموع الامرين والجمع بين الوصفين، فإن الإيمان الذي هو

عبارة عن التحقيق والتصديق أس، والعمل الصالح كالبناء عليه، ولا غناء بأيسر لا

بناء عليه، ولذلك قلبا ذكر المنفردين، وفيه دليل على أنها خارجة عن مسمى الإيمان

إذا اصل أن الشيء لا يعطف على نفسه ولا على ما هو داخل فيه.

أَنَّ لَهُمْ مَنْصُوبٌ بِنَزْعِ الْخَافِضِ وَإِفْضَاءِ الْفِعْلِ إِلَيْهِ، أَوْ مَجْرُورٌ بِإِضْمَارِهِ مِثْلُ: اللَّهُ

لأفعلن. والجنة:

البرة من الجن وهو مصدر جنة إذا ستره، ومدار التركيب على الستر، سمي بها الشجر المظلل لالتفاف أغصانه للبالغة كأنه يستر ما تحته سترة واحدة قال زهير:

كَأَنَّ عَيْبِي فِي غَرْبِي مَقْتَلَةٌ... مِنَ النِّوَا ضَمِحَ تَسْقَى جَنَّةً سَحْقًا

أى فجلاً طوالاً، ثم البستان، لها فيه من الأشجار المتكاثفة المظلمة، ثم دار الشواب لها فيها من الجنان، وقيل: سميت بذلك لأنه ستر في الدنيا ما أعد فيها للبشر من أفنان النعم كما قال سبحانه وتعالى:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ وَجَمْعُهَا وَتَنْكِيرُهَا لِأَنَّ الْجَنَانَ عَلَى مَا ذَكَرَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا سَبْعُ: جَنَّةِ الْفَرْدُوسِ، وَجَنَّةِ عَدْنِ، وَجَنَّةِ النَّعِيمِ، وَدَارِ الْخُلْدِ، وَجَنَّةِ الْبَأْوَى، وَدَارِ السَّلَامِ، وَعِلِّيُّونَ، وَفِي كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهَا مَرَاتِبٌ وَدَرَجَاتٌ مُتَفَاوِتَةٌ عَلَى حَسَبِ تَفَاوُتِ الْأَعْمَالِ وَالْعِبَالِ. وَاللَّامُ فِي لَهَا تَدُلُّ عَلَى اسْتِحْقَاقِهِمْ إِيَّاهَا، لِأَجْلِ مَا تَرْتَبُ عَلَيْهِ مِنَ الْإِيمَانِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ، لِأَنَّ لَهَا فَائِدَةً لَا يَكْفِي النِّعَمَ السَّابِقَةَ، فَضلاً عَنْ أَنْ يَقْتَضِيَ ثَوَاباً وَجْزَاءً فِيمَا يَسْتَقْبَلُ بَلْ يَجْعَلُ الشَّارِعَ، وَمَقْتَضَى وَعْدَةِ تَعَالَى لَا عَلَى الْإِطْلَاقِ، بَلْ بِشَرْطِ أَنْ يَسْتَبِرَ عَلَيْهِ حَتَّى يَمُوتَ وَهُوَ مُؤْمِنٌ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: وَمَنْ يَزِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُوتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَقَوْلُهُ تَعَالَى لِنَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَأَشْبَاهُ ذَلِكَ، وَلَعَلَّهُ سَبَّحَانَهُ وَتَعَالَى لَمْ يَقِيدْهَا هُنَا اسْتِغْنَاءً بِهَا.

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ أَيْ مِنْ تَحْتِ أَشْجَارِهَا، كَمَا تَرَاهَا جَارِيَةً تَحْتِ الْأَشْجَارِ النَّابِتَةِ عَلَى شَوَاطِئِهَا. وَعَنْ مَسْرُوقٍ أَنَّهَا الْجَنَّةُ تَجْرِي فِي غَيْرِ أَخْدُودٍ: وَاللَّامُ فِي الْأَنْهَارِ لِلْجِنْسِ، كَمَا فِي قَوْلِكَ لِفُلَانٍ: بَسْتَانٌ فِي الْمَاءِ الْجَارِي، أَوْ لِلْعَهْدِ، وَالْمَعْهُودِ: هِيَ الْأَنْهَارُ الْمَذْكُورَةُ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ الْآيَةَ. وَالنَّهْرُ بِالْفَتْحِ وَالسُّكُونِ: الْمَجْرِي الْوَاسِعُ فَوْقَ الْجُدُولِ وَدُونَ الْبَحْرِ، كَالنَّيْلِ وَالْفِرَاتِ، وَالتَّرْكِييبُ لِلسَّعَةِ، وَالْمُرَادُ بِهَا مَأْوَاهَا عَلَى الْإِضْمَارِ، أَوْ الْمَجَازِ، أَوْ الْمَجَارِي أَنْفُسُهَا. وَإِسْنَادُ الْمَجْرِي إِلَيْهَا مَجَازٌ كَمَا فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا الْآيَةَ.

ترجمہ:

وہ عمل جس کو شریعت جائز قرار دے دے اور غلبہ استعمال میں یہ ان اسمائے جامدہ کے قائم مقام ہے جو موصوف کے بغیر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حسبہ کا لفظ ہے اسی طرح حظیہ شاعر آل لام کی تعریف میں لکھتا ہے۔

كَيْفَ الْهَجَاءِ وَمَا تَنْفَكَ صَالِحَةٌ... مِنْ آلٍ لَا يَرِي بِظَهْرِ الْعَيْبِ تَأْتِي

بذمت کیونکہ ہو سکتی ہے جبکہ آل لام کی طرف سے میری عدم موجودگی میں بھی انعام مجھ تک پہنچتے رہتے ہیں۔ اس شعر میں صالحہ کا لفظ بغیر موصوف کے ذکر کیا گیا ہے۔ آیت طیبہ میں صالحات کو مؤنث ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گویا اس سے پہلے الحاصل موصوف مخدوف تصور کیا جائے گا، اصل عبارت یوں تھی،

"الحصائل الصالحات"

حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ صالحہ وہ عمل ہوگا جس میں درج ذیل چار چیزیں ملحوظ خاطر ہوں گی۔

(1) علم (2) نیت (3) صبر (4) اخلاص

ہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پر "ال" کیسا ہے اور "امنوا" پر اس کے عطف سے کیا مراد ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "ال" ہنسی ہے اور اس کے دخول کا مقصد تمام اعمال صالحہ کا استغراق نہیں بلکہ اس سے وہ اعمال مراد ہیں جن کے کرنے کی عام طور پر انسان سے توقع ہوتی ہے۔

نیز ایمان پر عطف کرنے کا مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ جنت کی بشارت کا حقدار وہی ہوگا جو ایمان اور اعمال صالحہ دونوں سے مزین ہوگا۔ کیونکہ ایمان اس بشارت کی بنیاد ہے۔ اور اعمال اس کی عمارت، اور بنیاد بغیر تعمیر کے غیر مفید ہوتی ہے اسی طرح اعمال کے بغیر ایمان بھی غیر مفید ہوگا اور اس کو ایمان پر معطوف کر کے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ اعمال ایمان کے مفہوم میں داخل نہیں۔ بلکہ اس کے مفہوم سے خارج ہیں اور ایمان نفس تصدیق قلبی کا نام ہے، ورنہ معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان تغایر باقی نہیں رہے گا۔

"لہم" ہم سے پہلے لام اختصاص کے معنی میں ہے، اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مومنین ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے جنت کے مستحق ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں کیونکہ ان کے یہ اعمال اور ایمان، سابقہ نعمتوں کا بدل بھی نہیں ہو سکتے، قطع نظر اس کے کہ وہ مزید کے مستحق ہوں بلکہ وہ اس استحقاق کا سبب بھی اسی بنا پر ہیں کہ شارع نے ان کو جنت عطا کرنے کا وعدہ فرما دیا وہ بھی اس شرط پر کہ ان کی موت بھی ایمان پر ہوں ورنہ ان کے سارے اعمال ضائع ہوں گے۔

"ان لہم" یہ حرف جر کے حذف کے ساتھ یا تو منصوب ہے اور فعل کو بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کر دیا گیا اور یا بتقدیر حرف جر یہ مجرور ہے جیسے "لننزلن" میں لفظ اللہ میں دونوں احتمال ہیں۔

"جنات" اس کا مفرد جنة ہے، یہ جن سے نکلا ہے جس کا معنی چھپانا اور جہاں بھی کسی چیز کو چھپانے اور مخفی ہونے کے معنی

پائے جائیں۔ وہاں اسی مادہ سے کوئی لفظ مشتق کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً گھنے درخت کو جنت کہتے ہیں۔
"مجنون" جس کی عقل پوشیدہ ہو۔

"جنین" وہ بچہ جو پیدا ہونے سے پہلے فوت ہو جائے، جنۃ کا معنی ڈھال ہے۔ لیکن یہاں اس سے مراد بسا تین اور دارالشواب ہے کیونکہ وہ بھی اوجھل اور پوشیدہ ہے۔ اس کو نکرہ اور جمع ذکر کرنے کا سبب یہ ہے کہ جنت ایک نہیں بلکہ سات ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ جنتیں سات ہیں ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ جنت الفردوس ☆ جنت عدن ☆ جنت نعیم ☆ دارالخلد
☆ جنت الماوی ☆ دارالسلام ☆ علیون ☆

ان تمام اجنات کے مختلف درجے اور مراتب ہیں جو مومنین کو ان کے اعمال کے اعتبار سے عطا کئے جائیں گے۔
"الانہار" اس کا معنی کشادہ کرنا ہے، جب کوئی اپنے مخالف کو نیزہ مار کر زخمی کر دیتا ہے تو کہا جاتا ہے۔

نہر تہ بالرحم

کہ میں نے اس کے زخم کے نیزے کے ساتھ کھلا کر دیا۔ اور دن کی روشنی کو بھی نہار کہتے ہیں۔ بوجہ وسیع ہونے کے، اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اصل میں "ماء الانہار" تھا۔ حضرت مسروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت کی نہروں کا پانی بغیر اخدود اور کھائیوں کے بہتا ہے۔ اور اس پر الف لام کے دو احتمال ہیں۔

(1) جنسی: یعنی اس سے نہروں کا کوئی خاص فرد مراد نہیں۔

(2) عہد خارجی: اس سے مراد ایسی نہریں ہیں جن کا تذکرہ

فیہا انہار غیر اسن

میں ہے:

واسناد اجری مجاز کما فی قولہ تعالیٰ واخرجت الارض اثقالها الایہ

متن:

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا

قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْهُ مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا، أو خبر مبتدأ محذوف، أو جملة مستأنفة. كأنه لما قيل: إن لهم جنات، وقع في خلد السامع أثمارها مثل ثمار الدنيا، أو أجناس آخر فأزيح بذلك، وكُلَّمَا نصب على الظرف، وِرِزْقًا مفعول به، ومن الأولى والثانية للابتداء واقعتان موقع الحال، وأصل الكلام ومعناه: كل حين رزقوا مرزوقاً مبتدأ من الجنات مبتدأ من ثمرة، قيد الرزق بكونه مبتدأ من الجنات، وابتداءً منها بابتدائه من، ثمرة

فصاحب الحال الاولی رزقاً وصاحب الحال الثانیة ضمیرة البستکن فی الحال، ویمتثل أن ینکون من ثمره، بیاناً تقدم کما فی قولک: رأیت منک أسداً، وهذا إشارة إلى نوع ما رزقوا کقولک مشيراً إلى نهر جار: هذا الباء لا ینقطع، فإذک لا تعنی به العین المشاهدة منه، بل النوع المعلوم المستمر بتعاقب جریانه وإن کانت الإشارة إلى عینه، فالعنی هذا مثل رزقنا ولكن لما استحکم الشبه بینهما جعل ذاته ذاته کقولک: أبو یوسف أبو حنیفة.

مِنْ قَبْلِ أَى: من قبل هذا فی الدنيا، جعل ثمر الجنة من جنس ثمر الدنيا لتمیل النفس إلیه أول ما یرى، فإن الطباع مائلة إلى البألوف متنفرة عن غیره، ویتبدین لها مزیتة وکنه النعمة فیہ، إذ لو کان جنساً لم یعهد ظن أنه لا ینکون إلا كذلك، أو فی الجنة لأن طعامها متشابهة فی الصورة، کما حکى ابن کثیر عن الحسن رضی الله عنهما: (أن أحدهم یؤتی بالصحفة فیأکل منها، ثم یؤتی بأخری فیراها مثل الاولی فیقول ذلك، فیقول الملک: کل فاللون واحد والطعم مختلف)، أو کما

روی أنه علیه الصلاة والسلام قال: «والذی نفس محمد بیده، إن الرجل من أهل الجنة لیتناول الثمرة لیأکلها فما هی بواصلة إلى فیہ، حتی یندل الله تعالی مکانها مثلها»

. فلعلهم إذا رأوها على الهيئة الاولی قالوا ذلك، والاول أظهر لمحافظة على عموم کُلِّها فإنه یدل على ترديدهم هذا القول کل مرة رزقوا، والداعی لهم إلى ذلك فرط استغرابهم وتبجحهم بما وجدوا من التفاوت العظیم فی اللذة والتشابه البلیغ فی الصورة.

ترجمہ:

"کَلِّمَا" ظرف ہونے کے سبب منصوب اور تکرار کے لئے ہے یہ آیت کریمہ یا تو جنات کی صفت ثانیہ ہے یا پھر مبتداء محذوف کی خبر ہے جو "ہم" یا "ہی" ضمیر ہے، یا یہ جملہ متانفہ ہے اور منها اور من ثمرات من ابتدائیہ یا بیانہ ہیں۔ اور رزق بمعنی مرزوق مفعول بہذوالحال یا مبین ہے اور منها اور من ثمرات اس سے حال ہے۔

"متشابهاً" کا معنی ملتا جلتا، ایل دوسرے کی مثل ہے۔ "هذا" یہ اسم اشارہ ہے اور اس کا مشار الیہ رزق کی جنس

ہے نہ کہ کوئی رزق کا خاص فرد۔

"ازواج" جمع ہے زوج کی اور یہ مذکر و مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ ہر اس چیز کے لئے جس کا اسی جنس سے کوئی فرد ہو جیسے "زوج الخف"۔

"ازواج مطہرات"

صاف ستھری بیویاں یعنی حوریں۔ "مطہرۃ" مشتق من التطہیر ہے۔ اس کا معنی اجسام کو پاک کرنے کے ساتھ ساتھ افعال و اخلاق کو مہذب کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ تو پر معنی یہ ہوگا کہ وہ ازواج جن کو ہر اس عیب سے پاک کر دیا گیا جو عورتوں میں معیوب ہوتے ہیں۔ مثلاً حیض، نفاس، میل اور بد اخلاقی وغیرہ اس کو مطہرات، طاہرہ اور مطہرۃ بھی پڑھا گیا ہے۔ لیکن باب تفعیل سے اسم مفعول کا صیغہ پڑھنا زیادہ بہتر اور قریب از قیاس ہے۔ یعنی وہ جن کو اللہ کریم نے صاف ستھرا کر دیا ازواج کے لفظ کو دیکھتے ہوئے جمع مؤنث کا صیغہ اور اس کو جماعۃ کے معنی میں کرتے ہوئے واحد مؤنث کے صیغہ کا موصوف بنانا جائز ہے۔ جیسے النساء فعلت فعلن پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرۃ اور طاہرۃ پڑھنا بھی روا ہے۔

"خالدون" یہ مشتق ہے خلد یخلد سے۔ جمہور کے نزدیک جس کا معنی عرصہ دراز تک رہنا ہے اسی وجہ سے وہ اشیاء جو طویل عرصہ تک باقی رہتی ہیں انہیں "خوالد" کہتے ہیں۔ جیسے چولہے کے پتھر وغیرہ اور وہ عضو جو تا حیات بدستور قائم رہتا ہے اس کو بھی "خلد" کہتے ہیں اور اکثر مقامات پر "خالدون" کے بعد ابداء کے لفظ کا آنا اور،

وما جعلنا للبشر من قبلك الخلد

کہ ہم نے آپ سے پہلے کسی انسان کے لئے ہمیشگی نہ رکھی۔

یہ بھی مذکورہ بالا معنی کی تائید کرتے ہیں البتہ معتزلہ اس سے ایسی ہمیشگی مراد لیتے ہیں جو ختم نہیں ہونے والی اسی سبب سے وہ کبیرہ گناہ کرنے والے مومن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مستحق عذاب کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے (اہلسنت وجماعت) نزدیک وہ اپنی سزا بھگتے کے بعد جنت میں چلا جائے گا۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جنت اور اس کی نعمتیں ابدی ہیں جبکہ ابدان ایسے اجزاء سے مرکب ہے جن میں تغیر لازم ہے، تو جنتیوں کا جنت میں رہنا کیسے ممکن ہوگا؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جنتیوں کے ابدان ایسے اجزاء سے مرکب کئے جائیں گے جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جنت دار البقاء ہے، دار الفناء نہیں تو وہاں کھانا پینا کیسا جبکہ کھانے کا مقصد بھوک مٹانا اور نکاح کا مقصد بچے پیدا کرنا ہے، تو ایسی نعمتوں کا کیا مقصد؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جنت کی ابدی نعمتوں کو دنیا کی بعض چیزوں کے ساتھ صفات و اسماء میں اشتراک کی وجہ سے تشبیہ دی گئی ہے نہ کہ فی کل الوجہ ان کی مثل قرار دیا ہے۔ اور وہ لذت و نفع کا حصول ہے، جو جنتی حاصل کریں گے۔ اور تشبیہ کے لئے اتنا قدرتشاہہ ہی کافی ہے۔

جنتی لوگوں کو جو رزق دیا جائے گا وہ رزق اسی رزق کے مشابہ ہوگا جو وہ دنیا میں استعمال کرتے رہے۔ تاکہ اس اثری رزق کی غنیمت ظاہر ہو۔ وہ بہت مزے دار ہوگا تاکہ جنتی خوشدلی کے ساتھ استعمال کریں۔ حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ جب جنتیوں کو ایک تھال رزق سے بھرا ہوا پیش کیا جائے گا جو کہ دنیاوی رزق کی مثل ہوگا تو جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم دنیا میں استعمال کرتے تھے، فرشتے کہیں گے کھا کر تو دیکھو، اس کے ذائقہ میں بہت فرق ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صحیحی توجیہ کو زیادہ پسند کیا ہے۔ اور یہی "کَلِمًا" کے عموم کے موافق ہے کیونکہ "کَلِمًا" کا لفظ بار بار یہ الفاظ کہنے پر دلالت کرتا ہے کہ جب بھی انیس رزق دیا جائے گا تو اس کو عجیب گردانتے ہوئے اور اس بات پر فخر سمجھتے ہوئے کہ وہ اس لذت میں بہت فرق اور ان کی مشکوں میں بہت مشابہت محسوس کر رہے ہیں۔

متن:

وَأَتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا اعترض يقرر ذلك والضمير على الاول راجع الى ما رزقوا في الدارين
فإنه مدلول عليه بقوله عز من قائل هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ ونظيره قوله عز وجل:
إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أُولَىٰ بِهِمَا أی بجنسی الغنی والفقیر، وعلى الثاني إلى الرزق.
فإن قيل: التشابه هو التماثل في الصفة وهو مفقود بين ثمرات الدنيا والآخرة كما
قال ابن عباس رضي الله تعالى عنهما: ليس في الجنة من أطعمة الدنيا إلا الاسماء.
قلت: التشابه بينهما حاصل في الصورة التي هي مناط الاسم دون المقدار والطعم،
وهو كلف في إطلاق التشابه. هذا: وإن للآية الكريمة محملاً آخر، وهو أن مستلذات
أهل الجنة في مقابلة ما رزقوا في الدنيا من المعارف والطاعات متفاوتة في اللذة
بحسب تفاوتها. فيحتمل أن يكون المراد من هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا أَنَّهُ ثَوَابُهُ. ومن تشابهها
تماثلها في الشرف والمزية وعلو الطبقة. فيكون هَذَا في الوعد نظير قوله:

تُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ فِي الْوَعْدِ

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ مَا يَسْتَقْنَدُ مِنَ النِّسَاءِ وَيَزِمُ مِنْ أحوالهن، كالحيض والدم
ودنس الطبع وسوء الخلق. فإن التطهير يستعمل في الاجسام والاخلاق والافعال.
وقرء: «مطهرات» وهما لغتان فصيحتان يقال النساء فعلت وفعلن، وهن فاعلة
وفواعل. قال:

وَإِذَا الْعَذَابُ بِالدَّخَانِ تَقَنَّعَتْ... وَاسْتَعْجَلْتُ نَصَبَ الْقُدُورِ فَمَلَّتْ

فالجمع على اللفظ، والإفراد على تأويل الجماعة، ومطهرة بتشديد الطاء وكسر الهاء

بمعنى متطهرة، ومطهرة أبلغ من طاهرة ومطهرة للإشعار بأن مطهر أظهر من وليس هو إلا الله عز وجل. والزوج يقال للذكر والانثى، وهو في الاصل لها له قرين من جنسه كزوج الحف، فإن قيل: فائدة البطعم هو التغذي ودفع ضرر الجوع، وفائدة البنكوح التوالد وحفظ النوع، وهي مستغنى عنها في الجنة. قلت: مطاعم الجنة ومناكحها وسائر أحوالها إنما تشارك نظائرها الدنيوية في بعض الصفات والاعتبارات، وتسمى بأسمائها على سبيل الاستعارة والتمثيل، ولا تشاركها في تمام حقيقتها حتى تستلزم جميع ما يلزمها وتفيد عين فائدتها.

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ دائمون. والخلد والخلود في الاصل الثبات المديد دام أم لم يدم، ولذلك قيل للأثافي والاحجار خوالد، وللجزء الذي يبقى من الإنسان على حاله ما دام حياً خلداً، ولو كان وضعه للدوام كان التقييد بالتأبيد في قوله تعالى: خَالِدِينَ فِيهَا أَبَداً لغوا واستعماله حيث لا دوام، كقولهم وقف مخلد، يوجب اشتراكاً، أو مجازاً. والاصل ينفىها بخلاف ما لو وضع للأعم منه فاستعمل فيه بذلك الاعتبار، كإطلاق الجسم على الإنسان مثل قوله تعالى: وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ لَكِنِ الْمُرَادُ بِهِ هَاهُنَا الدوام عند الجمهور لها يشهد له من الآيات والسنن.

فإن قيل: الابدان مركبة من أجزاء متضادة الكيفية، معرضة للاستحالات البودية إلى الانفكاك والانحلال فكيف يعقل خلودها في الجنان. قلت: إنه تعالى يعيدها بحيث لا يعثورها الاستحالة بأن يجعل أجزاءها مثلاً متقاومة في الكيفية، متساوية في القوة لا يقوى شيء منها على إحالة الآخر، متعانقة متلازمة لا ينفك بعضها عن بعض كما يشاهد في بعض البعادين.

هذا وإن قياس ذلك العالم وأحواله على ما نبهنا ونشأه من نقص العقل وضعف البصيرة. واعلم أنه

متن:

واعلم أنه لما كان معظم اللذات الحسية مقصوراً على: المساكن والبطاعم، والبنائج، على ما دل عليه الاستقرار، كان ملاك ذلك كله الدوام والثبات، فإن كل نعمة جليلة إذا قارنها خوف الزوال كانت منغصة غير صافية من شوائب الألم، بشر

المؤمنين بها ومثل ما أعد لهم في الآخرة بأبهي ما يستلذ به منها. وأزال عنهم خوف الفوات بوعد الخلود ليدل على كمالهم في التمتع والسرور.

ترجمہ:

اور جان لو کہ چونکہ عظیم ترین حسی لذتیں منحصر ہیں رہائش، خوراک اور ازدواج پر جیسا کہ تفتیش و تجسس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ان سب باتوں کا کمال ان کا ہمیشہ رہنا اور پائیدار ہونا ہے، کیونکہ ہر بڑی سے بڑی نعمت کے ساتھ جب اس کو زوال کا اندیشہ آجاتا ہے تو وہ ناخوشگوازی کا باعث ہو جاتی ہے اور رنج و الم کی آمیزش سے پاک نہیں رہتی تو اللہ کریم نے مومنین کو جنت کی خوشخبری دی اور جو اخروی لذتیں ان کے لئے رکھی گئیں ان کی منظر کشی فرمائی، ان لذتوں کے ذریعے جو ان میں حسین ترین ہیں اور فوت ہونے کے اندیشہ کو ان سے دور فرمایا اور دوام کا وعدہ فرمایا تاکہ یہ وعدہ ان کے لئے مکمل قییش اور سرور پر دلالت کرے۔

بشر کی مفصل تحقیق:

(بشر) البشیر (Happy news)

التبشیر

کے معنی ہیں اس قسم کی خبر سنانا جسے سن کر چہرہ شدت فرحت سے ٹٹما اٹھے۔ مگر ان کے معانی میں قدر سے فرق پایا جاتا ہے۔ تبشیر میں کثرت کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور بشر تہ (مجرد) عام ہے جو اچھی و بری دونوں قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے۔ اور البشیر تہ احمد تہ کی طرح لازم و متعدی آتا ہے جیسے: بشر تہ فابشر یعنی وہ خوش ہوا: اور آیت کریمہ:

"إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُ لِكَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 45) اللہ تجھے بشارت دیتا ہے۔

میں ایک قرأت نیز فرمایا: "لَا تَوَجَّلْ إِنَّكَ تُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ قَالَ: ابَشِّرْ مُنُونِي عَلَى أَنْ مَسْتَقِي
الْكِبْرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ قَالُوا: بَشِّرْ نَاكَ بِالْحَقِّ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 53-54)

مہمانوں نے کہا ڈریے نہیں ہم آپ کو ایک دانشمند بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں وہ بولے کہ جب بڑھاپے نے آپ کو پکڑا تو تم خوشخبری دینے لگے اب کا ہے کی خوشخبری دیتے ہوں انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو سچی خوشخبری دیتے ہیں۔

"فَبَشِّرْ عِبَادِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 17)

تو میرے بندوں کو بشارت سنادو۔

"فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ" (سورۃ یس آیت نمبر 11)

سو اس کو مغفرت کے بشارت سنادو۔

استبشر کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے
 "وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ" (سورة آل عمران آیت نمبر 170)
 اور خوشیاں منا رہے ہیں اپنے پچھلوں کی جو ابھی ان سے نہ ملے۔
 "يَسْتَبْشِرُونَ بِدَعْوَةِ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلِ" (سورة آل عمران آیت نمبر 171)
 خوشیاں مناتے ہیں اللہ کی نعمت اور فضل کی۔
 "وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ" (سورة الحجر آیت نمبر 67)
 اور اہل شہر (لوط کے پاس) خوش خوش (دوڑے) آئے۔

بشارۃ اور بشری:

اور خوش کن خبر کو بشارۃ اور بشری کہا جاتا چنانچہ فرمایا:
 "هُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ" (سورة یونس آیت نمبر 64)
 ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔
 "لَا بُشْرَى يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ" [(سورة الفرقان آیت نمبر 22)
 اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔
 "وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى" (سورة هود آیت نمبر 69)
 اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔
 "يَا بُشْرَى هَذَا غُلَامٌ" (سورة يوسف آیت نمبر 19)
 زہے قسمت یہ تو حسین لڑکا ہے۔
 "وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَى" (سورة الانفال آیت نمبر 10)
 اور یہ تو اللہ نے کیا مگر تمہاری خوشی کو۔

عمل کا معنی:

(عمل) العمل (Work, Business)

ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃ صادر ہو یہ فعل سے اخص ہے کیونکہ فعل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے۔ مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف البقر العوامل ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لئے استعمال ہوا

ہے نیز عمل کا لفظ اچھے اور بری دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے، قرآن میں:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 277)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے۔

لفظ صالح کا استعمال:

(صالح) الصالح (Good, Kind)

(درست، با ترتیب) یہ فساد کی ضد ہے عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں قرآن کریم میں لفظ صالح کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سیئۃ کے چنانچہ فرمایا:

"خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 102)

انہوں نے اچھے اور برے عملوں کے ملا دیا تھا۔

جنت کا معنی:

الجنة (Paradise, Garden)

ہر وہ باغ جس کی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے جنت کہلاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِهُمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ" (سورۃ ساء آیت نمبر 15)

(اہل) سبا کے لئے ان کے مقام بودباش میں ایک نشانی تھی (یعنی دو باغ ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف۔

اقسام جنت اور ان کے نام:

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جنات جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔

(1) جنۃ الفردوس (2) جنۃ عدن (3) جنۃ النعیم (4) دارالخلد (5) جنۃ المآوی (6) دارالسلام (7) علیین۔

تحقیق جری بجرى:

(جری) جری (ض) (Flow)

جرية و جریا و جریانا کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ پانی اور پانی کی طرح چلنے والی چیزوں کے متعلق

استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 51)

اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہ رہی ہیں۔ میری نہیں ہیں۔

"جَنَّاتٌ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 31)

باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

"وَلِتَجْرِيَ الْفُلُكُ" (سورۃ الروم آیت نمبر 46)
اور تاکہ کشتیاں چلیں۔

"فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ" (سورۃ العنكبوت آیت نمبر 12)
اس میں چشمے بہ رہے ہوں گے۔

اور آیت کریمہ: "إِنَّا لَنَاطِقِي الْمَاءِ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ" (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 11)
جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم لوگوں کو کشتی میں سوار کر لیا۔

میں جاریہ سے مراد کشتی ہے اس کی جمع جوار آتی ہے جیسے فرمایا:۔

"وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 24)
اور جہاز جو اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔

"وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ" (سورۃ الشوری آیت نمبر 32)

اور اس کی نشانیوں سے ہیں دریا میں چلنے والیاں جیسے پہاڑیاں۔

اور پرند کے سنگد انہ کو جریہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کھانا چل کر وہاں پہنچتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ طعام کا مجری بنتا ہے۔

الاجریات عاوت جس پر انسان چلتا ہے۔ الجری وکیل۔ یہ لفظ رسول اور وکیل سے اخذ ہے۔ اور جرمت جریا کے معنی وکیل

بنا کر بھیجنے کے ہیں اور حدیث میں ہے: یہاں یہ لفظ اپنے اصل معنی پر بھی محمول ہو سکتا ہے یعنی شیطان اپنے حکم کی بجا آوری اور

اطاعت میں بہ جانے پر تمہیں برا بیخیز نہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جری بمعنی رسول یا وکیل سے مشتق ہو اور معنی یہ ہو گئے

کہ شیطان کی وکالت اور رسالت کے سرپرست مت بنو گویا یہ آیت کریمہ:

"فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 76)

تو شیطان کے دوستوں سے لڑو۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا:

"إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 175)

وہ تو شیطان ہی ہے کہ اپنے دوستوں سے دھمکاتا ہے۔

لفظ تحت کا مفہوم:

(تحت) تحت (The Inferior Part)

(اسم ظرف) یہ فوق کی ضد ہے قرآن میں ہے:

"لَا تَكُلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَوَمِنْ تَحْتِهِمْ أَرْجُلُهُمْ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 66)
تو (ان پر رزق بینہ کی طرح برستا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

"جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ" (سورۃ الحج آیت نمبر 23)
(نعت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

"فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا" (سورۃ مريم آیت نمبر 24)
اس وقت ان کے نیچے کی جانب سے آواز دی۔

تحت اور اسفل میں فرق:

تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلا حصہ کو کہتے ہیں۔
المال تحتہ (مال اس کے نیچے ہے) اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے۔

حدیث میں ہے: لا تقوم الساعة حتى يظهر النحوت
کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ تا وقتیکہ کینے لوگ غلبہ حاصل نہ کر لیں۔
بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں آیت کریمہ:-

"وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 3-4)
اور جب یہ زمین ہموار کر دی جائے گی اور جو کچھ اس میں سے اسے نکلا کر باہر ڈال دے گی۔
کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

نہر کی تعریف:

(نہر) النهر (Stream, Canal)

بافراط پانی بننے کے مجری کو کہتے ہیں۔ کی جمع انہار آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَتَجْرِي خِلَالَهُمَا نَهْرًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 33)
اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔

تشبیہ کا مفہوم:

(ش ب ۵)

الشبيبة والشبة کے اصل معنی مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں باہم مماثل ہونا یا عدل ظلم میں اور دو چیزوں کا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکیں شبہۃ کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:

"وَأَنبِئِهِمْ بِمِثْلِهِمْ" (سورة البقرة آیت نمبر 25)

اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے میں متشابہا کے معنی یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔

لفظ زوج کی تحقیق عمیق:

(زوج) الزوج (A Couple, Pair)

جن حیوانات میں نر اور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نر اور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیاء میں جفت کو زوج کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ پھر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى" (سورة القيامة آیت نمبر 39)

اور (آخر کار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور عورت۔

"وَزَوْجِكَ الْحَبَّةَ" (سورة البقرة آیت 35) اور تیری بی بی جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زوجة (تا کے ساتھ) کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے:

فبکا بناتی شجوهن و زوجتیتو

میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔

اور زوج کی جمع ازواج آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"هُمُ وَأَزْوَاجُهُمْ" (سورة یس آیت نمبر 56) وہ اور ان کے جوڑے۔

اور آیت: "أَحْسَرُوا وَالَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجُهُمْ" (سورة الضافات آیت نمبر 22)

جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔

میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو فضل میں ان کی اقتداء کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:

"إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ" (سورة الحجر آیت نمبر 88)

اس کی طرف جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔

اشباہ و اقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد ہیں اور آیت:

"سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ" (سورة یس آیت نمبر 36)

پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم کی) چیزیں پیدا کیں۔

نیز: "وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ" (سورة الذاریات آیت نمبر 49)

اور تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔ میں اس بات پر تشبیہ کی ہے۔ کہ تمام چیزیں جو ہر ہوں یا عرض مادہ و صورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بتا رہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صالح (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تشبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خلقنا زوجین) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے بلکہ نفس ترکیب سے تو کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر تشبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جو ہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے لہذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت،

"أَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتَّىٰ" (سورۃ طٰ آیت نمبر 53)

طرح طرح کی مختلف روئیدگیاں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنی آیت:

"مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 10)

ہر قسم کی عمدہ چیزیں (آگائیں) اور آیت کریمہ:

"ثُمَّ آيَةَ أَزْوَاجٍ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 143)

(نرا اور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔

میں مراد ہیں۔

اور آیت کریمہ: "وَ كُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً" (سورۃ الواقعہ آیت نمبر 7)

میں ازواج کے معنی ہیں قرناء یعنی امثال و نظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو چنانچہ اس کے بعد اصحاب المیمنہ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَ إِذَا النُّفُوسُ رُجِعَتْ" (سورۃ التویر آیت نمبر 7) اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔

میں بعض نے زوجت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہر پیر و کار کو اس پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائیگا۔ جیسا کہ آیت:

"أَحْسَبُ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 22)

میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس روز روحوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائیگا جیسا کہ آیت،

"يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" (سورۃ الفجر آیت نمبر 27-28)

اے اطمینان پانے والی جان اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ میں بعض نے ربک کے معنی صاحبک یعنی بدن ہی کے ہیں اور بعض کے نزدیک زوجت سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کر دیا جائیگا جیسا کہ آیت کریمہ:

"يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّخْتَصِرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 30)

جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائیگا۔

میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

"وَزَوْجِنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 54)

اور ہم انہیں حور عین کا ساتھی بنا دیں گے۔

میں زوجنا کے معنی باہم ساتھی اور رفیق اور رفیق بنا دینا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زوجنا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازواجی تعلقات نہیں ہوں گے کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بحور کی بجائے زوجنا ہم حورا کہتا جیسا کہ زوجتہ امرءہ کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔

لفظ طہارت کا معنی اور اقسام:

(طہر) طہرت (Cleanliness)

طہارت دو قسم پر ہے:

طہارت جسمانی اور طہارت قلبی اور قرآن پاک میں جہاں کہیں طہارت کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم دونوں قسم کی

طہارت مراد ہے کہا جاتا ہے: طہر تہ فطہر و تطہر و اطہر فہو طاہر و متطہر

میں نے اسے پاک کیا چنانچہ وہ پاک ہو گیا۔ قرآن میں ہے:

"وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 6)

اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہو جایا کرو۔

یعنی یا جو چیز اس کے قائم مقام ہو اس کے ذریعہ طہارت کر لیا کرو۔ اور آیت کریمہ:

"وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 222)

اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔

مفہوم خلود:

(خلد) الخلود (ن) (Eternity)

کے معنی کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں دراز تک تغیر و فساد پیدا نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

"لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 129)

اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے۔

جنت میں خلود کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں ہے:

"أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 82)

وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔

نوٹ:

اتی، ثمر، رزق کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 26]

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (26)

”بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے رہے کافر وہ کہتے ہیں ایسی کہاوٹ میں اللہ کا کیا مقصود ہے اللہ بہتیروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتیروں کو ہدایت فرماتا ہے اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں۔“

متن:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً

لہا کانت الآيات السابقة متضمنة لأنواع من التمثيل، عقب ذلك ببيان حسنه، وما هو الحق له والشرط فيه، وهو أن يكون على وفق الممثل له من الجهة التي تعلق بها التمثيل في العظم والصغر والخسة والشرف دون الممثل، فإن التمثيل إنما يصار إليه لكشف المعنى الممثل له ورفع الحجاب عنه وإبرازة في صورة المشاهد المحسوس،

ليساعد فيه الوهم العقل ويصالحه عليه فإن المعنى الصرف إنما يدركه العقل مع
منازعة من الوهم، لأن من طبعه الميل إلى الحس وحب المحاكاة، ولذلك شاعت
الامثال في الكتب الإلهية وفشت في عبارات البلغاء، وإشارات الحكماء، فيمثل
الحقير بالحقير كما يمثل العظيم بالعظيم، وإن كان المثل أعظم من كل عظيم، كما
مثل في الإنجيل غل الصدور بالنخالة، والقلوب القاسية بالحصاة، ومخاطبة السفهاء
بأثارة الزنا بغير. وجاء في كلام العرب: أسمع من قراد وأطيش من فراشه، وأعز من مخ
البعوض. لا ما قالت الجهلة، من الكفار: لينا مثل الله حال المنافقين بحال
المستوقدين؟

وأصحاب الصيب وعبادة الأصنام في الوهن والضعف ببيت العنكبوت؛ وجعلها أقل
من الذباب وأخس قدراً منه؛ الله سبحانه وتعالى أعلى وأجل من أن يضرب الامثال
ويذكر الذباب والعنكبوت. وأيضاً، لينا أرشدهم إلى ما يدل على أن المتحدى به وحى
منزل؛ ورتب عليه وعيد من كفر به ووعد من آمن به بعد ظهور أمره؛
شَرَعَ في جواب ما طعنوا به فيه فقال تعالى: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَي لَا يترك ضرب المثل
بالبعوضة ترك من يستحي أن يمثل بها لحقارتها. والحياء: انقباض النفس عن
القبیح مخافة الذم، وهو الوسط بين الوقاحة:
التي هي الجرأة على القبائح وعدم المبالاة بها، والخجل: الذي هو انحصار النفس عن
الفعل مطلقاً.

واشتقاقه من الحياة فإنه انكسار يعترى القوة الحيوانية فيردّها عن أفعالها فقليل:
حيى الرجل كما يقال نسي وحشى، إذا اعتلت نساء وحشاة. وإذا وصف به البارئ
تعالى كما

جاء في الحديث «إن الله يستحي من ذى الشيبة المسلم أن يعذبه»

«إن الله حي كريم يستحي إذا رفع العبيد يديه أن يردّها صفرأ حتى يضع فيها خيراً»

فالمراد به الترك اللازم للانقباض، كما أن المراد من رحمته وغضبه إصابة
المعروف والمكرورة اللازمين لمعنييهما، ونظيرة قول من يصف إبلا:

إِذَا مَا اسْتَحْيِنَ الْمَاءُ يَعْرُضُ نَفْسَهُ ... كَرَعْنُ بِسَبَبِ فِي إِذَاءٍ مِنَ الْوَرْدِ

وإنما عدل به عن الترك، لما فيه من التمثيل والمبالغة، وتحتل الآية خاصة أن يكون مجيئه على المقابلة لها وقع في كلام الكفرة. وضرب المثل اعتماله من ضرب الخاتم، وأصله وقع شيء على آخر، وأن يصلحها مخفوض المحل عند الخليل بإضمار من، منصوب بإفشاء الفعل إليه بعد حذفها عند سيبويه. وما إيهامية تزيد النكرة إيهاماً وشياعاً وتسد عنها طرق التقييد، كقولك أعطني كتاباً ما، أى: أى كتاب كان. أو مزيدة للتأكيد كالتى في قوله تعالى: فِيمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَلَا نَعْنَى بِالْمَزِيدِ اللَّغْوُ الضَّائِعُ، فإن القرآن كله هدى وبيان، بل ما لم يوضع لمعنى يراد منه، وإنما وضعت لأن تذكر مع غيرها فتفيد له وثاقفة وقوة وهو زيادة في الهدى غير قادح فيه. وبعوضة عطف بيان لمثلاً، أو مفعول ليضرب، ومثلاً حال تقدمت عليه لأنه نكرة. أو هما مفعولاه لتضمنه معنى الجعل. وقرئت بالرفع على أنه خبر مبتدأ محذوف، وعلى هذا يحتمل ما وجوهاً آخر: أن تكون موصولة حذف صدر صلتها، كما حذف في قوله: تَمَاماً عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَمَوْصُوفَةٌ بِصِفَةٍ كَذَلِكَ، ومحلها النصب بالبدلية على الوجهين. واستفهامية هي المبتدأ، كأنه لما رد استبعادهم ضرب الله الامثال، قال بعده: ما البعوضة فما فوقها حتى لا يضرب به المثل، بل له أن يمثل بما هو أحقر من ذلك. ونظيرة فلان لا يبالى مما يهب ما دينار وديناران. والبعوض: فعول من البعض، وهو القطع كالبضع والعضب، غلب على هذا النوع كالمخبوش.

فَمَا فَوْقَهَا عَطْفٌ عَلَى بَعُوضَةٍ، أَوْ مَا إِنْ جَعَلَ اسْمًا، وَمَعْنَاهُ مَا زَادَ عَلَيْهَا فِي الْجِنَّةِ كَالذَّبَابِ وَالْعَنْكَبُوتِ، كَأَنَّهُ قَصْدٌ بِهِ رَدُّ مَا اسْتَنْكَرُوا. وَالْمَعْنَى: أَنَّهُ لَا يَسْتَحْبِي ضَرْبَ الْمِثْلِ بِالْبَعُوضِ فَضْلاً عَمَّا هُوَ أَكْبَرُ مِنْهُ، أَوْ فِي الْمَعْنَى الَّذِي جَعَلَتْ فِيهِ مِثْلاً، وَهُوَ الصَّغْرُ وَالْحَقَارَةُ كَجَنَاحِهَا فَإِنَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ ضَرْبُهُ مِثْلاً لِلدُّنْيَا، وَنَظِيرَةٌ فِي الْإِحْتِمَالَيْنِ مَا رَوَى أَنَّ رَجُلًا يَمْنَى خَرَّ عَلَى طَنْبِ فِسْطَاطٍ فَقَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَشَاكُ شَوْكَةً فَمَا فَوْقَهَا، إِلَّا كَتَبَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ، وَمَحِيَّتْ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةٌ»

فإنه يحتمل ما تجاوز الشوكة في الألم كالخروار وما زاد عليها في القلة كنخية النملة. لقوله عليه الصلاة والسلام «ما أصاب المؤمن من مكروه فهو كفارة لخطايا حتى

نخبة النبلة»

ترجمہ:

"یشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے پھر ہو"۔

جب اللہ کریم نے قرآن مجید کا منزل من اللہ ہونا عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کر دیا، اور منکرین کے لئے وعید فرمادی اور منافقوں اور کافروں کے احوال و عقائد کو بیان کرنے کے لئے بے شمار ضرب الامثال بیان فرمائیں، کبھی آگ میں جلانے اور کبھی کھڑی کے ساتھ تشبیہ دے کر ان کی حقارت و تذلیل کی اب اللہ کریم ان کے اعتراضات کے جواب ارشاد فرما رہا ہے۔ جو یہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر قرآن مجید اللہ کریم کی طرف سے نازل کردہ ہوتا تو اس میں حقیر چیزوں کا تذکرہ نہ ہوتا کیونکہ عام لوگ اپنے کلام میں ایسی اشیاء کا ذکر کرنا اچھا گمان نہیں کرتے۔ اور ایسی چیزوں کو انسانی طبیعت ناپسند کرتی ہے۔ تو اللہ کریم جو کہ "منزہ عن العیوب" ہے وہ اپنے کلام میں ایسی چیزوں کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔

تو رب کریم نے ان کے اس فضول اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ضرب الامثال بیان کرنے کی حکمت اور شرائط یہ ہیں کہ جو بات مشبہ میں مخفی ہے اس کو مشبہ بہ کے ساتھ تشبیہ دے کر واضح کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کے درمیان جو وجہ شبہ ہے اس میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں۔ اسی وجہ سے عظیم چیزوں کو عظیم چیزوں کے ساتھ اور حقیر چیزوں کو حقیر چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ تاکہ مشبہ میں مخفی معنی ظاہر ہو جائے۔ اور وہم اس کا انکار نہ کر سکے۔ اس مقصد کو ظاہر کرنے کے لئے صرف سابقہ کتب، حکماء اور ادباء کے اقوال ہی نہیں بلکہ عربوں کے کلام میں بھی یہ عام ہے مثلاً سابقہ کتب میں "غل الصدر" سینے کا کھوٹ، "قلوب قاسیہ" سخت دل اور "مخاطبة السفهاء" یعنی بے وقوفوں کی بات کرنے کو بالترتیب رخالة یعنی چھان یا بھوسہ، حصاة یعنی پتھر اور "اثارة الزنا بیر" بھڑوں کو بھڑکانا کے ساتھ تشبیہات دی گئی ہیں۔

اور ایسا آدمی جو قوت سماعت میں قوی ہو اس کو "قراد" یعنی چیچڑی کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور کہا جاتا ہے "انہ اسمع من قراد" یہ چیچڑی سے بھی زیادہ سننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خفیف اور ہلکے کو "اطیش من فراشه" کے ساتھ اور نایاب اشیاء کو "اعز من مخ البعوضۃ" کے ساتھ تشبیہات دی گئی ہیں۔

اگر سابقہ کتب اور لغت عرب میں ایسی ضرب الامثال قابل اعتراض نہیں تو پھر قرآن پاک پر اعتراض کیوں کیا جا رہا

ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب اگر آیت کریمہ کو میں تدبر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کریم حق واضح کرنے کے لئے پھر تو کیا، اس سے حقیر چیز کی مثال بیان کرنے سے بھی جھٹک محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی کسی اعتراض کی پرواہ کرتا ہے۔ خواہ وہ تشبیہ پھر، کبھی یا اس سے بھی رذیل چیز کی ہو۔

لا یخشی ان یضرب مثل البعوضۃ لحقارتها وغیرها

پھر یا اس جیسی حقیر چیز کی مثال اس کے حقیر ہونے کی وجہ سے ذکر کرنے کو ترک نہیں کرتا۔

اور حیات کا معنی وہ انکساری اور شکستگی ہے جو بدن کو اعتدال سے نکال دیتی ہے۔ اور اس کو اعمال و افعال سے روک دیتی ہے۔ کیسا کہ "حیسی الرجل آدنی عاجز آگیا۔ اسی طرح ننسی ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو جس کو عرق النساء کا درد ہو۔ اور "حشی" ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کو انتڑیوں کا مرض ہو۔ لیکن یہاں اس سے مراد لغوی معنی نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ معنی ہے جو اس کی عاجزی اور انکساری کو لازم ہے اور وہ معنی ہے چھوڑ دینا اور ڈرنا یعنی اللہ کریم ضرب الامثال بیان کرنے سے نہیں ڈرتا اور نہ ہی بوجہ حیاء اس کو چھوڑتا ہے۔

حیاء اصطلاح میں ایسی کیفیت کا نام ہے جو بے حیائی اور نجل (کسی کام کے کرنے سے رک جانا، اچھا ہو یا برا) کے درمیان ہوتی ہے۔ یا وہ حالت جو اللہ کریم کی نعمتوں اور اپنے گناہوں کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حیا کو جو لغوی معنی بیان ہوا ہے اس کے مطابق اس کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق اجسام سے ہے۔ اور اللہ کریم ایسے تمام اوصاف سے پاک اور منزہ ہے حالانکہ اس کی نسبت اللہ کریم کی طرف کی گئی ہے حدیث شریف کا مفہوم ہے،

ان الله يستحي من ذي الشيبة المسلم ان يعذبه
اللہ کریم بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے میں حیاء فرماتا ہے۔

إن الله حي كريم يستحي إذا رفع العبيد يديه أن يردهما صفر أحتق يضع فيهما خيرا
اللہ کریم بہت ہی باحیاء سخی ہے، اسے حیا آتا ہے ہ جب اس کا کوئی بندہ اس کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ انہیں خالی واپس لٹا دے یہاں تک اس کے ہاتھوں میں خیرات رکھ دیتا ہے۔

"يستحي" سے مراد ترک کرنا ہے۔ یعنی وہ اپنے بندے کے دونوں ہاتھوں کو خالی لوٹانے کو ترک کر دیتا ہے اور ترک کرنا یہ انقباض کے معنی کو لازم ہے، جیسا کہ اللہ کریم کی رحمت اور اس کے غضب سے مراد ان دونوں کو لازم ہے وہ مراد ہے یعنی رحمت کا معنی نیکی پہنچانا اور غضب کا معنی سزا دینا ہے اس کی مثال ایک شاعر کا قول ہے جو اپنے ہونٹوں کی صفت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے،

إذا ما استسحقين الماء يعرض نفسه ... كوعن سببت في إناء من الورد

یعنی میرے اونٹ اس پانی کو ترک کرنے کو رد کر دیتے ہیں جو اپنے آپ کو ان پر پیش کرتا ہے کہ اپنے پانی کو اپنے ہونٹوں کے ساتھ پیتے ہیں جو مشکیزے کی طرح ہے اس گھاٹ سے جو پھول کے برتنوں کی طرح ہے اس سے پیتے ہیں یعنی وہ گھاٹ جس کے کناروں پر گلاب کے پھول ہوں تو مطلب یہ ہوا کہ اس کے اونٹ اس گھاٹ سے پیاس کی وجہ سے پانی نہیں پیتے بلکہ وہ اس پانی سے حیاء کرتے ہوئے جو اپنے آپ کو ان پر پیش کرتا ہے، پیتے ہیں۔ اس مقام پر "یتروک" کا ذکر نہ کرنا اور اس کی

جگہ "یستحیٰ" ذکر کرنا اس کے اندر مبالغہ کا اظہار مطلوب ہے اور ترک عمل کو حیا کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جو کنایہ ضرب المثل کو لازم ہے اور اصول یہ ہے کہ،

الکناية ابلغ من التصريح
کنایہ صراحتہ گفتگو کرنے سے بلیغ ہوتا ہے۔

یہ بطور مشاکلہ لفظ ذکر کئے گئے ہیں کہ کفار نے جب اپنے اعتراض میں یہ لفظ استعمال کئے،

اما يستحي زب محمد ان يضرب مثل الذباب والبعوضة والعنكبوت
تو اللہ کریم نے بطور مشاکلہ اس کی نفی میں وہی الفاظ دہرا دیئے۔

"ان يضرب" یہ ضرب المثل کے معنی میں ہے اور ضرب المثل ضرب الخاتم سے مشتق ہے جس کا معنی ہے مہر لگانا مگر یہاں مثال بیان کرنے کے معنی میں ہے۔

ترکیب کلام میں "ان" مصدر یہ اپنے مابعد کے ساتھ مل کر خلیل کے نزدیک محل جر میں ہے اور اس سے پہلے "من" حرف جر مضر ہے اور سیبویہ کے نزدیک حرف جر کو حذف کرنے کے بعد بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کر دیا ہے۔ اس لئے یہ منصوب ہوگا اور اس میں مثلاً کے بعد "ما" کا لفظ ابہامیہ ہے جو اس نکرہ میں عموم و ابہام کا اضافہ کر رہا ہے۔ اور تخصیص کے سارے راستے بند کر رہا ہے جیسا تیرا کہنا "اعطني كتاباً ما" یعنی تو مجھے کوئی سی کتاب عطا کر دے یا یہ "ما" معنی میں تاکید پیدا کرنے کے لئے زائدہ ہے، جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں،

فبما رحمة من الله

اس میں ما زائدہ ہے، زائدہ سے مراد بے معنی نہیں کیونکہ سارے کا سارا قرآن ہدایت اور بیان ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ کسی مخصوص معنی کے لئے ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اپنے غیر کے ساتھ اسلئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس میں قوت اور مضبوطی کا فائدہ دے اور یہ ہدایت میں زیادتی ہے اور یہ باعث اعتراض نہیں۔ اور "بعوضة"، مثلاً سے عطف بیان ہوگا۔ یا یہ "يضرب" کا مفعول ہے اور مثلاً بعوضة سے حال ہے کیونکہ بعوضة نکرہ ہے اور جب ذوالحال نکرہ ہو تو حال کو اس سے مقدم ذکر کیا جاتا ہے، یا يضرب اپنے ضمن میں جعل کا معنی لئے ہوئے ہے اس وجہ سے "بعوضة" اور "مثلاً" دونوں اس کے مفعول ہوں گے، اور بعوضة کو مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی لہذا اس تاویل پر لفظ کے ترکیب میں کئی دوسرے احتمال ہوں گے۔

(۱) پہلا احتمال یہ کہ یہ "ما" موصولہ ہو اور اس کا صلہ پہلا پہلا حرف محذوف ہوگا کیسا کہ،

تماماً الذي احسن

میں "احسن" سے قبل مبتداء محذوف ہے۔

(2) دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ "ما" الموصولہ ہوگا اور اس کا مابعد اپنے مبتداء سے مل کر جملہ اسمیہ ہو کر "ما" کی صفت

ہے۔

مندرجہ بالا دونوں توجیہات میں یہ بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔

(3) تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ "ما" استفہامیہ مبتداء ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے تو گویا جب اللہ کریم نے ان کے

ضرب الامثال کو بعید سمجھنے کو رد فرمایا تو فرمایا:

ما بعوضة فما فوقها

کہ چمھر کیا ہے یا اس کے حجم میں چھوٹی اور بڑی چیز کیا ہے کہ اللہ کریم نے حق سمجھانے کے لئے اس کی ضرب المثل بیان نہ کرے بلکہ اسے حق حاصل ہے کہ وہ اس سے حقیر چیز کے ساتھ بھی مثال دے کر حق ظاہر کر دے۔

اس کی مثال یوں دی جاتی ہے کہ

فلان لایبالی مما یهب ما دینار و دیناران

کہ فلاں اس چیز کی پرواہ نہیں کرتا جو بخشش کر رہا ہے کہ وہ ایک دینار عطا کر رہا ہے یا دو دینار۔

"بعوض" بروزن فاعول، یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور بعض سے مشتق ہے کس کا معنی کاٹنا ہے کیسے "بضع" اور "عضب" کا معنی کاٹنا ہے لیکن اب یہ لفظ چمھر جیسی چیز کے کاٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ خموش کا لفظ جس کا معنی چہرے پر خراشیں مارنا لیکن اب یہ چمھر کے کاٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی چہرے پر ڈنگ مارتا ہے۔

فما فوقها

اس میں فاء عاطفہ اور اس کا عطف یا بعوضۃ پر ہے اور یا "ما" پر ہے اس شرط پر کہ ما کو اسم بنایا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ چیز جو چمھر سے جسم میں زائد ہو جیسے مکھی اور مکڑی، گویا اللہ کریم نے اس چیز کی تردید کا قصد فرمایا جس کو انہوں نے ناپسند کیا تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ کریم چمھر کے ساتھ مثال دینے کو حیاء کی وجہ سے ترک نہیں فرماتا چہ جائیکہ جسم میں اس سے زیادہ بڑی چیز میں اس سے زیادہ بڑی چیز کے ساتھ تشبیہ دینے کو وہ ترک فرمادے یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ صفت میں چمھر سے حقیر ہو جس صفت میں ضرب الامثال پیش کی جا رہی ہو اور وہ صغر اور حقارت ہے جیسے چمھر کا پر۔

نبی کریم ﷺ نے چمھر کے پر کے ساتھ دنیا کی مثال بیان فرمائی ہے فرمایا کہ اگر دنیا کی قدر اللہ کریم کی بارگاہ میں چمھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بنی آدم مناء میں خیمہ کے طنائوں سے گر پرا۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا:

یقول ما من مسلم یشاک شوکة فما فوقها الا کتبت له بها درجة اور محبت عنہ بها خطیئة

کہ کسی مسلمان کو کاٹنا یا کانٹے سے چھوٹی یا کانٹے سے بڑی چیز سے تکلیف نہیں پہنچائی جاتی مگر اس کے بدلے میں اس کا ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے اور اس سے اس کی تکلیف کی وجہ سے ایک گناہ کم کر دیا جاتا ہے اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ درد میں جو چیز کانٹے سے زیادہ ہو جس طرح گرنا یا قلت میں اس سے کم ہو جیسے چیونٹی کا ڈنگ مارنا جیسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا،

مَا أَصَابَ الْمُؤْمِنُ مِنْ مَكْرُوهٍ فَهُوَ كِفَارَةٌ لِمَخْطَايَاهُ حَتَّى نَجِبَةَ النَّمْلَةَ
کہ کسی مومن کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی مگر وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی جس طرح چیونٹی کا کاٹنا وغیرہ۔

متن:

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ

أما حرف تفصیل يفصل ما أجل ويؤكده ما به صدر ويتضمن معنى الشرط، ولذلك يجاب بالفاء. قال سيبويه: أما زيد فذاهب معناه، مهما يكن من شيء فزيد ذاهب، أي هو ذاهب لا محالة وأنه منه عزيمة، وكان الاصل دخول الفاء على الجملة لأنها الجزاء، لكن كرهوا إيلاءها حرف الشرط فأدخلوها على الخبر، وعوضوا المبتدأ عن الشرط لفظاً، وفي تصديره الجملتين به إحماد لأمر المؤمنين واعتداد بعلمهم، وذم بليغ للكافرين على قولهم، والضمير في أنه للمثل، أو لأن يضرب. والحق الثابت الذي لا يسوغ إنكاره يعجز الاعيان الثابتة والافعال الصائبة والاقوال الصادقة، من قولهم حق الامر، إذا ثبت ومنه: ثوب محقق أي: محكم النسج.

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ كَانَ مِنْ حَقِّهِ: وأما الذين كفروا فلا يعلمون، ليطابق قرينه ويقابل قسيبه، لكن لما كان قولهم هذا دليلاً واضحاً على كمال جهلهم عدل إليه على سبيل الكناية ليكون كالبرهان عليه.

مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يَحْتَمِلُ وَجْهَيْنِ: أن تكون «ما» استفهامية و«ذا» بمعنى الذي وما بعده صلته، والمجموع خبر ما. وأن تكون «ما» مع «ذا» اسماً واحداً بمعنى: أي شيء، منصوب المحل على المفعولية مثل ما أراد الله، والأحسن في جوابه الرفع على الاول، والنصب على الثاني، ليطابق الجواب السؤال.

والإرادة: نزوع النفس وميلها إلى الفعل بحيث يحملها عليه، وتقال للقوة التي هي مبدأ النزوع، والاول مع الفعل والثاني قبله، وكلا المعنيين غير متصور اتصاف الباري تعالى به، ولذلك اختلف في معنى إرادته فاقيل:

إرادته لأفعاله أنه غير ساء ولا مكرة، ولأفعال غيره أمره بها. فعلى هذا لم تكن المعاصي بإرادته، وقيل: عليه باشتغال الأمر على النظام الاكمل، والوجه الاصلح فإنه يدعو القادر إلى تحصيله، والحق: أنه ترجيح أحد مقدوريه على الآخر وتخصيصه بوجه دون وجه، أو معنى يوجب هذا الترجيح، وهي أعم من الاختيار فإنه ميل مع تفضيل وفي هذا استحقار واستبدال. ومثلاً نصب على التمييز، أو الحال كقوله تعالى: هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ.

ترجمہ:

اما یہ حرف تفسیر ہے اور ما قبل کلام میں یا متکلم کے ذہن میں جو اجمال ہوتا ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔ اور یہ جس سے پہلے آتا ہے اس میں تاکید پیدا کرتا ہے۔ یہ اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہوتا ہے اسی لئے اس کے جواب پر "فاء" داخل کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کہتا ہے

اما زيد فذاهب

کا معنی یہ ہوگا

مهما يكن من شئ فزيد ذاهب

یعنی وہ ہر حالت میں جانے والا ہے اور اس نے جانے کا پختہ عزم کر لیا ہے۔ اس کلام میں اصل تو یہ تھا کہ فاء "جواب شرط کے پورے جملہ پر داخل کی جاتی، لیکن اس طرح عربوں نے حرف شرط کے فوراً بعد "فاء" جزائیہ کا ذکر کرنا پسند نہیں فرمایا، اس لئے وہ اس کو خبر پر داخل کر دیتے ہیں اور مبتداء کو لفظاً شرط کے قائم مقام رکھ دیتے ہیں۔ حقیقت میں شرط محذوف ہوتی ہے جس کی تقدیر

ما هما يكن من شئ

ہے۔ اور "اما" کے بعد والا جملہ مکمل جواب شرط ہے۔ اس لئے "فاء" جزائیہ جواب شرط کے پہلے جز پر داخل کرنا مناسب ہوتا ہے لیکن اس طرح "اما" جو کلمہ شرط ہے اس کے فوراً بعد فاء داخل کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے بجائے مبتداء پر فاء داخل کرنے کے، اس کی خبر پر فاء داخل کر دیا گیا اور ان دونوں جملوں کے آغاز میں "اما" کو مکرر ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ مؤمنین کی تعریف کی جائے اور ان کے علم و یقین کی توصیف بیان کی جائے اور کفار کی مذمت اور ان کے عقیدہ اور کفر کے فساد کو ظاہر کیا جائے۔

انه الحق

میں ہاں ضمیر کا مرجع یا تو "مثلاً" ہے یا "ان بضر بوا" ہے۔

"الحق" یہ حق سے مشتق ہے اور صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور حق کا معنی پختہ اور مضبوط ہونا ہے اور وہ کپڑا جس کی بنائی پختہ اور مضبوط ہو اسے ثوب محقق کہتے ہیں اور اس کا اطلاق ایسی ثابت چیز پر ہوتا ہے جس کا انکار جائز نہیں اور اعیان ثابتہ، افعال اور اقوال صادقہ کے لئے یہ عام استعمال ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد مثل یا اس کا بیان مراد لیا گیا ہے۔

ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کلام کے سیاق و سباق کے مطابق یہاں،

امالذین کفروا فلا يعلمون

ہوتا لیکن اس جگہ یہ ذکر کیا گیا۔

امالذین کفروا فيقولون

اس کی کیا وجہ ہے؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حق تو یہی تھا کہ،

امالذین کفروا فلا يعلمون

ہوتا تا کہ اپنے قرین کے موافق ہو جاتا لیکن ان کا یہ کہنا، یہ کفار کی ضرب البطل سے جہالت اور نادانگی کے کمال پر واضح دلیل ہے اس لئے کنایۃ ان کی جہالت کو واضح کرنے کے لئے یہ انداز اپنایا گیا۔ اور ان کی اس جہالت پر دلیل قائم کرنے کے لئے "لا يعلمون" کی جگہ "يقولون" کا لفظ ذکر کیا گیا جس میں کنایۃ ان کی جہالت ثابت ہوتی ہے اور کلیہ ہے کہ کنایۃ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔ "ماذا اراد الله بهذا مثلاً" ما استفہامیہ مبتداء، ذال اسم موصول اپنے مابد صلہ سے مل کر خبر ہے یا یہ دونوں (ما اور ذال) ای شنی کے معنی میں محلاً منصوب اور "اراد" کا مفعول بہ ہے۔

"اراد" یہ ارادۃ سے مشتق ہے اور اس کا معنی کسی کام کے کرنے کا دل میں شوق پیدا کرنا اس اعتبار سے کہ وہ شوق کام کرنے کی طرف ابھارے یا اس سے مراد وہ قوت ہے جو میلان اور اشتیاق کا سبب بنتی ہے، ان دونوں معانی کے اعتبار سے اراد کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ جسم کے خواص سے ہے اور اللہ کریم جسم سے پاک ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں اس سے لغوی معنی مراد نہیں بلکہ لازم معنی مراد ہے یعنی کہ اللہ کریم اپنے افعال سر انجام دینے میں نہ ہی مجبور ہے اور نہ ہی بھولنے والا ہے بلکہ اپنے اختیار اور مرضی سے افعال کو سر انجام دیتا ہے۔ اس تاویل پر مجاصی اللہ کریم کی ارادہ سے نہیں ہوں گے۔

اور بعض نے کہا کہ اللہ کریم کے ارادہ سے مراد کسی امر کو اس کے علم کا کامل ترین نظام اور صالح وجہ پر شامل ہونا ہے، کیونکہ یہ علم ہی قادر کو اس کے حصول کی طرف دعوت دیتا ہے اور حق یہ ہے کہ اللہ کریم کے ارادہ سے مراد یہ ہے کہ دو مقدروروں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اور ایک وجہ کو چھوڑ کر دوسری وجہ کے ساتھ خاص کرنا ہے، یعنی حسن و قبح اور فائدہ و نقصان وغیرہ یا اس سے مراد وہ صفت ہے جو اس کا موجب اور سبب ہے اور اراد کا لفظ اختیار کے لفظ سے اعم ہے کیونکہ اختیار میں دوسری چیز کو

فضیلت دینے کے ساتھ اس کے کرنے کی طرف رغبت ہوتی ہے۔

"بہذا" یہ لفظ ان کے اس مثال کو حقیر و رذیل سمجھنے پر دلالت کر رہا ہے اس لئے یہ کفر ہے اور مثلاً کا لفظ تمیز یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں،

هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ

میں اس آیت کریمہ کا لفظ تمیز یا حال کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔

متن:

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا

جواب ماذا، اى: اِضْلال كَثِير و اِهداء كَثِير، وِضْع الْفِعْلِ مَوْضِعَ الْمَصْدَرِ لِلِإِشْعَارِ بِالْحَدُوثِ وَالتَّجَدُّدِ، أَوْ بَيَانِ لِلْجَمَلَتَيْنِ الْمَصْدَرَتَيْنِ بِأَمَّا، وَتَسْجِيلِ بِأَنَّ الْعِلْمَ بِكَوْنِهِ حَقًّا هَدَى وَبَيَانِ، وَأَنَّ الْجَعْلَ بِوَجْهِ إِيرَادَةِ وَالْإِنْكَارِ لِحَسَنِ مَوْرَدَةِ ضَلَالٍ وَفَسُوقٍ، وَكَثْرَةِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الْقَبِيلَتَيْنِ بِالنَّظَرِ إِلَى أَنْفُسِهِمْ لَا بِالْقِيَاسِ إِلَى مَقَابِلِهِمْ، فَإِنَّ الْمَهْدِيِّينَ قَلِيلُونَ بِالإِضَافَةِ إِلَى أَهْلِ الضَّلَالِ كَمَا قَالَ تَعَالَى: وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ

، وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِي الشَّاكِرِينَ وَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ كَثْرَةُ الضَّالِّينَ مِنْ حَيْثُ الْعَدَدُ وَكَثْرَةُ الْمَهْدِيِّينَ بِاعتبار الفضل والشرف كما قال:

قَلِيلٌ إِذَا عُدُّوا كَثِيرٌ إِذَا شُدُّوا وَقَالَ:

إِنَّ الْكِرَامَ كَثِيرٌ فِي الْبِلَادِ وَإِنْ قَلُّوا كَمَا غَيْرُهُمْ قَلٌّ وَإِنْ كَثُرُوا

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ أَيْ الْخَارِجِينَ عَنْ حَدِّ الْإِيمَانِ، كَقَوْلِهِ تَعَالَى: إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ مِنْ قَوْلِهِمْ: فَسَقَتِ الرُّطْبَةُ عَنْ قَشْرِهَا إِذَا خَرَجَتْ، وَأَصْلُ الْفَسْقِ: الْخُرُوجُ عَنِ الْقَصْدِ قَالَ رُوَيْبَةُ:

فَوَاسِقًا عَنْ قَصْدِهَا جَوَائِرُ الْفَاسِقِ فِي الشَّرْعِ: الْخَارِجُ عَنْ أَمْرِ اللَّهِ بِأَرْكَابِ الْكَبِيرَةِ وَهُوَ دَرَجَاتُ ثَلَاثَ:

الاولى: التَّغَابِي وَهُوَ أَنْ يَرْتَكِبَهَا أَحْيَانًا مُسْتَقْبَحًا إِيَّاهَا.

الثانية: الْإِنْمِهَاكُ وَهُوَ أَنْ يَعْتَادَ رْتَكِبَهَا غَيْرَ مَبَالٍ بِهَا.

الثالثة: الْجُودُ وَهُوَ أَنْ يَرْتَكِبَهَا مُسْتَصَوْبًا إِيَّاهَا، فَإِذَا شَارَفَ هَذَا الْمَقَامَ وَتَخَطَى خَطَطَهُ

خلع ربقة الإيمان من عنقه، ولا بس الكفر. وما دام هو في درجة التغابي أو الانهباك فلا يسلب عنه اسم المؤمن لا تصافه بالتصديق الذي هو مسبى الإيمان، ولقوله تعالى: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُواْ والمعتزلة لما قالوا: الإيمان: عبارة عن مجموع التصديقي والإقرار والعمل، والكفر تكذيب الحق ومخوذة. جعلوه قسماً ثالثاً نازلاً بين منزلي المؤمن والكافر لمشاركته كل واحد منهما في بعض الاحكام، وتخصيص الإضلال بهم مرتباً على صفة الفسق يدل على أنه الذي أعدهم للإضلال، وأدى بهم إلى الضلال. وذلك لأن كفرهم وعدولهم عن الحق وإصرارهم بالباطل صرفت وجوه أفكارهم عن حكمة المثل إلى حقارة المثل به، حتى رسخت به جهالتهم وازدادت ضلالتهم فأنكروه واستهزءوا به. وقرء (يضل) بالبناء للمفعول و«الفاسقون» بالرفع.

ترجمہ:

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا

یہ جملہ "ماذا اراد اللہ بہ" کا جواب ہے اور یہ مرفوع ہے اصل میں اضلال کثیر اور اهداء کثیر تھا، فعل کو مصدر کی جگہ اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ تجد ذ اور حدوث کا شعور دلایا جائے یا یہ ان دونوں جملوں کا بیان ہے جن کو "اما" کے ساتھ شروع کیا گیا ہے اور اس بات پر مہر تصدیق مثبت کرنا ہے کہ ضرب المثل کے حق ہونے کا علم ہونا ہدایت اور بیان ہے اور اس ضرب المثل کے ذکر کرنے کی جہت سے ناواقف ہونا اور اس کے مورد کے حسن کا اقرار نہ کرنا گمراہی اور فسق ہے۔

دونوں گروہوں کو کثیر کہا گیا حالانکہ کثرت ایک ہی جانب ہوتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اپنے اپنے قبیلوں کے اعتبار سے کثیر ہیں، نہ کہ اپنے مقابلین کے اعتبار سے کیونکہ گمراہوں کے مقابلہ میں ہدایت یافتہ تعداد کے اعتبار سے تھوڑے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ

وقليل من عبادي الشكور

کہ ہدایت یافتہ تھوڑے ہی ہیں۔ اور میرے بندوں میں سے شکر کرنے والے تھوڑے ہی ہیں اور اس میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ تعداد کے اعتبار سے گمراہ زیادہ ہوں اور فضل و شرف کے اعتبار سے ہدایت یافتہ زیادہ ہوں، قول شاعر ملاحظہ ہو،

إِنَّ الْكِرَامَ كَثِيرٌ فِي الْبِلَادِ وَإِنْ كَثُرُوا

سخی اگرچہ تعداد میں کم ہوتے ہیں لیکن علاقہ میں کثیر ہیں جیسے ان کے علاوہ اگرچہ وہ کثیر ہیں لیکن شرافت و بزرگی میں تھوڑے ہیں۔

وما يضلُّ به إلا الفاسقين

اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے ساتھ وہی گمراہ ہوتے ہیں جو حدود ایمان سے نکلنے والے ہیں جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد،

ان المنافقين هم الفاسقون

کہ بے شک منافق ہی دائرہ اسلام سے خارج ہونے والے ہیں اور یہ عربوں کے اس اقوال سے مشتق ہے،

فسقت الرطبة عن قشرها

کہ تر بکھور اپنے چمکے سے باہر نکلی۔ فاسق، فسق سے مشتق ہے جس کا معنی درمیانی راستہ سے نکلنا ہے۔ اصطلاح شرع میں فاسق اس آدمی کو کہتے ہیں جو صغیرہ گناہ پر مصر ہو یا کبیرہ گناہ کر کے اللہ کریم کے حکم سے نکل جائے، اس کے تین درجے ہیں۔

گناہ کبیرہ کے درجات:

1۔ تعالیٰ: گناہ کبیرہ کو گناہ سمجھ کر کبھی کبھی اس کا ارتکاب کرنا۔

2۔ اُصماک: گناہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کا عادی بن جانا اور اس کے ارتکاب میں جرے ہو جانا۔

3۔ تجود: گناہ کبیرہ کو جائز اور صحیح سمجھ کر کرنا، یہ فسق کا آخری درجہ ہے جب انسان اس درجہ میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کافر ہو

جاتا ہے۔

یاد رہے جب تک انسان فسق کے پہلے دو درجوں میں رہتا ہے وہ گنہگار تو ہوتا ہے لیکن اسلام سے خارج نہیں ہوتا کیونکہ اس کو تصدیق قلبی حاصل ہوتی ہے جو کہ اصل ایمان ہے۔ اور قرآن میں بھی مرتکب کبیرہ کو مومن کہا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو،

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا

کہ اگر مومنین کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ یہاں لڑائی کرنے والوں کو، جو کہ گناہ کبیرہ ہے مومن کہا گیا ہے۔ چونکہ معتزلہ کے نزدیک ایمان تین چیزوں کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔

تصدیق بالقلب عمل بالارکان اقرار باللسان

اور کفر حق کی تکذیب کرنا اور اس کا انکار کرنا ہے اس لئے انہوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے لئے ایک تیسرا درجہ بنایا ہے کہ نہ وہ مومن، نہ کافر اور دائمی عذاب کا مستحق ہے کیونکہ وہ بعض احکام میں مومن اور کافر دونوں کے ساتھ شریک ہے یعنی اسے تصدیق قلبی حاصل ہے لیکن اس کے مطابق عمل نہیں جو کہ کافروں کی عادت ہے۔ فاسقین کو گمراہی کے ساتھ خاص کرنے سے یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ اس گمراہی میں ہتلاہ ہونے کا سبب ان کا فسق اور ضرب المثل کو حقیر سمجھنا ہے۔ چونکہ اس سے ناواقفی ان کے دلوں میں راسخ ہو چکی ہے اور ان کی گمراہی بڑھ گئی ہے۔ اس لئے انہوں نے ضرب المثل کا انکار کر دیا اور باطل نظریہ پر اصرار نے ان کی سوچ کے دھارے اس ضرب المثل کی حکمت سے پھیر کر اس کی حقارت کی طرف موڑ دیئے ہیں بعض قراء نے "ا

الفاستقین" کو حالت رفیعی میں فاستقون کر کے پڑھا ہے اور اس صورت میں "یضل" کو مجہول کا صیغہ بنایا تو معنی یہ ہوگا کہ ضرب المثل کے ساتھ صرف فاسق ہی گمراہ ہوتے ہیں۔

معنی حیاة:

(حیات) الحیاة (Life)

کے معنی قباَح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور بعض نے استحیٰ فہو مستح (نحیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ قرآن میں ہے،

"إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا" (سورة البقرة آیت نمبر 26)

بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے پھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔

"وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ" (سورة الاحزاب آیت نمبر 53)

لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔

ایک روایت میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔ پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت ہو تو اس کے معنی انقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ حی کہ اللہ حی ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ قباَح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سراہنا انجام دینے والا ہے۔

ضرب المثل کی تعریف:

ضرب اللبن الدراہم سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں کسی بات کو اس طرح بیان کرنے کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے۔

"ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا" (سورة الزمر آیت نمبر 29)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا" (سورة الكهف آیت نمبر 32)

اور ان سے قصہ بیان کرو۔

"ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ أَنْفُسِكُمْ" (سورة الروم آیت نمبر 28)

وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ" (سورة الروم آیت نمبر 58)

اور ہم نے ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

بعوضة:

"مَثَلًا مَّا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً کھی۔

مکڑی کی مثال بیان فرمائے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ فَمَا فَوْقَهَا سے مچھر سے بڑی چیز کی طرف اشارہ ہے جیسے مکڑی جس کی کہ دوسری جگہ مثال بیان کی گئی ہے اور بعض نے فوق بلحاظ صغر مراد لیا ہے یعنی مچھر سے بھی چھوٹا اور جنہوں نے اس کی تفسیر ماد و نہا سے کی ہے ان کی مراد بھی یہی ہے بعض اہل لغت نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ فوق بمعنی دون بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے اضداد میں شمار کیا ہے مگر یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔

تحقیق فوق:

(فوق) فوق (Above, up)

یہ مکان، زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔

اوپر جیسے فرمایا۔

1۔ باعتبار علو جیسا کہ

"وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 63)

اور تم پر طور کو اونچا کیا۔

"مِنْ فَوْقِهِمْ ظِلٌّ مِنَ النَّارِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 16)

اوپر آگ کے پہاڑ ہیں۔

"وَجَعَلْ فِيهَا رَواسِيَ مِنْ فَوْقِهَا" (سورۃ فصلت آیت نمبر 10)

اور اسی نے زمین میں اس کے پہاڑ بنائے۔

اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا۔

"قُلْ هُوَ الْعَاقِبُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ"

(سورۃ الانعام آیت نمبر 65)

کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔

2۔ صعود یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں چنانچہ فرمایا:

"إِذْ جَاؤُكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔

3- کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے فرمایا:

"فَإِنَّ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 11)

اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔

4- جسمانیت کے لحاظ سے بڑایا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"مَثَلًا مَا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

پھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً مکھی۔ مکڑی کی مثال بیان فرمائے۔

5- بلحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے۔

جیسے فرمایا: "وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ كَذَّابٍ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 32)

اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے جیسے فرمایا:

"وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 212)

لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر پرفائق ہوں گے۔

"فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 55)

کافروں پر فائق۔

6- فوقیت معنی غلبہ اور تسلط

کے جیسے فرمایا: "وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 18)

اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

"وَأَنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 127)

فرعون سے اور بلاشبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

حرف آمّا کا استعمال:

(اما حرف) اما۔

یہ کبھی حرف تفصیل ہوتا ہے۔ اور احدا شینین کے معنی دیتا ہے اور کلام میں مکرر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"أَمَّا أَحَدُ كَمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصَلِّبُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 41)

اے قید خانہ کے دونوں ساتھیوں میں ایک تو اپنے رب (بادشاہ) کو شراب پلائے گا رہا دوسرا وہ سولی دیا جائے گا۔

اور کبھی ابتداء کلام کے لئے آتا ہے جیسے اما بعد فانہ کذا۔

علم کا مفہوم:

(علم) العلم (Knowledge)

کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا اور یہ قسم پر ہے اول یہ کہ کسی چیز کی ذات کا ادراک کر لینا دوم ایک چیز پر کسی صفت کے ساتھ حکم لگانا جو (فی الواقع) اس کے لئے ثابت ہو یا ایک چیز کی دوسری چیز سے نفی کرنا جو (فی الواقع) اس سے منفی ہو۔ پہلی صورت میں یہ لفظ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

"لَا تَعْلَمُوهُمْ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 60)

جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے۔

اور دوسری صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَإِنْ عَلِمْتُمْ هُنَّ مُؤْمِنَاتٍ" (سورۃ المستحینہ آیت نمبر 10)

اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں۔

اور آیت: "يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ"

سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہوش و حواس قائم نہیں رہیں گے۔

علم کی اقسام:

ایک دوسری حیثیت سے علم کی دو قسمیں ہیں:

(1) نظری اور (2) عملی۔

نظری وہ ہے جو حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے جیسے وہ عالم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے اور علم عمل وہ ہے جو عمل کے بغیر تکمیل نہ پائے جیسے عبادات کا علم ایک اور حیثیت سے بھی علم کی دو قسمیں ہیں۔

(1) عقلی یعنی وہ علم جو صرف عقل سے حاصل ہو سکے۔

(2) سمعی یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل نہ ہو بلکہ بذریعہ نقل و سماعت کے حاصل کیا جائے دراصل اعلمتہ و علمتہ

کے ایک معنی ہیں مگر اعلام جلدی سے بتا دینے کے ساتھ مختص ہے اور تعلیم کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ

کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ تعلیم کے معنی تصور کے لئے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تعلم

کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تعلیم کا لفظ اعلام کی جگہ آتا ہے جب کہ اس میں تاکید کے معنی مقصود ہوں جیسے

فرمایا۔

"أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ" (سورة البقرات آیت نمبر 16)
کیا تم اللہ کو اپنا دین بتاتے ہو۔

اور حسب ذیل آیات میں تعلیم کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔

"الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ" (سورة الرحمن آیت نمبر 1-2)
رحمن نے، اپنے محبوب کو قرآن سکھایا۔

تحقیق حق:

(حقوق) الحق (حق) (Justice, True, Right)

کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے اور لفظ حق کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔

اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَرُذُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقُّ" (سورة یونس آیت نمبر 30)

اور اللہ کی طرف پھیرے جائیں گے جو ان کا سچا مولیٰ ہے۔

(2) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔

اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا" (سورة یونس آیت نمبر 5)

وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند چمکتا۔

(3) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا۔

جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ بعث ثواب و عقاب اور جنت دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔

قرآن میں ہے:

"فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ" (سورة البقرة آیت نمبر 213)

تو اللہ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھادی جس میں جھگڑ رہے تھے۔

(4) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے۔

اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ" (سورۃ یونس آیت نمبر 33)

یونہی ثابت ہو چکی ہے تیرے رب کی بات۔

القول اور القیل کا معنی:

(قول) القول (Talk)

القول اور القیل کے معنی بات کے ہیں قرآن میں ہے:

"وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 122)

اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

مفہوم ارادہ:

(رود) الرود (Intention, Desire)

الارادۃ یہ ارادہ رود سے ہے جس کے معنی کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادۃ اصل میں اس قوۃ کا نام ہے، جس میں خواہش ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلتے ہوں۔ چنانچہ فرمایا:

"إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 17)

اگر وہ تمہارا برا چاہے یا تم پر مہر (امن و عاقبت) فرمانا چاہے۔

اسم اشارہ ذاکا استعمال:

(ذا) ہاں ہذا میں ذاکا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

ہذہ و ہذی و ہاتان۔ ان میں سے صرف ہاتان کا تثنیہ ہاتا تا آتا ہے۔ ہذہ اور ہذی کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا قرآن میں ہے:

"أَرَأَيْتَكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْت عَلَيَّ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 62)

کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

"هَذَا مَا تُوَعَدُونَ" (سورۃ ص آیت نمبر 53)

یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

"هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ" (سورۃ الذاریات آیت نمبر 14)

یہ وہی ہے جس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

"إِنَّ هَذَا لَسَاحِرٌ رَجُلٌ" (سورۃ طہ آیت نمبر 63)

کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

"هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُمْ بِهَا تُكذَّبُونَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 14)
یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

"هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكذَّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 43)
یہی وہ جہنم ہے جسے گنہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔

ہذا کے بالقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔ اس کے لئے ذاک اور ذالک استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا،

"الذَّالِكِ الْكِتَابُ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 1-2)
یہ کتاب یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

"ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 17)
یہ اس لئے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ہلاک کر دے۔

تعریفِ مثل:

(م مثل) مثل (ک) (Instance, Exaple)

المثل کے معنی ہیں ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔ اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہو جاتا ہو۔ اور معاملہ کی شکل سامنے آ جاتی ہو۔ مثلاً

مجاورہ:

عین ضرورت پر کسی چیز کو کھودینے کے لئے الصیف ضیعت اللبین کا مجاورہ وہ ضرب المثل ہے۔

چنانچہ قرآن میں امثال بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنَظَرٍ بِهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 21)
اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ فکرنہ کریں۔

معنی کثرت:

(ک کث)

کثرت اور قلت، کمیت منفصل یعنی اعداد میں استعمال ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 64)

اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھے گا۔

تحقیق فسق:

(فسق) فسق (Impiety, Sin)

فسق فلان کے معنی کسی شخص کے دائرہ شریعت سے نکل جانے کے ہیں یہ فسق الرطب کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی گدڑی کھجور کے اپنے چمکے سے باہر نکل آنا کے ہیں شرعاً فسق کا مفہوم کفر سے اعم ہے کیونکہ فسق کا لفظ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہ کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اگرچہ عرف میں بڑے گناہوں کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اور عام طور پر فسق کا لفظ اس شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو احکام شریعت کا التزام اور اقرار کرنے کے بعد تمام یا بعض احکام کی خلاف ورزی کرے۔

نوٹ: ایمان، رب، کفر، ضال، ہدایت کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 27]

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَائِبُونَ (27)

”وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان میں ہیں۔“

متن:

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ

صفة للفاسقين للذم وتقرير الفسق. والنقض: فسخ التركيب، وأصله في طاقات الحبل، واستعماله في إبطال العهد من حيث إن العهد يستعار له الحبل لما فيه من ربط أحد المتعاهدين بالآخر، فإن أطلق مع لفظ الحبل كان ترشيعاً للمجاز، وإن ذكر مع العهد كان رمزاً إلى ما هو من رواده وهو أن العهد حبل في ثبات الوصلة بين المتعاهدين كقولك شجاع يفترس أقرانه وعالم يفترق منه الناس فإن فيه تنبيهاً على أنه أسد في شجاعته يجر بالنظر إلى إفادته. والعهد: الموثق ووضع له من شأنه أن يراعى ويتعهد كالوصية واليمين، ويقال للدار، من حيث إنها تراعى بالرجوع إليها. والتاريخ لأنه يحفظ، وهذا العهد: إما العهد المأخوذ بالعقل، وهو الحجة القائمة على عبادة الدالة على توحيدة ووجوب وجوده وصدق رسوله، وعليه أول قوله تعالى:

وَأَشْهَدُهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ.

أو: البأخوذ بالرسول على الامم. بأنهم إذا بعث إليهم رسول مصدق بالمعجزات صدقوه واتبعوه ولم يكتبوا أمره ولم يخالفوا حكمه، وإليه أشار بقوله:

وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

ونظائره. وقيل: عهود الله تعالى ثلاثة: عهد أخذه على جميع ذرية آدم بأن يقرؤا بربوبيته، وعهد أخذه على النبيين بأن يقيموا الدين ولا يتفرقوا فيه، وعهد أخذه على العلماء بأن يبينوا الحق ولا يكتبوه.

مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ الضمير للعهد والميثاق: اسم لما يقع به الوثيقة وهي الاستحكام والمراد به ما وثق الله به عهده من الآيات والكتب أو ما وثقوه به من الالتزام والقبول، ويختل أن يكون بمعنى المصدر. ومن للابتداء فإن ابتداء النقص بعد الميثاق.

ترجمہ:

وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں۔

یہ الفاسقین کی صفت ہے اور ان کی مذمت اور ان کے فسق کی پختگی کے لئے لائی گئی ہے۔ نقض کا معنی مرکب چیز کے اجزاء کو جدا جدا کرنا اور کھولنا ہے۔ یہ اصل میں رسی کے بٹے ہوئے اجزاء کو کھولنے میں استعمال ہوتا ہے اور عہد کو باطل کرنے کے معنی میں نقض کا استعمال اس حیثیت سے ہے کہ عہد کے لئے مجازاً حبل یعنی رسی بطور استعارہ لی گئی ہے کیونکہ عہد بھی دو متعاہدین کو دوسرے کے ساتھ جوڑنے کا فائدہ دیتا ہے جس طرح رسی مختلف اجزاء کو جوڑتی ہے۔ اگر نقض کا لفظ حبل کے ساتھ استعمال کیا جائے جیسے

ينقض حبل الله

تو یہ تریخ للمجاز کے لئے ہوگا۔ (مشبہ کے مناسبات میں سے ایک مناسب کا ذکر ہوگا) اور اگر اس کو عہد کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ مثل حبل کے ہوگا جیسے وہ دو چیزوں کو ثابت کرنے میں وسیلہ ہوتی ہے اسی عہد بھی دو متعاہدین کے درمیان تعلق برقرار رکھنے کا وسیلہ ہوتا ہے جیسا کہ آپ کا کہنا،

شجاع يفترس اقتراہ

کہ وہ ایسا بہادر ہے جو اپنے ہم جنسوں کا شکار کرتا ہے۔

وعالم يغترف منه الناس

اور وہ ایسا عام ہے کہ لوگ اس سے چلو بھر کر پیتے ہیں۔ یہاں پہلے جملہ میں مشبہ بہ شیر کا مناسب ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے فقرہ میں مشبہ بہ دریا کا مناسب ذکر کیا گیا ہے تو گویا یوں کہا کہ وہ شیر کی طرح بہاؤ ہے اور دریا کی طرح سخی ہے۔ اسی طرح لفظ نقص میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عہد اسی کی مانند ہے جسے وہ توڑتے ہیں۔

"والعہد" عہد سے مراد مکہم اور مضبوط چیز ہے اور عہد اس چیز کے لئے وضع کیا گیا ہے جس شان یہ ہے اس کی رعایت اور حفاظت کی جائے جیسے وصیت اور قسم وغیرہ چونکہ عہد میں بھی اس کی رعایت اور حفاظت کرنا واجب ہوتا ہے اس کے لئے اسے عہد کہا جاتا ہے۔ گھر کو بھی عہد کہتے ہیں اس حیثیت سے گھر والا اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے تاریخ کو بھی عہد کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی گزشتہ اقوام کے کردار اور احوال کی حفاظت کرتی ہے اور یہاں اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ کریم نے اپنے بندوں کو عہد فرمایا کہ ان سے لیا تھا تو اس کائنات میں غور و فکر کر کے اور اس کی ذرہ ذرہ میں بکھری ہوئی آیات کو دیکھ کر اس کی وحدانیت اور واجب الوجود ہونے پر دلیل قائم کریں گے۔ نبوت اور صداقت پر حجت پر قائم کریں گے۔ اور ان پر ایمان لائیں گے اور اللہ کریم کے اس ارشاد گرامی سے سب مراد ہے کہ اللہ کریم نے انہیں خود ان کی ذات پر گواہ بنا لیا یا اس سے مراد وہ عہد ہوگا جو اللہ کریم نے رسولوں کے ذریعے سے ان کی امتوں سے لیا کہ ان کی طرف کوئی ایسا رسول بھیجا جائے جس کی معجزات کے ساتھ تصدیق ہو جائے اور اس کی پیروی کریں اور وہ نبوت کے امور کو نہ چھپائیں اور نہ ہی اس کے حکم کی خلاف ورزی کریں بلکہ اس کی اتباع کریں اور اسی کی طرف اللہ کریم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے،

وَإِذَا خَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ اتَوَا الْكِتَابَ..... ع

اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا اور اسی طرح اس قسم کی دوسری آیات سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ اللہ کریم کے تین عہد ہیں۔

- (1) جو اس نے ساری اولاد آدم سے لیا کہ وہ اس کے رب ہونے کا اقرار کریں۔
- (2) وہ عہد جو اللہ کریم نے انبیاء سے لیا کہ وہ اس کے دین کو قائم کریں اور اس میں اختلاف نہ کریں۔
- (3) وہ عہد جو اللہ کریم نے علماء سے لیا کہ وہ حق کو واضح کریں گے اور اس کو نہیں چھپائیں گے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو عالم حق بات چھپاتا ہے اور اس کو ظاہر نہیں کرتا تو قیامت کے دن جہنم کی آگ میں تپایا ہوا لوہے کا لگام اس کے منہ میں داخل کر لیا جائے۔

من بعد میثاقہ

اپنے عہد کو پختہ کرنے کے بعد۔

میثاقہ کی ضمیر کا مرجع لفظ عہد سے ہے اور میثاق ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کے ذریعے استحکام حاصل ہوتا ہے اور یہاں میثاق سے مراد وہ آیات اور کتابیں ہیں جن کے ساتھ اللہ کریم نے اس عہد کو پختہ کیا یا اس سے مراد وہ چیزیں ہوں گی جن

کے ذریعے بندوں نے اس عہد کو پختہ کیا یعنی اس کو لازم پکڑنا اور اس کو قبول کرنا ہے۔ میثاق اصل میں موثاق تھا، کسرہ کے بعد واؤ یا ہو گئی اور یہ بمعنی مصدر ہوگا اور اس آیت میں "حسن" سے مراد ہر دو صورتوں میں ابتداء ہوگی کیونکہ عہد کو توڑنے کی ابتداء اس کے بعد ہی ہوگی۔

متن:

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ

يَحْتَمِلُ كُلَّ قَطِيعَةٍ لَا يَرْضَاهَا اللَّهُ تَعَالَى. كَقَطْعِ الرَّحْمِ. وَالْإِعْرَاضِ عَنِ مَوَالِيَةِ الْمُؤْمِنِينَ وَالتَّفْرِيقَةِ بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ. وَالكَتَبِ فِي التَّصْدِيقِ. وَتَرْكِ الْجَمَاعَاتِ الْمَفْرُوضَةِ. وَسَائِرِ مَا فِيهِ رَفْضٌ خَيْرٌ. أَوْ تَعَاظِي شَرِّ فَإِنَّهُ يَقْطَعُ الْوَصْلَةَ بَيْنَ اللَّهِ وَبَيْنَ الْعَبْدِ الْمَقْصُودَةَ بِالذَّاتِ مِنْ كُلِّ وَصَلٍ وَفَصْلٍ. وَالْأَمْرُ هُوَ لِلْقَوْلِ الطَّالِبِ لِلْفِعْلِ وَقِيلَ: مَعَ الْعُلُوِّ وَقِيلَ: مَعَ الْإِسْتِعْلَاءِ. وَبِهِ تَمَيُّ الْإِمْرِ الَّذِي هُوَ وَاحِدُ الْأُمُورِ تَسْمِيَةً لِلْمَفْعُولِ بِهِ بِالصِّدْرِ. فَإِنَّهُ مِمَّا يُؤْمَرُ بِهِ كَمَا قِيلَ: لَهُ شَأْنٌ وَهُوَ الطَّلِبُ. وَالْقَصْدُ يَقَالُ: شَأْنَتِ شَأْنَهُ. إِذَا قَصَدْتَ قَصْدَهُ. وَأَنْ يُوصَلَ يَحْتَمِلُ النِّصْبَ وَالْحَفْضَ عَلَى أَنَّهُ بَدَلٌ مِنْ مَا. أَوْ ضَمِيرَةٌ.

والثاني أحسن لفظاً ومعنى.

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ بِالْمَنْعِ عَنِ الْإِيمَانِ وَالِاسْتِهْزَاءِ بِالْحَقِّ. وَقَطْعُ الْوَصْلِ الَّتِي بَهَا نِظَامُ الْعَالَمِ وَصَلَاحُهُ.

أَوْلِيكَ هُمُ الْخَائِبُونَ الَّذِينَ خَسِرُوا بِإِهْمَالِ الْعَقْلِ عَنِ النَّظَرِ وَاقْتِنَاصِ مَا يَفِيدُهُمُ الْحَيَاةَ الْأَبَدِيَّةَ. وَاسْتِبْدَالَ الْإِنْكَارِ وَالطَّعْنِ فِي الْآيَاتِ بِالْإِيمَانِ بِهَا. وَالنَّظَرِ فِي حَقَائِقِهَا وَالِاقْتِنَاصِ مِنْ أُنْوَارِهَا. وَاسْتِهْزَاءِ النَّقْضِ بِالْوَفَاءِ. وَالْفِسَادِ بِالصَّلَاحِ. وَالْعِقَابِ بِالشَّوَابِ.

ترجمہ:

اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان میں ہیں۔ یہاں قطع سے ہر وہ قطع تعلق ہے جس کو اللہ کریم ناپسند فرماتا ہے مثلاً قریبی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی نہ کرنا مومنین کے ساتھ دوستی سے اعراض کرنا اور انبیاء کرام اور آسمانی کتابوں میں تفریق کرنا یعنی بعض پر ایمان لانا اور بعض کا انکار کرنا، اور فرضی اجتماعات میں شرکت نہ کرنا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی بھلائی کو چھوڑنا اور برائی کو اپنانا وغیرہ کیونکہ بھلائی کو چھوڑنا اور برائی کو

اپنانا یہ اس تعلق اور واسطے کو توڑ دیتے ہیں جو بالذات اللہ کریم اور اس کے بندے کے درمیان مقصود ہوتا ہے ہر وصل اور فصل سے۔

والامر هو القول الطالب للفعل

اور امر ہر اس قول کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی فعل کی طلب کی جاتی ہے اور بعض کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی بلند مرتبہ اپنے سے کم مرتبہ والے سے فعل کی طلب کرے یا بذات خود بلند مرتبہ نہیں لیکن اپنے آپ کو بلند مرتبہ سمجھتا ہے۔ اس کا کسی کو کام کرنے کی طلب کرنا اور مجازاً امر کا لفظ اس کام کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کاموں میں سے ایک ہوتا ہے اس صورت میں مصدر بول کر مراد مفعول ہے کیونکہ یہ وہی چیز ہے جس کے کرنے کا کسی کو حکم دیا جاتا ہے جیسے لفظ شان کا معنی طلب کرنا اور قصد کرنا ہے جیسے کہا جاتا ہے،

شانت شانہ

میں نے اس کام کے کرنے کا قصد کیا۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو لفظ اور معنی کے اعتبار سے یہ دوسرا احتمال پسند ہے کیونکہ اس کے قریب ہے، اسی لئے انہوں نے کہا

والثانی احسن لفظاً ومعنی

ویفسدون فی الارض...

یعنی لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے ہیں اور حق کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں اور ان تعلقات کو منقطع کرتے ہیں جن پر نظام عالم قائم ہے اور ان کی اصلاح کا دار و مدار ہے۔

أولئك هم الخسرون

اور یہی لوگ بیہنگی کے خسارے میں ہیں۔ یعنی انہوں نے عقل کو نظر و فکر سے مہمل چھوڑ دیا اور ان کاموں کے کرنے میں استعمال نہ کیا جن سے انہیں دائمی زندگی حاصل ہو سکتی ہے بلکہ وہ آیات طیبات پر ایمان لانے اور حقائق کو تسلیم کرنے کی بجائے ان پر اعتراضات کرتے ہیں اور ان کو جھٹلاتے ہیں کس کی وجہ سے وہ دائمی خسارہ میں ہیں اور ان آیات کے انوار کو حاصل نہیں کرتے اور وعدوں کی خلاف ورزی کو خریدتے ہیں اصلاح کی بجائے فساد برپا کرتے ہیں اور بجائے ثواب کے عذاب حاصل کرتے ہیں اسی لئے وہ ہمیشہ ہمیشہ عذاب کے مستحق ہیں۔

لفظ نقض کی تحقیق:

(ن قی ض) النقص (To Break, To Spoil)

یہ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا شیرازہ بکھیرنے کے ہیں جیسے نقضت البناء عمارت کو ڈھانا الجبل رسی کے

بل اتارنا العقد گرہ کھولنا النجج والنقض یہ دونوں بمعنی منقوض آتے ہیں لیکن بکسر النون زیادہ تر عمارت کے لئے آتا ہے اور بفتح النون کا عام استعمال اشعار کے متعلق ہوتا ہے اسی سے دہلے اونٹ اور زمین کی پرت کو جو کھمبی وغیرہ کے نکلنے سے پھٹ جاتی ہے نقض کہا جاتا ہے پھر نقض العجل والعقد سے استعارہ کے طور پر عہد شکنی کے لئے بھی نقض کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"الَّذِينَ يَتَّقُونَ عَهْدَ اللَّهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 27)

جو اللہ کے اقرار کو توڑ دیتے ہیں۔

"وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا" (سورۃ النحل آیت نمبر 91)

اور جب کئی قسمیں کھاؤ تو ان کو نہ توڑو۔

لفظ عہد کی تحقیق:

(ع ۵۸) العهد (ض) (Promise)

کے معنی ہیں کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور خبر گیری کرنا اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عہد کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 34)

اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرش ہوگی۔

یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔

"لَا يَنْأَلُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 124)

کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔

میثاق کا معنی:

(و ثاق) وثق

وثقت به اثق ثقتم کسی پر اعتماد کرنا اور مطمئن ہونا۔ او ثقته افعال زنجیر میں جکڑناری سے کس کر باندھنا۔ اولو ثاق والو ثاق اس زنجیر یاری کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کو باندھ دیا جائے۔ قرآن میں ہے:

"وَلَا يُؤْتِي وَثَاقَهُ أَحَدٌ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 26)

اور نہ کوئی ایسا جکڑنا جکڑے گا۔

"حَتَّىٰ إِذَا أَخَذْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوُثَاقَ" (سورۃ محمد آیت نمبر 4)

یہ ان تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو جو زندہ پڑے جائیں ان کو قید کر لو۔

المیشاق کی تحقیق:

کے معنی پختہ عہد و پیمان کے ہیں جو قسموں کے ساتھ موکد کیا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَإِذْ أَخَذْنَا مِنْهُ الْمِيثَاقَ الْغَدِيَّةَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 81)

اور یاد کرو جب اللہ نے غمخیزوں سے ان کا عہد لیا۔

"وَإِذْ أَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 154)

اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔

الموثق کا معنی:

(اسم)

پختہ عہد و پیمان کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"حَتَّىٰ تَوْتُونَ مَوْتِقًا مِّنْ لَّهِ لَمَّا تَنَبَّيْ بِهٖ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْتِقَهُمْ"

(سورۃ یوسف آیت نمبر 66)

جب تک تم مجھے اللہ کا یہ عہد نہ دے دو کہ ضرور اسے لے کر آؤ گے مگر یہ کہ تم گھر جاؤ پھر جب انہوں نے یعقوب کو

عہد دے دیا۔

لفظ قطع کی تعریف:

(ق ط ع) القطع (Cut From)

کے معنی کسی چیز کو علیحدہ کر دینے کے ہیں خواہ اس کا تعلق حارہ بصر سے ہو جیسے اجسام اسی سے اعضاء کا قطع کرنا۔ قرآن میں

ہے:

"لَا قَطْعَانَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ مِنْ خِلَافٍ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 124)

میں پہلے تو تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسرے طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا۔

تحقیق امر:

(امر) الامر (اسم) (Order)

کے معنی شان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع امور ہے اور امرتہ (ن) کا مصدر بھی امر آتا ہے جس کے معنی علم دینا کے

ہیں امر کا لفظ جملہ اقوال و افعال کے لئے عام ہے۔ چنانچہ آیات:

وَالَّذِينَ يُزِجُ الْأَمْرَ كُلَّهُ" (سورۃ ہود آیت نمبر 123)

اور تمام امور کا رجوع اسی طرف ہے۔

اتصال کا معنی:

(وصول) الاتصال (Union)

کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہو جانے کے ہیں جس طرح کہ قطرہ دائرہ کی دونوں طرفین ملی ہوئی ہوتی ہیں اس کی ضد انفعال آتی ہے اور وصل کے معنی ملائے کے ہیں اور یہ اسم اور معنی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ وصلت فلانا صلہ رحمی کے معنی میں آتا ہے قرآن میں ہے

"وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 27)

اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اسی کو قطع کئے ڈالتے ہیں۔

فسد کا معنی:

(فساد) الفساد (Quarrel)

یہ فسد الشئی فهو فاسد کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ قرآن میں ہے:

"لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 71)

تو آسمان و زمین سب درہم برہم ہو جائیں۔

تحقیق خسارہ:

(خسران) الخسر والخسران (The Damage)

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسے مال و جاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت و سلامتی عقل و ایمان اور ثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالیٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَا ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ"

(سورۃ الزمر آیت نمبر 15)

ع

جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا۔ دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔

نوٹ: لفظ اللہ، ما، ارض کا ذکر ہو گیا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 28]

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (28)

”بھلا تم کیوں خدا کے منکر ہو گے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلا یا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جلانے کا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔“

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ

استخبار فیہ إنکار، وتعجیب لکفرہم بإنکار الخال التي يقع علیہا علی الطريق البرہانی، فإن صدوره لا ینفک عن حال وصفة فإذا أنکر أن یکون لکفرہم حال یوجد علیہا استلزم ذلك إنکار وجودہ، فهو أبلغ وأقوی فی إنکار الکفر، من (أتکفرون) وأوفق لها بعدہ من الخال، والخطاب مع الذین کفروا وما وصفہم بالکفر وسوء المقال وخبث الفعال، خاطبہم علی طريقة الالتفات، ووبخہم علی کفرہم مع علیہم بحالہم المقتضية خلاف ذلك، والمعنی أخبرونی علی أي حال تکفرون؟

وَ كُنْتُمْ أَمْوَاتًا

ای اجساماً لا حياة لها، عناصر وأغذية، وأخلاقاً ونطقاً، ومضغاً مختلفة وغير مختلفة. فَأَحْيَاكُمْ

بخلق الارواح ونفخها فيكم، وإنما عطفه بالفاء لأنه متصل بما عطف عليه غير مترامخ عنه بخلاف البواقي.

ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ

عند ما تقضى آجالكم. ثُمَّ يُحْيِيكُمْ بالنشور يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ أَوِ لِّلسُّوَالِ فِي الْقُبُورِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ بعد الحشر فيجازيكم بأعمالكم. أَوِ تَنْشُرُونَ إِلَيْهِ مِنْ قُبُورِكُمْ للحساب، فما أعجب كفركم مع عليكم بحالكم هذه. فإن قيل: إن عليوا أنهم كانوا أَمْوَاتًا فَأَحْيَاهُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُهُمْ، لم يعلبوا أنه يحييهم ثم إليه يرجعون.

ترجمہ:

یہاں کیف کے ساتھ استفہام کرنے کا سبب یہ ہے کہ چونکہ کیف کے ساتھ مسؤل عند کی حالت کی حالت کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے لیکن یہاں استفہام انکاری کے معنی میں ہے اور کفار سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ کونسی حالت ہے جس پر تم

اللہ کریم کا انکار کرتے ہو اور ان کے اس انکار پر کفر پر تعجب دلیل منطقی کے طریقہ پر کیا جاتا ہے کہ چونکہ کفر اور انکار کا ثبوت کسی حالت یا صفت کے سوا نہیں ہو سکتا تو جب اس حالت کا ہی انکار کر دیا گیا کہ کوئی ایسی حالت ہے ہی نہیں کہ جس پر کفر پایا جائے تو لازماً یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس کے وجود کا ہی انکار کر دیا جائے اور اس کے کفر کے انکار میں "انکفرون" کے ساتھ سوال کرنے کی نسبت یہ انداز اپنانا زیادہ بلغ اور قوی ہے اور بعد میں بیان ہونے والے حالات کے زیادہ قریب ہے یہاں خطاب کافروں سے ہے کیونکہ جب ان کے کفر کو بیان فرمایا اور ان کی غلط بات کو ذکر کیا اور ان کے افعال کی خباثت کا تذکرہ کیا تو بطور التفات ان کے ساتھ خطاب کیا اور ان کے کفر پر انہیں زجر تو بیخ کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ایسی حالت پر ہیں جو مذکورہ بالا کے خلاف کا تقاضا کرتی ہے اور یہاں کیف، تکفرون، اخبارونی علی ای حال تکفرون کے معنی میں ہے یعنی مجھے خبر دو کہ تم کس حالت پر اس سے کفر کرتے ہو۔

و کنتم امواتا

اس کا معنی یہ ہے کہ تم ایسے اجسام تھے جن میں زندگی نہ تھی تم محض عناصر اور غذا میں تھے اور اخلاط، نطفے اور مضع تھے بعض ان میں سے کامل اور بعض ناقص تھے۔

فاحیا کم

پس اس نے تمہیں زندہ کیا کہ ارواح پیدا فرما کر تمہارے اندر پھونک دیں اور اس کا قبل کلام پر عطف "فا" کے ساتھ کیا ہے۔ اس میں یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ جن پر اس کا عطف کیا گیا ہے یہ ان کے ساتھ متصل ہے ان کے درمیان اور اس کے درمیان بعد نہیں بخلاف ان حالات کے جو بعد میں مذکور ہو رہے ہیں کہ پھر وہ تمہیں مارے گا یعنی جب تمہاری عمریں ختم ہو جائیں گی پھر صور پھونکنے کے دن تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ یا قبر میں سوال جواب کے لئے تمہیں اٹھائے گا۔

ثم الیہ ترجعون

پھر بروز حشر تمہیں اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا اور وہ تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق سزا یا جزا دے گا یا تمہیں حساب و کتاب کے لئے قبروں سے اٹھا کر اس کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا تو پھر ان حالات کے جاننے کے باوجود تمہارا اس کی ذات سے کفر کرنا کتنا عجیب ہے۔

بمتن:

قلت: تمکنہم من العلم بہما لما نصب لہم من الدلائل منزل منزلة علیہم فی
إزاحة العند.

سیما وفي الآية تنبيه على ما يدل على صحتها وهو: أنه تعالى لما قدر على إحيائهم أولاً
قد على أن يحييهم ثانياً، فإن بدء الخلق ليس بأهون عليه من إعادته. أو الخطاب مع

القبیلین فیانہ سبحانہ وتعالیٰ لہا بین دلائل التوحید والنبوۃ. ووعدہم علی الإیمان وأوعدہم علی الکفر، أكد ذلك بأن عدد علیہم النعم العامة والخاصة، واستقبح صدور الکفر منهم واستبعدة عنهم مع تلك النعم الجليلة، فإن عظم النعم یوجب عظم معصية المنعم، فإن قيل: کیف تعد الإمامة من النعم البقتضية للشکر؛ قلت: لہا كانت وصلة إلى الحياة الثانية التي هي الحياة الحقيقية كما قال الله تعالى:

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوانُ.

كانت من النعم العظيمة مع أن المعدود علیہم نعمة هو المعنى المنتزع من القصة بأسرها، كما أن الواقع حالا هو العلم بها لا كل واحدة من الجبل، فإن بعضها ماض وبعضها مستقبل وكلاهما لا یصح أن يقع حالا. أو مع المؤمنین خاصة لتقرير البينة علیہم، وتباعد الکفر عنهم علی معنى، كيف يتصور منكم الکفر وكنتم أموالاً جهالاً، فأحياكم بما أفادكم من العلم والإيمان، ثم يميتكم الموت المعروف، ثم يحييكم الحياة الحقيقية، ثم إليه ترجعون، فيثيبكم بما لا عين رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر. والحياة حقيقة في القوة الحساسة، أو ما يقتضيها وبها سمى الحيوان حيواناً مجازاً في القوة النامية، لأنها من طلائعها ومقدماتها، وفيما يخص الإنسان من الفضائل، كالعقل والعلم والإيمان من حيث إنها كمالها وغايتها، والموت بإزائها يقال علی ما يقابلها في كل مرتبة قال تعالى: قُلِ اللهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ. وقال: اَعْلَمُوا أَنَّ اللهَ يُحْيِي الأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وقال:

أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ

وإذا وصف به البارئ تعالى أريد بها صحة اتصافه بالعلم والقدرة اللازمة لهذه القوة فينا، أو معنى قائم بذاته يقتضى ذلك على الاستعارة. وقرأ يعقوب تُرْجَعُونَ بفتح التاء في جميع القرآن.

ترجمہ:

یہ اصل میں

اخبرونی علی حال تکفرونی... الخ
کے معنی میں ہے اخبرونی میں "انتم" ضمیر ذوالحال اور کیف تکفرون کلمہ حال نیز تکفرون میں انتم ضمیر ذوالحال ہے

اور امواتِ الٰہیٰ آخرہ حال، حال ذوالحال سے مل کر تکفرون کا فاعل ہے۔

مندرجہ بالا آیت کریمہ میں تین گروہوں کے مخاطب ہونے کا احتمال ہے۔

پہلا یہ کہ صرف کافر ہوں۔ دوسرا یہ کہ مومن اور کافر دونوں مراد ہوں۔ تیسرا یہ کہ صرف مومن مراد ہوں۔

1- پہلا احتمال کہ اس کے مخاطب کافر ہوں، کیونکہ ما قبل کلام میں ان کے اقوال، افعال اور عقائد بیان کئے گئے ہیں۔ اب بطریق التفات ان کے کفر و انکار پر ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کی جا رہی ہے اور اس بات پر اظہارِ تعجب کیا جا رہا ہے کہ وہ باوجود اس حالت کو جاننے کے جو کفر نہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے، کیوں انکار کرتے ہیں یعنی نہ کوئی ایسی حالت ہے اور نہ ہی صفت جس پر اس ذات والا صفات کے ساتھ کفر کیا جائے اس وجہ سے کفار کا انکار کوئی معنی نہیں رکھتا۔

2- دوسرا احتمال یہ کہ آیت کے مخاطبین سے مراد کافر اور مومن دونوں ہوں، جس کے وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم نے اس سے ما قبل اپنی توحید، نبوت اور قرآن پاک کے حق ہونے پر بے شمار دلائل دیئے ہیں۔ مومنین کو جنت کی خوشخبری اور منکرین کی عذابِ جہنم کی وعیدیں سنائی ہیں اب اللہ کریم ان پر اپنی خاص اور عام نعمتوں کا تذکرہ فرما کر مومنین کے ساتھ وعدہ اور کافروں پر وعید کو مؤکد کر رہا ہے اور عظیم الشان نعمتوں کے باوجود ان کا کفر اور ناشکری قبیح اور بعید از مکان ہے کیونکہ نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے اس کا کفر اور ناشکری کی سزا بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا اے مومنو! تم میری ان نعمتوں کی ناشکری کیوں کرتے ہو، اور اے کافرو! تم میرا انکار کیوں کرتے ہو۔

3- تیسرا احتمال یہ کہ اس آیت کریمہ کے مخاطبین صرف مومن ہوں اور فرمایا کہ تم ہدایت قبول کرنے سے پہلے جاہل مطلق اور علم و عرفان سے خالی تھے میں نے تمہیں علم بھی دیا، اپنی نعمتوں سے بھی نوازا پھر تمہیں موت عطا فرما کر بصد عزت و احترام اس دار فانی سے رخصت فرمایا اور اس کے بعد تمہیں دوبارہ حقیقی زندگی عطا فرما کر ایسی نعمتوں سے نوازا جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ ہی کسی کے دل میں خیال گزرا ہوگا تو اتنی نوازشات کے ہوتے ہوئے تم میری ناشکری کر سکتے ہو؟

مندرجہ بالا احتمالات میں سے جو بھی مراد لیا جائے تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تم ایسے اجسام تھے جن میں زندگی نہ تھی تم محض غذا میں، عناصر، مضمغے اور نطفے تھے اللہ کریم نے روح پھونک کر زندگی عطا کی پھر مقررہ مدت کے بعد تمہیں موت عطا کرے گا اور پھر بعد صور پھونکنے کے تمہیں قبروں سے نکالے گا اور محشر میں جمع کرے گا یا اس سے مراد ہے کہ تمہیں قبروں میں ابتدائی سوالات کے لئے زندگی بخشے گا پھر محشر تک تم عالم برزخ میں رہو گے اس کے بعد تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا اور اعمال کے مطابق سزا و جزا عطا فرمائے گا۔ جب تمہاری حالت یہ ہے حساب کے لئے رب کے سامنے کھڑے ہو گے تو تمہارا ناشکری کرنا کتنا عجب ہے۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ موت کو ان نعمتوں میں سے کیسے شمار کیا جائے جو شکر کا تقاضا کرتی ہیں کیونکہ وہ تو نعمتوں

کے زوال کا نام ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ موت دائمی اور ابدی نعمتوں کے حصول کا سبب ہے اور زندگی کے ختم ہونے کے بعد ہی اصل زندگی نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد،

وان الدار الاخرة لهي الحيوان

یعنی آخرت کا گھر ہی حقیقی زندگی ہے۔ تو اس لحاظ سے وہ عظیم نعمتوں سے ہوگی جیسے کہا جاتا ہے۔

"احیاء" یہ فعل مضارع کا صیغہ ہے اور احیاء سے مشتق ہے جس کا معنی حس اور حرکت پیدا کرنا ہے کیونکہ حیوان کو اس لئے حیوان کہا جاتا ہے کہ اس میں حرکت ہوتی ہے اور یہاں اس سے مراد زندہ کرنا اور حس و حرکت پیدا کرنا ہے مجازاً اس کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے۔

(1) قوت نامیہ

کیونکہ وہ حس اور حرکت کے مبادیات اور اس کے مقدمات سے ہوتی ہے۔

(2) فضائل و کمالات اور علم و ایمان

فضائل و کمالات اور علم و ایمان کا پیدا ہونا کیونکہ انسان کا کمال اور اس کی غایت انہی پر موقوف ہے۔

(3) اموات

موت بمعنی زوال حیات یعنی وہاں حیات کا نہ ہونا جس کی شان یہ ہے کہ وہ زندہ ہو اور موت کا اطلاق ان تمام معانی اور اوصاف کے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جن کا ذکر حیات کے معنی میں بیان ہو چکا ہے یعنی حس و حرکت، قوت نامیہ، فضائل و کمالات اور علم و عرفان کا نہ ہونا موت کہلاتا ہے کیسا کہ فرمان باری تعالیٰ،

قل الله يحييكم ثم يميتكم

آپ فرمائیے کہ اللہ کریم ہی تمہیں زندگی دیتا ہے اور پھر تمہیں مارتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا،

اعلموا ان الله يحيى الارض بعد موتها

کہ جان لو اللہ کریم ہی زمین کے مردہ ہونے کے بعد اس میں قوت نامیہ پیدا فرمادیتا ہے۔ مزید ایک جگہ فرمایا،

او من كان ميتاً فاحيينه وجعلنا له نوراً يمشی به في الناس

کہ کیا وہ مردہ نہ تھا ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کو نور عطا فرمایا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے۔

حیات کے جو معانی اوپر بیان کئے گئے ہیں ان کا تعلق اجسام سے ہے اور اللہ کریم اجسام اور ان کے خواص اور اوصاف

سے پاک اور منزہ ہے تو ان معانی کے اعتبار سے اللہ کریم پر ان کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ "حی" اللہ کریم کی صفت ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جب حیات کی نسبت اللہ کریم کی طرف ہوگی تو اس سے مراد اللہ کریم کا علم اور قدرت کی

صفت سے متصف ہونا ہے جو اس کو قوت کو لازم ہے جو ہمارے اندر پائی جاتی ہے۔ یا اس سے مراد وہ صفت ہوگی جو اللہ کریم

کی ذات کے ساتھ ہے جو اس علم کا تقاضا کرتی ہے اور بطور استعارہ ان کو ذکر کیا گیا ہے تو "حی" کا معنی یہ ہوگا کہ وہ عالم اور قدیر ہے۔

اشکال اور اس کا جواب:

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ قیامت اور حشر کے جو منکر ہیں ان کے لئے مذکورہ بالا آیات، قیامت کے ثبوت اور دوبارہ زندگی کے لئے دلیل کیسے بن سکتی ہے کیونکہ انہوں نے کسے کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا ہی نہیں جبکہ وہ پہلی زندگی اور موت کے تسلسل سے باخبر ہیں اب اگر وہ اس کا انکار کر دیں اور یہ کہیں دوبارہ زندگی ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ ہڈیاں اور گوشت پوست جل کر خاکستر بن جاتے ہیں پھر دوبارہ انہیں کیسے جمع کیا جاتا ہے تو اس میں ان کا قصور کیا ہے جس پر انہیں مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اللہ کریم نے ان کے سامنے ایسے عام فہم اور واضح دلائل پیش فرمائے ہیں جنہیں دیکھ کر وہ اس کا علم حاصل کر سکتے ہیں کہ جو ذات مذکورہ بالا واقعات پر قادر ہے وہ دوبارہ زندہ بھی کر سکتا ہے لہذا ان کے عدم علم کا عذر اس طرح زائل ہو سکتا ہے اور اسی کو دوبارہ زندگی کے علم کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ یعقوب نے تمام قرآن کریم میں "ترجعون" کو بفتح "تاء" پڑھا ہے۔

کیف کی کیفیات:

(کیف)

کیف (اسم استفہام) اس چیز کی حالت دریافت کرنے کے لئے آتا ہے جس پر کہ شیبہ اور غیر شیبہ کا لفظ بولا جاسکتا ہو جیسے ابیض (سفید) اسود (سیاہی) صحیح (تندرست) سقیم (بیمار) وغیرہ۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے متعلق اس کا استعمال جائز نہیں ہے اور کبھی اس چیز پر بھی کیف کا اطلاق کر دیتے ہیں جس کے متعلق سوال کرنا ہو مثلاً کہا جاتا ہے کہ اسود اور ابیض مقولہ کیف سے ہیں اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق کیف کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ تشبیہ یا توشیح کے طور پر مخاطب سے استخبار کے لئے لایا گیا ہے جیسے فرمایا:

"كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 28)

بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گے۔

"كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 86)

کیونکر اللہ ایسی قوم کی ہدایت چاہے۔

"كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 7)

بھلاشکروں کے لئے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

"انظُرْ كَيْفَ ظَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 48)

دیکھو انہوں نے کس کس طرح کی تمہارے بارے میں باتیں بنائیں۔

"فَانظُرُوا كَيْفَ هَدَا الْخَلْقَ" (سورۃ العنكبوت آیت نمبر 20)

اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔

"أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ" (سورۃ العنكبوت آیت نمبر 19)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا پھر کس طرح اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔

مفہوم رجوع:

(رجوع) الرجوع (To Return)

اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے مبدأ حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور

خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز کے اور یا باعتبار فعل کے ہو الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رجوع کے

معنی لوٹانے کے ہیں۔

نوٹ: آیت بالا میں مذکور باقی الفاظ کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 29]

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (29)

”وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا تو ٹھیک

سات آسمان بنائے وہ سب کچھ جانتا ہے۔“

متن:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا

بیان نعمة آخری مرتبہ علی الاولی، فإنہا خلقہم أحياء قادرین مرة بعد أخرى، وهذه

خلق ما يتوقف عليه بقاؤهم وتم به معاشهم. ومعنى لَكُمْ لَكُمْ لأجلکم وانتفاعکم فی

دنياکم باستنفاعکم بها فی مصالح أبدانکم بوسط أو بغير وسط، ودينکم

بالاستدلال والاعتبار والتعرف لها يلائمها من لذات الآخرة وآلامها، لا علی وجه

الغرض، فإن الفاعل لغرض مستكمل به، بل على أنه كالغرض من حيث إنه عاقبة الفعل ومؤداة وهو يقتضى إباحة الأشياء النافعة، ولا يمنع اختصاص بعضها ببعض لأسباب عارضة، فإنه يدل على أن الكل للكل لا أن كل واحد لكل واحد. وما يعم كل ما فى الارض، إلا إذا أريد بها جهة السفلى كما يراد بالسما جهة العلو. وجميعاً: حال من الموصول الثانى.

ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ قَصْدًا إِلَيْهَا بِإِرَادَتِهِ، مِنْ قَوْلِهِمْ اسْتَوَى إِلَيْهِ كَالسَّهْمِ الْمُرْسَلِ، إِذَا قَصَدَ قَصْدًا مُسْتَوِيًّا مِنْ غَيْرِ أَنْ يَلْوِي عَلَى شَيْءٍ. وَأَصْلُ الاسْتِوَاءِ طَلَبُ السَّوَاءِ، وَإِطْلَاقُهُ عَلَى الْإِعْتِدَالِ لِمَا فِيهِ مِنْ تَسْوِيَةٍ وَضَعِ الْأَجْزَاءِ، وَلَا يُمْكِنُ حَمْلُهُ عَلَيْهِ لِأَنَّهُ مِنْ خَوَاصِّ الْأَجْسَامِ وَقِيلَ اسْتَوَى أَيْ: اسْتَوَى وَمَلَكَ، قَالَ:

قَدْ اسْتَوَى بِشْرٌ عَلَى الْعِرَاقِ... مِنْ غَيْرِ سَيْفٍ وَدَمٍ مُهْرَاقٍ

والاول أوفق للأصل والصلة المعدى بها والتسوية المترتبة عليه بالفاء، والمراد بالسما هذه الاجرام العلوية، أو جهات العلو، وثمر لعله لتفاوت ما بين الخلقين وفضل خلق السما على خلق الارض كقوله تعالى:

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا

لا للتراخي فى الوقت، فإنه يخالف ظاهر قوله تعالى: وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا فإنه يدل على تأخر دحو الارض المتقدم على خلق ما فيها عن خلق السما وتسويتها، إلا أن تستأنف بدحاها مقدراً لنصب الارض فعلاً آخر دل عليه أَنَّكُمْ أَشَدُّ خُلُقًا مِثْلَ تَعْرِفِ الْإَرْضَ وَتَدْبِرْ أَمْرَهَا بَعْدَ ذَلِكَ لَكِنَّهُ خِلَافُ الظَّاهِرِ فَسَوَّاهُنَّ عَدْلَهُنَّ وَخَلَقَهُنَّ مَصُونَةً مِنَ الْعُوجِ وَالْفُطُورِ. وَهِنَّ ضَمِيرُ السَّمَاءِ إِنْ فَسَّرْتَ بِالْأَجْرَامِ لِأَنَّهُ جَمْعٌ. أَوْ هُوَ فِي مَعْنَى الْجَمْعِ، وَإِلَّا فَمَبْهُمٌ يَفْسَرُهُ مَا بَعْدَهُ كَقَوْلِهِمْ: رَبِّهِ رَجُلًا.

سَبَّحَ سَمَاوَاتٍ بَدَلًا أَوْ تَفْسِيرًا. فَإِنْ قِيلَ: أَلَيْسَ إِنْ أَصْحَابِ الْإِرْصَادِ أَثْبَتُوا تِسْعَةَ أَفْلَاقٍ؟ قُلْتُ: فِيمَا ذَكَرْتَهُ شَكُوكٌ، وَإِنْ صَحَّ فَلَيْسَ فِي الْآيَةِ نَفْيُ الزَّائِدِ مَعَ أَنَّهُ إِنْ ضَمَّ إِلَيْهَا الْعَرْشَ وَالْكَرْسِيَّ لَمْ يَبْقَ خِلَافٌ.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں اللہ کریم ایک اور نعمت کا تذکرہ فرما رہا ہے اور وہ دوسری نعمت یہ ہے کہ جس سے نفع حاصل کرنا چاہی

نعمت یعنی زندگی پر موقوف ہے گویا زندگی کی بقاء اور دار و مدار اس دوسری نعمت پر ہے تو گویا یہ تمام نعمتیں، انسانی زندگی کی بقاء اور بدنوں کی سلامتی اور اس نعمت سے فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت پر موقوف ہے۔ اور یہ نعمتیں صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ انسان ان میں تدبر کر کے دین اسلام کے حق ہونے پر دلائل قائم کر سکتا ہے اور ان نعمتوں کے زوال اور وجود سے اخروی نعمتوں کے زوال اور درد و آلام پر قیاس کر سکتا ہے کوئی کم فہم یہ نہ سمجھے کہ اللہ کریم کو ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں اور انسان کو عطا کرنے میں کوئی غرض ہے کیونکہ اللہ کریم کے افعال، اغراض کے مرہون منت نہیں کیونکہ جس کے افعال کسی غرض کے محتاج ہوں وہ اس غرض کے حاصل ہوئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا حالانکہ اللہ کریم کی ذات ایسے نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے۔

اس آیت طیبہ میں "ما" کا لفظ ذوالحال ہے اور جمیعاً اس سے حال ہے اور یہ مذکورہ بالا تفصیلات اس وقت ہوں گی جبکہ "ما فی الارض" سے مراد وہ چیزیں لی جائیں جو زمین میں ہیں اور بذات خود اس سے مراد نہ ہوں ہاں اگر زمین سے نیچے والی جہت مراد لی جائے تو پھر لفظ "ما" زمین کو بھی شامل ہوگا جس طرح سماء کا لفظ بول کر اس سے اوپر والی جہت مراد لی جاتی ہے صرف آسمان مراد نہیں۔

قولہ استوی

یہ لفظ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ اپنے ارادی سے کسی چیز کی طرف قصد کرنا اور متوجہ ہونا ہے اور یہ اس قول سے مشتق ہے

استوی الیہ کالسهم المرسل اذا قصده قصدًا مستویًا... الخ

کہ اس نے اس کا سیدھا قصد کیا جیسے وہ تیرسیدھا نشانے پر جاتا ہے جس کو پھینکا جائے اور وہ ادھر ادھر نہیں مڑتا۔

☆ اس کا لغوی معنی برابری طلب کرنا ہے اور اس اطلاق اعتدال پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس میں مختلف اجزاء کو برابر رکھا جاتا ہے لیکن اس کو اعتدال کے معنی میں استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ اجسام کے خواص سے ہے اور اللہ کریم کی ذات جس طرح جسم سے پاک ہے اسی طرح وہ جسم کے خواص سے بھی منزہ ہے۔

☆ یہ معنی "استولی" اور "ملک" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی وہ اس پر غالب آیا اور مالک بن گیا۔ بطور دلیل قول شاعر ملاحظہ ہو،

قَدِ اسْتَوَى بِبَشَرٍ عَلَى الْعِرَاقِ... مِنْ غَيْرِ سَيْفٍ وَدَمٍ مُهْرَاقِ

کہ بشر عراق پر غالب آیا، بغیر تلوار چلائے اور بغیر خون بہائے۔

لیکن پہلا معنی یعنی ارادہ کے ساتھ کسی چیز کا سیدھا قصد کرنا لغوی معنی کے زیادہ قریب ہے اور جس صلہ کے ساتھ اس کو متعدی کیا گیا ہے (الی) وہ بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے اور "سواہن" کو فاء کے ساتھ اس پر معطوف کرنا جس کا معنی تمام

آسمانوں کو ٹیڑھا پن اور ظلل کے بغیر صحیح اور درست بنا یا بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے کہ استوی کا معنی سیدھا قصد کرنا ہے ورنہ ایک معنی کو ظاہر کرنے کے لئے دو لفظوں کا استعمال ہوگا جو جائز نہیں اور وہ الفاظ "استوا" اور "سواء" ہیں۔

"السماء" اس سے مراد جہات طویہ یا اجرام طویہ ہیں اس لئے "هن ضمیر کا مرجع "السماء" ہے ورنہ یہ ضمیر مبہم ہے اور "سبع سموات" اس کی تفسیر ہے جیسے "سبع درجہ" میں "ہ" ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر "رجلا" ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ علم فلسفہ کے ماہرین نے تجربات سے نوافلاک ثابت کئے ہیں اور اللہ کریم نے سات آسمان ذکر کئے ہیں ان میں تطبیق کیسے ممکن ہوگی؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک میں سات آسمانوں کا ذکر ہے زیادہ کی نفی نہیں اور خصوصاً جب عرش اور کرسی بھی ساتھ ملائیں تو نو ہو جاتے ہیں اس لئے ان میں تضاد نہیں۔ نیز فلسفیوں نے نوافلاک ثابت کرنے کے لئے جو دلائل پیش کئے وہ شکوک اور شبہات سے خالی نہیں اس لئے ان کو عقیدے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ اس سوال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے سات آسمانوں کا ذکر کیا ہے اور فلسفیوں نے نوافلاک ثابت کئے ہیں محققین کے نزدیک آسمان اور فلک دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

متن:

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

فیه تعلیل کا نہ قال: ولکونہ عالم بالکلیات کلہا، خلق ما خلق علی ہذا النمط الاکمل والوجه الانفع، واستدلال بأن من کان فعلہ علی ہذا النسق العجیب والترتیب الانبی کان علیماً، فإن إتقان الافعال واحکامها وتخصیصها بالوجه الاحسن الانفع، لا یتصور إلا من عالم حکیم رحیم، وإزاحة لبساً یختلج فی صدورهم من أن الابدان بعد ما تبددت، وتفتتت أجزاءها، واتصلت بما یشاکلها، کیف تجمع أجزاء کل بدن مرة ثانیة بحیث لا یشد شیء منها، ولا ینضم إليها ما لم یکن معها فیعاد منها کما کان، ونظیرة قوله تعالی: وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ.

واعلم أن صفة الحشر مبنیة علی ثلاث مقدمات، وقد برهن علیها فی ہاتین الآیتین: أما الاولى فہی:

أن مواد الابدان قابلة للجمع والحیاة وأشار إلى البرهان علیها بقوله: وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ لِمُمِّيْتِكُمْ فَإِن تَعَاقَبَ الْاَفْتِرَاقُ وَالاجْتِمَاعُ وَالْمَوْتُ وَالْحَيَاةُ عَلِيهَا یبدل علی أنها قابلة لها بذاتها، وما بالذات یأبی أن یزول ویتغیر. وأما الثانیة والثالثة: فإنه عز

وجل عالم بها وبنمواقعها، قادر علی جمعها وإحیاءها، وأشار إلی وجه إثباتها بأنه تعالی قادر علی إبداءها وإبداء ما هو أعظم خلقاً وأعجب صنعاً فكان أقدر علی إعادتهم وإحیاءهم، وأنه تعالی خلق ما خلق خلقاً مستویاً محکماً من غیر تفاوت واختلال مراعی فیہ مصالحهم وسد حاجاتهم.

وذلك دلیل علی تناهی علیه و کمال حکمتہ جلبت قدرته ودقت حکمتہ. وقد سکن نافع وأبو عمرو والكسائی: الهاء من نحو فهو وهو تشبیهاً له بعضه.

ترجمہ:

یہ آیت کریمہ ماقبل آیت کریمہ میں بیان کردہ حکم کی علت ہے۔ وہ حکم یہ ہے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا ممکن اور اللہ کریم اس پر قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ان تمام چیزوں کے مناسب اجزاء کا عالم ہے اس وجہ سے اس نے ہر چیز کو کامل طریقہ اور بہترین انداز میں بنایا، اور اس بات پر دلیل قائم کرنا مقصود ہے کہ جس ذات پاک کا فعل اس عجیب تناسب پر اور شاندار ترتیب پر ہے وہ علیم ہے کیونکہ افعال کو مضبوط، خوبصورت اور منافع بخش جہت کے ساتھ خاص کرنا عالم، حکیم اور کریم کے بغیر ممکن نہیں اور انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق کفار کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا ہے ان کا یہ وہم تھا کہ جب سارے بدن ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ان کے اجزاء بکھر جائیں گے اور ہم شکلوں کے ساتھ مل جائیں گے تو ہر بدن کے اجزاء کو کس طرح دوبارہ زندہ کیا جائے گا جب کہ نہ تو کوئی چیز ان سے علیحدہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسی چیز ان کے ساتھ ملائی جائے جو پہلے ان کے ساتھ نہ تھی تو اللہ کریم نے ان کے اس شک کو اس طرح دور کیا کہ وہ ہر ایک چیز کو خوب جانتا ہے اور اس کے مناسب مواقع سے بھی باخبر ہے اس لئے اس کے نزدیک ان تمام چیزوں کو اکٹھا کر کے زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور اس کی مثال اللہ کریم نے بیان فرمائی،

وهو بكل خلق علیم

کہ وہ اپنی تمام مخلوق کو خوب جاننے والا ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان دونوں آیات میں انسان کو دوبارہ زندہ کرنے اور بروز حشر جمع کرنے کی دلیل ذکر کی ہے کیونکہ دوبارہ زندہ کرنے کا دعویٰ کے درست ہونے کا دار و مدار تین مقدمات پر ہے۔ پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جسم کے تمام اجزاء، جمع ہونے اور حیات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کی دلیل قرآن مجید میں مذکور ہے،

کنتم اموثاً فاحیا کم ثم ممیتکم

کیونکہ افتراق اور اجتماع کا تسلسل اور زندگی و موت کی کشمکش اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اجزاء اجتماع و افتراق کو

قبول کرتے ہیں اور جو چیز بالذات کسی چیز کو قبول کرتی ہے وہ اس بات سے انکار کر دیتی ہے کہ وہ اس سے زائل ہو جائے اور اس میں تغیر و تبدل پیدا ہو جائے،

دوسرا اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ کریم ہر چیز کو جانتا ہے اور اسے اس کی مناسب جگہوں کا بھی علم ہے اس لئے وہ انہیں جمع کرنے اور ان کو زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور ان دونوں کی طرف اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ وہ ذات ان تمام اجزاء کو جس طرح پہلی مرتبہ پیدا کرنے پر قادر ہے اسی طرح وہ خلق کے اعتبار سے عظیم اور صنعت کے اعتبار سے عجیب مخلوق کو ابتداء پیدا کرنے پر بھی قادر ہے تو جس کی شان یہ ہو وہ انہیں دوبارہ جوڑنے اور زندہ کرنے پر بھی قادر ہوگا۔

ایک اور بات یہ کہ اللہ کریم نے جو بھی چیز پیدا کی ہے وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے اس میں ان کی مصلحتوں اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی رعایت رکھی گئی ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کریم کا علم انتہاء کو پہنچنے والا ہے اور اس کی حکمت سب پر بھاری ہے تو ایسی ذات کے لئے دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

نافع، ابو عمر اور کسائی نے "ہو" کی "ہا" کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے جیسے "فہو" "وہو" اور اس کو عضد کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ اسم ثلاثی ہے اور اس کے عین کلمہ کو عین کلمہ کے سکون کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

جمع کی تعریف:

(جمع مع) الجمع (ف) (Plus)

کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ملا دینا۔ محاورہ ہے: چنانچہ وہ اکٹھا ہو گیا۔ قرآن میں ہے۔

"وَجَمَعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ" (سورۃ القیامۃ آیت نمبر ۹)

اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔

(مال) جمع کیا اور بند رکھا۔

"يَجْمَعُ مَالًا وَعَدَدًا" (سورۃ الہمزۃ آیت نمبر ۲)

مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔

استواء کا معنی:

(سوی) المساواة (Equality, Balance)

کسی چیز کے اپنی ذات کے اعتبار سے حالت اعتدال پر ہونے کے لئے بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى" (سورۃ النجم آیت نمبر ۶)

پھر اس جلوہ نے تصد فرمایا۔

آسمان کے کہتے ہیں؟

(س م و) سماء (Sky)

ہر شے کے بالائی حصہ کو سماء کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سماء ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنا۔

اور آیت: "اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 12) اللہ ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں۔ کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

مساواة اور تسویہ کا معنی:

(س و ی) المساواة (Equality, Balance)

کے معنی وزن کیل یا مساحت کے لحاظ سے دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے ہیں۔
التسویۃ کے معنی کسی چیز کو ہموار کرنے ہیں اور آیت:

"الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ" (سورۃ الانفطار آیت نمبر 7)

وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا۔

میں سواک سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت کو اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق بنایا اور آیت:

"وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 7)

اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے قوی کو برابر بنایا۔

اسی طرح آیت کریمہ: "فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتَ فِيهِ مِن رُّوحِي" (سورۃ الحجر آیت نمبر 29)

تو جب میں اسے ٹھیک کر لوں اور اس میں اپنی طرف کی خاص معزز روح پھونک دوں۔

تحقیق سبع:

(س ب ع) سبع (Seven)

السبع اصل میں "سبع" سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے؛

"سَبْعَ سَمَاوَاتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 29) سات آسمان۔

"سَبْعًا يَشُدُّ أَدَا" (سورۃ النساء آیت نمبر 16) سات مضبوط (آسمان بنائے)۔

"وَسَبْعَ سُبُلَاتٍ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 48) سات بائیں۔

"سَبْعَ لَيَالٍ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 7) سات راتیں۔

"سَبْعَةَ وَثَمَانِيَةَ كَلِمَاتٍ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 22) سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتابہ۔

"سَبْعُونَ خِرَافًا" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 32) ستر گز۔

"سَبْعِينَ مَرَّةً" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 80) ستر مرتبہ۔

اور آیت: "سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي" (سورۃ الحجر آیت نمبر 87)

(الحمد کی) سات آیتیں (عطا فرمائیں جو نماز کی ہر رکعت میں مکرر پڑھی جاتی ہیں میں بعض نے کہا ہے کہ سورۃ الحمد مراد ہے۔ کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ السبع الطوال یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک سات لمبی سورتیں مراد ہیں۔ اور قرآن پاک کی تمام سورتوں کو بھی مثانی کہا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں واقعات تکرار کے ساتھ مذکور ہیں من جملہ ان کے یہ سات سورتیں ہیں السبع والسبع اونٹوں کو ساتویں روز پانی پر وارد کرتا۔ الاسبوع۔ ایک ہفتہ یعنی سات دن جمع اسابیع طفت بالبیت اسبوعا میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے سبعت القوم میں ان کا ساتواں بن گیا۔ اخذت سبع اموالہم میں نے ان کے اموال سے ساتواں حصہ وصول کیا۔ السبع۔ درندہ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے جیسا کہ سات کا عدد "عدد تام" ہوتا ہے۔

ہذلی نے کہا ہے:

كَأَنَّ عَبْدَ لَالٍ أَبِي رَبِيعَةَ مَسْبَعٌ

وہ آل ابی ربیعہ کا غلام ہے جس کی بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لئے درندے آگئے ہوں۔ بعض نے مسبع کا معنی مہمل مع السباع کئے ہیں یعنی وہ جو درندوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے اور بعض نے مسبع (فتح باء) پڑھا ہے۔ اور یہ دعویٰ سے کہنا یہ ہے یعنی وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔ سبع فلانا کسی کی غیبت کرنا اور درندہ کی طرح اس کا گوشت کھانا۔ المسبع۔ درندوں کی سرزمین۔

نوٹ: خلق، ارض، الی، شی اور علم کے معانی کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 30]

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا
وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (30)
"اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، بولے کیا ایسے کو

نائب کرے گا جو اس میں فساد پھیلانے کا اور خوزریاں کرے گا اور ہم تجھے سزا دیتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔“

متن:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

تعداد لنعبه ثلاثة تعم الناس كلهم، فإن خلق آدم وإكرامه وتفضيله على ملائكته بأن أمرهم بالسجود له، إنعام يعمر ذريته، وإذ: ظرف وضع لزمان نسبة ماضية وقع فيه أخرى، كما وضع إذا الزمان نسبة مستقبلية يقع فيه أخرى، ولذلك يجب إضافتهما إلى الجبل كحيث في المكان، وبنيتا تشبيهاً لهما بالموصلات، واستعملتا للتعليل والمجازاة، ومحلها النصب أبداً بالظرفية فإنها من الظروف الغير المتصرفه لها ذكرناه، وأما قوله تعالى: وَإِذْ كُرِّ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ ونحوه فعلى تأويل: إذ كر الحادث إذ كان كذا، فحذف الحادث وأقيم الظرف مقامه، وعامله في الآية قالوا، أو أذ كر على التأويل المذكور لأنه جاء معمولاً له صريحاً في القرآن كثيراً، أو مضمحل عليه مضمون الآية المتقدمة، مثل وبدأ خلقكم إذ قال، وعلى هذا فالجملة معطوفة على خلق لكم داخلة في حكم الصلة، وعن معمر أنه مزيد، والملائكة جمع ملائك على الاصل كالشمال جمع شمال، والتاء لتأنيث الجمع، وهو مقلوب مألک من الالوكة وهي: الرسالة، لأنهم وسائط بين الله تعالى، وبين الناس، فهم رسل الله، أو كالرسل إليهم، واختلف العقلاء في حقيقتهم بعد اتفاقهم على أنها خوات موجودة قائمة بأنفسها، فذهب أكثر المسلمين إلى أنها أجسام لطيفة قادرة على التشكل بأشكال مختلفة، مستدلين بأن الرسل كانوا يرونهم كذلك، وقالت طائفة من النصارى: هي النفوس الفاضلة البشرية المفارقة للأبدان، وزعم الحكماء أنهم جواهر مجردة مخالفة للنفوس الناطقة في الحقيقة، منقسمة إلى قسمين: قسم شأنهم الاستغراق في معرفة الحق جل جلاله والتنزه عن الاشتغال بغيره، كما وصفهم في محكم تنزيله فقال تعالى: يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ وهم العليون والملائكة المقربون، وقسم يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ عَلَى مَا سَبَقَ بِهِ الْقَضَاءُ وَجَرَى بِهِ الْقَلَمُ الْإِلَهِيُّ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ وهم المديرات أمراً، فمنهم

سماویة، ومنہم أرضیة، علی تفصیل اثبتہ فی کتاب الطوالح۔
 والمقول لهم: الملائكة كلهم لعموم اللفظ وعدم البعصص، وقيل ملائكة الارض،
 وقيل إبليس ومن كان معه في محاربة الجن، فإنه تعالى أسكنهم في الارض أولاً
 فأفسدوا فيها، فبعث إليهم إبليس في جند من الملائكة فدمرهم وفرقهم في الجزائر
 والجبال، وجاعل: من جعل الذي له مفعولان وهما في الأرض خَلِيفَةً أعمل فيهما، لأنه
 بمعنى المستقبل ومعتمد على مسند إليه، ويجوز أن يكون بمعنى خالق، والخليفة من
 يخلف غيره وينوب منابه، والهاء فيه للمبالغة، والمراد به آدم عليه الصلاة والسلام
 لأنه كان خليفة الله في أرضه، وكذلك كل نبي استخلفهم الله في عمارة الارض
 وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ أمره فيهم، لا حاجة به تعالى إلى من
 ينوبه، بل لقصور المستخلف عليه عن قبول فيضه، وتلقى أمره بغير وسط، ولذلك لم
 يستنبح ملكاً كما قال الله تعالى: **وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا جَعَلْنَاهُ رَجُلًا** ألا ترى أن الانبياء لما
 فاقت قوتهم، واشتعلت قريحتهم بحيث **يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ** ولو لم تمسسه نار، أرسل
 إليهم الملائكة ومن كان منهم أعلى رتبة كلمه بلا واسطة، كما كلم موسى عليه
 السلام في الميقات، ومحمداً صلّى الله عليه وسلّم ليلة المعراج، ونظير ذلك في
 الطبيعة أن العظم لما عجز عن قبول الغذاء من اللحم لما بينهما من التباعد، جعل
 الباري تعالى بحكمته بينهما الغضروف المناسب لهما ليأخذ من هذا ويعطى ذلك، أو
 خليفة من سكن الارض قبله، أو هو وذريته لأنهم يخلفون من قبلهم، أو يخلف
 بعضهم بعضاً، وإفراد اللفظ: إما للاستغناء بذكره عن ذكر بنيه كما استغنى بذكر
 أبي القبيلة في قولهم: **مضر وهاشم، أو على تأويل من يخلفكم، أو خلفاً يخلفكم**، وفائدة
 قوله تعالى **هَذَا لِلْمَلَأِكَةِ**، تعليم المشاورة، وتعظيم شأن المجعل، بأن بشر عز وجل
 بوجود سكان ملكوته، ولقبه بالخليفة قبل خلقه، وإظهار فضله الراجح على ما فيه من
 الفساد بسؤالهم، وجوابه وبيان أن الحكمة تقتضي إيجاد ما يغلب خيرة، فإن ترك
 الخير الكثير لأجل الشر القليل شر كثير إلى غير ذلك.

ترجمہ:

ما قبل آیات میں اللہ کریم نے اپنے قادر مطلق، بنعم حقیقی اور لائق عبادت ہونے کا تذکرہ فرمایا کہ تم میرا انکار نہ کرو اور میرا

شریک نہ بناؤ اور بنی آدم کو عطا کردہ نعمتوں کا تذکرہ کیا مثلاً فرمایا کہ تم مردہ تھے تمہیں زندگی عطا کی وہ ہمیں پھر مارے گا اور اس کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

دوسرا نکتہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ بیان کیا کہ وہ ذات پاک ہے جس نے تمہارے لئے وہ تمام نعمتیں پیدا فرمائیں جو زمین و آسمان میں ہیں۔

اور تیسرا نکتہ یہ کہ اللہ کی نعمت کا تذکرہ فرمایا اور یہ نعمت اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی گئی اور ملائکہ پر آپ کو فضیلت دی گئی اور آپ کی عظمت کے اعتراف کے لئے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا مگر بالواسطہ یہ نعمت تمام اولادِ آدم کی فضیلت و شرافت کا اظہار ہے کیونکہ آدم علیہ السلام ان تمام کی اصل اور باپ ہیں تو اصل اور باپ کی عزت اولاد کا اکرام ہی ہوتا ہے کیونکہ جو اعزاز قبیلے کے باپ کو حاصل ہوتا ہے وہ پورے قبیلے کو حاصل ہوتا ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ اے اولادِ آدم میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں اور تمہارے باپ کو خلافت فی الارض کا تاج پہنا کر عطا فرمائی اور ملائکہ کے اس استفسار کے باوجود کہ یہ فساد اور خونریزی کا مرتکب ہوگا اس کو خلیفہ کیوں بنایا جا رہا ہے اسے خلیفہ بنا دیا اور فرشتوں کو اپنے اس قول پر معذرت کرنے اور حضرت آدم علیہ السلام کا اعتراف کرنے کے لئے سجدہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو گویا یہ نعمت صرف حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل نہ ہوئی بلکہ تمام اولاد کو عطا ہوئی۔

"اذ یاذ اور حیث" یہ تینوں معنی اور لازم الاضافت ہیں پہلے دونوں معنی بر سکون ظرف زمان کے لئے اور اپنے مابعد کے ساتھ مل کر کلام میں مذکور فعل یا کسی محذوف فعل کا مفعول بنتے ہیں اس لئے عموماً محل نصب میں ہوتے ہیں۔ "اذا" یہ زمانہ ماضی مستقبل میں واقع ہونے والی نسبت کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے جس زمانہ میں دوسری نسبت بھی واقع ہو۔ "اذ" زمانہ ماضی میں نسبت حکمیہ کے واقع ہونے کو ظاہر کرتا ہے جس زمانہ میں دوسری نسبت بھی واقع ہو۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اذ زمانہ ماضی میں واقع ہونے والی دو نسبتوں کو ظاہر کرتا ہے مگر بعض جگہوں میں اس سے پہلے ایسا فعل آجاتا ہے جو زمانہ مستقبل کا معنی دیتا ہے اس صورت میں ان دونوں کو یکجا کرنا کیسے ممکن ہے؟ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ میں ہے،

وَ اذْکُرْ اَٰخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْاَحْقَافِ... الخ

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں "اذ ذکر الحادث از کان کذا تھا" تو گویا اس سے پہلے الحادث شبہ فعل محذوف ہے الحادث زمانہ ماضی کو ہی شامل ہے یا اس سے پہلے فعل مضمرب ہی ہوگا جس پر آیت کریمہ کا مضمون دلالت کرتا ہے تو اس کا عطف "خلق لکم" پر ہوگا اور صلہ کے حکم میں داخل ہوگا اور معمر کے نزدیک یہ زائدہ ہے۔

نوٹ: واو عاطفہ ہے اس کا مابعد معطوف ہے اذ ظرف زمانہ برائے ماضی مضاف

قال ربك للملائكة قول ائی جاعل فی الارض خلیفۃ مقولہ

قول مقولہ مل کر "اذ" کا مضاف الیہ ہو کر فعل محذوف "اذ کر یا قالوا" کی طرف ہے۔

"الملائکہ" اس کا مفرد "مَلَک" ہے اصل مالک بروزن مفعل الوکۃ سے مشتق ہے جس کا معنی پیغام رسانی کرنا ہے۔ اس میں قلب کرنے کے بعد ہمزہ کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا، اور یہ بمعنی مرسل ہے۔ اب یہ ملائکہ یا تو اللہ کی طرف سے انبیاء کی طرف یا عام لوگوں کی طرف اس کے پیغام اور فیض پہنچانے کا سبب ہیں۔

تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ فرشتے ایسی ذات ہیں جو موجود اور قائم بذاتہ ہیں مگر اس میں ان کا اختلاف یہ ہے کہ کیا یہ اجسام ہیں یا ارواح؟ لطیف ہیں یا کثیف؟ اس مسئلہ میں ان کے اقوال کی تفصیل یہ ہے کہ اہل اسلام سے اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ ہوا کی طرح لطیف اجسام ہیں اور مختلف شکلوں میں تبدیلی پر قادر ہیں کیونکہ انبیاء نے انہیں اسی طرح مختلف اشکال میں دیکھا ہے کبھی وہ اپنی اعلیٰ شکل میں نورانی پروں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی حضرت وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں اور کبھی کسی اور صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ فلاسفہ اسلام کے نزدیک جو اہر مجردہ ہیں لیکن انسانی اجسام سے نکلنے والی روحمیں نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور وہ علم و قوت میں، ان ارواح سے کہیں زیادہ ہیں۔

نصاری کا کہنا ہے کہ ملائکہ وہ روحمیں ہیں جو انسانی اجسام سے جدا ہوتی ہیں۔ اگر وہ نیک، پاکیزہ اور طیب ہوں تو ان کو ملائکہ کہا جاتا ہے، اور اگر وہ شریر اور خبیث ہوں تو انہیں شیطان اور جن کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ نظر یہ بعید از حقیقت ہے۔

اقسام ملائکہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرشتوں کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں:

1- علیون 2- مقربون۔

ان دونوں کی ڈیوٹی اللہ کریم کا ذکر اور اس کی عبادت میں مشغول رہنا ہے۔

3- مدبرات الامر: ان کا کام اللہ کریم کے حکم کے مطابق انتظام کرتے ہیں ان میں بعض آسمان کا نظام سرانجام دیتے ہیں انہیں سماویہ کہتے ہیں اور بعض کی ڈیوٹی زمین کے انتظام میں ہے ان کو ارضیہ کہتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن فرشتوں کے سامنے اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کا ذکر کیا گیا

اس سے مراد وہ تمام فرشتے تھے یا بعض؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس سے مراد تمام فرشتے ہیں کیونکہ یہاں جمع مکر معرف باللام ذکر فرمائی ہے جو عموم کا فائدہ دیتی ہے اور اس کی تاکید بھی ایسے کلام کے ساتھ لائی جاتی ہے جن میں تخصیص کا کوئی مقام نہیں رہتا مثلاً "کلہم اجمعون" البتہ

بعض علماء کا خیال ہے کہ ان سے مراد صرف وہ ملائکہ ہیں جن کو زمین کا انتظام سونپا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک وہ فرشتے اور ابلیس ہے جن کو ابلیس کی معیت میں زمین سے جنات کو نکالنے اور بھگانے کے لئے بھیجا گیا تھا اور انہوں نے جنات کو پہاڑوں

اور جزیروں میں بھگا دیا مگر اول حق ہے۔

"اُنّی جاعل" جاعل اسم فاعل ہے یہ جعل سے مشتق ہے جس کا معنی بنانا ہے اور یہ افعال تصییر میں سے ہونے کی وجہ سے دو مفعولوں کو نصب دیتا ہے اسی لئے جاعل کے دو مفعول ہیں۔

خلیفۃ اور فی الارض یا یہ خالق کے معنی میں ہوگا اس وقت اس کا مفعول خلیفہ ہوگا اور فی الارض، خلیفہ سے حال ہوگا۔ اور یہاں اسم فاعل کے عمل کی شرائط میں سے دو شرطیں موجود ہیں۔

پہلی یہ کہ وہ استقبال کے معنی میں ہے، دوسری یہ کہ اس سے پہلے مسند الیہ موجود ہے جو کہ "اُنّی" ہے۔

خلیفہ:

یہ فعل کے وزن پر ہے اور صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور اس کے آخر میں تائے تانیث نہیں بلکہ مبالغہ پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ جیسے علامتہ کے آکر میں تاء ہے اس کی جمع خلفاء ہے خلافت نہیں اس کا معنی پیچھے آنے والا کسی کے قائم مقام ہونے والا اور اصطلاح میں خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے قائم مقام ہو کر ان تمام امور کو عملی جامہ پہنانے پر قادر ہو جس کو مستخلف علیہ سرانجام دیتا ہو۔

خلیفہ کا معنی سمجھنے کے بعد تین چیزوں کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

1- خلیفہ سے کون ہستی مراد ہے۔

2- خلیفہ کہنے کی وجہ۔

3- خلیفہ بنانے کی ضرورت

خلیفہ سے کون ہستی مراد ہے؟:

خلیفہ سے مراد یا تو حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن کو اللہ کریم نے اپنا نائب مقرر کیا اور ان کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا فرمایا اور انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرشتوں کو یہ حکمت سمجھائی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کیوں خلیفہ بنایا گیا۔ اور فرمایا کہ خلیفہ وہ ہوتا ہے جو تمام امور سے باخبر ہو، بے خبر اور جاہل خلافت کے معاملات نہیں چلا سکتا۔

یا خلیفہ سے مراد آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد دونوں ہیں۔ اور واحد کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ آدم ابو البشر ہیں جب ان کا تذکرہ آگیا تو اولاد خود بخود اس کے تحت داخل ہو، جیسے کوئی یہ کہتا ہے یہ کام مضر یا ہاشم نے کیا تو اس سے مراد پورا قبیلہ ہوتا ہے۔ یا خلیفہ کا لفظ اسم جنس ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور اولاد آدم دونوں ہوں گے۔

خلیفہ کہنے کی وجہ:

حضرت آدم علیہ السلام اور اولاد آدم اللہ کریم کے نائب ہیں اس لئے ان کو خلیفہ کہا گیا۔

یا وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلیفہ بنتے رہتے ہیں اس لئے انہیں خلیفہ کہہ دیا گیا۔

خلیفہ بنانے کی ضرورت:

ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کریم جو قادر مطلق ہے اس کو زمین کا نظام چلانے کے لئے خلیفہ کی حاجت کیوں ہوئی؟ کیا وہ یہ کام خود انجام نہیں دے سکتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زمین کا نظام چلانے کے لئے اللہ کریم کو کسی کی ضرورت نہیں وہ حاکم مطلق ہے کلمہ "کن" کے ساتھ ہر چیز کا انتظام فرما سکتا ہے لیکن جن کے لئے خلیفہ مقرر کیا گیا وہ اللہ کریم سے فیض حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ اللہ کریم کے علم میں یہ تھا کہ جن پر خلیفہ مقرر کر رہا ہوں وہ اس کے محتاج ہوں گے ان کی فطرت گناہوں کی ظلمت اور تکدر سے تاریک ہوگی۔ ان کے دل و دماغ مادیت زدہ ہوں گے، ان کا ادراک و احساس اس قابل کہاں کہ اس نور مجرد اور لطیف و خمیر سے بلا واسطہ فیض حاصل کر سکیں اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ کوئی واسطہ ہو جس کے اندر اکتساب فیض اور دوسروں کو فیض پہنچانے کی صلاحیت موجود ہو۔ ایک طرف وہ اپنے روشن ضمیر اور طہارت، فکر و نظر اور اپنی مخصوص علمی اور نظریاتی قوتوں کے سبب عالم قسد اور بارگاہ ملکوت سے مناسبت رکھتا ہو، وہاں سے علم حاصل کرتا ہو، اور دوسری طرف انسانوں کے ساتھ مناسبت ہو اور ایسا واسطہ انبیاء کرام کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اللہ کریم نے انبیاء کو اپنا خلیفہ بنایا جو ایک طرف سے اللہ کریم سے کسب فیض کرتے ہیں اور دوسری جانب لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

اگر کوئی فرشتہ نبی ہوتا تو وہ بھی انسان ہوتا تاکہ اتحاد جنس ہونے کی وجہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا رہے۔ انبیاء کرام کی جسمانی قوتیں عام انسانوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے دل اللہ کریم کی معرفت کے نور سے متور اور روشن ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ کریم سے علوم و معارف حاصل کر کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بلاواسطہ ستر ہزار پردوں کے اندر سے اور ہمارے آقا ﷺ نے بلا حجاب قافی تو سین اودائی کے مقام پر "فاوحی الی عبدہ ما ووحی" کا فیض حاصل کیا۔ استفادہ اور افادہ کی مثال انسانی جسم میں بھی موجود ہے جس پر مذکورہ بالا حقیقت کو قیاس کیا جاسکتا ہے انسانی جسم دو چیزوں کا مجموعہ ہے،

1- گوشت 2- ہڈیاں

ہڈیاں سخت ہوتی ہیں جبکہ گوشت نرم۔ اور ہڈیاں گوشت سے غذا حاصل کرنے سے قاصر ہوتی ہیں اس لئے اللہ کریم نے ان کے درمیان غضروف یعنی (نرم ہڈی) واسطہ بنا دی، جو گوشت کی طرح نرم اور نہ ہڈی کی طرح سخت ہے۔ اب وہ اپنی نرمی کی وجہ سے گوشت سے غذا حاصل کرتی ہے اور ہڈیوں کے ہم جنس ہونے کی وجہ سے ان تک پہنچاتی ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام اللہ کریم سے فیض حاصل کر کے بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہ ان سے کسب فیض کرتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کا معاملہ فرشتوں کے سامنے کیوں رکھا؟

- اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ
- ☆ ہمیں باہمی مشاورت کی تعلیم کے لئے۔
 - ☆ خلیفہ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے
 - ☆ اس فضیلت کو ظاہر کرنے کے لئے جو ممکن مفسد پر غالب ہے۔
 - ☆ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ خیر کثیر کو شر قلیل کے مقابلہ میں ترک کرنا بذات خود شر کثیر ہے۔

متن:

قَالُوا اَلْجَعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ

تَعَجُّبٌ مِنْ اَنْ يَسْتَخْلَفَ لِعِبَارَةِ الْاَرْضِ وَاِصْلَاحِهَا مِنْ يَفْسُدُ فِيهَا، اَوْ يَسْتَخْلَفَ مَكَانَ اَهْلِ الطَّاعَةِ اَهْلَ الْمَعْصِيَةِ، وَاسْتِكْشَافَ عَمَّا خَفِيَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْحِكْمَةِ الَّتِي بَهَرَتْ تِلْكَ الْمَفَاسِدَ وَالْغَمَّ، وَاسْتِخْبَارَ عَمَّا يَرِشُدُهُمْ وَيُزِيحُ شَبَهَتَهُمْ كَسُؤَالِ الْمُتَعَلِّمِ مَعْلِمَهُ عَمَّا يَخْتَلِجُ فِي صَدْرِهِ، وَلَيْسَ بِاعْتِرَاضٍ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى جَلَّتْ قُدْرَتُهُ، وَلَا طَعْنَ فِي بَنِي آدَمَ عَلَى وَجْهِ الْغَيْبَةِ، فَيَانِهِمْ اَعْلَى مِنْ اَنْ يَظُنَّ بِهِمْ ذَلِكَ لِقَوْلِهِ تَعَالَى:

بَلْ عِبَادٌ مُكْرَمُونَ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ

وَإِنَّمَا عَرَفُوا ذَلِكَ بِإِخْبَارٍ مِنْ اللَّهِ تَعَالَى، أَوْ تَلَقَى مِنَ اللَّوْحِ، أَوْ اسْتِنْبَاطَ عَمَّا رَكَزَ فِي عَقُولِهِمْ اَنْ الْعَصِيَّةَ مِنْ خَوَاصِمِهِمْ، أَوْ قِيَاسَ لِأَحَدِ الثَّقَلَيْنِ عَلَى الْآخَرِ. وَالسُّفْكَ وَالسَّبْكَ وَالسَّفْحُ وَالشَّنُّ أَنْوَاعٌ مِنَ الصَّبِّ، فَالسُّفْكَ يُقَالُ فِي الدَّمِ وَالدمِ وَالدمِ، وَالسَّبْكَ فِي الْجَوَاهِرِ الْمَذَابِ، وَالسَّفْحُ فِي الصَّبِّ مِنْ اَعْلَى، وَالشَّنُّ فِي الصَّبِّ مِنْ فَمِ الْقَرْبَةِ وَنَحْوِهَا، وَكَذَلِكَ السِّنُّ، وَقَرَأَ «يُسْفِكُ» عَلَى الْبِنَاءِ لِلْمَفْعُولِ، فَيَكُونُ الرَّاجِعُ إِلَى مَنْ، سِوَا جَعَلَ مَوْصُولاً أَوْ مَوْصُوفاً مَحْذُوفاً، أَيْ: يَسْفِكُ الدَّمَاءَ فِيهِمْ.

وَتَحْنٌ نُسْبِحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ حَالٍ مَقْرَرَةٌ لِحُجَّةِ الْإِشْكَالِ كَقَوْلِكَ: اَتَحْسَنُ إِلَى اَعْدَائِكَ وَأَنَا الصَّدِيقُ الْبَحْتِاجُ الْقَدِيمُ. وَالْمَعْنَى: اَتَسْتَخْلَفُ عَصَاةَ وَنَحْنُ مَعْصُومُونَ اَحْقَاءُ بِذَلِكَ، وَالْمَقْصُودُ مِنْهُ، الْاِسْتِفْسَارُ عَمَّا رَجَّحَهُمْ وَمَعَ مَا هُوَ مُتَوَقَّعٌ مِنْهُمْ. عَلَى الْمَلَائِكَةِ الْمَعْصُومِينَ فِي الْاِسْتَخْلَافِ، لَا الْعَجَبُ وَالتَّفَاخُرُ. وَكَأَنَّهُمْ عَلِمُوا اَنْ الْبِجْعُولُ خَلِيفَةُ ذُو ثَلَاثِ قَوَى عَلَيْهَا مَدَارُ اَمْرَةٍ: شَهْوِيَّةٌ وَغَضَبِيَّةٌ تُوْدِيَانِ بِهِ إِلَى الْفَسَادِ وَسْفِكِ الدَّمَاءِ، وَعَقْلِيَّةٌ تَدْعُو إِلَى الْمَعْرِفَةِ وَالطَّاعَةِ. وَنَظَرُوا إِلَيْهَا مَفْرَدَةً وَقَالُوا: مَا الْحِكْمَةُ فِي

استخلافہ، وهو باعتبار تينك القوتين لا تقتضى الحكمة إجمادة فضلاً عن استخلافه، وأما باعتبار القوة العقلية فنحن نقيم ما يتوقع منها سلباً عن معارضة تلك المفسد، وغفلوا عن فضيلة كل واحدة من القوتين إذا صارت مهذبة مطواعة للعقل، متبرنة على الخير كالعفة والشجاعة ومجاهدة الهوى والإنصاف. ولم يعلموا أن التركيب يفيد ما يقصر عنه الآحاد، كالأحاطة بالجزئيات واستنباط الصناعات واستخراج منافع الكائنات من القوة إلى الفعل الذي هو المقصود من الاستخلاف، وإليه أشار تعالى إجمالاً بقوله:

قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ

والتسبيح تبعيد الله تعالى عن السوء وكذلك التقديس، من سَبَّحَ فِي الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ وَقُدْسٌ فِي الْأَرْضِ إِذَا ذَهَبَ فِيهَا وَأَبْعَدُ، وَيُقَالُ قُدَّسَ إِذَا طَهَرَ لِأَنَّهُ مَطْهُرُ الشَّيْءِ مَبْعُدُهُ عَنِ الْأَقْدَارِ. وَيَحْتَدِيكَ فِي مَوْضِعِ الْحَالِ، أَيْ: مَتَلَبِّسِينَ بِحَمْدِكَ عَلَى مَا أَلْهَيْتَنَا مَعْرِفَتَكَ وَوَفَّقْتَنَا لِتَسْبِيحِكَ، تَدَارَكُوا بِهِ مَا أَوْهَمَ إِسْنَادَ التَّسْبِيحِ إِلَى أَنْفُسِهِمْ، وَنَقُدْسُ لَكَ نَطَهَرَ نَفُوسَنَا عَنِ الذُّنُوبِ لِأَجْلِكَ، كَأَنَّهُمْ قَابَلُوا الْفَسَادَ الْبَفسِرَ بِالشَّرِكِ عِنْدَ قَوْمٍ بِالتَّسْبِيحِ، وَسَفَكَ الدَّمَاءَ الَّذِي هُوَ أَكْثَرُ الْأَفْعَالِ الذَّمِيمَةِ بِتَطْهِيرِ النُّفُوسِ عَنِ الْإِثَامِ وَقِيلَ: نَقُدْسُكَ وَاللَّامُ مَزِيدَةٌ.

ترجمہ:

اس آیت میں اللہ کریم نے یہ بیان فرمایا کہ جب اس نے فرشتوں کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ مقرر کرنے کا معاملہ پیش فرمایا اور اپنے ارادہ کا اظہار کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ اللہ۔ تو اس کو زمین کی آبادی کے لئے خلیفہ بنا رہا ہے جو اس میں فساد پیدا کرے گا اور خوب بہائے گا کیونکہ یہ ایسے اجزاء سے مرکب ہے جن سے بھائی کی توقع کم، اور فتنہ و فساد کی زیادہ۔ اور ہمارے ہوتے ہوئے جو ہمیشہ تیری تسبیح و تہلیل بیان کرتے رہتے ہیں ایسے فساد اور خون بہا کرنے والے کو خلیفہ کیوں بنایا جا رہا ہے تو اللہ کریم نے جواب دیا کہ جو میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔

فرشتوں کا اللہ کریم کی بارگاہ میں مذکورہ بالا خدشہ کا اظہار کرنا یہ نہ تو اللہ کریم کے ارادہ پر اعتراض ہے اور نہ ہی حضرت آدم علیہ السلام میں مخفی عیوب کو ظاہر کرنا مقصود ہے اور نہ ہی اپنا تقاخر اور بڑائی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جس کہ وجہ سے ملائکہ کی عصمت داغدار ہو اور انہیں گناہوں کا مرتکب تصور کیا جائے، کیونکہ ملائکہ کے سوا ایسے انداز اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کریم ان کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی حکمت ظاہر فرمائے اور ان کی رہنمائی فرمائے جن سے ان کا یہ شبہ زائل ہو جائے

نیز فرشتوں کی موجودگی میں حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے پر تعجب کا اظہار تھا اور فرشتوں کا یہ استفسار اللہ کریم سے اس طرح تھا جیسے کوئی شاگرد کسی مسئلہ سے متعلق اپنے دل میں پیدا ہونے والے شبہ کے ازالہ کے لئے اپنے استاذ سے سوال کرتا ہے۔ اور یہ گستاخی نہیں کہلاتا، یہی حالت فرشتوں کی تھی لہذا حق یہ کہنا کہ مذکورہ بالا غدشہ کا اظہار فرشتوں کی عصمت کے خلاف ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام فساد اور خون ریزی کے مرتکب ہوں گے۔

1- اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم نے فرشتوں کو یہ بتا دیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس قسم کے اوصاف سے متصف کر کے پیدا کیا جائے گا۔

2- دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم نے قیامت تک ہونے والے واقعات اپنے علم اور فیصلہ کے مطابق لوح محفوظ پر لکھ دیئے تھے اور فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی مذکورہ بالا صفات اور اوصاف لوح محفوظ سے پڑھ لئے مگر ان کو خلیفہ بنانے کی حکمتوں کو نہ پڑھ سکے۔

3- فرشتوں نے انسان کو جنات پر قیاس کیا کہ وہ ناری مخلوق تھے، وہ زمین کی آبادی کی بجائے اس میں تخریب کاری کرتے رہے اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے اجزائے ترکیبی میں بھی ناری اجزاء ہیں لہذا وہ بھی ان خرابیوں کا مرتکب ہوں گے۔

4- فرشتوں نے یہ گمان کیا ہوگا کہ گناہوں سے محفوظ ہونا صرف انہی کا خاصہ ہے ان کے علاوہ جو بھی ہوگا وہ فساد اور خون بہانے کا مرتکب ہوگا۔

5- فرشتوں کے دل میں نافرمان کو خلیفہ بنانے کی حکمت میں جو خلعش پیدا ہوئی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ملائکہ نے یہ کہا کہ اے مولا کریم کہ ہم تجھے ہر نقص و عیب سے پاک سمجھتے ہیں اور تیری تسبیح کرتے رہتے ہیں، یہ فخر و تکبر کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے یہ گمان کیا کہ جس کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے اس میں تین قوتیں ہوں گی۔ جن میں سے دو فساد تک پہنچانے والی ہیں۔

1- قوت غضبیہ

2- قوت شہویہ

یہ دونوں قوتیں فساد اور خون ریزی تک پہنچاتی ہیں۔

3- قوت عقلیہ

یہ معرفت اور اطاعت کی دعوت دیتی ہے۔

تو ملائکہ نے یہ گمان کیا کہ قوت عقلیہ سے جن افعال کو انجام دینے کی تمنا کی جاسکتی ہے ہم وہ انجام دے رہے ہیں جن میں مذکورہ بالا مفاسد نہیں لہذا ہمارے ہوتے ہوئے انہیں کیوں غلیفہ بنایا جا رہا ہے، لیکن فرشتے ان رازوں سے لاعلم تھے۔ جو ان دونوں قوتوں کے مہذب بن جانے اور عقل کے فرمانبردار ہو جانے کے بعد ان سے اظہار پذیر ہوتے ہیں، جن کو اکیلی قوت عاقلہ انجام دینے سے قاصر ہوتی ہے۔ مثلاً پاکدامن ہونا، شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کرنا، خواہشات نفس کے ساتھ مقابلہ کرنا، انصاف کرنا اور اس دنیا میں چھپی ہوئی منفعت کا اظہار صنعتوں کا قیام اور اسی قسم کے بے شمار جزئیات کو عملی جامہ پہنانا وغیرہ اس چیز کو اللہ کریم نے،

اَللّٰی اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اور جو ذات ان تینوں قوتوں کی مظہر ہوگی وہی ان مذکورہ بالا امور کو انجام دے سکے گی۔ ان تمام مذکورہ بالا توجیہات کے باوجود فرشتوں کے لئے بہتر یہ تھا کہ وہ اس بات پر خاموش رہتے استفسار نہ کرتے یہاں تک کہ اللہ کریم خود ان کے سامنے یہ تمام حکمتیں بیان فرمادیتا ان کے خاموش نہ رہنے کی وجہ سے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک فرشتوں کی تسبیح کے الفاظ یہ ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں پہلے آسمان والے فرشتے یہ تسبیح کرتے ہیں،

سُبْحَانَ ذِي الْمَلِكِ وَالْمَلَكُوتِ

دوسرے آسمان والے یہ

سُبْحَانَ ذِي الْعِزَّةِ وَالْجَبْرُوتِ

تیسرے آسمان والے یہ

سُبْحَانَ الَّذِي لَا يَمُوتُ

کے الفاظ سے اللہ کریم کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔

"لک" اس میں لام کے دو معانی ہیں پہلا سبب اور علت کے لئے اور دوسرا زائدہ۔

اگر لام سبب اور علت کے لئے ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ ہم تیری وجہ سے اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھے ہوئے ہیں اور اگر لام زائدہ ہو تو معنی یہ ہوگا کہ ہم تجھے پاک اور مقدس تصور کرتے ہیں۔ بعض مفسرین نے فساد فی الارض سے شرک مراد لیا ہے اور "یفسد" کو "یشرک" کے معنی میں کیا ہے تو اس صورت میں "نسب" کا معنی یہ ہوگا کہ ہم تجھ کو شرک سے پاک تصور کرتے ہیں اور یفسدک الذماء کے مقابلہ میں "نقدس" ہوگا معنی یہ ہوگا کہ ہم تجھے ایسے گناہوں سے پاک مانتے

ہیں یعنی خون ریزی وغیرہ سے، یہ مکمل جملہ "تجعل" کی ضمیر "انت" سے حال ہے اور "بحمدک نسبح" کی ضمیر سے حال ہے۔

لفظ ملائکہ کا اصل معنی :

(الک) (Angel)

الملائکة (فرشتے) اور ملک اصل میں مالک ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ملاک سے مغلوب ہے اور مالک و ملائکة والوی کے معنی رسالت یعنی پیغام کے ہیں اسی سے لکنی کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں اسے میرا پیغام پہنچا دو،۔ الملائکة کا لفظ (اسم جنس ہے اور) واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا" (سورۃ الحج آیت نمبر 75)

اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کر لیتا ہے۔

خلیل نے کہا ہے کہ مالکۃ کے معنی ہیں پیغام اور اسے مالکۃ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی منہ میں چبایا جاتا ہے اور یہ فرس یا الک اللجام کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا منہ میں لگام کو چبانا۔

تحقیق لفظ خلیفہ:

(خلف) خلیفہ (Successer)

(پیچھے) الخلفۃ کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔ خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب ہو اور ریاس کے عجز کے سبب سے ہو اور یا محض نائب کو شرف بخشنے کی غرض سے ہو اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے چنانچہ فرمایا:

"وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 165)

اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔

سفک کا معنی :

(س ف ک) (ض) (Fool)

السفک کے معنی خون ریزی کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 30)

اور کشت و خون کرتا پھرے۔

ویسے یہ لفظ ہر سیال چیز اور آنسو بہانے کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔

دم کا اصل معنی:

(دمی) الدم (Blood)

خون۔ یہ اصل میں دما می تھا (یاء کو برائے مخفیف حذف کر دیا ہے) قرآن میں ہے:

"حَرِّمَتْ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 3)

تم پر حرام ہے مردار اور خون۔

دم کی جمع دماء ہے۔ قرآن میں ہے

"لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 84)

کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا۔

دمیت (د) الجراحۃ زخم سے خون بہنا۔ فرس مدعی۔ خون کی طرح نہایت سرخ رنگ کا گھوڑا۔ الدمیتہ گڑیا (جو

خون کی مانند سرخ اور منقوش ہو) شکجۃ دامید۔ سر کا زخم جس سے خون بہ رہا ہو۔

تحقیق لفظ سبح:

(س ب ح) السبح (Praise)

اس کے اصل معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں سبح (ف) سبحا و سبحاۃ وہ تیز رفتاری سے چلا پھر

استعارہ یہ لفظ فلک میں نجوم کی گردش اور تیز رفتاری کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:

"وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 33)

سب (اپنے اپنے) فلک یعنی دوائر میں تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اور گھوڑے کی تیز رفتاری پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا" (سورۃ النازعات آیت نمبر 3)

اور فرشتوں کی قسم جو آسمان وزمین کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں۔

اور کسی کام کو سرعت کے ساتھ گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا" (سورۃ المزمل آیت نمبر 7)

اور دن کے وقت کو تم بہت مشغول کار ہے ہو۔

التسبیح کے معنی تزیہ الہی بیان کرنے کے ہیں اصل میں اس کے معنی عبادت الہی میں تیزی کرنا کے ہیں۔ پھر اس کا

استعمال ہر فعل خیر پر ہونے لگا ہے جیسا کہ ابعاد کا لفظ شر پر بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے ابعدا اللہ خدا سے ہلاک کرے پس تسبیح کا

لفظ قوی۔ فعلی اور قلبی ہر قسم کی عبادت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَلَوْلَا آتَاهُ كَانٍ مِنَ الْمُسْتَجِيبِينَ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 143)
تو اگر وہ تسبیح کرنے والا نہ ہوتا۔

یہاں بعض نے مستحین کے معنی مصلین کئے ہیں لیکن نسب یہ ہے کہ اسے تینوں قسم کی عبادت پر محمول کیا جائے۔

تقدیس کا معنی:

(قدس) التقدیس (Sacred)

کے معنی اس تطہیر الہی کے ہیں جو کہ آیت،

"وَيُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيراً" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 33)
اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

میں مذکور ہے۔ کہ اس کے معنی تطہیر بمعنی ازالہ نجاست محسوسہ کے نہیں ہے اور آیت کریمہ:

"وَتَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 30)
اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے حکم کی بجا آوری میں اشیاء کو پاک و صاف کرتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی۔ نصفی
بالتقدیس بھی لکھے ہیں۔ یعنی ہم تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 102)
تم فرماؤ اسے پاکیزگی کی روح نے اتارا۔

میں روح القدس سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدس یعنی قرآن حکمت اور
فیض الہی لے کر نازل ہوتے تھے۔ جس سے نفوس انسانی کی تطہیر ہوتی ہے۔ اور البیت المقدس کو بیت مقدس اس لئے کہا
جاتا ہے کہ وہ نجاست شرک سے پاک و صاف ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

"يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ" (سورۃ السائدۃ آیت نمبر 21)
اے قوم اس پاک زمین میں داخل ہو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھی ہے۔
میں ارض مقدسہ کے معنی پاک سرزمین کے ہیں۔

اور

خطیرۃ القدس:

خطیرۃ القدس سے بعض کے نزدیک جنت اور بعض کے نزدیک شریعت مراد ہے اور یہ دونوں قول صحیح ہیں۔ کیونکہ

شریعت بھی ایک ایسا حظیرہ یعنی احاطہ ہے جس میں داخل ہونے والا پاک وصال ہو جاتا ہے۔
نوٹ: لفظ رب، جعل، ارض اور علم کے معنی گزر چکے ہیں۔

[سورة البقرة (2): آية 31]

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (31)

”اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیاء) کے نام سکھائے، پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ۔“

متن:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

إما بخلق علم ضروری بہا فیہ، أو إلقاء فی روعه، ولا یفتقر إلى سابقة اصطلاح لیتسلسل. والتعلیم فعل یترتب علیہ العلم غالباً، ولذلك یقال علمتہ فلم یتعلم. وآدم اسم أعجمی کأزر وشالح، واشتقاقہ من الأدمة أو الأدمة بالفتح معنی الاسوۃ، أو من أديم الارض لہاروی عنہ علیہ الصلاة والسلام أنه تعالیٰ قبض قبضة من جمیع الارض سهلها وحزنها فخلق منها آدم فلذلك یأتی بنوہ أخیافاً، أو من الادم أو الادمۃ معنی الالفة، تعسف کاشتقاق إدیس من الدرس، ویعقوب من العقب، وإبلیس من الإبلاس. والاسم باعتبار الاشتقاق ما یكون علامة للشیء ودلیلاً یرفعہ إلى الذهن مع الالفاظ والصفات والافعال، واستعمالہ عرفاً فی اللفظ الموضوع لمعنی سواء کان مرکباً أو مفرداً مخبراً عنہ أو خبراً أو رابطة بینہما. واصطلاحاً: فی المفرد الدال علی معنی فی نفسہ غیر مقترن بأحد الازمنة الثلاثة. والہرادی فی الآیة إما الاول أو الثانی وهو یتلزم الاول، لأن العلم بالفاظ من حیث الدلالة متوقف علی العلم بالمعانی، والمعنی أنه تعالیٰ خلقہ من أجزاء مختلفة وقوی متباينة، مستعداً لإدراك أنواع المدركات من المعقولات والمحسوسات، والہتخیلات والہوہومات. وألہبہ معرفة ذوات الأشياء وخواصها وأسمائها وأصول العلوم وقوائین الصناعات وکیفیة آلتها.

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ الضمير فيه للمسييات المدلول عليها ضمناً إذ التقدير أسماء المسييات، فحذف المضاف إليه لدلالة المضاف عليه و عوض عنه اللام كقوله تعالى: وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْباً لَأَنَّ العرض للسؤال عن أسماء المعروضات فلا يكون المعروض نفس الاشياء سيما إن أريد به الالفاظ، والمراد به ذوات الاشياء، أو مدلولات الالفاظ، وتذكيرة ليغلب ما اشتمل عليه من العقلاء، وقرء عرضهن و عرضها على معنى عرض مسياتهن أو مسياتها.

فَقَالَ أَنبِيُّونِي بِأَسْمَاءٍ هُوَ لَاءِ تَبَكَّيْتُ لَهُمْ وَتَنبِيهِ عَلَى عَجْزِهِمْ عَنِ أَمْرِ الْخِلَافَةِ، فَإِنَّ التَّصَرُّفَ وَالتَّجْدِيرَ إِقَامَةَ الْعِدْلَةِ قَبْلَ تَحْقِيقِ الْمَعْرِفَةِ، وَالْوُقُوفَ عَلَى مَرَاتِبِ الْإِسْتِعْدَادَاتِ وَقَدْرِ الْحَقُوقِ مَحَالٍ، وَلَيْسَ بِتَكْلِيفٍ لِيَكُونَ مِنْ بَابِ التَّكْلِيفِ بِالْمَحَالِّ وَالْإِنْبَاءُ: إِخْبَارٌ فِيهِ إِعْلَامٌ، وَلِذَلِكَ يَجْرِي مَجْرَى كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهَا. إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ فِي زَعْمِكُمْ أَنَّكُمْ أَحْقَاءُ بِالْخِلَافَةِ لِعَصْبَتِكُمْ، أَوْ أَنَّ خَلْقَهُمْ وَاسْتِخْلَافَهُمْ وَهَذِهِ صِفَتُهُمْ لَا يَلِيْقُ بِالْحَكِيمِ، وَهُوَ وَإِنْ لَمْ يَصْرَحُوا بِهِ لَكِنَّهُ لَازِمٌ مَقَالَهُمْ. وَالتَّصْدِيقُ كَمَا يَتَطَرَّقُ إِلَى الْكَلَامِ بِاعْتِبَارِ مَنْطُوقِهِ قَدْ يَتَطَرَّقُ إِلَيْهِ بِفَرْضِ مَا يَلْزَمُ مَدْلُولَهُ مِنَ الْإِخْبَارِ، وَبِهَذَا الْاِعْتِبَارِ يَعْتَرَى الْإِنْشَاءَاتُ.

ترجمہ:

اور اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام (اشیاء) کے نام سکھائے۔

لفظ آدم عربی ہے یا عجمی؟

لفظ آدم یہ عربی زبان کا لفظ ہے یا عجمی زبان کا؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک یہ لفظ عربی نہیں عجمی ہے جیسے آذر اور شالخ عجمی ہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جن لوگوں نے آدم لفظ کا مادہ اشتقاق لغت عرب میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے انہوں نے ہٹ دھرمی اور تعسف سے کام لیا ہے۔ جیسے ادریس کا مادہ درس اور یعقوب کا عقب تصور کرنا تعسف ہے۔ البتہ علماء کے نزدیک یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ اشتقاق اور معنی درج ذیل ہو سکتے ہیں۔

1۔ یہ آدمتہ سے بنا ہے جس کا معنی گندم گوں ہونا ہے یعنی گندم گوں رنگ والا۔

2۔ یہ آدمتہ سے مشتق ہے جس کا معنی اسوہ، نمونہ اور طریقہ ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تمام کائنات کے لئے نمونہ

تھے۔

3- یہ ایدم الارض سے مشتق ہے بمعنی زمین کا ظاہر اور سطح ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

قبض الله قبضه من جميع الارض سهلها وخرمها
سخت اور نرم تمام زمین سے ایک ٹھٹی مٹی لی گئی جس سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اسی وجہ سے اولاد آدم میں رنگت اور مزاج میں اختلاف ہے۔

4. یہ آدم سے مشتق ہے یا ادم بمعنی الفت کیونکہ ان کی آپس میں باہمی محبت ہوتی ہے۔
تعلیم: کا معنی علم سکھانا ہے، قاضی صاحب کے نزدیک یہ وہ عمل ہے جس پر اکثر علم مرتب ہوتا ہے مگر کبھی اس پر علم مرتب نہیں بھی ہوتا جیسے کہا جاتا ہے۔

علمته فلم يتعلم

میں نے اسے علم سکھایا اس نے نہیں سیکھا۔

الاسماء: یہ اسم کی جمع ہے اور یہ تین معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

1- معنی لغوی 2- عرفی 3- اصطلاحی

1- معنی لغوی: یہ سمۃ یا سمو سے مشتق ہے اگر سمۃ سے مشتق ہو تو اس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ کیونکہ یہ اپنے مسمیٰ کے پہچاننے کی علامت اور نشانی ہوتا ہے۔ اور اگر سمو سے مشتق ہو تو معنی بلند کرنا ہوگا، کیونکہ اسم اپنے مسمیٰ کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا ہے جیسے دلیل اپنے مدلول کو اٹھاتی ہے۔ اب اس کا اطلاق الفاظ، افعال اور صفات تمام پر ہوگا۔ یعنی اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو معنی کے الفاظ، صفات اور افعال تمام سکھادیئے۔

2- عرفی معنی

عرف عام میں اسم وہ لفظ ہے جو کسی معنی کو ادا کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہو، خواہ وہ مفرد، مرکب، مسند الیہ، خبر یا رابطہ ہو۔

3- اصطلاحی

وہ مفرد لفظ ہے جو اکیلا اپنا معنی ظاہر کرے اور وہ کسی زمانہ کے ساتھ مقرر نہ ہو۔ یہ معنی مراد نہیں کیونکہ یہ اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں۔

"عرضہم" ان کو ملائکہ پر پیش کیا۔ یعنی مسیات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ان کے اسماء ان سے دریافت کئے۔ اسماء کے بعد مضاف الیہ مخذوف ہے۔ جو مسیات ہے اور اس کے عوض میں اس پر الف لام داخل کر دیا گیا ہے جیسے "واشتعل الراس شیباً" الراس اصل میں راسی تھا۔ ی مشکلم کے عوض اس پر الف لام داخل ہے اور مسیات سے مراد ذوات اشیاء اور الفاظ کے مدلولات ہیں۔ "ہم" ضمیر عقلاً کو غیر عقلاً پر غلبہ کی وجہ سے ذکر کی گئی ہے۔ بعض نے عرضہن اور عرضہا بھی

پڑھا۔

"انبثوا" یہ انباء سے مشتق ہے جس کا معنی ایسی خبر دینا جس میں مخاطب کو نفع پہنچانا مقصود ہو، اس وجہ سے انبثوا اور اخبار ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب فرشتوں کو اسماء کا علم ہی نہیں دیا گیا تو ان سے اسماء کے متعلق سوال کرنا تکلیف مالا یطاق نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ تکلیف مالا یطاق نہیں بلکہ صرف فرشتوں کو چپ کرانے کے لئے تھا اور ان کو اس عجز پر آگاہ کرنا مقصود تھا کہ تم خلافت جیسا مشکل کام نہیں سنبھال سکتے لہذا اللہ کریم کے فیصلہ کو بغیر چون و چرا مان لو۔

مزید ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی حکمت معلوم کرنے کے لئے جملہ استفہامیہ،

اتجعل فیہا من یفسد فیہا

لایا گیا جو کہ جملہ انشائیہ ہے اور اس کو،

نحن نسبح بحمدک... الخ

کے ساتھ مقید کیا جس سے ان کے معصوم ہونے اور خلافت کے حقدار ہونے کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا تو انہیں "ان کنتم صادقین" کے ساتھ خطاب کیوں کیا؟ جب کہ یہ صدق و کذب کا احتمال نہیں رکھتا، کیونکہ یہ جملہ انشائیہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح جملہ خبریہ اپنے ظاہر معنی کے اعتبار سے صدق و کذب کا احتمال رکھتا ہے اسی طرح وہ غرض اور معنی جو کلام کو لازم ہوتا ہے وہ بھی صدق و کذب کا احتمال رکھتے ہیں یہاں فرشتوں نے اگرچہ جملہ انشائیہ مقیدہ بالحال استعمال کیا تھا لیکن اس سے یہ خبر اور دعویٰ سمجھ آتا ہے کہ حکیم کے یہ لائق نہیں کہ وہ ایسے فساد اور قتل و غارت کرنے والے کو پیدا فرمائے اور اسے خلیفہ بنائے جن کی حمد اور تصدیق کا اظہار کرنے والے موجود ہیں لہذا یہ غرض اور معنی صدق و کذب کا احتمال رکھتا ہے۔ اس لئے "ان کنتم صادقین" کے ساتھ خطاب فرمایا۔

لفظ تعلیم کی تحقیق:

(Education, Teaching) تعلیم

کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ معلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ تعلیم کے معنی تصور کے لئے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تعلم کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تعلیم کا لفظ اعلام کی جگہ آتا ہے جب کہ اس میں تاکید کے معنی مقصود ہوں جیسے فرمایا۔

"اتعلّمون اللہ یدینکم" (سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۶)

تم فرماؤ کیا تم اللہ کو اپنا دین بتاتے ہو۔

اور حسب ذیل آیات میں تعلیم کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔

"الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 1-2)

رحمن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا۔

قلم کے ذریعہ (لکھنا) سکھایا؛

"وَعَلَّمْنَاهُ مَا لَمْ تَعْلَمُوا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 91)

اور تم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے۔

"عَلَّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ" (سورۃ النمل آیت نمبر 16)

ہمیں اللہ کی طرف سب جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

"وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 129)

اور اللہ کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: "وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 31)

اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔

میں حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے اندر بولنے کی صلاحیت اور استعداد رکھ دی جس کے ذریعہ اس نے ہر چیز کے لئے ایک نام وضع کر لیا یعنی اس کے دل میں الفاظ کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو ان کے کام سکھادیئے ہیں جسے وہ سرانجام دیتے رہتے ہیں اور آواز دیتی ہے جسے وہ نکالتے رہتے ہیں۔

لفظ آدم کی تحقیق اعظم:

(ادم) آدم (Adam, The First man, People)

ابو البشر آدم علیہ السلام بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ ادیم لارض سے مشتق ہے اور ان کا نام آدم اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان کے جسم کو بھی ادیم لارض یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ادمہ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگ کے ہیں۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی گندمی رنگ کے تھے اس لئے انہیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ رجل آدم کے معنی گندمی رنگ مرد کے ہیں۔ اور بعض آدم کی وجہ تسمیہ بیان ہے کہ وہ مختلف عناصر اور متفرق قوی کے امتزاج سے پیدا کئے گئے تھے۔ جیسا کہ آیت،

"إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ مَّبْتَلِيَةٍ" (سورۃ الدھر آیت نمبر 2)

بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا مٹی سے کہ وہ اسے جانچیں۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے جعلت فلانا ادمہ اہلی میں فلاں کو اپنے اہل و عیال میں ملا لیا مخلوط کر لیا۔ بعض

نے کہا ہے کہ آدم ادم سے شتق ہے اور ادم سالن وغیرہ ہر چیز کو کہتے ہیں جس سے طعام کو لذیذ اور خوشگوار محسوس ہو اور آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال کر اسے پاکیزہ بنا دیا تھا جیسے کہ آیت

"وَنفَخْتَ فِيهِ مِنْ رُوحِي" (سورۃ ص آیت نمبر 72)

اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکوں۔

میں مذکور ہے اور پھر اسے عقل و فہم اور فکر عطا کر کے دوسری مخلوق پر فضیلت بھی دی ہے جیسے فرمایا:

"وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 70)

اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

اس بناء پر ان کا نام آدم رکھا گیا ہے اور حدیث میں ہے

"لو نظرت اليها فانه احري ان يودم بينكما"

اگر تو اسے اپنی مگیتر کو ایک نظر دیکھ لے تو اس سے تمہارے درمیان الفت اور خوشگوار پیما ہو جانے کا زیادہ امکان

ہے۔

عرض کا معنی:

(عرض) العرض (Profer, front)

اعرض الشئ اس کی ایک جانب ظاہر ہو گئی عرضت العود علی الاناء برتن پر لکڑی کو چوڑی جانب سے رکھا۔

عرضت الشئ علی فلان اولفان میں نے فلاں کے سامنے وہ چیزیں پیش کی۔

چنانچہ فرمایا: "ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 31)

پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

لفظ نباء کا مفہوم:

(ن ب ا) النبأ (News, Report)

کے معنی خیر مفید کے ہیں جو علم یا غلبہ ظن کا قاعدہ دے اور حقیقی معنی کے لحاظ سے کسی خبر تک اس میں تین چیزیں موجود نہ

ہوں۔ یعنی نہایت مفید ہونا اور اس سے علم یا غلبہ ظن کا حاصل ہونا اور بنا صرف اس خبر کو کہا جاتا ہے جس میں کذب کا احتمال نہ ہو۔

جیسے خبر متواتر خبر الہی اور خبر نبوی جیسے فرمایا:

"قُلْ هُوَ تَبَأٌ عَظِيمٌ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ" (سورۃ ص آیت نمبر 67, 68)

کہ تم فرماؤ وہ بڑی خبر ہے تم اس سے غفلت میں ہو۔

صدق کا مفہوم:

(ص دق) الصدق. (Truth)

یہ ایک الکذب کی ضد ہے اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے۔ وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو۔ الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں پھر قول میں بھی صرف خبر کے لئے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے اسی لئے ارشاد ہے۔

"وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا" (سورة النساء آیت نمبر 122)

اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

سچ کی فضیلت:

حضرت سیدنا احنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے بیٹے سے ارشاد فرمایا:

اے میرے بیٹے! سچ کی فضیلت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ سچ آدمی کی بات اس کے دشمن کے بارے میں بھی قبول کی جاتی ہے جبکہ جھوٹ کے بُرا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جھوٹے شخص کی بات نہ تو اس کے دوست کے بارے میں قبول کی جاتی ہے اور نہ دشمن کے بارے میں۔ (الذکرۃ الحمدویۃ الباب الثامن فی الصدق والکذب، ۶۳/۳)

نوٹ: اسم، آلا اور ملائکہ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 32]

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (32)

"بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا ہے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔"

متن:

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا

اعتراف بالعجز والقصور، وإشعار بأن سؤالهم كان استفساراً ولم يكن اعتراضاً، وأنه قد بان لهم ما خفي عليهم من فضل الإنسان والحكمة في خلقه، وإظهار لشكر نعمته بما عرفهم وكشف لهم ما اعتقل عليهم، ومراعاة للأدب بتفويض العلم كله إليه. وسبحان: مصدر كغفران ولا يكاد يستعمل إلا مضافاً منصوباً بإضمار فعله، كعباد الله. وقد أُجْرِيَ علماً للتسبيح، بمعنى التنزيه على الشلوذ في قوله: سبحان من علقبة الفاخر. وتصدير الكلام به اعتذار عن الاستفسار والجهل بحقيقة الحال، ولذلك جعل مفتاح

التوبة فقال موسى عليه السلام:

سُبْحَانَكَ تَبَّتْ إِلَيْكَ

وقال يونس: سُبْحَانَكَ إِلَهِي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ.

إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الَّذِي لَا يَخْفَى عَلَيْهِ خَافِيَةٌ. الْحَكِيمُ الْمَحْكَمُ لِمَبْدَعَاتِهِ الَّذِي لَا يَفْعَلُ إِلَّا مَا فِيهِ حِكْمَةٌ بِالْعَقْلِ. وَأَنْتَ فَصْلٌ وَقِيلَ: تَأْكِيدٌ لِلْكَافِ كَمَا فِي قَوْلِكَ: مَرَرْتُ بِكَ أَنْتَ، وَإِنْ لَمْ يَجْزْ: مَرَرْتُ بِأَنْتَ، إِذَا التَّابِعُ يَسُوعُ فِيهِ مَا لَا يَسُوعُ فِي الْمَتْبُوعِ، وَلِذَلِكَ جَازَ: يَا هَذَا الرَّجُلِ، وَلَمْ يَجْزْ: يَا الرَّجُلِ، وَقِيلَ: مَبْتَدَأُ خَبْرَةً مَا بَعْدَهُ وَالْجُمْلَةُ خَبْرٌ إِنْ:

ترجمہ:

فرشتوں نے یہ کہہ کر اپنے عجز کا اقرار کر لیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ ان کا سوال کرنا صرف استفسار تھا نہ کہ خلافت آدم علیہ السلام پر اعتراض، نیز اللہ کریم نے خلیفہ بنانے کی حکمت کو بھی واضح کر دیا اور حضرت آدم علیہ السلام کے کمال اور فضیلت کو واضح کر دیا اور فرشتوں نے اس نعمت کا شکر یہ ادا کرنے اور ادب کی مراعات کا خیال کرتے ہوئے تمام علوم کو اللہ کریم کے سپرد کر دیا۔

"سبحان" یہ غفران کی طرح مصدر ہے اور مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ فعل محذوف سے منصوب ہوتا ہے یا یہ تسبیح بمعنی تنزیہ مصدر کا علم ہے اور تعجب کے اظہار کے لئے ذکر کیا جاتا ہے لیکن اس معنی میں بہت کم استعمال ہوتا ہے جیسے،

سبحان من علقمة الفاخر

علقمہ کے فخر پر تعجب ہے یہ علم اس لئے ہے کہ یہاں یہ غیر منصرف ہے۔

سبحان کا لفظ توبہ کی قبولیت کی کنجی ہے۔ اسی لئے جب بھی کسی پیغمبر پر کوئی آزمائش آئی تو اس نے ان الفاظ کے ساتھ ہی

اللہ کریم کی بارگاہ میں نجات کی دعا کی تو اللہ کریم نے قبول فرمایا جیسا کہ دعائے موسیٰ علیہ السلام،

سبحانك تبت اليك

اور حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا کی

لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِلَهِي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ.

تو اللہ کریم نے اس دعا کو قبول فرمایا، اور نجات عطا کی۔

فرشتوں کا اپنے کلام کے آغاز میں اس کا ذکر کرنا اس بات پر معذرت کرنے کے لئے تھا کہ انہوں نے استفسار کیوں

کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی حقیقت حال سے کیوں بے خبر رہے۔

"العلیم" وہ ذات جس پر کوئی چیز مخفی نہ ہو۔

"الحکیم" بمعنی دانایا یعنی وہ ذات جو اپنی ایجادات کو مضبوط اور مستحکم کرنے والی ہے پس حکیم وہ ہوتا ہے جو وہی کرتا ہے

جس میں کامل درجہ کی دانائی اور حکمت ہوتی ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ

مذکورہ بالا جملہ میں "انت" کے اضافہ کے دو فائدے ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) یہ ضمیر فصل ہے کہ جب مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو ان کے درمیان یہ ذکر کی جاتی ہے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اس ضمیر کے بعد واقع ہونے والے کلمات اس کے ماقبل کی خبر ہیں لہذا العلیم اور حکیم یہ دونوں ان کی خبر ہوں گے اور خبریں اس اسم کے ساتھ مختص ہیں۔

(۲) "سی" ضمیر منصوب متصل مؤکد اور "انت" تاکید ہے۔ مؤکد اور تاکید ملکر ان کا اسم اور العلیم اور حکیم اس کی خبریں ہیں "انت" اگرچہ ضمیر مرفوع منفصل ہے مگر اس کو "ک" ضمیر منصوب متصل کی تاکید بنانا جائز ہے۔ کیونکہ یہ تابع ہے اور تابع میں جو چیز پڑھنا جائز ہوتی ہے وہ متبوع میں جائز نہیں ہوتی جب کہ یا هذا الرجل جائز ہے۔ اور بعض کے نزدیک "انت" مبتداء "اور اس کے بعد خبریں ہیں اور یہ جملہ اسمیہ" ان کی خبر ہے۔

سبحان کی تعریف:

(س ب ح) السبوح (Holy)

سبحان یہ اصل میں غفران کی طرح مصدر ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ" (سورۃ الروم آیت نمبر ۱۷)

سو جس وقت تم لوگوں کو شام ہو اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ تو پاک ذات ہے ہم کو کچھ معلوم نہیں۔

شاعر نے کہا ہے:

سبحان من علقمة الفاخر

سبحان اللہ علقمہ بھی فخر کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سبحان علقمہ ہے اس میں معنی اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے زائد ہے اور علقمہ کی طرف سبحان کی اضافت بطور تحکم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سبحان اللہ من اجل علقمہ ہے اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا۔ السبوح القدوس یہ اسماء حسنیٰ سے ہے اور عربی زبان میں فحول کے وزن پر صرف یہ دو کلمے ہی آتے ہیں اور ان کو فاء کلمہ کی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے کلوب و سمود السبحة بمعنی تسبیح ہے اور ان منکوں کو بھی سبحة کہا جاتا ہے جن پر تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

حکمت کیا ہے؟:

(ح ك م) المحکمة (The Science of physic, wisdom)

کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔ لہذا حکمت الہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت

احکام کے ساتھ ان کو موجود کرتا ہیں اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کوموں کو سرانجام دینے کا نام ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 12)

اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔

میں حکمت کے یہی معنی مراد ہیں جو کہ حضرت لقمان کو عطا کی گئی تھی۔ لہذا جب اللہ تعالیٰ کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا ہے۔

"أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ" (سورۃ النین آیت نمبر 8) کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

حکمت و دانائی کی باتیں:

حضرت سیدنا یوسف بن حسین علیہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: م

میں نے حضرت سیدنا ذوالنون مضر بن علیہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا:

مجھے ایک مغربی کے متعلق بتایا گیا کہ وہ بہت حکمت و دانائی کی باتیں کرنے والا مرد صادق ہے۔ اس خبر نے مجھے اس کی ملاقات پر ابھارا۔ میں نے رختِ سفر باندھا اور مطلوبہ منزل کی جانب چل پڑا، وہاں پہنچ کر ان کے دروازے پر تقریباً چالیس (40) دن تک ٹھہرا رہا۔ وہ نماز کے وقت گھر سے نکلتے نماز پڑھ کر واپس چلے آتے۔ کسی کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا:

اے بندۂ خدا! میں چالیس دن سے آپ کے دروازے پر ٹھہرا ہوا ہوں لیکن آپ نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے گفتگو نہیں کی۔

اس نے کہا: اے میرے بھائی! میری زبان خونخوار درندہ ہے۔ اگر میں اسے چھوڑ دوں گا تو یہ مجھے کھا جائے گی۔ میں نے کہا: اللہ عزَّ وَّجَلَّ آپ پر رحم فرمائے! مجھے کچھ نصیحت کرو تا کہ میں اسے یاد کر لوں۔ کہا: کیا تم ایسا کر سکو گے؟ میں نے کہا: ان شاء اللہ عزَّ وَّجَلَّ۔ فرمایا: سنو! دنیا سے محبت نہ کرو۔ فقر کو غناء سمجھو۔ اللہ عزَّ وَّجَلَّ کی طرف سے آنے والی آزمائش کو نعمت جانو، اگر اس کی طرف سے کچھ نہ ملے تو اس نہ ملنے کو عطا سمجھو۔ اللہ عزَّ وَّجَلَّ کا ساتھ ہوتے ہوئے تنہائی بھی اُنس ہے۔ اے بھائی! ذلت کو عزت جانو۔ زندگی کو موت سمجھو۔ اطاعت و فرمانبرداری کو پیشہ اور توکل کو معاش سمجھو۔ بخدا! ہر شدت کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ اتنا کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔ پھر ایک ماہ تک اس نے مجھ سے کلام نہ کیا۔ میں نے کہا: اے اللہ عزَّ وَّجَلَّ کے بندے! اب میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں اگر مناسب سمجھو تو مزید کچھ نصیحت کرو۔ کہا: جان لو! بے شک زاہد (یعنی دنیا کو چھوڑنے والا) وہ ہے کہ ا۔ جو ملے اسی پر گزارہ کرے۔ جہاں چاہے رہے۔ اس کا لباس اتنا ہی ہو جو ستر پوشی کا کام دے

سکے۔ تنہائی اس کی مجلس اور تلاوت قرآن اس کا مشغلہ ہو۔ اللہ رب العزت اس کا محبوب، ذکر الہی عَزَّ وَجَلَّ اس کی غذا، خاموشی اس کی جنت، خوف اس کی عادت و فطرت، شوق اس کا مطلوب، نصیحت اس کی ہمت اور اس کا غور و فکر عبرت، صبر اس کا تکیہ اور صدیقین اس کے بھائی ہوں۔ اس کا کلام حکمت، عقل اس کی دلیل، حلم اس کا دوست، بھوک اس کا سالن اور آہ و زاری اس کی عادت ہوتی ہے اور اس کا مطلوب و مقصود صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ذات ہوتی ہے۔

حضرت سیدنا ذوالنون مصری علیہ رحمۃ اللہ القوی فرماتے ہیں: اس کی یہ حکمت بھری عارقانہ باتیں سن کر میں نے اس

سے پوچھا:

انسان اپنی غلطیوں اور نقصان پر کب مطلع ہوتا ہے؟ فرمایا:

جب وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرنے والے لوگوں کے پاس بیٹھے گا تو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے خوب واقف ہو جائے گا۔

اتنا کہہ کر وہ حکیم و دانا شخص اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ (عیون الکاویات حصہ دوم صفحہ نمبر 269)

نوٹ: تعلیم، تسبیح اور قول کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 33]

قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئُهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ (33)

”فرمایا اے آدم بتادے انہیں سب (اشیاء کے) نام جب اس نے (یعنی آدم نے) انہیں سب کے نام بتادیے

فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے

اور جو کچھ تم چھپاتے ہو“۔

متن:

قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئُهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ

أى: أعلمهم، وقرء بقلب الهمزة ياء وحذفها بكسر الهاء فيهما.

فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ

تَكْتُمُونَ استحضار لقوله تعالى: إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ لكنه جاء به على وجه أبسط

ليكون كالحجة عليه، فإنه تعالى لما علم ما خفى عليهم من أمور السماوات والأرض

وما ظهر لهم من أحوالهم الظاهرة والباطنة علم ما لا يعلمون وفيه تعريض

معاتبہم علی ترک الاولیٰ، وهو أن يتوقفوا مترصدین لأن یبین لهم، وقیل: مَا تُبْدُونَ قَوْلَهُمْ: اَلْجَعْلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا. وَمَا تَكْتُمُونَ اسْتِبْطَانَهُمْ أَنَّهُمْ أَحْقَاءُ بِالْخِلَافَةِ، وَأَنَّهُ تَعَالَى لَا يَخْلُقُ خَلْقًا أَفْضَلَ مِنْهُمْ. وقیل: مَا أَظْهَرُوا مِنَ الطَّاعَةِ، وَأَسْرَ إِبْلِيسَ مِنْهُمْ مِنَ الْمَعْصِيَةِ، وَالْهَمْزَةُ لِلْإِنْكَارِ دَخَلَتْ حَرْفَ الْجَمْعِ فَأَفَادَتْ الْإِثْبَاتَ وَالتَّقْرِيرَ.

واعلم أن هذه الآيات تدل على شرف الإنسان، ومزية العلم وفضله على العبادة، وأنه شرط في الخلافة بل العبدية فيها، وأن التعليم يصح إسناداً إلى الله تعالى، وإن لم يصح إطلاق المعلم عليه لاختصاصه بمن يحترف به، وأن اللغات توقيفية، فإن الاسماء تدل على الالفاظ بخصوص أو عموم، وتعليقها ظاهر في إلقائها على المتعلم مبيناً له معانيها، وذلك يستدعي سابقة وضع، والاصل ينفي أن يكون ذلك الوضع ممن كان قبل آدم فيكون من الله سبحانه وتعالى، وأن مفهوم الحكمة زائد على مفهوم العلم، وإلا لتكرر قوله: إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ وَأَنْ عُلُومَ الْمَلَائِكَةِ وَكِبَالَتِهِمْ تَقْبَلُ الزِّيَادَةَ، وَالْحُكَمَاءُ مَنْعُوا ذَلِكَ فِي الطَّبَقَةِ الْعُلْيَا مِنْهُمْ، وَحَمَلُوا عَلَيْهِ قَوْلَهُ تَعَالَى: وَمَا مِثْلًا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَعْلُومٌ وَأَنْ آدَمَ أَفْضَلَ مِنْ هَؤُلَاءِ الْمَلَائِكَةِ لِأَنَّهُ أَعْلَمُ مِنْهُمْ، وَالْأَعْلَمُ أَفْضَلُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ وَأَنَّهُ تَعَالَى يَعْلَمُ الْأَشْيَاءَ قَبْلَ حُدُوثِهَا.

ترجمہ:

قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ

، فرمایا اے آدم بتادے انہیں سب (اشیاء کے) نام۔

فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ... الخ

اس آیت کریمہ میں اللہ کریم اپنا یہ قول فرشتوں یا دولا رہا ہے جو فرمایا تھا،

الَّتِي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ

لیکن یہاں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے تاکہ اس پر دلیل قائم ہو جائے کہ اللہ کریم جب زمین و آسمان کے ان تمام امور کو جانتا ہے جو ان پر مخفی تھے اور وہ انہیں بھی جانتا ہے جو ان کے ظاہر اور باطنی حالات ہیں لہذا وہ ہر اس چیز سے آگاہ ہوگا جسے وہ نہیں جانتے ہیں اس میں بطور تعریض فرشتوں کو ترک اولیٰ پر عتاب کیا جا رہا ہے لیکن ان کے لئے بہتر تو یہ تھا کہ وہ

توقف کرتے اور انتظار کرتے یہاں تک کہ اللہ کریم خود انہیں اس حکمت پر مطلع کر دیتا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیز تھی جن کو فرشتے ظاہر کر رہے تھے اور وہ کیا تھا جسے چھپا رہے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام خلافت کے لائق نہیں کیونکہ وہ زمین میں خون ریزی اور فساد کریں گے اور کناہیہ کہہ رہے تھے کہ فرشتے اپنی اطاعت اور عصمت کی وجہ سے خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ یا شیطان کے علاوہ تمام فرشتے اپنی اطاعت کا اظہار کر رہے تھے اور شیطان اپنے دل میں اللہ کریم کی نافرمانی چھپا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو میرے اوپر مسلط کیا گیا تو میں اس کی قطعاً اطاعت نہیں کروں گا اور مجھے اس پر غلبہ دیا گیا تو اسے ہلاک و برباد کر دوں گا۔ (تو اللہ کریم نے جواب میں یہ آیت نازل کی کہ میں شیطان کے ظاہر و باطن کو جانتا ہوں) اس آیت کے تحت امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے چند نکات اخذ کئے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

☆ انسان کی شرافت ملائکہ پر، اور علم کی فضیلت عبادت پر ظاہر ہو رہی ہے۔

☆ زمین کا خلیفہ بننے کے لئے عالم ہونا شرط ہے۔

☆ تعلیم کے فعل کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنا جائز ہے لیکن اسے معلم کہنا جائز نہیں کیونکہ معلم وہ ہوتا ہے جس کا پیشہ تعلیم

ہوتا ہے اور اللہ کریم پیشوں کا محتاج نہیں، البتہ تمام لغتیں اور معانی اسی نے القاء فرمائے ہیں۔

☆ تمام لغات توقیفی ہیں اختراعی نہیں کیونکہ سکھانے کی نسبت اللہ کریم کی طرف ہے۔

☆ فرشتوں کے علوم زیادتی اور نقصان کو قبول کرتے ہیں، البتہ حکماء نے یہ کہا ہے کہ جو طبقہ علیاء کے فرشتے ہیں ان کے

علوم کی اور زیادتی کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کا کہنا ہے،

وما منا الا هو مقام معلوم

کہ فرشتوں نے کہا کہ ہم میں سے ہر ایک کا مقام معلوم ہے۔

☆ اشیاء کے وجود میں آنے سے پہلے بھی اللہ کریم ان کو جانتا ہے نہ کہ ان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اسے علم ہوتا

ہے جیسا کہ قدریہ کا عقیدہ ہے۔

☆ تکبر کرنا قبیح عمل ہے اور یہ انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

☆ کامیابی و ناکامی کا دار و مدار خاتمہ اور انجام پر ہے اور اللہ کریم کے امر کی اتباع پر ابھارنا اور ترغیب دینا ہے۔

☆ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ وہ ان سے زیادہ عالم ہیں۔

☆ امر و وجوب کے لئے ہے اسی لئے شیطان کی مذمت کی کہ وہ وجوب کا تارک تھا اور نہ اس کی مذمت نہ ہوتی۔

بدا کا اصل معنی:

(ب دو) بدا (ن) (Evidend, Openly)

الشیء یدو اوبداء کے معنی نمایاں طور پر ظاہر ہو جانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
 "وَبَدَأَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 47)
 اور ان کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائے گا جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔

تحقیق لفظ کتم:

(ک ت م) کتمہ (ن) (To Hide, To Cover)

کتمنا و کتماننا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
 "وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 140)
 اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔
 "وَأَنْ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 146)
 مگر ایک فریق ان میں سچی بات جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔
 "وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 283)
 اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ: "الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ"
 (سورۃ النساء آیت نمبر 37)
 جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا
 چھپا کے رکھیں۔

میں کتمان فضل سے کفر ان نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:
 "وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 37)
 اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔
 اور آیت کریمہ: "وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 42)
 اور اللہ سے کوئی بات چھپائیں نہیں سکیں گے۔

قول ابن عباس رضی اللہ عنہ:

مندرجہ بالا حدیث پاک کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں
 گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔ تو جھٹ سے پکارا نہیں گے،
 "وَاللَّهُ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 23)

اللہ کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔

قول حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ:

اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپائی ہوتی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آخرت میں متعدد واقف ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کچھ چھپانا سکے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

تنگدستی چھپانا:

لوگوں سے اپنی تنگدستی اور فقر وفاقہ چھپانا بہت اچھا عمل ہے۔ دیکھئے رب تبارک و تعالیٰ نے اصحاب صفحہ کے اس عمل کی تعریف فرمائی کہ وہ سخت ضرورت اور بھوک و پیاس کے باوجود اپنی خودداری کے سبب کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتے تھے، جس بناء پر ناواقف لوگ انہیں مالدار اور خوش حال سمجھتے تھے۔ اصحاب صفحہ کے فقر کی پہچان ان کی طرز پریشانی اور قدرتی علامات سے تھی کہ ان کے چہروں پر فاقوں کے آثار، آوازیں کمزور اور رفتار میں ضعف تھا۔

(تفسیر نعیمی از مولانا احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ ج ۳ ص ۱۳۹)

علم دین کو چھپانا گناہ ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جس شخص سے کچھ دریافت کیا گیا جس کو وہ جانتا ہے اور اس نے اس کو چھپایا روز قیامت اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ (ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی کتمان العلم، ۴/۲۹۵، الحدیث: ۲۶۵۸)

علماء پر واجب ہے کہ اپنے علم سے فائدہ پہنچائیں اور حق ظاہر کریں اور کسی غرض فاسد کے لئے اس میں سے کچھ نہ

چھپائیں۔

دوران نماز منہ اور ناک چھپانا:

نماز میں عمامہ شریف پر چادر اس طرح اوڑھنا کہ منہ اور ناک چھپ جائے مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ حضرت علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

”نماز میں ناک اور منہ کو ڈھانپنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ یہ مجوسیوں (یعنی آتش پرستوں) کا طریقہ ہے کہ وہ آگ

کی پوجا کرتے وقت اس طرح کرتے ہیں۔“

(درعی روردر الحار، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا، مطلب الکلام علی اتحاد المسبحة، ۲/۵۱۱)

نوٹ: آیت بالا میں مذکور باقی الفاظ کی تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 34]

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (34)
 ”اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔“

متن:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ

لما أنبأهم بأسمائهم وعلیهم ما لم یعلموا أمرهم بالسجود له، اعترافاً بفضله، وأداء لحقه واعتذاراً عما قالوا فيه، وقیل: أمرهم به قبل أن یسوی خلقه لقوله تعالى: فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ امتحاناً

لهم وإظهاراً لفضله. والعاطف عطف الظرف على الظرف السابق إن نصبته مضمراً، وإلا عطفه بما یقدر عاملاً فيه على الجملة المتقدمة، بل القصة بأسرها على القصة الأخرى، وهي نعمة رابعة عدها علیهم. والسجود في الاصل تنذل مع تطامن قال الشاعر:

تَرَى الْأَكْمَ فِيهَا سُجْدًا لِلخَوَافِرِ

وقال آخر:

وَقُلْنَا لَهُ اسْجُدْ لِلَّيْلِ فَاسْجَدَا

یعنی البعیر إذا طأ رأسه. وفي الشرع: وضع الجبهة على قصد العبادة، والبأمر به إما المعنى الشرعی فالمسجود له بالحقیقة هو الله تعالى، وجعل آدم قبلة لسجودهم تفخماً لشأنه، أو سبباً لوجوبه فکأنه تعالى لها خلقه بحيث یكون نموذجاً للمبدعات كلها بل الموجودات بأسرها، ونسخة لها في العالم الروحانی والجسمانی وخريعة للملائكة إلى استيفاء ما قدر لهم من الكمالات، ووصلة إلى ظهور ما تباينوا فيه من المراتب والدرجات، أمرهم بالسجود تنذراً لها رأوا فيه من عظیم قدرته وباهر آياته، وشكراً لها أنعم علیهم بواسطته، فاللام فيه كاللام في قول حسان رضى الله تعالى عنه:

الْإِنْسِ أَوَّلَ مَنْ صَلَّى لِقَبْلَتِكُمْ... وَأَعْرَفَ النَّاسِ بِالْقُرْآنِ وَالشُّانِ
أَوْ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى:

الْعَمَّ الصَّلَاةَ لِنُكُولِ الشُّنْسِ.

وَأَمَّا الْمَعْنَى اللَّغَوِي وَهُوَ التَّوَاضُّعُ لِأَدَمَ تَحِيَّةً وَتَعْظِيماً لَهُ، كَسُجُودِ إِخْوَةِ يُوسُفَ لَهُ، أَوْ
التَّنَدُّلِ وَالْإِنْقِيَادِ بِالسَّعْيِ فِي تَحْصِيلِ مَا يَنْبُطُ بِهِ مَعَاشَهُمْ وَيَتَمُّ بِهِ كِبَالَهُمْ. وَالْكَلَامُ
فِي أَنَّ الْمَأْمُورِينَ بِالسُّجُودِ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ، أَوْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَا سَبَقَ.
فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبِي وَاسْتَكْبَرَ امْتَنَعَ عَمَّا أَمَرَ بِهِ، اسْتِكْبَاراً مِنْ أَنْ يَتَّخِذَهُ وَصَلَةً فِي
عِبَادَةِ رَبِّهِ أَوْ يَعْظُمَهُ وَيَتَلَقَّاهُ بِالتَّحِيَّةِ، أَوْ يَخْدُمَهُ وَيَسْعَى فِيمَا فِيهِ خَيْرٌ وَصَلَاحَةٌ. وَالْإِبَاءُ:
امْتِنَاعٌ بِاخْتِيَارٍ. وَالتَّكْبِيرُ: أَنْ يَرَى الرَّجُلُ نَفْسَهُ أَكْبَرَ مِنْ غَيْرِهِ، وَالْاسْتِكْبَارُ طَلَبُ
ذَلِكَ بِالتَّشْبِيحِ

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مندرجہ بالا عبارت سے جو نکات اخذ کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

سجدہ کا معنی اور اس کی اقسام:

س ج (سجد) (Prostration)

اللہ کریم کا ارشاد ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ

اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ کو کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ سجدہ کرنے کا حکم کب نازل ہوا اس میں دو قول ہیں۔ پہلا
یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کا فرشتوں کو اسماء سے آگاہ کرنے کے بعد حکم ہوا کہ وہ اسے سجدہ کریں۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ
حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے امتحان کے طور پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

1۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو ساری اشیاء کے نام سے آگاہ کر دیا اور انہیں وہ کچھ بتا دیا جسے وہ نہیں
جانتے تھے تو اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کا اعتراف کرنے اور اس کا حق ادا کرنے اور جو کچھ حضرت آدم علیہ
السلام کے متعلق انہوں نے کہا تھا اسے معذرت کرنے کے لئے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا گویا تعلیم اسماء کے بعد ملائکہ کو سجدہ
کرنے کا حکم دیا گیا اور یہی بات امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک راجح ہے۔

2۔ بعض کے نزدیک تخلیق آدم سے پہلے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم تا کہ وہ انہیں آزمائے اور حضرت آدم علیہ السلام کی

فضیلت کو ظاہر فرمائے جیسا کہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ پھر جب میں آدم علیہ السلام کی تخلیق مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا، یہ قول امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک راجح نہیں بلکہ ضعیف ہے اس لئے اس کو "قیل" کے ساتھ بیان کیا گیا۔

وَاذْقَلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ... الخ

امام بیضاوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس ظرف کا عطف ماقبل ظرف پر ہے یعنی "وَاذْقَلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ... الخ" مضمون فعل "اذکر" کے متعلق ہو کر ماقبل ظرف "وَاذْقَلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ" پر ہے تو گویا اصل عبارت اس طرح تھی اور "اذکر اذْقَلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ... الخ" اس کی ترکیب میں دوسرا قول یہ ہے کہ "اذْقَلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ" کا عامل "قالوا اتجعل فیہا... الخ" ہے اور "وَاذْقَلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسجدوا" کا عامل "فسجدوا... الخ" اس لئے یہاں ایک ظرف کا عطف دوسری ظرف پر نہیں بلکہ ایک جملہ فعلیہ کا عطف دوسرے جملہ فعلیہ پر ہے بلکہ ایک واقع کا عطف دوسرے واقع پر یا ایک مضمون کا عطف دوسرے مضمون پر ہے، ایک پورے قصہ کا عطف دوسرے پورے قصہ پر ہے۔ اور یہ اللہ کریم کی چوتھی نعمت ہے جو وہ اولاد آدم علیہ السلام پر شمار فرما رہا ہے۔

"سجدوا" یہ سجود سے مشتق ہے جس کا لغوی معنی ہے جھک کر عاجزی ظاہر کرنا جیسے زید الخیل طائی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں،

الا کم فیہا سجد اللحوافر

پورا شعر کچھ اس طرح ہے،

بجمع تضل البلق فی حجرانہ تری الا کم فیہا سجدوا اللحوافر

کہ ایسا لشکر جس کے چنگبرے گھوڑے اس کے کناروں میں چھپ گئے تھے اور ہجوم کی وجہ سے نظر نہیں آتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گھائیاں گھوڑوں کے ٹاپوں کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔

اس شعر میں بطور استشہاد "سجدوا" کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی سرنگوں ہونے والے ہیں۔

شریعت میں سجدہ کا معنی یہ ہے کہ کسی کو معبود سمجھ کر اس کی عبادت کا قصد کرتے ہوئے پیشانی کو زمین پر رکھنا۔ سجدہ کی دو

اقسام ہیں:

(۱) سجدہ تعظیمی

(۲) سجدہ عبادت

اگر یہاں سجدہ شرعی مراد لیا جائے تو حقیقت میں مسجد اللہ کریم ہوگا اور حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کے لئے قبلہ بنا دیا جیسے بیت اللہ شریف مسجد نہیں بلکہ مسجد الیہ ہے یعنی اسے سجدہ عبادت کے لئے قبلہ بنا دیا گیا۔ سجدہ عبادت اللہ کریم کے علاوہ کسی کو جائز نہ تھا اور نہ ہی آج ہے بلکہ جو غیر اللہ کو معبود سمجھ کر سجدہ کرے پکا کافر ہے اور یا آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کا سبب بنا دیا گیا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کریم کی تمام مخلوقات کا بلکہ تمام موجودات کا نمونہ بن جائیں اور عالم روحانی اور

عالم جسمانی میں جو کچھ ہے اس کا خلاصہ ہو جائیں اور فرشتوں کے لئے ان کمالات کے حصول کا ذریعہ بن جائیں جو ان کے لئے مقدر تھے اور فرشتے جن مراتب اور درجات میں مختلف تھے ان کے ظہور کا وسیلہ ہو جائیں۔ اس لئے انہیں آدم علیہ السلام کے سامنے ان کی پستی کو ظاہر کرنے کے لئے انہیں سجدہ کا حکم دیا، کیونکہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے اندر اللہ کریم کی عظیم قدرت اور اس کی واضح آیات کو دیکھ لیا ہے اور تاکہ وہ اس انعام کا شکر ادا کریں جو اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کے واسطے سے انہیں عطا فرمائے تھے۔ اس لئے "لَا دَمَ" سے پہلے لام یہی اسی طرح "الی" کے معنی میں ہے جیسا کہ حضرت حنان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس شعر میں ہے جو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کہا:

الْيَسَّ أَوَّلَ مَنْ صَلَّى لِقَبْلَتِكُمْ... وَأَعْرَفَ النَّاسِ بِالْقُرْآنِ وَالشَّنَنِ

آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اے علی رضی اللہ عنہ کی شان کے منکر۔۔! کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سب سے پہلے شخص نہیں جنہوں نے تمہارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرمائی اور کیا وہ تم میں سب سے زیادہ قرآن اور حدیث کو جاننے والے نہیں ہیں یا یہ لام سبب اور علت کے لئے ہوگی۔ جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں:

اقم الصلوة لعلواك الشمس

کہ زوال شمس کی وجہ سے نماز قائم کرو۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر سجدہ کا شرعی معنی لیا جائے تو موجودہ حقیقت میں اللہ کریم کی ذات ہوگی اور حضرت آدم علیہ السلام

قبلہ یا وجوب سجدہ کا سبب ہوں گے۔

اور اگر سجدہ کا لغوی معنی لیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ کریم نے ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کرنے اور کہنے کا حکم دیا۔ یہ اسی طرح ہوگا جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی آپ کی تعظیم کے لئے آپ کے سامنے عاجزی اور انکساری کرنے کی خاطر جھک گئے تھے، یا ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اطاعت کرنے کا اعتراف کر لیں اور اس کی خدمت انجام دیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی اطاعت کرتے ہوئے ان تمام کاموں میں جن پر ان کی معیشت کا دار و مدار ہے اور جس کے ساتھ ان کے کمالات مکمل ہوتے ہیں بھرپور کوشش کریں۔

اب اس میں اختلاف ہے کہ تمام ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم تھا یا ان میں سے ایک گروہ کو یہ حکم دیا گیا تھا، اس کی تفصیل

ما قبل کلام میں گزر چکی ہے۔

فَسَجِدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ

تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے منکر ہوا اور غرور کیا اور کافروں سے ہو گیا۔

یعنی اس حکم کو عملی جامہ پہنانے سے رک گیا۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے رب کی عبارت

میں حضرت آدم علیہ السلام کو وسیلہ بنائے، یا ان کی تعظیم کرے، یا اسلام کے ساتھ ان کا استقبال کرے، یا وہ ان کی خدمت

کرے اور ایسے کاموں میں وہ کوشش کرے جس میں حضرت آدم علیہ السلام اصلاح اور بھلائی ہو اور سجدہ نہ کرنے کا سبب اس کا تکبر اور غرور تھا، جس کا اس نے "انا خیر منہ" کہہ کر اعتراف بھی کر لیا تھا۔
"ابن" یہ اباء سے مشتق ہے جس کا معنی اپنے اختیار اور ارادہ سے انکار کرنا ہے۔

تکبر: اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا اور استکبار کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا بنانے کی کوشش اور طلب کرنا،

وكان من الكافرين

اور وہ کافروں سے ہو گیا۔

سجدہ کی فضیلت میں تین احادیث مبارکہ:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَا تَقَرَّبَ الْعَبْدُ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى بِشَيْءٍ أَفْضَلَ مِنْ سُجُودٍ خَفِيٍّ

ترجمہ: بندہ ایک پوشیدہ سجدے سے بڑھ کر کسی چیز کے ساتھ اللہ عزَّ وَّجَلَّ کا قرب حاصل نہیں کرتا۔

(الاحمد لابن المبارک، باب العمل والذکر الخفی، الحدیث ۱۵۳، ص ۵۰)

روایت میں ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اللہ عزَّ وَّجَلَّ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا مستحق بنا دے اور جنت میں مجھے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت عطا فرمائے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

سجدوں کی کثرت کے ساتھ میری مدد کرو۔ (الاحمد لابن المبارک، الحدیث ۱۲۸۷، ص ۵۵، مختصر ۱)

حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

بندہ سجدے کی حالت میں اللہ عزَّ وَّجَلَّ کے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہذا اس وقت کثرت سے دعا مانگا کرو۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب ما یقال۔۔۔۔۔ الخ، الحدیث ۱۰۸۳، ص ۷۵۳، منہوم)

سجدے میں قُرب الہی:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کی گیا سوال مع جواب ملاحظہ ہو،

عرض: بندوں کو قُرب الہی اللہ کا مرتبہ علاوہ نماز بھی ہوتا ہے؟

ارشاد: ہاں ہر سجدے میں رب عزَّ وَّجَلَّ کے قریب ہوتا ہے۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب ما یقال فی الركوع۔۔۔ الخ، الحدیث ۳۸۲، ص ۲۵۰)

اقسام سجدہ:

اور سجدے چار قسم (کے) ہیں:

(۱) سجده نماز

(۲) سجده تلاوت

(۳) سجده سهو

(۴) سجده شکر

نیز سجده شکر سنتی مستحب ہے۔

متن:

وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ

اى فى علم الله تعالى، او صار منهم باستقباحه امر الله تعالى إياه بالسجود لآدم اعتقاداً بأنه أفضل منه، والافضل لا يحسن أن يؤمر بالتخضع للفضل والتوسل به كما أشعر به قوله: أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ جِوَاباً لِقَوْلِهِ: مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ. لا يترك الواجب وحده. والآية تدل على أن آدم عليه السلام أفضل من الملائكة المأمورين بالسجود له، ولو من وجه، وأن إبليس كان من الملائكة وإلا لم يتناوله أمرهم ولا يصح استثناءه منهم، ولا يرد على ذلك قوله سبحانه وتعالى:

إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ لَجَازٌ أَنْ يُقَالَ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَعَلًا وَمِنَ الْمَلَائِكَةِ نَوْعًا، ولأن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما روى: أن من الملائكة ضرباً يتوالدون يقال لهم الجن ومنهم إبليس. وليس زعم أنه لم يكن من الملائكة أن يقول: إنه كان جنياً نشأ بين أظهر الملائكة، وكان مغبوراً بالالوف منهم فغلبوا عليه، أو الجن أيضاً كانوا

مأمورين مع الملائكة لكنه استغنى بذكر الملائكة عن ذكرهم، فإنه إذا علم أن الاكابر مأمورون بالتنزل لأحد والتوسل به، علم أن الاصاغر أيضاً مأمورون به. والضمير فى فسجدوا راجع إلى القبيلين كأنه، قال فسجد المأمورون بالسجود إلا إبليس، وأن من الملائكة من ليس بمعصوم وإن كان الغالب فيهم العصية، كما أن من الإنس معصومين والغالب فيهم عدم العصية، ولعل ضرباً من الملائكة لا يخالف الشياطين بالذات، وإنما يخالفهم بالعوارض والصفات كالبررة والفسقة من الإنس والجن يشبهها.

وكان إبليس من هذا الصنف كما قاله ابن عباس رضى الله تعالى عنهما فلذلك صح عليه التغيير عن حاله والهبوط من محله، كما أشار إليه بقوله عز وعل: إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ لَا يُقَالَ:

کیف یصح ذلك والملائكة خلقت من نور والجن من نار، لها روت عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا أنه علیہ الصلاة والسلام قال: «خلقت الملائكة من النور، وخلق الجن من نارٍ من نار»

لأنه كالتمثيل لها ذكرنا، فإن المراد بالنور الجوهر البصير والنار كذلك، غير أن ضوءها مكثد مغبور بالدخان محذور عنه بسبب ما يصحبه من فرط الحرارة والإحراق فإذا صارت مهذبة مصفاة كانت محض نور، ومتى نكصت عادت الحالة الأولى جذعة ولا تزال تتزايد حتى ينطفئ نورها ويبقى الدخان الصرف، وهذا أشبه بالصواب وأوفق للجمع بين النصوص، والعلم عند الله سبحانه وتعالى.

ومن فوائد الآية استقباح الاستكبار وأنه قد يفضي بصاحبه إلى الكفر، والحث على الائتمار لأمره وترك الخوض في سره، وأن الأمر للوجوب، وأن الذي علم الله تعالى من حاله أنه يتوفى على الكفر هو الكافر على الحقيقة، إذ العبرة بالخواتم وإن كان يحكم الحال مؤمناً وهو الموافاة المنسوبة إلى شيخنا أبي الحسن الأشعري رحمه الله تعالى.

ترجمہ:

اور کافر ہو گیا۔

اللہ کریم کے علم میں تھا کہ ابلیس یا تو سجدہ کرنے کے حکم سے انکار کرے گا اور کافر ہو جائے گا، یا اس نے اللہ کریم کے حکم کو قبیح سمجھا جس کی وجہ سے کافر ہو گیا کیونکہ اس کو عقیدہ تھا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہے اور افضل کو مفضول کے سامنے جھکنے کا حکم دینا جائز نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے لئے یہ مناسب ہوتا ہے کہ وہ اسے اللہ کریم کی عبادت کے لئے وسیلہ بنائے جس طرح اللہ کریم کا یہ ارشاد گرامی اس سے آگاہ کر رہا ہے جب اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اللہ کریم نے فرمایا اے ابلیس تجھے اس ذات کو سجدہ کرنے سے جس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے۔ کیا تو نے اپنے آپ کو بڑا سمجھا ہے اور یا تو بلند مرتبہ لوگوں سے ہے تو اس نے جواب دیا "انا خیر منه" میں اس سے بہتر ہوں تو گویا اسے صرف ترک واجب کی وجہ سے راندہ درگاہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کے تکبر اور غرور کی وجہ سے اسے دھتکارا گیا تھا۔

والآية تدل على ان آدم عليه السلام... الخ

یہ آیت کریمہ اس بات پر دال ہے کہ وہ فرشتے جنہیں حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا ان سے حضرت آدم علیہ السلام افضل ہیں اگرچہ یہ فضیلت من وجہ ہی ہے اور یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ابلیس جنس ملائکہ سے تھا، ورنہ اسے وہ حکم سجدہ شامل نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی استثناء ان سے درست ہوگی اس سلسلہ میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے

بڑی عجیب و غریب بحث فرمائی ہے جس کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے آیت کا ظاہر تو اس بات پر دلالت کرتا ہے ابلیس جنس ملائکہ سے تھا اور سجدہ کا جو حکم ملائکہ کو دیا گیا وہ بھی اس حکم میں شامل تھا ورنہ ان سے اس کی استثناء درست نہیں ہوگی حالانکہ ملائکہ نوری ہیں اور ابلیس ناری ہے قرآن مجید کی ایک اور آیت میں اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان جنوں میں سے تھا،

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ

یعنی وہ جنوں میں سے تھا اور اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

ظاہر ان دونوں آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ان میں تعارض کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ بعض علمائے کرام کے نزدیک ابلیس باعتبار جنس فرشتوں میں سے تھا اور بطور افعال جنوں میں سے تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا کہ ملائکہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گناہوں سے معصوم اور عبادت میں ہی مشغول رہتے ہیں۔

دوسرے وہ جن سے نسل چلتی اور اولاد بھی پیدا ہوتی ہے، قسم اول کو ملائکہ اور قسم ثانی کو جنات کیا جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ابلیس اگرچہ جنس ملائکہ سے نہ تھا لیکن سجدہ کے حکم میں ملائکہ کے ساتھ شریک تھا کیونکہ حکم سجدہ صرف فرشتوں کو نہ تھا بلکہ جن بھی اس میں داخل تھے لیکن ابلیس نے اس حکم کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا اور دھتکارا گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ نوری اور ناری کا فرق کرنا مناسب نہیں کیونکہ نور اور نار ایک ہی چیز ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ نار میں دھواں ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں حرارت ہوتی ہے اور جب آگ دھواں اور حرارت سے پاک ہو جائے تو وہی نور بن جاتی ہے لہذا فرشتے اپنی طہارت نفس اور پاکیزگی کی وجہ سے نور بن گئے اور یہ اپنی خباثت اور نافرمانی کی وجہ سے ناری بن گیا لہذا آیت میں کوئی تعارض نہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

مندرجہ بالا آیت کے فوائد ملاحظہ ہوں،

☆ تکبر قبیح عمل ہے۔

☆ تکبر، تکبر کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

☆ اللہ کریم کے حکم کی اتباع پر ابھارنا۔

☆ اس کے مخفی رازوں میں غور و حوض کو ترک کرنا۔

☆ امر و وجوب کا فائدہ دیتا ہے وہ شخص جس کے متعلق اللہ کریم جانتا ہے کہ اس کی موت کفر پر ہوگی وہ فی الحقیقت کافر ہے

کیونکہ انجام کا اعتبار خاتمے پر ہوتا ہے اگرچہ اس کے اقرار کی وجہ سے اسے مومن ہی کہا جائے گا جیسا کہ ابو الحسن الاشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا، ان کے قول کو موافقت کہتے ہیں۔

حرف لام کی مفصل تحقیق:

(اللام) حرف

یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

اول حروف جارہ اور اس کی چند قسمیں ہیں۔

(1) لام للتعديہ:

لتعديہ کے لئے اس وقت بعض اوقات تو اس کا حذف کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے فرمایا:

"فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 103)

تو جب ان دونوں نے ہمارے حکم پر گردن رکھی۔

اور کبھی حذف کرنا جائز ہوتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الَّذِي كَفَرْتُمْ وَيُخْلِطَ إِلَيْكُمْ رِجْسَ الْيَهُودِ وَالنَّسَاءِ اللَّائِي اتَّخَذْنَ عَلَيْهُنَّ مَوَدَّةَ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكُونُوا يَكْتُمُونَ" (سورۃ النساء آیت نمبر 26)

خدا چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمادے۔ میں لام مذکور ہے اور آیت:

"فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 125)

(سورۃ الانعام آیت نمبر 125)

اور جسے اللہ راہ دکھانا چاہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ خوب

رکا ہوا کر دیتا ہے۔

میں اسے حذف کر دیا ہے یعنی اصل میں لایہدیہ ولا یضلہ ہے۔ یعنی اصل میں الا یہدی ولا یضلہ ہے۔

(2) لام بمعنی ملک اور استحقاق:

ملک اور استحقاق کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔

اور ملک سے ہمیشہ ملک عین ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ ملکہ منافع اور ملک تصرف سب کو عام ہے چنانچہ فرمایا:

"وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 18)

اور آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت خدا ہی کی ہے۔

"وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 7)

اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں۔ اور ملک تصرف کے لئے مثلاً کسی شخص کے ساتھ لکڑی تصرف کے لئے مثلاً

کسی شخص کے ساتھ لکڑی اٹھاتے وقت تم اس سے یہ کہو۔ خذ طرفک لاخذنی کہ تم اپنی جانب سے پکڑ لو تا کہ میں اپنی جانب

پکڑوں۔ اور اللہ در کی طرح جب اللہ کذا کہا جاتا ہے تو اس میں تو اس میں بعض نے لام تملیک مانا ہی یعنی یہ چیز بلحاظ شرف و منزلت کے اتنی بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر کسی کا ملک نہیں ہونا چاہیے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں لام ایجاد کے لئے ہے یعنی اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ موجودات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اسباب طبعی یا صنعت انسانی کے واسطے سے ایجاد کیا ہے۔

اور دوم وہ جنہیں بغیر کسی واسطے کے پیدا کیا ہے جیسے افلاک اور آسمان وغیرہ اور یہ دوسری قسم پہلی کی نسبت اشرف اور اعلیٰ

ہے۔

اور آیت کریمہ: "لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 25)
اور ان کے لئے لعنت اور برا گھر ہے۔

اور

"وَيَلِّ لِلْمُطَفِّفِينَ" (سورۃ المطففین آیت نمبر 1)
ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے۔

میں لام استحقاق کے معنی دیتا ہے یعنی یہ لوگ لعنت اور ویل کے مستحق ہیں۔ اور یہ سلام بھی لام ملک کی طرح ہے لیکن لام پال اسی چیز پر داخل ہوتا ہے جو ملک میں حاصل ہو چکی اس پر استحقاق ثابت ہونے کے لحاظ سے حاصل شدہ چیز کی طرح ہو بعض وعلمائے نحو کہا ہے کہ آیت کریمہ:

"لَهُمُ اللَّعْنَةُ"

میں لام بمعنی علی ہے۔ اسی علیہم اللعنة (یعنی ان پر لعنت ہے) اسی طرح آیت کریمہ:

"لِكُلِّ امْرءٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ" (سورۃ النور آیت نمبر 11)

ان میں جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لئے اتنا ہی وبال ہے۔

میں بھی لام بمعنی علی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہی لام بمعنی الی بھی آتا ہے جیسا کہ آیت

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا حِمْيَرًا" (سورۃ الزلزلہ آیت نمبر 5)

کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کا حکم بھیجا ہوگا۔

میں ہے یعنی اوحی الیہا مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں تو وحی تسخیری ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے اور یہ اس وحی کی طرح

نہیں ہوتی جو انبیاء کرام علیہ السلام کی طرف بھیجی جاتی ہے لہذا لام بمعنی الی نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَلَا تَكُنْ لِلْغَائِبِينَ خَصِيماً" (سورۃ النساء آیت نمبر 105)

اور (دیکھو) دغا بازوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ لام اجل ہے اور سبب اور جانب کے معنی دیتا ہے یعنی تم ان کی حمایت میں مت بحث کرو جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

"وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَلُونَ أَنفُسَهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 107)

اور ان کی طرف سے نہ جھگڑو جو اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے ہیں۔
اور یہ لاتکن للہ خصیما کے لام کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہاں لام مفعول پر داخل ہوا ہے اور معنی یہ ہیں۔

"لَا تَكُنْ خَصِيمَ اللَّهِ"

کہ تم اللہ کے خصیم یعنی فریق مخالف مت بنو۔

(3) لام ابتداء:

لا ابتداء جیسے

فرمایا: "لَمْ سَجِدْ أَسِسْ عَلَى التَّقْوَى" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 108)
البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

"لِيُؤْسَفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيَّ أَبِينَا مِنَّا" (سورۃ یوسف آیت نمبر 8)
کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔

"لَا تَنَّمُوا أَشْدُّ رَهْبَةً" (سورۃ الحشر آیت نمبر 13)

تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں بڑھ کر ہے۔

(4) لام جوان کے بعد آتا ہے:

چہارم وہ لام جوان کے بعد آتا ہے۔

یہ کبھی تو ان کے اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی ان کی خبر اور کبھی متعلق خبر پر چنانچہ جب اسم خبر سے متاخر ہو تو اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 13)

اس میں بڑی عبرت ہے۔

اور خبر پر داخل ہونے کی مثال جیسے فرمایا:

"إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" (سورۃ الفجر آیت نمبر 14)

بے شک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں۔

"إِنَّ إِبْرَاهِيمَ أَحْسَبُكُمْ وَأَوَّاهٌ مُدْبِرٌ" (سورہ بقرہ آیت نمبر 75)
 بیشک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے عقل والے نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔
 اور یہ لام متعلق خبر پر اس وقت آتا ہے جب متعلق خبر ان کی خبر پر مقدم ہو جیسے فرمایا:
 "لَعَنَّاكَ إِتْمُكُمْ لِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ" (سورہ الحجر آیت نمبر 72)
 اے محمد! تمہاری جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش ہو رہے تھے۔

(5) لام مخفہ:

وہ لام جو ان مخفہ کے ساتھ آتا ہے۔
 جیسے فرمایا: "وَأَنَّ كُلَّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" (سورہ الزخرف آیت نمبر 35)
 اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے۔

(6) لام قسم:

یہ بھی اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:
 "لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ" (سورہ یوسف آیت نمبر 111)
 بلکہ ایسے قصص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے۔ اور کبھی فعل ماضی پر آتا ہے جیسے فرمایا:
 "لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ" (سورہ قال عمران آیت نمبر 81)
 ان کے قصے میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ اگر یہ لام فعل مستقبل پر آئے تو اس کے ساتھ فون تاکید ثقیلہ یا خفیفہ کا آنا
 ضروری ہے جیسے فرمایا: تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی۔ اور آیت کریمہ:
 "وَأَنَّ كَلِمَاتِي يَوْمَ الْقِيَامَتِ لَمَّا لِيَوْمِيَّتُهُمْ" (سورہ قہود آیت نمبر 111)

اور تمہارا پروردگار ان سب کو قیامت کے دن ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا۔ میں لہذا کلام ان کے جواب میں واقع
 ہوا ہے۔ اور لیو فیہم کلام قسم کا ہے۔

(7) لو کی خبر پر داخل ہونے والا لام:

وہ لام جو لو کی خبر پر داخل ہوتا ہے۔
 جیسے فرمایا: "وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ" (سورہ البقرہ آیت نمبر 103)
 اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔
 "لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ" (سورہ الفتح آیت نمبر 25)

اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے تو جوان میں کافر تھے ان کو ہم عذاب دیتے۔

"وَلَوْ اَنَّكُمْ قَالُوا لِي قَوْلُهُ لَكَانَ حَيْدُرًا اَلَهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 46)

اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور آپ کو متوجہ کرنے کے لئے راعنا کی جگہ انظرنا کہتے تو ان کے حق میں

بہتر ہوتا۔ اور کبھی لو کے جواب میں لام محذوف ہوتا ہے جیسے ہے۔

(8) وہ لام جو مدعا کے لئے استعمال ہو:

وہ لام جو مدعا یا مدعو الیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مدعو کے لئے یہ مفعول ہوتا ہے۔ جیسے یا الذید۔ اور مدعو الیہ آئے تو مکسور ہوتا ہے جیسے یا الذید۔

(9) لام امر:

لام امر یہ ابتدا میں آئے تو مکسور ہوتا ہے۔

جیسے فرمایا: "يا ايها الذين آمنوا ايسئذ انكم الذين ملكتم ايما نكم" (سورۃ النور آیت نمبر 58)

مومنوں تمہارے غلام لونڈیاں تم سے اجازت لیا کریں۔

"لِيَقْضِ عَلَيْنَا رُبُّكَ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 77)

تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔

اور اگر اس پر دوا و یا قافا آجائے تو ساکن ہو جاتا ہے جیسے فرمایا:

"وَلِيَتَّبِعْتُمْ اَوْ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ" (سورۃ العنكبوت آیت نمبر 66)

اور فائدہ اٹھائیں عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا۔

"وَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 29)

تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

"فَلْيَفْرَحُوا" (سورۃ قیونس آیت نمبر 58)

اور جب اس پر ٹم داخل ہو تو اسے ساکن اور متحرک دونوں طرح پڑھنا جائز ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلِيُؤْفُوا نُدُورَهُمْ وَلِيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ" (سورۃ الحج آیت نمبر 29)

پھر اپنا میل کھیل اتاریں اور اپنی ٹپٹیں پوری کریں اور اس آزاد گھر کا طواف کریں۔

سجد کا معنی:

(سج ج د) السجود (ن) (Prostration)

اُس کے اصل معنی عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو سجود کہا جاتا ہے اور یہ انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے (کیونکہ) سجود کی دو قسمیں ہیں۔

سجود اختیاری:

جو انسان کے ساتھ خاص ہے اور اسی سے وہ ثواب الہی کا مستحق ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَاتَّجِدُوا لِلّٰهِ وَاَعْبُدُوْا" (سورۃ النجم آیت نمبر 62)

سواللہ کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

سجود تسخیری:

جو انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاَصَالِ"

(سورۃ الرعد آیت نمبر 15)

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے خواہ مجبوری سے اور ان کی پرچھائیاں ہر صبح و شام۔

لفظ ابلیس کا معنی:

(بل س) (ابلاس) (افعال) (Devil, Satan)

کے معنی سخت ناامیدی کے باعث عملیں ہونے کے ہیں۔ ابلیس وہ مایوس ہونے کی وجہ سے مغموم ہوا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے ابلیس مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ" (سورۃ الروم آیت نمبر 12)

اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرموں کی آس ٹوٹ جائے گی۔

"اَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 44)

تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس میں وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

"وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يَنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِيْنَ" (سورۃ الروم آیت نمبر 49)

اگرچہ اس کے اتارنے سے پہلے آس توڑے ہوئے تھے۔

اور عام طور پر غم اور مایوسی کی وجہ سے انسان خاموش رہتا ہے اور اسے کچھ سوچھائی نہیں دیتا اس لئے ابلس فلان کے معنی

خاموش اور ذلیل سے عاجز ہونے کے ہیں۔

لفظ ابی کا مفہوم:

(ابی) الاباء۔ (Refusal, Objection)

کے معنی شدت امتناع یعنی سختی کے ساتھ انکار کرنا ہیں۔ یہ لفظ الامتناع سے خاص ہے لہذا ہر اباء کو امتناع کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو اباء نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے۔

"وَيَأْتِي اللَّهَ إِلَّا أَنْ يُتَمَّ نُورًا" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 32)

اور اللہ نہ مانے گا مگر اپنے نور کا پورا کرنا۔

"وَتَأْتِي قُلُوبُهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 8)

لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔

"أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 34)

اس نے سخت سے انکار کیا اور تکبر کیا۔

"إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 34)

مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔

ایک روایت میں ہے: "كلکم فی الجنة الا من ابی"

(کہ) تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص جس نے (اطاعت الہی سے) انکار کیا۔

رجل ابی۔ خود دار آدمی جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے۔ ابیت الضییر (مضارع تابی) تجھے اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ضرر

سے محفوظ رکھے۔ تیس آبی۔ وہ بکرا جو پہاڑی بکروں کا بول ملا ہو پانی پی کر بیمار ہو جائے اور پانی نہ پی سکے اس کا مونث ابواء

ہے۔

مفہوم کبیر:

(ک ب ر) کبیر (Pride)

اور الکبر والتکبیر والاستکبار کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں پہلی یہ ہے کہ وہ حالت ہے جس کے سبب سے

انسان عجب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور عجب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے اور سب سے بڑا تکبر قبول

حق سے انکار اور عبادت سے انحراف کر کے اللہ تعالیٰ پر تکبر کرنا ہے۔

مفہوم استکبار:

الاستکبار

اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کا قصد کرے۔ اور یہ بات اگر نشانے شریعت کے مطابق اور پر عمل ہو اور پھر ایسے موقع پر ہو۔ جس پر تکبر کرنا انسان کو سزاوار ہے تو محمود ہے۔

دوم یہ کہ انسان جھوٹ جھوٹ بڑائی کا اظہار کرے اور ایسے اوصاف کو اپنی طرف منسوب کرے جو اس میں موجود نہ ہوں۔ یہ مذموم ہے۔ اور قرآن میں یہی دوسرا معنی مراد ہے فرمایا:

"أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 34)

مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آ گیا۔

کان کی مفصل تحقیق:

(ک و ن) کان۔

فعل ماضی کے معنی کو ظاہر کرتا ہے جو مشترکات باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو ازلیت (یعنی ہمیشہ سے ہے) کے معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 40)

اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

"وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 27)

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور جب یہ کسی جنس کے ایسے وصف کے متعلق استعمال ہو جو اس میں موجود ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ وصف اس اسم کے ساتھ لازم و ملزوم رہتا ہے اور بہت ہی کم اس علیحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات:

"وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 67)

اور انسان ہے ہی ناشکر۔

"وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 100)

اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔

"وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 54)

اور انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے، میں تشبیہ کی ہے کہ یہ امور انسان کے اوصاف لازمہ سے ہیں اور شاذ و نادر ہی اس سے منفک ہوتے ہیں اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا:

"كَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 29)

اور شیطان آدمی کو بے مدد چھوڑ دیتا ہے۔

"وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 27)

اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا یعنی ناقدر ہے۔ جب یہ فعل زمانہ ماضی کے متعلق استعمال ہوتو اس میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ چیز تا حال اپنی پہلی حالت پر قائم ہو اور یہ بھی کہ اس کی وہ حالت متغیر ہو گئی ہو مثلاً کان فلان کذا ثم صار کذا۔ یعنی فلاں پہلے ایسا تھا لیکن اب اس کی حالت تبدیل ہو گئی ہے نیز یہ ماضی بعید کے لئے بھی آتا ہے جیسے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز پیدا کی تھی اور ماضی قریب کے لئے بھی حتیٰ کہ اگر وہ حالت زمانہ تکلم سے ایک لمحہ بھی پہلے ہو تو اس کے متعلق کان کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے لہذا جس طرح کان آدم کذا کہہ سکتے ہیں اسی طرح کان زید دھنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر آیت:

"كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 29)

وہ بولے ہم کیسے بات کریں اس سے جو پالنے میں بچہ ہے۔

کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو ابھی گود کا بچہ تھا یعنی کم عمر ہے اور یہ بھی کہ جو ابھی گود کا بچہ ہے یعنی ماں کی گود میں ہے لیکن یہاں زمانہ حال مراد لینا بے معنی ہے اس میں زمانہ قریب ہے جیسے آیت:

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 110)

جتنی امتیں ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ کنتم مانہ حال پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کے علم اور حکم کے مطابق بہتر تھے۔ اور آیت کریمہ:

"وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 280)

اور اگر (قرض لینے والا) تنگ دست ہو۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کان کے معنی کسی چیز کا واقع ہو جانے کے ہیں اور یہ فعل تام ہے۔ یعنی اگر وہ تنگ دست ہو جائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کون کا لفظ کسی جوہر کے اپنے سے پست تر جو میں تبدیل ہونے کے لئے آتا ہے اور اکثر متکلمین اسے معنی ابداع میں استعمال کرتے ہیں بعض علامائے نحو کا خیال ہے کہ کینونہ کا لفظ اصل میں کونونہ بروزن فعلولتہ ہے۔ نقل کی وجہ سے واؤ سے تبدیل ہو گئی ہے مگر سیبویہ کے نزدیک یہ اصل میں کینونونہ بر وزن فیعلولتہ ہے۔ واؤ کو یا میں ادغام کرنے سے کینونہ ہو گیا پھر ایک یاء کو تخفیف کے لئے گرا دیا تو کینونہ بن گیا جیسا کہ میت سے میت بنا لیتے ہیں جو اصل میں میوت ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ کینونہ (بشدد یاء کے ساتھ اکثر استعمال ہوتا ہے) مکان۔ بعض کے نزدیک یہ دراصل کان ذیکون (کون) سے ہے مگر کثرت استعمال کے سبب میم کو اصلی تصور کر کے اس سے ممکن وغیرہ مشتقات استعمال ہونے لگے ہیں جیسا کہ مسکین سے تمسکن بنا لیتے ہیں حالانکہ یہ (ص ک ن) سے ہے۔

استکان فلان فلاں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ گویا وہ ٹھہر گیا اور زلت کی وجہ سے سکون و طمانینت کو چھوڑ دیا، قرآن میں ہے:

"فَمَا اسْتَكَاؤُا لِرَبِّهِمْ" (سورۃ المؤمن آیت نمبر 76)

تو بھی انہوں نے اللہ کے آگے عاجزی نہ کی۔

تکبر کرنے والا پکڑا گیا:

نبی کریم ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے:

تم سے پہلے کا ایک شخص دو سبز چادریں اوڑھے اتراتا ہوا نکلا، تو اللہ عزوجل نے زمین کو حکم دیا تو زمین نے اسے پکڑ لیا، اب وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا رہے گا۔

تکبر کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا:

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس کے دل میں رائی کے دانے جتنا بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ عرض کی گئی، آدمی تو یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اور جوتے اچھے ہوں۔ تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بے شک اللہ عزوجل جمیل ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے، جبکہ تکبر تو حق کی مخالفت اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔

بُولَسْ اور طِينَةُ الْخَبَالِ:

قیامت کے دن متکبرین کو انسانی شکلوں میں چیونٹیوں کی مانند اٹھایا جائے گا، ہر جانب سے ان پر ذلت طاری ہوگی، انہیں جہنم کے "بولس" نامی قید خانے کی طرف ہانکا جائے گا اور بہت بڑی آگ انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر ان پر غالب آ جائے گی، انہیں "طِينَةُ الْخَبَالِ" یعنی جہنمیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔

نوٹ: لفظ آدم، قول، ملائکہ کا ذکر ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 35]

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ

الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ (35)

”اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی

چاہے مگر اس بیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔“

متن:

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

السكنى من السكون لأنها استقرار ولبس، وأنت تأكيد أكد به المستكن ليصح العطف عليه، وإنما لم يخاطبها أولاً تنبيهاً على أنه المقصود بالحكم والبعطوف عليه تبع له. والجنة دار الثواب، لأن اللام للعهد ولا معهود غيرها. ومن زعم أنها لم تخلق بعد قال إنه بستان كان بأرض فلسطين، أو بين فارس وكرمان خلقه الله تعالى امتحاناً لآدم، وحمل الإهباط على الانتقال منه إلى أرض الهند كما في قوله تعالى:

اهْبِطُوا مِصْرًا وَكُلًّا مِنْهَا رِجَالًا وَأَسْعَارُ أَهْلًا

صفة مصدر محذوف.

حَيْثُ شِئْتُمْ أَي مَكَانٍ مِنَ الْجَنَّةِ شِئْتُمْ، وَسِعَ الْأَمْرَ عَلَيْهِمَا إِزَاحَةً لِلْعَلَّةِ، وَالْعَدْرُ فِي التَّنَاوُلِ مِنَ الشَّجَرَةِ الْمَنْهِي عَنْهَا مِنْ بَيْنِ أَشْجَارِهَا الْفَائِئِةَ لِلْحَصْرِ.

ترجمہ:

اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو۔

"اسکن" فعل امر کا صیغہ ہے، جو سکنی سے مشتق ہے اور سکنی ماخوذ ہے سکون سے۔ اور اس کا معنی رہائش اختیار کرنا اور مسکن بنانا ہے کیونکہ وہ استقرار اور ٹھہرنے کی جگہ ہے اور سکون کا معنی حرکت نہ کرنا اور ٹھہر جانا ہے چونکہ جہاں رہائش اختیار کر لی جائے وہاں سکون حاصل ہوتا ہے اس لئے یہ سکون سے ماخوذ ہے۔ اسکن میں "انت" ضمیر مؤکد اور یہ "انت" اس کی تاکید ہے۔ مؤکد اور تاکید مل کر معطوف علیہ، واو عاطفہ زوجک معطوف ہے یہاں "انت" ضمیر مرفوع منفصل اس لئے ذکر کی گئی ہے تاکہ اسی پر اسم ظاہر کا عطف صحیح ہو جائے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو اکٹھا خطاب نہیں فرمایا جس طرح "ولا تقرنا" اور "فتکونا" میں خطاب فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات پر مطلع کیا جائے کہ حضرت آدم علی السلام مقصود بالحکم ہیں۔ اور "زوجک" ان کے تابع ہے، جس طرح معطوف، معطوف علیہ کے اعراب میں تابع ہوتا ہے۔

اور "الجنة" سے مراد دار الثواب ہے کیونکہ اس پر الف لام عہد خارجی کا ہے اور دار الثواب کے علاوہ کوئی اور مخصوص جنت نہیں ہے۔ معتزلہ کا کہنا ہے کہ دار الثواب ابھی تک تو پیدا ہی نہیں ہوا، اس لئے اس سے مراد وہ باغ ہے جو فلسطین، فارس اور کرمان کے درمیان پیدا فرمایا تھا تاکہ حضرت آدم علیہ السلام کو آزما یا جاسکے چونکہ اس سے آگے والی آیت میں اللہ کریم نے ارشاد فرمایا "اهبطوا" یہ اہباط سے مشتق ہے۔ جس کا معنی اوپر سے نیچے اتارنا ہے، لہذا معتزلہ کا یہ کہنا درست نہیں۔ معتزلہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اہباط سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کو ہندوستان کی طرف منتقل کرنا ہے اور اہباط کا لفظ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم نے بنی اسرائیل کو ارشاد فرمایا:

اهبطو مصرًا

کہ صحرائی زمین سے شہری زمین کی طرف منتقل ہو جاؤ۔

اہلسنت کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جس جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کو داخل کیا گیا تھا۔ اس کے اوصاف یہ بیان کئے گئے ہیں کہ وہاں آپ کو نہ تو بھوک لگے گی اور نہ ہی آپ برہنہ ہوں گے اور نہ ہی اس میں آپ کو پیاس اور دھوپ لگے گی تو یہ اوصاف دارالثواب کے ہی ہو سکتے ہیں، زمین پر واقع کسی باغ یا غنچہ وغیرہ کے نہیں۔

وکلأ منہارغداً

"رغداً" کا معنی کشادگی اور آسانی کے ساتھ کھانا ہے اور رغداً یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اس میں "اکلأ رغداً" تھا۔

حیث شئتُمَا

جہاں سے تم دونوں چاہو۔ یعنی جنت کی جس جگہ سے چاہو۔ با فراغت، سکون اور کشادگی کے ساتھ کھاؤ۔ تو یہاں اللہ کریم نے کھانے کے حکم میں ان دونوں (حضرت حوا و آدم علیہما السلام) کے لئے وسعت پیدا کر دی یعنی جہاں سے چاہو، وہاں سے کھاؤ تا کہ اس ممنوعہ درخت سے کھانے میں عذر اور علت زائل ہو جائے۔ یعنی اس ممنوعہ درخت کے علاوہ بہت سے ایسے درخت ہیں جن سے کھانے سے نہیں روکا گیا، وہاں سے کھانے کی اجازت تھی۔

متن:

وَلَا تَقْرَبُوا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ

فیه مبالغات، تعلیق النہی بالقرب الذی ہو من مقدمات التناول مبالغة فی تحریمہ، ووجوب الاجتناب عنہ، وتنبیہاً علی أن القرب من الشیء یورث داعیة، ومیلاً یأخذ بمجامع القلب ویلہیہ عما ہو مقتضی العقل والشرع، كما روى "حبك الشیء یعنی ویصم فینبغی أن لا یحوما حول ما حرم الله علیہما مخافة أن یقعاً فیہ، وجعله سبباً لأن یكونا من الظالمین الذین ظلموا أنفسهم بارتکاب المعاصی، أو بنقص حظہما بالإتیان بما یخل بالکرامة والنعیم، فإن الفاء تفید السببیهة سواء جعلت للعطف علی النہی أو الجواب لہ، والشجرة هی الحنطة، أو الکرمة، أو التینة، أو شجرة من أکل منها أحدث، والاولی أن لا تعین من غیر قاطع كما لم تعین فی الآیة لعدم توقف ما هو المقصود علیہ، وقرء بکسر الشین، و"تقرباً" بکسر التاء و"هذی" بالیاء.

ترجمہ:

ولا تقرباً... الخ

یہ فعل بھی تشبیہ کا صیغہ ہے اور اس کے ساتھ ممنوعہ درخت کے نزدیک جانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ اس میں کئی مبالغے ہیں۔

پہلا یہ کہ نبی کو قرب کے ساتھ معلق کر دیا گیا ہے اور قرب کسی چیز کے حاصل کرنے کے مقدمات میں سے ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس درخت کی حرمت میں مبالغہ ظاہر کیا جائے اور اس سے اجتناب کے وجوب کو ثابت کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اس بات پر تشبیہ کرنا مقصود ہے کہ کسی چیز کا قرب ایک ایسا جذبہ اور میلان پیدا کر دیتا ہے جو پورے دل پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور وہ جذبہ اسے اس چیز سے غافل کر دیتا ہے جس کا عقل اور شریعت تقاضا کرتی ہے۔ جیسے روایت کیا گیا ہے کہ تیرا کسی چیز سے محبت کرنا تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے۔ اس لئے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے لئے مناسب یہی ہے کہ جس چیز کو اللہ کریم نے ان دونوں پر حرام قرار دے دیا، اس کے گرد نہ گھومیں کہ کہیں وہ اسے استعمال کرنے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

تیسرا یہ کہ اس کے قرب کو اس بات کا سبب بنا دیا گیا ہے کہ اس کے استعمال کرنے سے وہ ان نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے جو گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نقصان میں مبتلا کر دیتے ہیں، یا اس سبب سے کہ وہ اس کے استعمال کرنے سے اپنا حصہ کم کر لیں گے جو ان کی کرامت اور نعمت کی کمی کا سبب بن جائے گا۔ کیونکہ یہاں "فأَسْبِيبَهُ" ذکر کیا گیا ہے۔ خواہ اس کا عطف بھی پر قرار دیں اسے فعل بھی کا جواب تصور کریں تو معنی یہ ہوگا کہ اس درخت کے قریب جانا نقصان کا باعث ہوگا اور جنت، کرامت اور نعمتیں چھین کی جائیں گی اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

اس جگہ کونسا درخت مراد ہے اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض کے نزدیک گندم، انگور کی بیل، انجیر یا کوئی ایسا درخت ہے جس سے کوئی کھائے تو اسے حدیث لاحق ہو جاتا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ اس پر کوئی قطعی دلیل موجود نہیں کہ کونسا درخت مراد ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اسے معین نہ کیا جائے، جس طرح آیت کریمہ میں اس کی تعیین نہیں کی گئی، کیونکہ اس پر مقصود موقوف نہیں اور "الشجرۃ" کو بکسر شین اور تقر باء بکسرہ تاء اور حذہ کو حذی یاء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

سکون کی تعریف:

(س لکن) السکون (ن) (Silence, Quietness)

حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سکون کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سکون فلان مکان کذا کے معنی ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کر لی۔ اسی اعتبار سے جائے رہائش کو مسکن کہا جاتا ہے اس کی جمع مساکن آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 25)

کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اور فرمایا: "وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 13)
اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔

"وَلِتَسْكُنُوا فِيهِ" (سورۃ یونس آیت نمبر 67)

تاکہ اس میں آرام کرو۔ تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سکنتہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اس سکنتہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي" (سورۃ بقرہ آیت نمبر 37)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد دلا بسائی ہے۔

"أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 6)

عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو اپنی طاقت بھر۔

زوج کا معنی:

(زوج) الزوج (Pair)

جن حیوانات میں نر اور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نر اور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیاء میں جفت کو زوج کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ پھر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى" (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 39)

اور (آخر کار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور عورت۔

"وَزَوْجِكَ الْجَنَّةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 35)

اور تیری بی بی جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زوجہ (تا کے ساتھ) کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے
فبکا بناتہ شجوهن و زوجتہ میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔ اور زوج کی جمع ازواج آتی ہے چنانچہ

قرآن میں ہے:

"هُنَّ وَأَزْوَاجُهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 56)

وہ اور ان کے جوڑے اور آیت:

"الْحٰشِرُ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجُهُمْ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 22)

جولوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔

میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو فعل میں ان کی اقتدا کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:

"إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا وَلَهُمْ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 88)

اس کی طرف جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔ ایشاہ و اقراں یعنی ایک دوسرے سے

ملنے جلتے لوگ مراد ہیں اور آیت:

"سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ" (سورۃ قینس آیت نمبر 36)

پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم کی) چیزیں پیدا کیں۔ نیز:

"وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ" (سورۃ الذاریات آیت نمبر 49)

اور تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنا کیں۔

میں اس بات پر تشبیہ کی ہے۔ کہ تمام چیزیں جو ہر ہوں یا عرض مادہ و صورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بتا رہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صالح (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تشبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خلفنا زوجین) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے بلکہ نفس ترکیب سے تو کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر تشبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جو ہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے لہذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت

"أَزْوَاجًا مِّنْ ثَبَاتٍ شَثِي" (سورۃ طہ آیت نمبر 53)

طرح طرح کی مختلف روئید گیاں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنی آیت:

"مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 10)

ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں)۔

اور آیت کریمہ: "فَمَائِيَّةَ أَزْوَاجٍ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 143)

(نراور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔

میں مراد ہیں اور آیت کریمہ: "وَ كُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 7)

میں ازواج کے معنی ہیں قرناء یعنی امثال و نظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو چنانچہ اس کے بعد

اصحاب المیمنة سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ" (سورۃ التکویر آیت نمبر 7)

اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔ میں بعض نے زوجت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہر پیر و کار کو اس پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائیگا۔ جیسا کہ آیت:

"اَحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 22)

میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس روز روجوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائیگا جیسا کہ آیت

"يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" (سورۃ الفجر آیت نمبر 27-28)

اے اطمینان پانے والی جان اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔

تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ میں بعض نے ربک کے معنی صاحبک یعنی بدن ہی کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زوجت سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کر دیا جائیگا جیسا کہ آیت کریمہ:

"يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ" (سورۃ قال عمران آیت نمبر 30)

جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائے گا۔

میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

"وَزَوْجَانَهُمْ يُحْجَرُونَ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 54)

اور ہم انہیں حور عین کا ساتھی بنا دیں گے۔ میں زوجنا کے معنی باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زوجنا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائے گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازواجی تعلقات نہیں ہوں گے کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بحور کی بجائے زوجناہم حورا کہتا جیسا کہ زوجتہ امرء کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔

اکل کا لغوی و مجازی معنی:

(الكل) (الكل) (To eat, To Suffer)

کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اكلت النار الحطب کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا

ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اكل بضم کاف و سکونا کہا جاتا ہے ارشاد ہے،

"اَكَلَهَا دَائِمًا" (سورۃ الرعد آیت نمبر 35) اُس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

تحقیق لفظ رغذ:

(رغذ) رغذ

اور غیدا۔ آسودہ زندگی قرآن میں ہے:

"وَكُلًّا مِنْهَا رَغَدًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 35)

اور اس میں سے تم دونوں با فراغت کھاؤ۔

"يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ" (سورۃ النحل آیت نمبر 112)

ہر طرف سے ان کا رزق با فراغت ان کے پاس چلا آتا تھا۔

ارغد القوم آرام راحت میں بسر کرنا۔ ارغد ماشیتہ اس سے اپنے مویشی چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیئے۔ ان میں اول

یعنی ارغد القوم جذب و جذب کی طرح لازم ہے اور دوسرا یعنی ارغد ماشیتہ ادخل کی طرح متعدی ہے۔

مرغاد کسے کہتے ہیں؟:

المرغاد ایک قسم کا کھانا جو دودھ میں خرما وغیرہ ڈال کر بنایا جاتا ہے اور دافر ہونے کی وجہ سے زندگی کی آسودگی پر

دلالت کرتا تھا۔

حیث کا استعمال:

(ح ی ث) حیث

(یہ ظرف مکان مبنی بر ضم ہے) اور مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن

میں ہے:

"وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 144)

اور تم جہاں ہو کرو۔

لفظ قرب کی تحقیق:

(ق ر ب) القرب (Near)

القرب والبعد یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے:

قربت منہ اقرب وقربتہ اقربہ قریبا قربانا کسی کے قریب جانا اور مکان زمان، نسبی تعلق مرتبہ حفاظت اور قدرت سب

کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرب مکانی کے متعلق فرمایا:

"وَلَا تَقْرَبُوا هَذِهِ الشَّجَرَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 35)

مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

"وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 152)

اور تیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔

"وَلَا تَقْرُبُوا الزُّنَىٰ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 32)

اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔

"فَلَا يَقْرُبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا" (سورۃ التوبة آیت نمبر 28)

تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا تَقْرُبُوا هُنَّ" (سورۃ البقرة آیت نمبر 222)

ان سے مقاربت نہ کرو۔

میں جماع سے کنایہ ہے۔

"فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ" (سورۃ الذاریات آیت نمبر 27) اور (کھانے کے لئے) ان کے آگے رکھ دیا۔

اور قرب زمانی کے متعلق فرمایا:

"اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 1)

لوگوں کا حساب اعمال کا وقت نزدیک پہنچا۔

شجر کی تعریف:

(شجر الشجر (Tree)

درخت وہ نبات جس کا تنہ ہو۔ واحد شجرہ جیسے ثمر و ثمرۃ۔ قرآن میں ہے:

"إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 18)

جب وہ اس پیڑ کے نیچے تمہاری بیعت کرتے تھے۔

"أَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 72)

کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا۔

"وَالنَّجْمِ وَالشَّجَرِ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 6)

اور بزرے اور پیڑ سجدہ کرتے ہیں۔

"مِنْ شَجَرٍ مِنْ زُقُومٍ" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 52)

تھوہر کے درخت سے۔

"إِنَّ شَجَرَةَ الزُّقُومِ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 43)

بلاشبہ تھوہر کا درخت گنجان درختوں والی وادی۔

بہت دوختوں والی جگہ۔ هذا الوادی اشجر من ذالک اس وادی میں اس سے زیادہ درخت ہیں۔ الشجار
والمشجرة والتشاجر باہم جھگڑنا اور اختلاف کرنا۔ قرآن میں ہے۔

"فِيهَا شَجَرٌ يَبِينُهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 65) اپنے تنازعات میں۔

شجرنی عنہ مجھے اس سے جھگڑا کر کے دور ہٹا دیا یا روک دیا، حدیث شریف میں ہے۔

فان اشتجر وافر السلطان ولی من لا ولی له

اگر تنازع ہو جائے تو جس عورت کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہے الشجار۔ ہودہ کی لکڑی چھوٹی پاکی۔

مشجر کے کہتے ہیں؟:

المشجر لکڑی کا اسٹینڈ جس پر کپڑے رکھے یا پھیلائے جاتے ہیں۔ شجرہ بالرمح اسے نیزہ مارا یعنی نیزہ مار کر اس

میں چھوڑ دیا۔

ایک عجیب و غریب درخت:

سبع سنابل میں ہے: نمرود کے دروازے پر ایک درخت تھا جس کا سایہ بالکل نہ تھا۔ جب ایک شخص اس کے نیچے آتا اس
کے لائق سایہ ہو جاتا، دوسرا آتا تو دو کے لائق ہو جاتا۔ غرض ایک لاکھ تک آدمی اس کے سایہ میں رہ سکتے اور جہاں ایک لاکھ
سے ایک بھی زیادہ ہو اسب دھوپ میں۔ (سبع سنابل، سنبلہ ششم، درحقائق وحدت، ص ۱۵۰)

مبارک درخت:

قرآن مجید میں مبارک درخت سے مراد "زیتون" کا درخت ہے۔ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد یہ سب سے پہلا
درخت ہے جو زمین پر اُگا اور سب سے پہلے جہاں اُگا وہ کوہ طور ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے ہم کلام ہوئے۔
زیتون کے درخت کی عمر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض عالموں نے فرمایا ہے کہ تین ہزار برس تک یہ درخت باقی رہتا
ہے۔ (تفسیر صاوی، ج ۴، ص ۱۳۶۰، پ ۱۸، المونون: ۲۰)

ظلم کا لغوی معنی:

(ظلم م). الظلم (Cruelty, Tyranny)

اہل لغت اور اکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی زیادتی کر کے یا اسے

اس کی صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر۔

ظلم کی اقسام:

بعض علماء نے کہا ہے کہ ظلم تین قسم پر ہے۔

(1) پہلی قسم:

وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے اس کی کسب سے بڑی قسم کفر و شرک اور نفاق ہے۔ چنانچہ فرمایا،

"إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 13)

بیشک شرک بڑا ظلم ہے۔

(2) دوسری قسم:

دوسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ:

"وَجَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّمْلًا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ"

اور برائی کا بدلہ اسی کی برابر برائی ہے، تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ پر ہے بیشک وہ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔

میں ظالمین سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں۔

(3) تیسری قسم:

تیسری قسم کا ظلم وہ ہے جو ایک انسان خود اپنے نفس پر کرتا ہے۔

چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

"فَإِنَّهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 32)

تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

حکایت:

حضرت سیدنا عبدالمنعم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے والد سے اور وہ حضرت سیدنا وہب علیہ رحمۃ اللہ الاحد سے روایت کرتے ہیں کہ کسی ملک میں ایک ظالم و مغرور بادشاہ رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک عظیم الشان محل بنوایا اور اس کی تعمیر پر کافی مال خرچ کیا، جب تعمیر مکمل ہو چکی تو اس نے ارادہ کیا کہ میں سارے محل کا دورہ کروں اور دیکھوں کہ یہ میری خواہش کے مطابق بنا ہے یا نہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور محل کو دیکھنے چل پڑا۔ اندر سے دیکھنے کے بعد اس نے محل کے بیرونی حصوں کو دیکھنا شروع کیا اور محل کے ارد گرد گرد چکر لگانے لگا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا اور ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

یہ ہمارے محل کے ساتھ جھونپڑی کس نے بنائی ہے؟

سپاہیوں نے جواب دیا: چند روز سے یہاں ایک مسلمان بوڑھی عورت آئی ہے، اس نے یہ جھونپڑی بنائی ہے اور وہ اس میں اللہ عزوجل کی عبادت کرتی ہے۔

جب بادشاہ نے یہ سنا تو بڑے مغرورانہ انداز میں بولا: اس غریب بڑھیا کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ہمارے محل کے قریب جھونپڑی بنائے، اس جھونپڑی کو فوراً گرا دو۔ حکم پاتے ہی سپاہی جھونپڑی کی طرف بڑھے، بڑھیا اس وقت وہاں موجود نہ تھی۔ سپاہیوں نے آن کی آن میں اس غریب بڑھیا کی جھونپڑی کو ملیا میٹ کر دیا۔ بادشاہ جھونپڑی گروانے کے بعد اپنے دوستوں کے ہمراہ اپنے نئے محل میں چلا گیا۔

جب بڑھیا واپس آئی تو اپنی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کو دیکھ کر بڑی غمگین ہوئی اور لوگوں سے پوچھا:

میری جھونپڑی کس نے گرائی ہے۔ لوگوں نے بتایا: ابھی کچھ دیر قبل بادشاہ آیا تھا، اسی نے تمہاری جھونپڑی گروائی ہے۔ یہ سن کر بڑھیا بہت غمگین ہوئی اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر اللہ عزوجل کی بارگاہ میں یوں عرض گزار ہوئی:

اے میرے پاک پروردگار عزوجل! جس وقت میری جھونپڑی توڑی جا رہی تھی، میں موجود نہ تھی لیکن میرے رحیم و کریم پروردگار عزوجل! تو تو ہر چیز دیکھتا ہے، تیری قدرت تو ہر شے کو محیط ہے، میرے مولیٰ عزوجل! تیرے ہوتے ہوئے تیری ایک عاجز بندگی کی جھونپڑی تو زدی گئی۔

اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اس بڑھیا کی آہ وزاری اور دعا مقبول ہوئی۔ اللہ عزوجل نے حضرت سیدنا جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس پورے محل کو بادشاہ اور اس کے سپاہیوں سمیت تباہ و برباد کر دے۔ حکم پاتے ہی حضرت سیدنا جبرائیل علیہ السلام زمین پر تشریف لائے اور سارے محل کو اس ظالم بادشاہ اور اس کے سپاہیوں سمیت زمین بوس کر دیا۔
نوٹ: لفظ آدم، جنت، شی اور لاک کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 36]

فَازْلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ
وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (36)

”تو شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا اور ہم نے فرمایا نیچے اترو، آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے۔“

متن:

فَازْلَهُمَا الشَّيْطَانُ

عَنْهَا أَصْدَرُ زَلَمَهُمَا عَنِ الشَّجَرَةِ وَحَمَلَهُمَا عَلَى الزَّلَّةِ بِسَبَبِهَا، وَنَظِيرٌ «عَنْ هَذِهِ فِي قَوْلِهِ

تعالیٰ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي. أو أزلها عن الجنة بمعنى أذهبها، وبعضه قراءة حمزة «فأزالها» وهما متقاربان في المعنى، غير أن أزل يقتضى عثرة مع الزوال، وإزاله قوله: هَلْ أَذُكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَى وقوله: مَا نَهَا كُفْرًا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَتَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ومقاسمته إياها بقوله: إِي لَكُمَا لِيَن النَّاصِحِينَ. واختلف في أنه تمثل لها فقاولها بذلك، أو ألقاه إليها على طريق الوسوسة، وأنه كيف توصل إلى إزالها بعد ما قيل له: فَأَخْرَجَ مِنْهَا قَائِكُمْ رَجِيمًا. فقيل: إنه منع من الدخول على جهة التكرمة كما كان يدخل مع الملائكة، ولم يمنع أن يدخل للوسوسة ابتلاء لآدم وحواء.

وقيل: قام عند الباب فناداهما. وقيل: تمثل بصورة دابة فدخل ولم تعرفه الخزنة. وقيل: دخل في فم الحية

حتى دخلت به. وقيل: أرسل بعض أتباعه فأزالها، والعلم عند الله سبحانه وتعالى. فَأَخْرَجَهَا مِنْهَا كَأَنَّا فِيهِ أَى مِنَ الْكِرَامَةِ وَالنَّعِيمِ.

وَقُلْنَا اهْبِطُوا خُطَابَ لَادِمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَحَوَاءَ لِقَوْلِهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى: قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا. وجمع الضمير لأنها أصلا الجنس فكانها الإنس كلهم. أو هما وإبليس أخرج منها ثانيا بعد ما كان يدخلها للوسوسة، أو دخلها مسارقة أو من السماء.

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ حَالِ اسْتَعْنَى فِيهَا عَنِ الْوَاوِ بِالضَّمِيرِ، وَالْمَعْنَى مُتَعَادِلِينَ يَبْنَى بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ بِتَضْلِيلِهِ.

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ مَوْضِعَ اسْتِقْرَارٍ، أَوْ اسْتِقْرَارٍ. وَمَتَاعٌ تَمْتَعُ إِلَى حِينٍ يَرِيدُ بِهِ وَقْتُ الْمَوْتِ أَوْ الْقِيَامَةِ

ترجمہ:

تو ابلیس (شیطان) نے برا ہیختہ کیا اور اس درخت کے سبب ان دونوں سے لغزش کروادی۔ "عنها" سے پہلے "عن" اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہو رہا بلکہ بمعنی سبب ہے۔ اور عربی میں یہ سبب کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ،

وما فعلته عن امری

اور میں نے وہ کام اپنے حکم کے سبب سے نہیں کیا۔

یاد رہا "عن" اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس صورت میں "ازلہما عن الجنة اذہب" ہما کے معنی میں ہوگا۔ یعنی "عسہا" کی ضمیر کا مرجع جنت ہوگا، یعنی ان دونوں کو جنت سے نکال دیا اور اس کو "بسمزہ" کا "ازلہما" پڑھنا بھی اسکی تائید کرتا ہے، کیونکہ ازل اور ازال دونوں قریب المعنی ہیں۔ البتہ ازل زوال کے ساتھ لغزش کا بھی تقاضا کرتا ہے اور شیطان کا ان دونوں کو پھسلانا اس طرح تھا کہ اس نے کہا،

هَلْ اَدَّلَكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبُلُ

کیا میں تمہاری ہمیشہ رہنے والے درخت اور ایسے ملک کی طرف رہنمائی کروں جو بوسیدہ نہیں ہوگا اور اس کا یہ کہنا،

مَا نَهَا كُما رَبُّكُما عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُونَا مَلَکَيْنِ اَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ

اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ تم اس سے کھا کر فرشتے نہ بن جاؤ یا تم

دونوں ہمیشہ رہنے والوں سے نہ ہو جاؤ اور اس نے ان دونوں کے سامنے قسم اٹھا کر کہا۔

اِنِّي لَكُما مِنَ الصَّالِحِينَ

بخدا میں تمہارے لئے نصیحت کرنے والوں میں سے ہوں اور اب اس میں اختلاف ہے کہ شیطان نے وسوسہ اندازی کا

طریقہ کیا اختیار کیا تھا، امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔

1۔ وہ مثالی شکل میں ان کے سامنے آیا اور نصیحت بھرا کلام کرنے لگا اور قسم اٹھائی، وہ سمجھے اللہ کریم کے نام کی کوئی جھوٹی

قسم نہیں اٹھاتا تو انہوں نے اسے کھالیا۔

2۔ وہ جنت میں داخل نہیں ہوا بلکہ باہر سے ہی وسوسہ اندازی کے طریقہ پر القاء کرتا رہا۔

3۔ کسی جنتی جانور کی شکل میں متشکل ہو کر فرشتوں کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنت میں داخل ہو گیا۔

4۔ دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی اور وہ دونوں دروازے تک آگئے، وہاں سے بات شروع ہوئی اور سلسلہ کلام مکمل

ہوا۔

5۔ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہو گیا اور وہیں سے ان سے کلام کیا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

سانپ کو قتل کیا کرو، خواہ وہ حرم میں ہو یا باہر، ہم نے اس کے ساتھ صلح نہیں کی جب سے اس کے ساتھ ہماری دشمنی شروع ہوئی

ہے۔ یہ خبر متواتر نہیں۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس نے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو پھسلانے تک کیسے رسائی حاصل کی جب کہ اس کو یہ کہہ کر

نکال دیا گیا تھا۔

فاخرج منها فانك رجيم

کہ تو اس سے نکل جا کیونکہ تو دھتکارہ جا چکا ہے۔

تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس کو جنت میں عزت و احترام کے ساتھ داخل ہونے سے منع کیا گیا تھا جس پر وہ پہلے فرشتوں کے ساتھ مل کر جنت میں داخل ہوا تھا اور سوسہ اندازی کے لئے داخل ہونے سے منع نہیں کیا گیا تھا۔ تا کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو آزما یا جاسکے۔

نوٹ: مذکورہ بالا تمام چیزوں کے باوجود حقیقت کا علم اللہ کریم کے پاس ہے کہ اس نے کیسے دوسرا عالم کیا۔ اس پر کوئی نص قطعی نہیں ہے۔ البتہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ان دونوں کو جنت سے نکلنے کا سبب وہی اعمین تھا۔ جس پر نص قطعی دلالت کرتی ہے جو مندرجہ ذیل ہے،

فاخرجہما کانا فیہ

یعنی جس جنت اور کرامت میں وہ لطف اندوز ہو رہے تھے اس سے اس نے ان دونوں کو نکال دیا۔

قلنا اہبطوا۔۔۔

یہاں یہ خطاب حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام دونوں کو ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اللہ کریم نے ان دونوں کو صیغہ کے ساتھ خطاب فرمایا ہے "قال اہبطا منها جمیعا" کہ دونوں اس سے اکٹھے نکل جاؤ تو جمع کا صیغہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے واسطے سے تمام ذریت آدم کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ وہی پوری جنس کی اصل ہیں تو گویا وہی تمام کے تمام انسان ہیں، یا اس سے مراد حضرت آدم، حضرت حوا اور ابلیس تینوں ہیں اور ابلیس کے اس حکم میں داخل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دوسوہ ڈالنے کے لئے جنت میں داخل ہوا تھا یا چپکے چپکے اندر داخل ہو گیا تھا تو اسے بھی دوبارہ نکلنے کا حکم دیا گیا اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان تینوں کو آسمان سے نیچے اترنے کا حکم دیا ہے۔

بعضکم لبعض عدو۔۔۔

یہ جملہ "اہبطوا" میں ضمیر مرفوع متصل سے حال ہے۔ حال اور ذوالحال کے درمیان رابطہ کبھی واؤ ہوتی ہے کبھی ضمیر اور کبھی دونوں ہوتے ہیں مگر یہاں صرف ضمیر رابطہ کافی ہے اور وہ "کم" ضمیر ہے، معنی یہ ہوگا کہ اس حال میں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہو گے۔ آیت کریمہ میں مستقر کا لفظ یا تو طرف مکان کے معنی میں ہے یعنی موضع استقرار یا بمعنی استقرار مصدر میسی ہے۔ متاع کا معنی لطف اندوز ہونا ہے، اور "حین" کی معنی موت کا وقت یا قیامت ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ زمیں میں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ یا ٹھہرنا اور اللہ کریم کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا موت کے وقت تک یا قیامت تک ہے، گویا اس دار فانی میں تمہارا قیام عارضی ہے۔

الزلة کی تحقیق:

(زلزل) الزلة (ض) (Earth Quake)

کے اصل معنی بلا قصد کے قدم پھسل جانے کے ہیں کہا جاتا ہے:

زلزلت رجل تنزل اور پھسلنے کی جگہ کو زلزلہ کہا جاتا ہے نیز جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے اسے بھی بطور تشبیہ زلزلہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

"فَإِنْ زَلَلْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 209)

اگر تم لغزش کھا جاؤ۔

"فَازَلَّهَا الشَّيْطَانُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)

انہیں شیطان نے پھسلا دیا۔

استزلہ استفعال کسی کو پھسلانے کا قصد ارادہ کرنا اور آیت کریمہ:

"إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 155)

شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ شیطان انہیں آہستہ آہستہ پھسلانے کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ وہ پھسل گئے کیونکہ جب انسان صغائر میں بے پرواہی سے کام لیتا ہے تو وہ شیطان کے تسلط کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔

حدیث پاک:

حدیث میں ہے: مَنْ أُزِلَّتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا

کہ جسے بلا طلب نعمت مل جائے اسے منعم کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب بلا قصد نعمت حاصل ہونے پر شکر گزاری لازم ہے تو جو احسان کسی کے قصد اور ارادہ سے ہو اس کا شکر یہ ادا کرنا ضروری ہے۔

التزلزل کا معنی:

التزلزل اس کے معنی اضطراب کے ہیں اور اس میں تکرار حروف تکرار معنی پر دال ہے قرآن میں ہے:

"إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا" (سورۃ الزلزلہ آیت نمبر 1)

جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے گی۔

"إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ" (سورۃ الحج آیت نمبر 1)

پیشک قیامت کا زلزلہ بڑی (سخت) مصیبت ہوگی۔

"وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 11)

اور خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے۔

لفظ خرج کا مفہوم:

(خ ر ج) خروج۔ (ن)

خروج کا معنی کسی کے اپنی قرار گاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قرار گاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجی کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو۔ قرآن میں ہے:

"فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ" (سورۃ القصص آیت نمبر 21)

موسیٰ وہاں سے ڈرتے نکل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

لفظ بسوط کی مفصل تحقیق:

(ہ ب ط) الهبوط (ض) (To Alight, To Get Down)

کے معنی کسی چیز کے قہر یعنی بے اختیاری کی حالت میں نیچے اتر آنا کے ہیں جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے اور الهبوط (بفتح ہاء) صیغہ مفت ہے یعنی نیچے کرنے والی چیز ہبوط فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے جیسے انا میں نیچے اتار دیا۔ قرآن میں ہے:

"وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 74)

اور بعض پتھر ایسے بھی (ہوتے ہیں) جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

اور جب لفظ ہبوط انسان کے لئے بولا جاتا ہے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے بخلاف لفظ انزال، الّا فعال کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر با شرف چیزوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جیسے ملائکہ قرآن بارش وغیرہ اور جہاں کہیں کسی چیز کے حقیر ہونے پر تشبیہ مقصود ہے وہاں لفظ ہبوط استعمال کیا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوًّا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)

اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن۔

"فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 13)

تو یہاں سے اتر جا تجھے نہیں پہنچتا کہ یہاں رہ کر غرور کرے نکل۔

"اهْبِطُوا مِصْرَ أَفْئَانَ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

یا کسی شہر میں اتر دو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے ان کا شرف ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس کے مابعد کی آیت:

"وَطَرَبْتَ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَأَوْ يَغْضَبُ مِنَ اللَّهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے۔

نیز قرآن مجید میں ہے،

"قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 38)

ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ۔

محاورہ:

محاورہ ہے ہیط المرض لہم العلیل بیمارینے اس کے گوشت کو کم کر دیا یعنی لاغر کر دیا اور الہبط اونٹ وغیرہ کو کہتے ہیں جو غذا کے ناقص اور مالک کی بے اعتنائی کی وجہ سے لاغر ہو جائے۔

لفظ بعض کا معنی:

(بعض الشئی) (Certain, some, Many)

ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اس لئے کل کے بالقابل استعمال ہوتا ہے جیسے:

بعضہ وکلہ اس کی جمع ابعاض آتی ہے قرآن میں ہے:

"بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)

آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن۔

عدو کی تعریف:

(عدو العدو) (Enemy)

کے معنی حد سے بڑھنے اور باہم ہم آہنگی نہ ہونا ہیں اگر اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عداوت اور معاداة کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عدو کہا جاتا ہے اور اگر عدل و انصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عدوان اور عدو کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدُوًّا بِغَيْرِ عِلْمٍ"

(سورۃ الانعام آیت نمبر 108)

اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے۔

اور اگر اس کا تعلق کسی جگہ کے اجزاء کے ساتھ ہو تو اسے عدو کہہ دیتے ہیں جیسے مکان ذو عدو یا ہوا مقام۔ چنانچہ

معداۃ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے رجل عدو و قوم عدو اور یہ واحد جمع دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (سورۃ قحطہ آیت نمبر 123)

اب سے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

استقر کا معنی و مفہوم:-

استقر فلان قرار پکڑنے کا فصد کرنا اور کبھی یہ بمعنی قرر (قرار پکڑنا) بھی آجاتا ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب چنانچہ جنت کے متعلق فرمایا:

"خَيْرٌ مُسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 24)

ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا۔

اور جن ہم کے متعلق فرمایا:

"سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 66)

اور دوزخ ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

"فَمُسْتَقَرًّا وَمُسْتَوْدَعًا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 98)

تمہاری لئے ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی۔

اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک مستقر سے مراد زمین میں ٹھہرنا ہے اور مستودع سے مراد قبر میں

ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مستقر سے مراد توزمین ہی ہے لیکن مستودع سے مراد دنیا ہے۔ الحاصل

ہر وہ حالت جس سے انسان منتقل ہو جائے وہ مستقر تام نہیں ہو سکتا ہے۔

تحقیق لفظ متاع:

(م ت ع) المتوع (Profit, Benefit)

ہر وہ چیز جس سے کسی قسم کا نفع حاصل کیا جائے اسے متاع و متعة کہا جاتا ہے اس معنی کے لحاظ آیت کریمہ:

"وَلِنَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 65)

جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

میں غلہ کو متاع کہا ہے اور بعض نے غلہ کے تھیلے یا بوریاں مراد لئے ہیں اور یہ دونوں متاع میں داخل اور باہم متلازم ہیں

کیونکہ غلہ ہمیشہ تھیلوں ہی میں ڈالا جاتا ہے۔

حین کا مطلب:

(ح ی ن) الحین

اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو۔ یہ ظرف مبہم ہے اور اس کی تعین ہمیشہ مضاف الیہ سے ہوتی ہے

جیسے فرمایا:

"وَلَاتَ حِينَ مَنَاصٍ" (سورۃ ص آیت نمبر 3)

اور وہ رہائی کا وقت نہ تھا۔

نوٹ: شیطان اور ارض کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 37]

فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (37)

”پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی، بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان“۔

متن:

فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ اسْتَقْبَلَهَا بِالْاِخْذِ وَالْقَبُولِ وَالْعَمَلُ بِهَا حِينَ عَلِمَهَا. وَقَرَأَ ابْنُ كَثِيرٍ بِنَصْبِ آدَمَ وَرَفَعَ الْكَلِمَاتِ عَلَىٰ أَنَّهَا اسْتَقْبَلَتْهُ وَبَلَّغَتْهُ وَهِيَ قَوْلُهُ تَعَالَى: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا الْآيَةَ، وَقِيلَ: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالَى جَدُّكَ لِأَنَّكَ إِلَّا أَنْتَ ظَلَمْتَ نَفْسِي فَاعْفُرْ لِي، إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ. وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: يَا رَبِّ أَلَمْ تَخْلُقْنِي بَيْنَ يَدَيْكَ، قَالَ: بَلَى، قَالَ: يَا رَبِّ أَلَمْ تَنْفَعْ فِي الرُّوحِ مِنْ رُوحِكَ، قَالَ: بَلَى، قَالَ: يَا رَبِّ أَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتَكَ غَضَبِكَ، قَالَ: بَلَى، قَالَ: أَلَمْ تَسْكُنْ جَنَّتَكَ، قَالَ: بَلَى، قَالَ: يَا رَبِّ إِنْ تَبَتِ وَأَصْلَحْتَ أُرَاجِعِي أَنْتَ إِلَى الْجَنَّةِ قَالَ: نَعَمْ. وَأَصْلُ الْكَلِمَةِ:

الكلم، وهو التأثير المدرك بإحدى الحاستين السبع والبصر كالكلام والجراحة والحركة.

فَتَابَ عَلَيْهِ رَجَعُ عَلَيْهِ بِالرَّحْمَةِ وَقَبُولُ التَّوْبَةِ، وَإِنَّمَا رَتَبَهُ بِالْفَاءِ عَلَى تَلَقَى الْكَلِمَاتِ لِتَضَمُّنِهِ مَعْنَى التَّوْبَةِ: وَهُوَ الْإِعْتِرَافُ بِالذَّنْبِ وَالنَّدَمُ عَلَيْهِ وَالْعَزْمُ عَلَى أَنْ لَا يَعُودَ إِلَيْهِ. وَأَكْتَفَى بِذِكْرِ آدَمَ لِأَنَّ حَوَاءَ كَانَتْ تَبَعًا لَهُ فِي الْحُكْمِ وَلِذَلِكَ طَوَى ذِكْرَ النِّسَاءِ فِي أَكْثَرِ الْقُرْآنِ وَالسَّنَنِ.

إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّجَاعُ عَلَى عِبَادَةِ الْمَغْفِرَةِ أَوِ الَّذِي يَكْثُرُ اعْتَابُهُمْ عَلَى التَّوْبَةِ. وَأَصْلُ التَّوْبَةِ:

الرجوع، فإذا وصف بها العبد كان رجوعاً عن المعصية، وإذا وصف بها الباري تعالى أريد بها الرجوع عن العقوبة إلى المغفرة.

الرحيم المبالغ في الرحمة، وفي الجمع بين الوصفين، وعد للثائب بالإحسان مع العفو.

ترجمہ:

فتلقى میں فاء تعقیبہ ہے اور تلقی کا معنی ہے کہ عمل اور قبول کرنے کے لئے کسی چیز کو حاصل کرنا تو معنی یہ ہوگا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ سے کلمات سیکھے تو ان کو عملی جامہ پہنایا اور انہیں قبول کر لیا۔ علامہ ابن کثیر نے لفظ آدم کو منصوب پڑھا ہے اور "کلمات" کو رفع دیا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچے اور انہوں نے آپ علیہ السلام کا استقبال کیا۔ وہ کلمات کون سے تھے، اس کے متعلق امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مندرجہ ذیل تین اقوال ذکر کئے ہیں۔

1- کلمات سے مراد

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ.

2- بعض کے نزدیک یہ کلمات سکھائے گئے،

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِي
فَاغْفِرْ لِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ.

3- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے پروردگار کیا تو نے مجھے اپنی قدرت کے ہاتھ سے پیدا نہیں فرمایا تو اللہ کریم نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر عرض کی اے میرے رب کیا تو نے میرے اندر اپنی خاص روح نہیں پھونکی، اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں، عرض کیا اگر میں توبہ کر لوں اور اصلاح کر لوں تو کیا تو مجھے دوبارہ جنت میں لوٹا دے گا، رب تعالیٰ نے فرمایا ہاں۔

"کلمات" اس کا مفرد کلمہ ہے اور اس کا معنی وہ چیز جس کے ادراک کی تاثیر، کان، آنکھ یا حرکت سے ہو۔ جیسے گفتگو کرنا زخمی ہونا وغیرہ۔ جنت سے نکلنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کئی سال روتے رہے، معافی مانگتے رہے مگر اللہ کریم کی بارگاہ کوئی جواب نہیں آیا، یہاں تک کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عاجزی اور انکساری کی انتہا کر دی اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اس پر شرمندگی ظاہر کی اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا پکا ارادہ کیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دیا، تب اللہ کریم عزوجل نے توجہ فرمائی اور معاف کیا۔

"فتاب" مشتق من التوبہ ہے اور اس کا معنی اعتراف گناہ کرنا، اس پر شرمندہ ہونا اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا اور رجوع کرنا ہے تو جب اس کی نسبت بندہ کی طرف ہو تو معنی یہ ہوتا ہے کہ اس نے گناہوں سے رجوع کر لیا اور جب اس کی نسبت

اللہ کریم کی طرف ہو اور اس کا صلہ "علی" ہو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ کریم نے اپنی بخشش اور مغفرت کے ساتھ بندہ کی توبہ قبول فرمائی۔ اور اسے عذاب و سزا دینے سے رجوع فرمایا، کیونکہ بے حد توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

"تواب" اور "رحیم" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں تو ان دونوں صیغوں کو اکٹھا کر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ توبہ کرنے والے کے ساتھ گناہوں کی معافی اور احسان کرنے کا وعدہ ہے۔

تحقیق تلقی:

وتلقى السماحة منه والندی خلقا سخاوت اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ لقیبت بكذا۔ میں فلاں چیز کے ساتھ اس کے سامنے پہنچا۔ قرآن میں ہے:

"وَيُلْقُونَ فِيهَا تِجِيَّةً وَسَلَامًا" (سورة الفرقان آیت نمبر 75)

اور وہاں ان کا استقبال دعا و سلام کے ساتھ کیا جائے گا۔

"وَلَقَاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا" (سورة الانسان آیت نمبر 11)

اور تازگی اور شادمانی سے ہمکنار فرمائے گا۔

تلقاه کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

"وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ" (سورة الانبياء آیت نمبر 103)

اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے۔

"وَإِنَّكَ لَتَلْقَى الْقُرْآنَ" (سورة النمل آیت نمبر 6)

اور تم کو قرآن عطا کیا جاتا ہے۔

کلم کی تعریف:

(كلم) الكلمة. (Word, Speech)

یہ اصل میں اس تاثیر کو کہتے ہیں جس کا ادراک ذوحاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کیساتھ ہوتا ہے۔ اور کلم (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔ محاورہ ہے۔ کلمتہ میں نے اسے ایسا زخم لگایا۔ جس کا نشان ظاہر ہوا اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور کلم) معنی تاثیر میں مشترک ہیں۔

توبہ کا معنی:

(توب) التوب (ن) (Repentance)

کے معنی گناہ کے باحسن وجود ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے۔

ابن سینا کی توبہ:

اور امام یافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "میراث الجنان" میں ایک روایت یہ تحریر فرمائی کہ ابن سینا آخر عمر میں تائب ہو گیا تھا۔ (میراث الجنان السنۃ ثمان وعشرون واربعة مائة، ج ۳، ص ۳۸، ۴۰)

موت سے کچھ مدت پہلے ایون کھانا چھوڑ دیا، باندی غلام سب آزاد کر دیے، رات دن نماز و تلاوت قرآن میں مشغول رہتا تھا۔ اگر ایسا ہے تو اس کے اس شعر نے کام دیا کہ۔

آنجا کہ عنایتے تو باشد باشد
نا کردہ چو کردہ کردہ چوں نا کردہ

یعنی: جس گنہگار پر تیرا کرم ہو گیا تو اس کے گناہ ایسے ہو گئے جیسے کئے ہی نہیں اور جو نیکیاں نہیں کر سکا وہ بھی درج ہوں گی۔ رحمت بے سبب کو متوجہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اتنی برس کے بت پرست کو ایک آن (یعنی لمحے) میں مسلمان بلکہ قطب شہر بلکہ ابدال سے بھی اعلیٰ بند لائے سب سے کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے (یعنی اگر تائب ہو کر فوت ہوا) تو رحمت اللہ تعالیٰ علیہ مگر امت میں بڑا فتنہ چھوڑ گیا۔

"وَحَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ"

اللہ ہمیں کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے۔

توبہ کرنے والے سے اللہ عز و جل خوش ہوتا ہے:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی نے فرمایا:

اللہ عَزَّ وَجَلَّ کا بندہ جب توبہ لاتا ہے رب عَزَّ وَجَلَّ کے حضور تو وہ اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا وہ شخص جس کی اُوٹنی مع ذراہ کے (یعنی سامان سفر کے ساتھ) گم گئی اس کے مل جانے پر خوش ہو۔

(ماخوذ از صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب فی الغص علی التوبہ۔۔۔۔۔ الخ، الحدیث ۲۷۴۳، ص ۱۳۶۸) (ملفوظات اعلیٰ حضرت مؤرخ نمبر 380)

اعتذار کی صورتیں:

(Excuse)

کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لم افعلہ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔

دوسری صورت:

یہ ہے کہ اس کے لئے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشے لگ جائے۔

تیسری صورت:

یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلانے۔ اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے۔

شرعاً توبہ:

جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادام ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔ تاب الی اللہ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن میں ہے؛

"وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا" (سورۃ النور آیت نمبر 31)

اور اللہ کی طرف توبہ کرو۔

توابع کا معنی:

التوابع

یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صنعت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہ کو ترک کر دے اور جب ثواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 54)

بیشک وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اور آیت کریمہ:

"وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 71)

اور جو توبہ کرے اور اچھا کام کرے تو وہ اللہ کی طرف رجوع لایا جیسی چاہے تھی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک کر کے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔

"عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَالْيَهُ مَتَابٌ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 30)

میں اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نوٹ: لفظ رب اور رحم کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 38]

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (38)

”ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہو اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم۔“

متن:

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا کرر للتأكيد، أو لاختلاف المقصود فإن الاول دل على أن هبوطهم إلى دار بلية يتعادون فيها ولا يخلدون، والثاني أشعر بأنهم اهبطوا للتكليف، فمن اهتدى الهدى نجا ومن ضله هلك، والتنبيه على أن مخافة الإهباط المقترن بأحد هذين الأمرين وحدها كافية للحازم أن تعوقه عن مخالفة حكم الله سبحانه وتعالى فكيف بالمقترن بهما، ولكنه نسي وَلَمْ تَجِدْ لَهُ عَزْمًا، وأن كل واحد منهما كفي به نكالا لَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَدَّكُرَ. وقيل الاول من الجنة إلى السماء الدنيا، والثاني منها إلى الارض وهو كما ترى. وجميعًا حال في اللفظ تأكيد في المعنى كأنه قيل: اهبطوا أنتم أجمعون ولذلك لا يستدعي اجتماعهم على الهبوط في زمان واحد كقولك:

جاءوا جميعًا فإمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

الشرط الثاني مع جوابه جواب الشرط الاول، وما مزيدة أكدت به إن ولذلك حسن تأكيد الفعل بالنون وإن لم يكن فيه معنى الطلب، والمعنى: إن يأتينكم مني هدى بإنزال أو إرسال، فمن تبعه منكم نجا وفاز، وإنما جرى بحرف الشك، وإتيان الهدى كائن لا محالة لأنه محتمل في نفسه غير واجب عقلاً، وكرر لفظ الهدى ولم يضر لأنه أراد بالثاني أعم من الاول، وهو ما أتى به الرسل واقتضاه العقل، أي: فمن تبع ما أتاه مراعيًا فيه ما يشهد به العقل فلا خوف عليهم فضلاً عن أن يحل بهم مكروه، ولا هم يفوت عنهم محبوب فيحزنوا عليه، فالخوف على المتوقع والحزن على الواقع نفى عنهم العقاب وأثبت لهم الثواب على أكد وجه وأبلغه. وقرء «هدى» على لغة هذيل و«لا خوف» بالفتح.

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے "مکررہ بالتاکید" ذکر فرمایا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حوا علیہ السلام اور شیطان وغیرہ کو جنت سے نکلنے کا حکم ایک مرتبہ پہلے مذکور ہو چکا ہے تو اسے دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

اس کے جواب میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی چند وجوہات بیان کی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ماقبل آیت میں جنت سے نکلنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس میں تاکید پیدا کرنے کے لئے اسے دوبارہ ذکر فرمادیا۔ یا ان دونوں کے مقصود میں اختلاف ہے اس طرح کہ اس سے ماقبل آیت میں جنت سے نکلنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ دنیا تمہارے لئے آزمائش کا گھر ہوگی اور تمہاری اولاد کے درمیان دشمنی کے آثار پیدا ہوں گے اور دنیا تمہارے لئے ہمیشگی کا گھر نہیں ہے۔ اور زیر بحث آیت میں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ انہیں احکام کا مکلف بنانے کے لئے اتاری جا رہا ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس تمہاری ہدایت کے لئے کتابیں نازل کی جائیں گی اور رسول بھیجے جائیں گے جس نے اس ہدایت کو قبول کر لیا وہ کامیاب ہوگا اور ابدی نعمتوں کا حق دار ہوگا اور جس نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا اور گمراہی کا راستہ اختیار کیا وہ ہلاک اور برباد ہو جائے گا اور عذابِ نار کا حق دار ہوگا۔

تیسری وجہ جو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو ذکر فرمائی وہ یہ ہے کہ ہبوط کا دوبارہ حکم اس لئے ذکر فرمایا کہ انہیں اس بات پر مطلع کیا جائے کہ جنت سے نکلنے کا خوف جو ان دونوں باتوں سے مقرر ہے کہ وہ آپس میں دشمن رہیں گے اور زمین میں ہمیشہ نہیں رہیں گے اور دوسرا انہیں احکام کا مکلف بنایا جائے گا جو انہیں جزاء یا سزا تک پہنچائیں گے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کو بھی ذکر کیا جاتا تو اللہ کریم کے حکم کی مخالفت کرنے سے محتاط آدمی کو روکنے کے لئے کافی تھا، لیکن یہاں دونوں امروں کے ساتھ ہبوط کو مقرر کر کے ذکر کیا گیا ہے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام اس سے بچنے میں محتاط کیوں نہ ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے دانست حکم عدولی نہ ہوئی ہو بلکہ وہ بھول گئے تھے۔ اور اس حکم عدولی میں ان کے عزم کا دخل نہیں تھا اور اس بات پر بھی تشبیہ کرنا مقصود تھا کہ ان دونوں مذکورہ باتوں میں سے ہر ایک عبرت ضاصل کرنے کے لئے کافی ہے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے کیوں نصیحت حاصل نہ کی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ پہلی دفعہ جو حکم دیا گیا ہے وہ جنت سے آسمان دنیا کی طرف نکلنے کی کا حکم تھا اور دوسرے حکم میں آسمان سے زمین کی طرف نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک قول ضعیف ہے کیونکہ پہلے ہبوط کے ساتھ "استقرار فی الارض" کا ذکر ہے اور دوسرے ہبوط میں منھا کی حاضیر ہے جس کا مرجع جنت ہے اس لئے یہ قول ضعیف ہے۔

"جمیعاً" یہ لفظ حال ہے اور معنی تاکید ہے گویا اللہ کریم نے یوں ارشاد فرمایا

اهبطوا انتم اجمعون

کہ تم سارے کے سارے نکل جاؤ لیکن یہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ وہ سارے کے سارے ایک ہی زمانے میں اکٹھے جنت سے نکل جائیں بلکہ ان کے خروج کے اوقات مختلف تھے جس طرح پر یہ قول "جاؤ اجمعاً" کہ وہ سارے آئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اکٹھے آئے۔

اس جملہ میں دو فعل شرط ہیں تو ان کا جواب کیا ہوگا۔ دوسری شرط،

فمن تبع ہدای

یہ اپنے جواز شرط کے ساتھ مل کر پہلی شرط،

فاما یا تینکم منی ہدی

کا جواب شرط ہے اور "اما" اصل میں "ان ما" تھا۔ ان حرف شرط اور مازائدہ ہے جو ان کے معنی میں تاکید پیدا کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے اس لئے اس کے فعل کی نون تاکید کے ساتھ تاکید لانا جائز ہے۔ حالانکہ فعل کے تاکید نون کے ساتھ اس وقت لگائی جاتی ہے جب کہ اس میں طلب کے معنی پائے جائیں کیونکہ یہ تاکید کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے اس کو قسم کے قائم مقام رکھتے ہوئے اس کے آخر میں نون تاکید لگا دیا ہے، تو معنی یہ ہوگا کہ اگر میری طرف سے رسول بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے ہدایت آجائے تو تم میں سے جو اس کی اتباع کرے گا وہ نجات پائے گا اور کامیاب ہوگا اس مقام پر "ان حرف شرط ذکر کیا گیا ہے جو متکلم کے شک کو ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ کریم کی طرف سے ہدایت کا آنا ابدی امر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ عقلی طور پر بذات خود ہدایت کے آنے میں احتمال ہے کیونکہ وہ اللہ کریم پر واجب نہیں۔ اور لفظ ہدایت کو دوبارہ ذکر فرمایا اس کی طرف ضمیر نہیں لوائی۔ حالانکہ یہاں کلام کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں ضمیر لوائی جاتی اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مقام پر جس ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ پہلی ہدایت سے عام ہے۔ خواہ وہ کتابیں نازل فرما کر اور رسول بھیج کر عطا کی جائے یا عقل سلیم عطا کر دی جائے اور پہلی ہدایت سے مراد شرعی ہدایت یعنی کتاب و رسول بھیجنا اور دوسری سے شرعی اور عقلی دونوں مراد ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ جس نے اس کی اتباع کی جو ہدایت اللہ کریم نے اسے عطا فرمائی ہے اس میں اس بات کی رعایت کی جس کی عقل شہادت دیتی ہے تو انہیں نہ تو آخرت میں نیکیوں کے ضائع ہونے کا خوف ہوگا اور نہ ہی ان کی کوئی محبوب چیز ان سے فوت ہوگی جس پر وہ خوردہ ہوں گے کیونکہ خوف کا لفظ ایسے نقصان کے لئے استعمال ہوتا ہے جو مستقبل میں انسان کو پہنچنے والا ہو اور حزن و پریشانی اس نقصان پر ہوتی ہے جو اس سے پہلے ہو چکا ہو تو گو یا اللہ کریم نے ہدایت قبول کرنے والوں سے آخرت کے عذاب کی نفی فرمادی اور مؤکد اور مبلغ طریقہ پر ان کے سابقہ نیک اعمال پر ثواب عطا کرنے کی خوشخبری سنائی۔

لغت بنی ہذیل پر ہذی کو ہذی کر کے پڑھا گیا ہے یعنی ہدی کی یا کو مشدد پڑھا گیا ہے۔ اور لا خوف کے فاء کو مفتوح

پڑھا گیا ہے۔

جمع کا معنی:

(جمع مع الجمع) (To Add)

کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ملا دینا۔ محاورہ ہے: جَمَعْتُهُ فَاجْتَمَعَ چنانچہ وہ اکٹھا ہو گیا۔ قرآن میں ہے۔

"وَجَمَعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ" (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 9)

اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔ (مال) جمع کیا اور بند رکھا۔

"يَجْمَعُ مَالًا وَعَدَدَةً" (سورۃ الہمزۃ آیت نمبر 2)

مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔

تحقیق لفظ تبع:

(ت ب ع) تبعہ واتبعہ (Follow)

کے معنی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں یہ کبھی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 38)

تو جو میری ہدایت کا پیرو ہو اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم۔

"قَالَ يَا قَوْمِ اَتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ اَتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا" (سورۃ قیاس آیت نمبر 20-21)

کہنے لگا کہ اے میری قوم پیروں کے پیچھے چلو ایسے کے جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔

"فَمَنْ اَتَّبَعَ هُدَايَ" (سورۃ ظہ آیت نمبر 123)

تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔

"اَتَّبِعُوا مَا اُنزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 3)

اے لوگو اس پر چلو جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اُترا۔

"قَالُوا اَتُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَزْدُ ذُلُونًا" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 111)

بولے کیا ہم تم پر ایمان لے آئیں اور تمہارے ساتھ کہنے ہوئے ہیں۔

"وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي" (سورۃ یوسف آیت نمبر 38)

اور اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلتا ہوں۔

"ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيحَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 18)

پھر ہم نے اس کام کے عمدہ راستہ پر تمہیں کیا تو اسی راہ چلو اور نادانوں کی خواہشوں کا ساتھ نہ دو۔

"وَاتَّبِعُوا مَا تَشَاءُوا الشَّيَاطِينُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 102)

اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے۔

خوف کی تعریف اور اس کا استعمال:

(خوف) الخوف (س)

کے معنی ہیں قرآن دشواری سے کسی آنے والے کا خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ کالفظ قرآن دشواری بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد اسن آتی ہے۔ اور یہ ابورد نیوی اور آخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے: قرآن میں ہے:

"وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 57)

اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

حزن کی تعریف:

(حزن) الحزن والحزن (Worry, Uncomfortableness)

کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بے قراری سے طبیعت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اسے بھی حزن یا حزن کہا جاتا ہے اس کی ضد فوج ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنی معتبر ہوتے ہیں اس لئے غم زدہ ہونے کے لئے خشونت بصرہ بھی کہا جاتا ہے حزن (س) غمزدہ ہونا ممکن کرنا۔ قرآن میں ہے:

"لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ" (سورۃ قال عمران آیت نمبر 153)

اور معافی اس لئے سنائی کہ جو ہاتھ سے گیا۔

نوٹ: اتنی اور ہدایت کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 39]

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (39)

"اور وہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا۔"

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ عطف علی فَمَنْ تَبِعَ

إِلَىٰ آخِرَةِ قَسِيمٍ لَهُ كَأَنَّهُ قَالَ: وَمَنْ لَمْ يَتَّبِعْ بَلْ كَفَرُوا بِاللَّهِ، وَكَذَّبُوا بِآيَاتِهِ، أَوْ كَفَرُوا

بالآیات جنائاً، و کذبوا بها لساناً فيكون الفعلان متوجهين إلى الجار والمجرور، والآية في الاصل العلامة الظاهرة، ويقال للمصنوعات من حيث إنها تدل على وجود الصانع وعلمه وقدرته، ولكل طائفة من كلمات القرآن المتميزة عن غيرها بفصل، واشتقاقها من أي لأنها تبين أي من أي أو من أي إلى، وأصلها أية أو أوية كتمررة، فأبدلت عينها ألفاً على غير قياس، أو أيية، أو أوية كرمكة فأعلت، أو آئية كقائلة فحذفت الهزة تخفيفاً، والمراد بآياتنا الآيات المنزلة، أو ما يعبها والمعقولة.

ترجمہ:

اس مذکورہ بالا آیت کا عطف "فمن تبع... الخ" پر ہے اور یہ اس ما قبل آیت کا تقسیم ہے یعنی اس کی ضد ہے گویا اللہ کریم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ جس نے اس ہدایت کی اتباع نہ کی بلکہ اس نے اللہ کریم کے ساتھ کفر کیا اور اس کی آیات کو جھٹلایا تو وہی دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے یا اس نے دل کے ساتھ آیات کا انکار کیا، اور زبان کے ساتھ اس کی تکذیب کی اس آیت میں دو فعل ہیں اور دونوں "بایتنا" میں عمل کا تقاضا کرتے ہیں اور اس میں بصریوں اور کوئیوں کا اختلاف ہے کہ پہلے فعل کو عمل دیا جائے یا دوسرے کو۔ بصریوں کے نزدیک دوسرے فعل کو عمل دینا مختار ہے اس لئے وہ پہلے فعل کا معمول محذوف تصور کرتے ہیں لہذا تقدیر عبارت یوں ہوگی،

والذین کفروا باللہ و کذبوا بآیتنا

اور کوئیوں کے نزدیک پہلے فعل کو عمل دینا مختار ہے اور وہ دوسرے فعل کا معمول محذوف تصور کرتے ہیں لہذا ان کے نزدیک تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہوگی۔

کفروا بالآیات جنائاً و کذبوا بها لساناً

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے

فيكون فعلان متوجهين إلى الجار والمجرور

کہہ کر اسی اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "آیات" جمع ہے اس کی مفرد آیت ہے جس کا معنی ظاہری نشانی ہے۔ اور مصنوعات کو بھی آیات کہا جاتا ہے کیونکہ وہی صانع کے وجود، اس کے علم اور اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہے۔

قرآن پا کے الفاظ کا وہ حصہ جس کو دوسرے حصہ سے وقف کے ساتھ الگ کر دیا جائے اس کو بھی آیت کہتے ہیں۔ اور یہ "ای" بمعنی جدا ہونا سے مشتق ہے یا "اوی ایہ" سے مشتق ہے جس کا معنی پناہ لینا ہے اور آیت اصل میں اییہ یا اویہ تھا، عین کلمہ کو خلاف قیاس الف سے بدل دیا۔ اور یا یہ آیت، فاعل کے وزن پر ہے، تخفیفاً ہمزہ مکسورہ کو حذف کر دیا گیا اور یہاں آیات سے مراد وہ تمام آیات ہیں جو نازل کی گئیں اور یا آیات منزلہ اور آیات منقولہ تمام مراد ہیں۔

متن:

وقد تمسكت الحشوية بهذه القصة على عدم عصبة الانبياء عليهم الصلاة والسلام من وجوه:

الاول: أن آدم صلوات الله عليه كان نبياً، وارتكب المنهي عنه والهرتكب له عاص. والثاني: أنه جعل بارتكابه من الظالمين والظالم ملعون لقوله تعالى: **الْأَلْعَنَةُ اللَّهُ عَلَى الظَّالِمِينَ.**

والثالث: أنه تعالى أسند إليه العصيان، فقال **وَعَضَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى.** والرابع: أنه تعالى لقنه التوبة، وهي الرجوع عن الذنب والندم عليه. والخامس: اعترافه بأنه خاسر لولا مغفرة الله تعالى إياه بقوله: **وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ** والخاسر من يكون ذا كبيرة. والسادس: أنه لو لم يذنب لم يجر عليه ما جرى. والجواب من وجوه.

الاول: أنه لم يكن نبياً حينئذ، والمدعى مطالب بالبيان. والثاني: أن النهي للتنزيه، وإنما سمي ظالماً وخاسراً لأنه ظلم نفسه وخسر حظه بترك الاولى له. وأما إسناد الغي والعصيان إليه، فسياق الجواب عنه في موضعه إن شاء الله تعالى. وإنما أمر بالتوبة تلافياً لما فات عنه، وجرى عليه ما جرى معاتبته له على ترك الاولى، ووفاء بما قاله للملائكة قبل خلقه.

والثالث: أنه فعله ناسياً لقوله سبحانه وتعالى: **فَنَسِيتُ وَلَمْ نُحَدِّثْ لَهُ عَزْماً** ولكنه عوتب بترك التحفظ عن أسباب النسيان، ولعله وإن حط عن الامة لم يحط عن الانبياء لعظم قدرهم كما

قال عليه الصلاة والسلام أشد الناس بلاء الانبياء، ثم الاولياء، ثم الامثل فالامثل

أو أدى فعله إلى ما جرى عليه على طريق السببية المقدرة دون المؤاخذة على تناوله كتناول السم على الجاهل بشأنه.

لا يقال إنه باطل لقوله تعالى: **مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا، وَقَاتَمَهُمَا الْآيَتِينَ**، لأنه ليس فيها

ما يدل على أن تناوله حين ما قال له إبليس، فلعل مقاله أورت فيه ميلاً طبيعياً، ثم إنه كف نفسه عنه مراعاة لحكم الله تعالى إلى أن نسي ذلك، وزال المانع فحمله الطبع عليه.

والرابع: أنه عليه السلام أقدم عليه بسبب اجتهاد أخطأ فيه، فإنه ظن أن النهي للتنزيه، أو الإشارة إلى عين تلك الشجرة فتتناول من غيرها من نوعها وكان المراد بها الإشارة إلى النوع، كما

روى أنه عليه الصلاة والسلام أخذ حريراً وذهباً بيده وقال هذان حرام على ذكور أمتي حل لإناهما

وإنما جرى عليه ما جرى تعظيماً لشأن الخطيئة ليجتنبها أولاده.

وفيها دلالة على أن الجنة مخلوقة وأنها في جهة عالية، وأن التوبة مقبولة، وأن متبع الهدى مأمون العاقبة، وأن عذاب النار دائم، وأن الكافر فيه مخلد، وأن غيره لا يخلد فيه بمفهوم قوله تعالى: هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ.

ترجمہ:

فرقہ خشویہ نے اس قصہ حضرت آدم وحواء علیہما السلام اور ان کے خروج من الجنۃ سے عدم عصمت انبیاء پر مختلف طریقوں سے استدلال کیا ہے۔ یاد رہے کہ فرقہ خشویہ کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام کا عذاب تکاب کبیرہ کو جائز سمجھتا ہے۔ ان کا پہلا استدلال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور انہوں نے منیٰ عنہ کا ارتکاب کیا تھا اور منیٰ عنہ کا مرتکب عاصی ہے۔

دوسرا استدلال یہ ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے ظالمین میں سے شمار کیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) اور ظالم پر لعنت آئی ہے، اللہ کریم کا ارشاد،

"أَنْ لَّعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ" (سورۃ اعراف آیت نمبر 144)

کہ اللہ کی لعنت ظالموں پر۔

اور ظاہر ہے کہ لعنت صاحب کبیرہ پر ہی ہو سکتی ہے کیونکہ صاحب صغیرہ کا تو کفارہ سہیات ہو جاتا ہے۔

تیسرا استدلال یہ ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی جانب عصیان اور غی کی نسبت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے،

"وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى" (سورۃ طہ آیت نمبر 121)

اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی۔

چوتھا استدلال یہ ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کی تلقین کی اور توبہ نام ہے گناہ سے رجوع ہونے اور اس پر نادم ہونے کا، اور توبہ کبیرہ سے ہی ہوا کرتی ہے۔

پانچواں استدلال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ کہ کر،

"وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ" (سورۃ اعراف آیت نمبر 23)

تو اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والوں میں ہوئے۔

یعنی اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ خسارے میں ہیں سوائے اس کے کہ اللہ کریم نے ان کی مغفرت فرمادے اور خاسر

وہی ہو سکتا ہے جو مرتکب کبیرہ ہو۔

چھٹا استدلال یہ ہے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے گناہ نہ کیا ہوتا تو ان کو وہ سب کچھ پیش ہی نہ آتا جو پیش آیا کیونکہ

صغیرہ پر تو مؤاخذہ ہوتا ہی نہیں، اور اگر ہوتا بھی ہے تو اتنا سخت و شدید نہیں ہوتا۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان اعتراضات کے مختلف جوابات ارشاد فرمائے ہیں، پہلا جواب یہ ہے جس کو خلاصہ میں

ہم نے پہلے رکھا ہے یعنی پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جس وقت ذنب کا صدور ہوا تھا اس وقت تک ان کو

نبوت نہیں ملی تھی، پس نبی سے صدور ذنب ثابت نہیں ہوتا، اور جو اس کے دعوے دار ہیں کہ نبوت کے بعد صدور ہوا تھا اس سے

ہمارا مطالبہ دلیل کا ہے وہ اپنی دلیل پیش کرے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نہی عن الشجرۃ تنزیہی طور پر تھی اور ان کو ظالم اور خاسر اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے ترک اولیٰ

اور ترک افضل کی وجہ سے اپنا حصہ گھٹا دیا اور اپنا نقصان کیا اور ہر ظالم ملعون نہیں۔

ظلم کی دو قسمیں ہیں:

ظلم قلیل اور ظلم کثیر۔

اسی طرح لعن کے معنی ہیں اللہ کریم کی رحمت سے دور ہونا اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ رحمت کاملہ سے دور ہونا یا مطلق

رحمت سے دور ہونا۔ ملعون وہ ہے جو اللہ کریم کی مطلق رحمت سے دور ہو اور یہ صورت ظلم کبیرہ اور ظلم عظیم کی صورت میں ہوتی

ہے نہ کی معمولی ظلم کی صورت میں اور غی اور عصیان کی نسبت جو حضرت آدم علیہ السلام کی جانب کی گئی ہے تو اس کا جواب انشاء

اللہ وہاں دیا جائے گا جہاں یہ آیات وارد ہوئیں۔ (یعنی سورۃ طہ میں۔)

اور توبہ کا حکم تو معمولی لغزش کی تلافی کے لئے بھی دیا جاسکتا ہے یعنی ترک اولیٰ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا جو نقص

حظ ہو گیا تھا اور درجہ میں معمولی سانزول ہو گیا تھا اس کی تلافی اور مقام رفیع کی بازیابی کے لئے توبہ کا حکم دیا گیا تھا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ تناول شجرہ بھول کر اور نسیاناً ہوا تھا کیونکہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا ہے،

"وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْدَأَ لَهُ عَزْمًا" (سورۃ طہ آیت نمبر 115)

اور بیشک ہم نے آدم کو اس سے پہلے ایک تاکیدی حکم دیا تھا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس کا قصد نہ پایا۔ اب رہی یہ بات کہ اس پر ناراضگی کیوں ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ناراضگی ترک تحفظ پر ہوئی ہے نہ کہ نسیان پر، یعنی ناراضگی اس پر نہیں ہوئی کہ نسیان کیوں ہوا آدم بھول گئے؟ بلکہ اس پر ہوئی کہ نسیان کے اسباب کیوں پیدا کئے، ان اسباب کے سلسلے میں متیقظ کیوں نہ رہے۔

یہاں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نسیان اور خطا پر تو کوئی مواخذہ نہ ہونے کی نص صریح موجود ہے۔ پس اسباب نسیان پر مواخذہ نہ ہونے کی نص صریح موجود ہے پس اسباب نسیان پر مواخذہ کرنا ہے۔ اس شبہ کا جواب امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "لعلہ" سے دیا ہے یعنی شاید ایسا ہے کہ نسیان و خطا کا مواخذہ امت کے حق میں تو مرفوع ہے یعنی امت سے اٹھالیا گیا ہے، امت کو بھول چوک پر نہیں پکڑا جائے گا لیکن انبیاء کرام عظیم القدر ہیں ان کی شان بلند و بالا ہے، وہ ان چیزوں کے بارے میں بھی مسؤل ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے،

أشد الناس بلاء الانبياء، ثم الاولياء، ثم الامثل فالامثل

سب سے زیادہ شدید مصائب انبیاء کرام علیہم السلام پر آئے پھر اولیاء اللہ پر پھر جو جتنا اللہ کریم کافرمانبردار ہے اسی کے مطابق مصائب کا اس پر نزول ہوتا ہے۔

او ادى فعله الى ما جزى عليه

یہ ہبوط آدم علیہ السلام کے استدلال کا ایک اور جواب ہے، حاصل یہ ہے کہ ہبوط آدم علیہ السلام سزا اور عتاب کے طور پر نہیں تھا بلکہ سبب عادی اور مسبب عادی کے طور پر تھا یعنی جس طرح بھولے سے آگ میں ہاتھ ڈالنے پر ہاتھ جل جاتا ہے یا نادانی اور لاعلمی میں زہر کھانے والے ہلاکت واقع ہو جاتی ہے اور یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہاتھ ڈالنے والے پر اللہ کریم کا عقاب ہو یا زہر کھانے والے کو اللہ کریم نے سزا دی بلکہ یہی کہا جاتا ہے عادتاً ہاتھ کا آگ میں ڈال دینا جل جانے کا سبب ہے جب سبب عادی کو اختیار کیا جائے گا تو اس پر مسبب کا ترتب ہو جائے گا۔ اسی طرح اکل شجرہ سبب تھا اور ہبوط اس کا مسبب تھا گویا اللہ کریم نے اس شجرہ کی طبیعت و فطرت میں یہ سبب پوشیدہ فرمادی تھی کہ اس کو جو کھائے گا وہ خود بخود نیچے اتر جائے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے نسیان ہوا تھا، امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اس جواب پر حشو یہ فرقہ کی طرف سے اعتراض کیا جا رہا ہے کہ نسیان کا قول باطل ہے حضرت آدم علیہ السلام کا یہ عمل نسیان نہیں تھا، عمد تھا کیونکہ اللہ کریم کا ارشاد ہے،

مَا نَهَكُمَا رَبُّكُمَا عَنِ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَتَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ

(سورۃ اعراف آیت نمبر 19)

اور بولا تمہیں تمہارے رب نے اس پیڑ سے اسی لئے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے والے۔ اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو نبی کی یاد دہانی کی گئی تھی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَقَاتَمَهُمَا آيَاتِي لَكُمْ آلَيْنِ التَّصْحِيحِينَ (سورة اعراف آیت نمبر 21)

اور ان سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

یہ قسم کھانا بتا رہا ہے کہ حضرت آدم وحوٰ علیہما السلام اکل شجرہ سے انکار کر رہے تھے اور مخالفت کو یاد کرتے ہوئے ابلیس کو غیر معتبر سمجھ رہے تھے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شبہ یہاں وارد نہیں ہو سکتا کیونکہ پیش کردہ دونوں آیتوں میں اس کی صریح دلالت نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تناول شجرہ اسی وقت ہوا تھا جس وقت ابلیس نے ان سے یہ سب کچھ کہا تھا اس لئے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابلیس کے اس قول نے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں ایک طبعی میلان پیدا کر دیا تھا پھر انہوں نے اللہ کریم کے حکم کا پاس دلچسپی رکھتے ہوئے خود کو روک لیا یہاں تک کہ اللہ کریم کے حکم کو بھول گئے اور جو رکاوٹ تھی یعنی ذکر نبی وہ دور ہو گئی اور پھر طبیعت نے اسی پر آمادہ کر دیا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ کہ حضرت آدم علیہ السلام اکل من الشجرہ کا اقدام ایک اجتہاد کی وجہ سے کیا تھا جس میں ان سے خطا ہو گئی واضح رہے کہ یہ جواب ان حضرات کے نزدیک درست ہو سکتا ہے جن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہ السلام سے اجتہادی خطا ہو سکتی ہے لیکن وہ اس پر برقرار نہیں رہتے بلکہ اللہ کریم کی طرف سے فوراً ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ اجتہادی خطا کی صورت یہ ہوتی کہ حضرت آدم علیہ السلام یہی سمجھے کہ نئی تنزیہی ہے تحریمی نہیں۔ یا ارشاد اس معین و مشخص درخت کی جانب مقصود ہے یہ سمجھ کر اسی نوع کے دوسرے درخت سے کھا لیا، حالانکہ مقصود نبی اسی نوع کی جانب اشارہ کرنا تھا اور اس نوع کو ممنوع قرار دینا تھا جیسا کہ روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی آل نے ایک گلزار یشم اور ایک گلزار سونے کا اپنے دست مبارک میں لیا اور فرمایا کہ یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور امت کی عورتوں کے لئے حلال ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں مقصود اس خاص شکل کے گلزارے کو حلال یا حرام کرنا نہیں ہے بلکہ اس نوع کی تحریم مقصود ہے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے اجتہادی خطا کے نتیجے میں یہ ہوا تھا تو پھر یہ تمام سلوک یعنی اخراج من الجنة ان کے ساتھ کیوں کیا گیا؟ مجتہد مخطی تو معذور سمجھا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خطا کی خوفناکی کو ظاہر کرنے کے لئے ایسا کیا گیا تاکہ اولاد آدم کو تنبیہ ہو جائے، اور وہ اس سے اجتناب کرے۔

وفيها دلالة على أن الجنة مخلوقة... الخ

یعنی آیات مذکورہ جن کا سلسلہ "وقلنا یا آدم اسکن" سے شروع ہو کر "خالدون" تک ہے ان میں اس مسئلہ پر دلالت ہوتی ہے کہ جنت پیدا کی جا چکی ہے اور یہ کہ جنت اوپر کی سمت میں واقع ہے اور یہ کہ توبہ قبول کی جاتی ہے اور یہ کہ ہدایت کی پیروی کرنے والا مومن العاقبت ہے، اور یہ کہ عذاب ناردائمی ہو گا اور یہ کہ کافر اس میں ہمیشہ رہے گا، کیونکہ خلود دوام کا نام ہے، پس اگر سلسلہ عذاب منقطع ہو گیا تو خلود ہمکنی نہیں بن سکتا اور آیات میں اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے غیر کافر دوزخ میں

ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا اس لئے کہ قول باری تعالیٰ:

"ہم فیہا خالدون"

میں صاحب کشف علامہ زمخشری کے قول کے مطابق قعر ہے اور قعر کا مفہوم موافق یہ ہے کہ "خلود فی النار" کفار کے ساتھ مخصوص ہے اب اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ غیر کافر خلود کے ساتھ متصف نہیں ہے۔

متن:

واعلم أنه سبحانه وتعالى لما ذكر دلائل التوحيد والنبوة والمعاد، وعقبها تعداد النعم العامة تقرير ألها وتأكيدها، فإنها من حيث إنها حوادث محكمة تدل على محدث حكيم له الخلق والامر وحده لا شريك له، ومن حيث إن الإخبار بها على ما هو مثبت في الكتب السابقة ممن لم يتعلمها، ولم يمارس شيئاً منها إخبار بالغيب معجز يدل على نبوة المخبر عنها، ومن حيث اشتغالها على خلق الإنسان وأصوله وما هو أعظم من ذلك، تدل على أنه قادر على الإعادة كما كان قادراً على الإبداء، خاطب أهل العلم والكتاب منهم، وأمرهم أن يذكروا نعم الله تعالى عليهم، ويوفوا بعهده في اتباع الحق واقتفاء الحجج ليكونوا أول من آمن بمحمد صلى الله عليه وسلم وما أنزل عليه فقال.

ترجمہ:

اور واضح ہونا چاہئے کہ آئندہ آیات یعنی،

"یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی الّتی انعمت علیکم"

کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ اللہ کریم نے ماقبل میں دلائل توحید، دلائل نبوت اور دلائل معاد کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد اپنے عام احسانات کا ذکر فرمایا تاکہ مذکورہ مضامین اور زیادہ پختگی کے ساتھ ثابت ہو جائیں، اس لئے کہ یہ احسانات اس حیثیت سے کہ وہ حکیمانی واقعات ہیں جو روز مزہ کی زندگی میں سامنے آتے ہیں اور ان میں بے شمار حکمتوں کا اہل بصیرت کو ادراک ہوتا ہے یہ واقعات باحکمت خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک ہستی موجود ہے جو ان کو وجود عطا کرنے والی ہے اور جو حکمت کا سرچشمہ ہے اور جس سے تنہا کے لئے ہی خلق اور امر ثابت ہے۔ ان دونوں اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں اور ان واقعات زندگی کی ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ ان کو پیش کرنے والا، ان کی خبر دینے والا اور کتب سابقہ میں جس طرح درج ہے، ٹھیک اسی طرح خبر دینے والا ان میں سے ہے جس نے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب نہ پڑھی، نہ کسی سے سیکھی اور نہ سنی، اس طرح کا اخبار، اخبار بالغیب ہے اور معجزہ ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خبریں دینے والا نبی برحق ہے، اور ایک

حیثیت یہ بھی ہے کہ یہ حوادث انسان کی تخلیق، اصول تخلیق اور اس سے بڑی اور عظیم چیزوں پر مشتمل ہے، اس بناء پر یہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ہستی جو ان حوادث کی ایجاد پر قادر تھی ان کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔

ان دلائلوں کو سامنے رکھ کر اللہ کریم نے اہل علم اور اہل کتاب کو مخاطب فرمایا اور ان کو اس کا حکم دیا کہ وہ اللہ کریم کے احسانات کو یاد کریں اور اتباع حق اور اتباع دلائل کے سلسلے میں کئے ہوئے وعدوں کو پورا کریں، تاکہ ان لوگوں میں سب سے سابق ہو جائیں جو حضرت محمد ﷺ پر اور اس کتاب پر ایمان لائے جو آپ ﷺ پر اتاری گئی، چنانچہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا:

یٰۤاِیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰتُوا الْاٰیٰتِیْنَ الّٰحِیٰۃِ

لفظ آیت کا معنی:

الایة (Verse)

اسی کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں دراصل آیت ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے گو اس دوسری (اصل) شے کا بذاتہ اس نے ادراک نہ کیا ہو مگر یقین کر لیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کر لیا کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے اور لزوم کا یہ سلسلہ محسوسات اور معقولات دونوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں راستے پر فلاں قسم کے نشانات ہیں اور پھر وہ نشان بھی مل جائے تو اسے یقین ہو جائیگا کہ اس نے راستہ پالیا ہے۔ اسی طرح کسی مصنوع کے علم سے لامحالہ اس کے صانع کا علم ہو جاتا ہے۔

لفظ صاحب کی تحقیق و معنی:

(ص ح ب) صاحب (Companion)

کے معنی ہیں ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔ خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے یا مکان یا زمان کے اور عام اس سے کہ وہ مصاحبت بدنی ہو جو کہ اصل اور اکثر ہے یا بذریعہ عنایت اور ہمت کے ہو جس کے متعلق کہ شاعر نے کہا ہے:

اگر تو میری نظروں سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں ہے۔

اور حذف میں صاحب صرف اسی کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر ساتھ رہے اور کبھی کسی چیز کے مالک کو بھی ہو صاحبہ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح اس کو بھی جو کسی چیز میں تصرف کا مالک ہو۔ قرآن میں ہے:

"اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهِ لَا تُخَازِنِیْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 40)

جب اپنے یار سے فرماتے تھے تم نہ کھا۔

"قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ یُحَاوِرُهٗ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 34)

تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا۔

"أَمْ حَسِبْتُمْ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيبِ" (سورۃ الکہف آیت نمبر ۹)
کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور لوح والے۔

"وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ" (سورۃ الحج آیت نمبر 44)
اور مدین کے رہنے والے بھی۔

"أَصْحَابِ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 82)
وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔

"وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْخُوَبِ" (سورۃ القلم آیت نمبر 48)
اور اس مچھلی والے کی طرح نہ ہونا۔

اور آیت: "مِنْ أَصْحَابِ الشَّعْبِ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 6)
(تاکہ وہ) دوزخ والوں میں ہوں۔

اور آیت کریمہ: "وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً" (سورۃ المدثر آیت نمبر 31)
اور ہم نے دوزخ کے داروغہ فرشتے بنائے ہیں۔

میں اصحاب النار سے دوزخی مراد نہیں ہیں بلکہ دوزخ کے داروغے مراد ہیں۔ پھر صاحب کا لفظ کبھی ان کی طرف مضاف ہو تو ہے جو کسی کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جیسے صاحب الجیش (فوج کا حاکم اور کبھی حاکم کی طرف جیسے صاحب الاسیر (بادشاہ کا وزیر) المصاحبۃ والاصطحاب میں بنسبت لفظ الاجتماع کے مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ مصاحبۃ کا لفظ عرصہ دراز تک ساتھ رہنے کو مقتضی ہے اور لفظ اجتماع میں یہ شرط نہیں ہے لہذا اصطحاب کے موقعہ پر اجتماع کا لفظ تو بول سکتے ہیں مگر اجتماع کی جگہ پر ہر مقام میں اصطحاب کا لفظ نہیں بول سکتے اور آیت کریمہ:

"ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ" (سورۃ سبأ آیت نمبر 46)
پھر سوچو کہ تمہارے ان صاحب میں جنون کی کوئی بات نہیں۔

تمہارے رفیق کو سودا نہیں میں نبی کریم ﷺ کو صاحبکم کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ زندگی بسر کی ہے ان کا تجربہ کر چکے ہو اور ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہو چکے ہو پھر بتاؤ کہ ان میں کوئی دماغی خلل یا ذیوانگی نہ جاتی ہے یہی معنی آیت،

"وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 22)
اور تمہارے صاحب مجنون نہیں۔

کے ہیں۔ الاصحاب للشنی کے معنی ہیں وہ فرمانبردار ہو گیا اصل میں اس کے معنی کسی کا مصاحب بن کر اس کے ساتھ

رہنے کے ہیں۔ چنانچہ اصحاب فلان اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا پیٹا بڑا ہو کر اس کے ساتھ رہنے لگے۔ اور اصحاب فلان فلان کے معنی ہیں وہ اس کا ساتھی بنا دیا گیا۔

قرآن میں ہے: "وَلَا هُمْ مِمَّا يُصْحَبُونَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 43)

اور نہ ہم سے پناہ ہی دیئے جائیں گے۔

یعنی ہماری طرف سے ان پر سبکدوشی کی کٹکٹائی وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی چیزوں سے اولیاء اللہ کی مدد کی جاتی ہے۔ ادیم مصعب: کچا چڑھ جس سے بال نہ اتارے گئے ہوں۔

نار کی تعریف:

(نور) نار (Fire, flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 71)

بھلا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔

خلد کیا ہے؟:

(خلد) الخلود (Eternity)

کے معنی کسی چیز کے فساد کے غرض سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں

دراز تک تغیر و فساد پیدا نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

"لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 129)

شاید تم ہمیشہ رہو گے۔ جنت میں خلود کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان

میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں ہے:

"أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 82)

وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

شعر:

امام اہلسنت، مجدد دین و ملت الحاج امام احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں:

خلد میں ہوگا ہمارا داخلہ اس شان سے یا رسول اللہ ﷺ کا نعرہ لگاتے جائیں گے

نوٹ: لفظ کفر اور کذب کی تحقیق ہو چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 40]

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (40)

”اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا، اور خاص میرا ہی ڈر رکھو۔“

متن:

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ أَيُّ أَوْلَادِ يَعْقُوبَ، وَالْإِبْنِ مِنَ الْبِنَاءِ لِأَنَّهُ مَبْنِي أَبِيهِ، وَلِذَلِكَ يَنْسَبُ الْمَصْنُوعُ إِلَى صَانِعِهِ فَيُقَالُ: أَبُو الْحَرْبِ، وَبِنْتُ الْفِكْرِ. وَإِسْرَائِيلُ لِقَبِّ يَعْقُوبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَمَعْنَاهُ بِالْعِبْرِيَّةِ: صَفْوَةُ اللَّهِ، وَقِيلَ: عَبْدُ اللَّهِ وَقَرَأَ إِسْرَائِيلُ بِحَذْفِ الْيَاءِ وَإِسْرَائِيلُ بِحَذْفِهَا وَإِسْرَائِيلُ «بِقَلْبِ الْهَمْزَةِ يَاءً».

اَذْكُرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ أَيُّ بِالْتَفَكُرِ فِيهَا وَالْقِيَامُ بِشُكْرِهَا، وَتَقْيِيدُ النِّعْمَةِ بِهِمْ لِأَنَّ الْإِنْسَانَ غَيُورٌ حَسُودٌ بِالطَّبِيعِ، فَإِذَا نَظَرَ إِلَى مَا أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ مِنْ غَيْرَةِ حَمَلِهِ الْغَيْرَةِ وَالْحَسَدِ عَلَى الْكُفْرَانِ وَالسُّخْطِ، وَإِنْ نَظَرَ إِلَى مَا أَنْعَمَ اللَّهُ بِهِ عَلَيْهِ مِنْ حَمَلِهِ حُبِّ النِّعْمَةِ عَلَى الرِّضَى وَالشُّكْرِ. وَقِيلَ أَرَادَ بِهَا مَا أَنْعَمَ اللَّهُ بِهِ عَلَى آبَائِهِمْ مِنَ الْإِنجَاءِ مِنْ فِرْعَوْنَ وَالغُرْقِ وَمِنَ الْعَفْوِ عَنِ اتِّخَاذِ الْعَجْلِ، وَعَلَيْهِمْ مِنْ إِدْرَاكِ زَمَنِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَرَأَ اذْكُرُوا وَالْأَصْلُ اذْكُرُوا. وَنِعْمَتِي بِإِسْكَانِ الْيَاءِ وَقَفَاءً وَإِسْقَاطِهَا دَرَجاً هُوَ مَذْهَبٌ مِنْ لَا يَحْرُكُ الْيَاءَ الْبِكَسُورَ مَا قَبْلَهَا.

وَأَوْفُوا بِعَهْدِي بِالْإِيمَانِ وَالطَّاعَةِ.

أَوْفِ بِعَهْدِكُمْ بِحَسَنِ الْإِثَابَةِ وَالْعَهْدُ يُضَافُ إِلَى الْمَعَاهِدِ وَالْمَعَاهِدِ وَلَعَلَّ الْأَوَّلَ مُضَافٌ إِلَى الْفَاعِلِ وَالثَّانِي إِلَى الْمَفْعُولِ، فَإِنَّهُ تَعَالَى عَهْدَ إِلَيْهِمْ بِالْإِيمَانِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ بِنَصْبِ الدَّلَائِلِ وَإِنْزَالِ الْكُتُبِ، وَوَعْدِهِمْ بِالثَّوَابِ عَلَى حَسَنَاتِهِمْ، وَلِلْوَفَاءِ بِهَا

عَرَضٌ غَرِيضٌ فَأَوْلُ مَرَاتِبِ الْوَفَاءِ مَنَّا هُوَ الْإِتْيَانُ بِكَلِمَتِي الشَّهَادَةِ، وَمَنْ اللَّهُ تَعَالَى حَقَّنَ الدَّمَ وَالْمَالَ، وَأَخْرَجَنَا مِنَ الْإِسْتِغْرَاقِ فِي بَحْرِ التَّوْحِيدِ بِحَيْثُ يَغْفُلُ عَنِ نَفْسِهِ فَضْلاً عَنْ غَيْرِهِ، وَمَنْ اللَّهُ تَعَالَى الْفَوْزَ بِاللِّقَاءِ الدَّائِمِ. وَمَا رَوَى عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ

تعالیٰ عنہما: اوفوا بعهدی فی اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اوف بعهدکم فی رفع
الأصار والإغلال. وعن غیرہ اوفوا بأداء

الفرائض وترك الكبائر أوف بالمغفرة والثواب. أو أوفوا بالاستقامة على الطريق
المستقیم، أوف بالكرامة والنعيم المقيم، فبالنظر إلى الوسائط. وقيل كلاهما
مضاف إلى المفعول والمعنى: أوفوا بما عاهدتموني من الإيمان والتزام الطاعة، أوف
بما عاهدتكم من حسن الإثابة. وتفصيل العهدين في سورة المائدة في قوله تعالى:
وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَى قَوْلِهِ: وَلَا دُخْلَ لَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الأنهارُ. وقرأ أوف بالتشديد للبالغه.

وَإِيَّائِي فَآرْهُبُونِ فيما تأتون وتندون وخصوصًا في نقض العهد، وهو أكد في إفادة
التخصيص من إياك نعبد لها فيه مع التقديم من تكرير المفعول، والفاء الجزائية
الدالة على تضمين الكلام معنى الشرط كأنه قيل:

إن كنتم راهبين شيئًا فارهبون. والرهبة: خوف مع تحرز. والآية متضمنة للوعد
والوعد دالة على وجوب الشكر والوفاء بالعهد، وأن المؤمن ينبغي أن لا يخف أحدًا إلا
الله تعالى.

ترجمہ:

بنی اصل میں بنین ہے جو کہ ابن کی جمع ہے اور یہ مشتق ہے بناء سے، جس کا معنی بنیاد بنانا ہے۔ اور بیٹا چونکہ اپنے باپ کی
نسل کی بقاء کی بنیاد ہوتا ہے اس لئے اسے ابن کہتے ہیں اسی وجہ سے مصنوع کو صانع کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے
ہیں "ابن الحرث" کھیتی باڑی کا باپ اور "بنت الفکر" کسی کی سوچ کا نتیجہ۔

"اسرائیل" یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے اور یہ عبد اللہ اور صفوة اللہ کے معنی میں ہے۔ "اسر" بمعنی عبد اور "نیل" بمعنی
اللہ ہے مطلب اللہ کا بندہ۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور بنی اسرائیل سے مراد اولاد یعقوب ہے، اسرائیل کو
اسرائل، اسرال اور سرائیل بھی پڑھا گیا ہے۔

میرا انعام یاد کرو یعنی ان انعامات میں غور کرو اور ان کا شکر ادا کرو اور انعام کو خصوصی طور پر بنی اسرائیل کی جانب منسوب
کرنا اس وجہ سے ہے کہ انسان طبعی طور پر حاسد اور غیور ہے۔ تو اگرچہ اس کی توجہ ان انعامات کی طرف مبذول کرائی جائے جو
دوسروں پر ہوئے ہیں۔ تو اس کو غیرت اور حسد کفر و ناراضگی پر آمادہ کر سکتے ہیں لیکن جب اس کی توجہ ان انعامات کی جانب
ہوتی ہے جو خود اس پر ہوئے ہیں تو اس کو انعام کی محبت رہنا اور شکر پر آمادہ کرتی ہے۔ علماء نے کہا کہ انعامات سے مراد وہ

انعامات بھی ہیں جو ان کے آباؤ اجداد پر ہوئے ہیں۔ مثلاً فرعون سے نجات دینا، ڈوبنے سے بچا لینا اور بچھڑے کی پوجا سے درگزر کرنا۔ اور وہ انعامات بھی ہیں جو خود اس دور کے بنی اسرائیل پر ہوئے ہیں یعنی ان کا عہد نیت کو پالینا۔ اور ایک قرأت میں "اذکروا" ہے جس کی اصل باب افتعال ہے، افتعلوا کے وزن پر ہے نیز اس قرأت میں بصورت وصل "نعمتی" کی یاد کو ساکن کر کے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور جن کے نزدیک یاد ماقبل مکسور کو حرکت نہیں دی جاتی ان کا مذہب یہی ہے کہ ایسی یاد کو اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِي بِالْإِيمَانِ وَالطَّاعَةِ.

اور میرا عہد پورا کرو۔

میرا حکم اور وصیت جو ایمان کے بارے میں تھی تم اسے پورا کرو اور میں تمہارے ساتھ کیا ہوا عہد پورا کروں گا، یعنی حسن ثواب کا جو وعدہ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ اور عہد کی اضافت عہد کرنے والے کی جانب بھی ہوتی ہے، اور اس کی جانب بھی ہوتی ہے جس سے عہد کیا جاتا ہے اور غالباً اول یعنی "بعہدی" کا عہد مضاف الی الفاعل ہے اور ثانی یعنی "بعہدکم" کا عہد مضاف الی المفعول ہے۔ کیونکہ اللہ کریم نے ان سے ایمان اور عمل صالح کا حکم دیا تھا جس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ ایمان اور علم صالح پر دلائل قائم کر دیئے تھے اور کتابیں نازل کر دی گئی تھیں اور ان سے ان کی نیکیوں پر ثواب کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور دونوں وعدوں کو پورا کرنے کا میدان بہت وسیع ہے۔ چنانچہ انسانوں کی جانب سے عہد کو پورا کرنے کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ دونوں کلموں پر ایمان لائیں۔ اور اللہ کریم کی جانب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہماری جان و مال کی حفاظت فرمائے۔ اور ہماری جانب سے اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ ہم اللہ کریم کی توحید میں اتنا مستغرق ہو جائیں کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو جائیں۔ اور اللہ کریم کی طرف سے وفائے عہد کا آخری درجہ یہ ہے کہ اپنی دائمی ملاقات سے ہم کو سرفراز فرمائے۔ اور وہ جو روایت کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہ میرا وہ عہد پورا کرو جو تم سے میں نے اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں لیا تھا۔ اور میں وہ عہد پورا کروں گا جو میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا کہ تم سے بوجھ اور طوق اتار دیا جائے گا۔ اسی طرح وہ تفسیر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے اصحاب سے مروی ہے کہ اے بنی اسرائیل فرانس کو ادا کر کے اور کبیرہ گناہوں کو ترک کر کے میرا عہد پورا کرو۔ میں تمہاری مغفرت کر کے اور ثواب عطا کر کے تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں گا۔ نیز یہ کہ صراط مستقیم پر استقامت اختیار کر کے تم لوگ میرا عہد پورا کرو اور

میں تمہیں عزت، بزرگی اور بے شمار نعمتیں عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

یہ تمام تفسیریں درمیانی درجہ کی ہیں، انتہائی درجہ وہی ہے ہم نے بیان کر دیا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ دونوں جگہ لفظ عہد مفعول بہ کی جانب مضاف ہے، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم نے جس چیز کا مجھ سے عہد کیا تھا یعنی ایمان اور التزام۔ اطاعت کا، اس کو تم پورا کرو اور میں اچھی جزاء کا وعدہ پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہوا ہے۔ اور ان دونوں عہدوں کی تفصیل

اللہ کریم کے ارشاد،

وَلَقَدْ اخذ الله ميثاق بني اسرائيل

سے لے کر

وَأَدْخَلْتَكُمْ جِبَاتٍ

میں بیان ہوئی ہے۔

وَإِيَّايَ فَازْهَبُون

اور خاص میرا ہی ڈر رکھو،

یعنی جو کام کرتے ہو اور جو کام چھوڑتے ہو دونوں کے بارے میں مجھ ڈرو۔ تم پر لازم ہے کہ جن ادا امر کی بجا آوری کرو وہ صرف میرے ڈر کی وجہ سے ہو اور ترکِ نواہی کا سبب بھی میرا خوف ہی ہو، جو تمہارے لئے تازیانہ ہو۔ خاص طور پر میرے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو توڑتے وقت میری عظمت اور قہارت تمہارے ذہن میں ہو۔

خوف صرف اللہ کریم ہی کا ہو۔ اس تخصیصِ خوف کے معنی کا فائدہ دینے میں "ایای فارہبون" نسبت "ایک نعبد" کے زیادہ پر زور ہے۔ یعنی جس قدر پر زور تخصیص "ایای فارہبون" میں ہے اتنی پر زور "ایک نعبد" میں نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں تقدیم مفعول کے ساتھ تکرار مفعول بھی ہے۔ نیز فاء جزا ہے جو تعقیب و اشتراط کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ "ایای نعبد" میں مفعول بہ چونکہ مکرر نہیں اس لئے وہ جملہ واحد ہے اور "ایای فارہبون" میں بہ مکرر ہے اور فارہبون، ایای میں عامل نہیں ہے اس لئے ایای کا عامل مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی،

ایای ارہبوا فارہبون

اس تقدیر کے تحت ڈرنے کا حکم مکرر ہوا اور تعقیب کے ساتھ ہوا۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ مجھ سے ہر وقت ڈرتے رہو، یہ خشیت تمہارے اندر مسلسل باقی رہے۔ اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ تقدیر عبارت سے واضح ہو گیا کہ "وایای فارہبون" دو جملے ہیں۔

فارہبون کی فاء تعقیب اور شرط دونوں معانی پر دلالت کرتی ہے جس سے تفصیلی معنی یہ نکلتے ہیں "ان کنتم راہبین شیئاً فارہبون" یعنی تم کسی شے سے بھی خوف رکھتے ہو تو وہ صرف میرا خوف ہونا چاہئے نہ کہ کسی اور کا خوف۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ "رہبۃ" کے معنی اس خوف کے ہیں جس میں احتیاط و اجتناب بھی ہو۔

آیت کریمہ میں "اوف بعہدکم" وعدہ پر مشتمل ہے گویا یہ اعلان ہے کہ جو لوگ اپنے عہد کو پورا کریں گے ان کو بے شمار قسموں کے ثواب عطا کئے جائیں گے۔ نیز "اوفوا بعہدکم" امر کا صیغہ ہے یہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کریم کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور وعدہ پورا کرنا ضروری ہے۔

"وایات فارہبون" کی تخصیصات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مومن کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کریم کے سوا کسی سور چیز سے خوف کھائے۔

ذکر کی تحقیق:

الذکرى۔ (Recitation, Prayer)

کثرت سے ذکر الہی کرنا اس میں الذکر سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن میں ہے: ذَکِّرْتُمْ کَذَا قرآن میں ہے:

"وَذَكِّرْهُمْ بِآيَاتِهِ اللَّهُ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 5)

اور ان کو اللہ کے دن یاد دلاؤ۔

اور آیت کریمہ:

"فَتَذَكِّرْ أَحَدَهُمَا الْأُخْرَى" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 282)

تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلاوے۔ اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر بنا دے گی۔ بعض علماء نے آیت کریمہ:

"فَاذْكُرُونِي أَذْکُرْكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 152)

سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

"أذْکُرُوا نِعْمَتِي" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 40)

یاد کرو میرا وہ احسان۔

میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس نے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔ اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الہی میں غور فکر کرتے رہو حتیٰ کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔

پانچ باتوں کی وحی:

حضرت سیدنا حارث اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی طرف پانچ باتوں کی وحی فرمائی اور ان پر خود عمل کرنے اور بنی

اسرائیل کو ان پر عمل کی ترغیب دلانے کا حکم دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں تمہیں کثرت سے ذکر کرنے کا حکم دیتا ہوں اور ذکر کرنے والے کی مثال اس شخص کی طرح ہے جسکے دشمن اس کی تلاش میں ہوں بھروسہ ایک قلعے کے پاس پہنچ کر اپنے آپ کو اس میں چھپالے، اسی طرح بندہ ذکر اللہ عزوجل کے ذریعے ہی شیطان سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

(امجد رک، کتاب الصوم، باب وان ربح الصوم ربح اسک، رقم، ۱۵۷۴، ج ۲، ص ۵۱)

ذکر کی فضیلت:

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور پاک، صاحب اولاد، ستیاح افلاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب عزوجل فرماتا ہے،

اے ابن آدم! جب تو تنہائی میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی تنہا تیرا ذکر کرتا ہوں اور جب تو کسی مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس مجمع سے بہتر مجمع میں تیرا ذکر کرتا ہوں۔ (الترغیب والترہیب، کتاب الذکر والدعاء، الترغیب فی الاکتار من ذکر اللہ، رقم، ۲، ج ۲، ص ۲۵۲)

رفیق اعلیٰ میں بندے کا ذکر:

حضرت سیدنا معاذ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ اپنے دل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اپنے فرشتوں کی جماعت میں اس کا چہ چاکر ہوں اور جب میرا بندہ کسی مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں رفیق اعلیٰ میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔

(الترغیب والترہیب، کتاب الذکر والدعاء، باب الترغیب فی الاکتار من ذکر اللہ، رقم، ۲، ج ۲، ص ۲۵۲)

نعمت کسے کہتے ہیں؟:

(ن ع م) النعمة (Blessing, Favour)

اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فعلۃ کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے: جلستہ و رکبۃ وغیرہ ذالک۔ اور نعمۃ کے معنی تنعم یعنی آرام و آسائش کے ہیں اور یہ فعلۃ کے وزن پر ہے جو مرۃ ہے جو مرۃ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے:

ضربۃ و شتمۃ اور نعمۃ کا لفظ اسم جنس ہے جو قلیل و کثیر کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے،

"وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا" (سورۃ النحل آیت نمبر ۱۸)

اور اگر اللہ کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔

لفظ اوفوا تحقیق:

(وفی) الوافی (Honour, keep, Make Good)

اور کبھی تو فی کے معنی موت اور نیند کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 42)

اللہ لوگوں کی مرنے کے وقت ان کی روحمیں قبض کر لیتا ہے۔

"أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ" (سورۃ یونس آیت نمبر 46)

یا تمہاری مدت حیات پوری کر دیں۔

عہد کا مفہوم:

(ع ۵۵) العہد (ض) (Promis, Agreement)

کے معنی ہیں کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور خبر گیری کرنا اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عہد کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت

ضروری ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (الاسراء آیت نمبر 34)

اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔

یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔

"لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 124)

کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔

ایقائے عہد کی بہترین مثال:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي الْحَمْسَاءِ قَالَ بَاتِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ أَنْ يُبْعَثَ

وَبَقِيَّتْ لَهُ بَقِيَّةٌ فَوَعَدْتُهُ أَنْ آتِيَهُ بِهَا فِي مَكَانِهِ فَتَسِيْتُ فَمَا كَرِهْتُ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَإِذَا هُوَ فِي

مَكَانِهِ فَقَالَ لَقَدْ شَقَقْتُ عَلَىٰ أَنَا هَاهُنَا مِنْذُ ثَلَاثٍ أَنْتَظِرُكَ

روایت ہے حضرت عبد اللہ ابن ابی الحمساء رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی

نبوت کے ظہور سے پہلے حضور (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے خرید و فروخت کی اور آپ کا کچھ بقایا رہ گیا میں نے وعدہ کیا کہ میں اسی

جگہ وہ چیز لاتا ہوں پھر میں بھول گیا تین دن کے بعد مجھے یاد آیا تو حضور انور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) اسی جگہ تھے فرمایا کہ

تم نے مجھ پر مشقت ڈال دی میں تین دن سے یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

(مکھوۃ الصواع، کتاب الادب، باب الوعد، الفصل الثانی، الحدیث ۳۸۸۰، ج ۲، ص ۱۹۹)

عہد شکنی کی وعید:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قیامت کے دن تین شخصوں کا مد مقابل ہوں گا، ایک وہ شخص جو میرے نام پر وعدہ دے پھر عہد شکنی کرے۔ دوسرا وہ شخص جو آزاد کو بیچے پھر اس کی قیمت کھائے۔ تیسرا وہ شخص جو مزدور سے کام پورا لے اور اس کی مزدوری نہ دے۔ (بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حراً، ۱۵۲/۲، الحدیث: ۲۴۴۲)

عہد توڑنے والے پر لعنت:

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے، جو کسی مسلمان کا عہد توڑے تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، نہ اس کی کوئی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔“

(بخاری، کتاب فضائل المدینہ، باب حرم المدینہ، ۱/۶۱۶، الحدیث: ۱۸۷۰)

تحقیق لفظ رھب:

(رہب) الرھب والرھبة

ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو قرآن میں:

”لَا تَنْتُمْ أَشَدَّ رَهْبَةً“ (سورۃ القصص آیت نمبر 13)

تمہاری ہیبت تو ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر ہے۔

”جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ“ (سورۃ القصص آیت نمبر 32)

اور دفع خوف کے لئے اپنے بازو کیڑ لو۔

اس میں ایک قرأت رھب بظنمہ الراء بھی ہے۔ جس کے معنی فزع یعنی گھبراہٹ کے ہیں۔

دلچسپ حکایت:

مقاتل کہتے ہیں کہ رھب کی تفسیر معلوم کرنے کی غرض سے نکلا دریں اثنا کہ میں کھانا کھا رہا تھا ایک اعرابی عورت آئی۔ اور اس نے کہا اسے اللہ کے بندے مجھے کچھ خیرات دیجئے جب میں لپ بھر کر اسے دینے لگا تو کہنے لگے یہاں میری آستین میں ڈال دیجئے تو میں سمجھ گیا کہ آیت میں بھی (رھب بمعنی آستین ہے) لیکن پہلے معنی یعنی گھبراہٹ کے زیادہ صحیح ہیں۔

قرآن میں ہے:

”وَيَذْعُونَ نَارًا غَيَابًا وَرَهْبًا“ (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 90)

ہمارے فضل کی توقع اور ہمارے عذاب کے خوف سے ہمیں پکارتے رہتے ہیں۔

”تُرْهَبُونَ بِهِ عَدُوُّ اللَّهِ“ (سورۃ الانفال آیت نمبر 60)

والعبادة للوفاء بالعهود، وتقييد المنزل بأنه مصدق لما معهم من الكتب الإلهية من حيث إنه نازل حسبما نعت فيها، أو مطابق لها في القصص والمواعيد والدعاء إلى التوحيد والامر بالعبادة والعدل بين الناس والنهي عن المعاصي والفواحش، وفيما يخالفها من جزئيات الأحكام بسبب تفاوت الأعصار في المصالح من حيث إن كل واحدة منها حق بالإضافة إلى زمانها، مراعى فيها صلاح من خوطب بها، حتى لو نزل المتقدم في أيام المتأخر لنزل على وفقه، ولذلك

قال عليه الصلاة والسلام: "لو كان موسى حياً لما وسعه إلا اتباعي"

تنبيه على أن اتباعها لا يناق في الإيمان به، بل يوجب ذلك عرض بقوله:

وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ بَأْنِ الْوَاجِبِ أَنْ يَكُونُوا أَوَّلَ مَنْ آمَنَ بِهِ، وَلَأَنَّهُمْ كَانُوا أَهْلَ النَّظَرِ فِي مَعْجَزَاتِهِ وَالْعِلْمِ بِشَأْنِهِ وَالْمُسْتَفْتَحِينَ بِهِ وَالْمُبَشِّرِينَ بِزَمَانِهِ. وَأَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَقَعْ خَيْرًا عَنْ ضَمِيرِ الْجَمْعِ بِتَقْدِيرِ: أَوَّلَ فَرِيقٍ أَوْ فَوْجٍ أَوْ بَتَأْوِيلِ لَا يَكُنْ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْكُمْ أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ، كَقَوْلِكَ كَسَانًا حَلَةً فَإِنْ قِيلَ كَيْفَ نَهَوْنَا عَنِ التَّقَدُّمِ فِي الْكُفْرِ وَقَدْ سَبَقَهُمْ مَشْرُكُوا الْعَرَبِ؟ قُلْتَ الْمُرَادُ بِهِ التَّعْرِيفُ لَا الدَّلَالَةُ عَلَى مَا نَطَقَ بِهِ الظَّاهِرُ كَقَوْلِكَ أَمَا أَنَا فَلَسْتُ بِجَاهِلٍ أَوْ لَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ، مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، أَوْ مَنْ كَفَرَ بِمَا مَعَهُ فَإِنْ مِنْ كَفَرَ بِالْقُرْآنِ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا يَصْدُقُهُ، أَوْ مِثْلَ مَنْ كَفَرَ مِنْ مَشْرُكِي مَكَّةَ. وَأَوَّلَ: أَفْعَلُ لَا فَعْلُ لَهُ، وَقِيلَ: أَصْلُهُ أَوْ أَلٌ مِنْ وَأَلٌ، فَأَبْدَلْتَ هَمْزَتَهُ وَآوَاءً تَخْفِيفًا غَيْرَ قِيَاسِيٍّ أَوْ أَوَّلُ مِنْ آلٍ فَقَلْبْتَ هَمْزَتَهُ وَآوَاءً وَأَدْغَمْتَ.

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَلَا تَسْتَبَدُّوا بِالْإِيمَانِ بِهَا وَالْإِتْبَاعَ لَهَا حِظُوظَ الدُّنْيَا، فَإِنَّهَا وَإِنْ جَلَّتْ قَلِيلَةً مُسْتَرْذَلَةً بِالْإِضَافَةِ إِلَى مَا يَفُوتُ عَنْكُمْ مِنْ حِظُوظِ الْآخِرَةِ بَتَرَكِ الْإِيمَانِ. قِيلَ: كَانَ لَهُمْ رِئَاسَةٌ فِي قَوْمِهِمْ وَرِسُومٌ وَهَدَايَا مِنْهُمْ، فَخَافُوا عَلَيْهَا لَوْ اتَّبَعُوا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاخْتَارُوهَا عَلَيْهِ. وَقِيلَ: كَانُوا يَأْخُذُونَ الرَّشِيَّ فَيَحْرِفُونَ الْحَقَّ وَيَكْتُمُونَهُ.

وَإِيَّائِي فَاتَّقُونِ بِالْإِيمَانِ وَاتَّبَاعِ الْحَقِّ وَالْإِعْرَاضِ عَنِ الدُّنْيَا، وَلَمَّا كَانَتِ الْآيَةُ السَّابِقَةَ مُشْتَمَلَةً عَلَى مَا هُوَ كَالْمَبَادِي لَهَا فِي الْآيَةِ الثَّانِيَةِ، فَصَلَّتْ بِالرَّهْبَةِ الَّتِي هِيَ مُقَدِّمَةُ التَّقْوَى، وَلِأَنَّ الْخُطَابَ بِهَا عَمَّ الْعَالَمَ وَالْمَقْلُدَ، أَمْرَهُمْ بِالرَّهْبَةِ الَّتِي هِيَ مَبْدَأُ السَّلُوكِ،

والخطاب بالثانية لما خص أهل العلم، أمرهم بالتقوى التي هي منتهاها.

ترجمہ:

وَأٰمِنُوۡا بِمَا اَنْزَلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا۔

یہاں صرف ایمان کا ذکر کیا گیا ہے کہ بایں طور کہ ایمان کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر ابھارہ گیا ہے کیونکہ مقصود ایمان ہی ہے اور وقائے عہد کے لئے اصل رکن یہی ہے اور "منزل" میں یہ قید لگانا کہ وہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اہل کتاب کے پاس ہیں اس حیثیت سے ہے کہ یہ قرآن اسی کے مطابق نازل ہوا ہے جو کتب سابقہ میں بیان ہوا ہے۔ یا یہ کہ یہ قرآن قصص اور مواہید میں نیز توحید کی دعوت اور امر عبادت میں اور عدل بین الناس اور نبی عن المعاصی والفتوحش کے حکم میں، کتب سابقہ کے مطابق ہے۔ اور قرآن کریم کا کتب سابقہ سے جزوی احکام میں مختلف ہونا اس وجہ سے ہے کہ اوقات اور اور کی مصلحتیں مختلف ہوتی ہیں۔ یعنی ہر مصلحت جزئی اپنے دور کے لحاظ سے برحق ہے۔ اور اس میں ان لوگوں کی اصلاح و فلاح ملحوظ ہے، جو اس کے مخاطب ہیں۔ حالانکہ پہلے نازل ہونے والی چیزیں اگر بعد میں نازل ہوتیں تو بعد والے زمانے کے مطابق نازل ہوتیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لو كان موسى حياً لهما وسعه إلا اتباعي

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ کسی چیز کی گنجائش نہ ہوتی۔

نیز "مصدقاً لهما معکم" کی قید اس حقیقت پر تشبیہ کرنے کے لئے ہے کہ کتب سابقہ کی اتباع، قرآن کریم پر ایمان لانے کے منافی نہیں۔ بلکہ ان کی اتباع اس پر ایمان لانے کا موجب ہے۔ اسی لئے اللہ کریم نے اس پر تعریضاً یہ ارشاد فرمایا:

ولا تكونوا اول کافر بہ

اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو۔

اس آیت میں تعریضاً یہ مراد ہے کہ تم پر ضروری ہے کہ تم قرآن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے بنو، اور اہل کتاب سے یہ بات تعریضاً اس لئے کہی گئی کہ وہ معجزات قرآن میں غور کرنے کے اہل تھے نیز اس کی عظمت شان کو جاننے کے اہل تھے۔ نیز حامل قرآن کے ذریعے فتح و نصرت کے طالب تھے۔ اور اس کی آمد آمد کی بشارت دینے والے تھے۔ اور "اول کافر" لا تکونوا کی ضمیر جمع سے خبر واقع ہے۔ اور "اول کافر" کی تاویل ہوگی "اول فریق کافر" یا "اول فوج کافر" یا،

لا یکن کل واحد منکم اول کافر بہ

کی تاویل میں لیا جائے گا۔ جیسے تمہارا قول "کسنا حلة"

اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ان کو کفر میں سبقت کرنے سے کیونکر منع کیا گیا، جب کہ مشرکین عرب ان پر کفر میں سبقت

لے چکے تھے تو میں جواب دوں گا کہ اس سے مقصود تعریف ہے وہ معنی مقصود نہیں ہیں جن پر منطوق ظاہری دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ تمہارا کہنا "اما انا فلست بجاہل" یا یہ مراد ہے کہ اہل کتاب میں سب سے پہلے کفر کرنے والے نہ بنو۔ یا یہ کہ ان لوگوں میں سب سے پہلے کفر کرنے والے نہ بن جاؤ جنہوں نے اپنی کتاب کا کفر کیا کیونکہ جنہوں نے قرآن کا انکار کیا تو یقیناً ان کتابوں کا بھی انکار کیا جنہوں نے قرآن کی تصدیق کی۔ یا یہ مراد ہے کہ مشرکین مکہ جیسے نہ بن جاؤ جنہوں نے کفر کیا۔ اور "اول" افضل کا صیغہ ہے جس کا کوئی فعل نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل "اول" ہے یہ "وال" سے مشتق ہے، ہمزہ کو بغرض تخفیف، خلاف قیاس واؤ سے بدل دیا گیا ہے۔ یا اس کی اصل "اعول" ہے اور یہ آل بمعنی جمع سے مشتق ہے ہمزہ کو واؤ سے بدل کر واؤ میں ادغام کر دیا گیا، اول ہو گیا۔

وَلَا تَشْكُرُوا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِلَّا

اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو۔

یعنی آیات پر ایمان لانے اور ان کی پیروی کرنے کے عوض، دنیاوی ساز و سامان حاصل نہ کرو۔ اس لئے کہ دنیاوی ساز و سامان کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اخروی نعمتوں کے مقابلے میں قلیل و حقیر ہے۔ جو ترک ایمان کی وجہ سے تم سے فوت ہو جائے گا۔ مفسرین نے کہا کہ علماء یہود کو اپنی قوم میں سرداری حاصل تھی، اور ان کو قوم سے ہدیے اور محصول وصول ہوتے تھے لہذا ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر وہ نبی کریم ﷺ کی پیروی کرتے ہیں تو وہ تمام چیزیں ہاتھ سے جاتی رہیں گی اس لئے انہوں نے اس دنیاوی مال کو، اتباع پر ترجیح دی، بعض نے کہا کہ وہ حق بات کو چھپا کر اور اس میں تحریف کر کے رشوتیں وصول کرتے تھے۔ اور مجھی سے ڈرو۔

وَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

ایمان لا کر اور حق کی پیروی کر کے اور دنیا سے اعراض کر کے، اور آیات ثانیہ کے مشتملات آیت اولیٰ کے مشتملات چونکہ مبادی کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے پہلی آیت کا فاصلہ میں مصدر "رہبۃ" کا فعل لایا گیا ہے۔ جو تقویٰ کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ پہلی آیت کریمہ کے مخاطب عام ہیں، عام بھی مخاطب ہیں اور مقلد بھی، اسلئے ان کو رہبت کا حکم دیا گیا جہاں سے سلوک کا آغاز ہوتا ہے۔ اور دوسرے آیت کے مخاطب خاص کراہل علم ہیں اس لئے ان کو تقویٰ کا حکم دیا گیا جو سلوک کا منتہی ہے۔

شمن کی تعریف:

(ثامن) الشمن

اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو فروخت کرنے والا اپنی چیز کے عوض خریدار سے وصول کرتا ہے خواہ وہ زر نقد ہو یا سامان۔

قرآن میں ہے: "وَشَرُّوْا كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ" (سورہ یوسف آیت نمبر 20)

اور اسے تھوڑی سی قیمت یعنی چند درہموں پر بیچ ڈالو۔

سختی قلت:

(قل ل) القلة والكثرة (To Diminish)

لمحاذ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عظیم اور صغر صفات اجسام سے ہیں بعد کثرت و قلت اور عظیم و صغر میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ:

”ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا“ (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 60)

پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔

میں قلیلاً سے عرصہ قلیل مراد ہے۔

نوٹ: ایمان، ما، نزول، کفر، ثراء، تقویٰ کے معانی گزر چکے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 42]

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (42)

”اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ و دانستہ حق نہ چھپاؤ۔“

متن:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ عطف علی ما قبله. واللبس الخلط وقد يلزمه جعل الشيء مشتبهاً بغيره والمعنى لا تخلطوا الحق بالمنزل عليكم بالباطل الذي تخترونه وتكتمونه حتى لا يميز بينها، أو ولا تجعلوا الحق ملتبساً بسبب خلط الباطل الذي تكتبونه في خلاله. أو تذكرونه في تأويله.

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ جزم داخل تحت حكم النهي كأنهم أمروا بالإيمان وترك الضلال، ونهوا عن الإضلال بالتلبس على من سمع الحق والإخفاء على من لم يسمعه، أو نصب بأضمار أن على أن الواو للجمع بمعنى مع، أي لا تجمعوا البس الحق بالباطل وكتمانه، وبعضه أنه في مصحف ابن مسعود ”وتكتمون“ أي وأنتم تكتمون بمعنى كاتمين، وفيه إشعار بأن استقباح اللبس لما يصحبه من كتمان الحق.

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ عالمون بأنكم لا بسون كاتمون فإنه أقبح إذا الجاهل قد يعذر.

ترجمہ:

اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ

یہ ما قبل پر معطوف ہے، اور "لبس" کے معنی مخلوط کرنے کے ہیں۔ اور خلط کا لازمی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز دوسری چیز سے مخلوط ہو کر مشتبہ ہو جائے، یہاں مراد یہ ہے کہ حق منزل کو اس باطل کے ساتھ مخلوط نہ کرو جس کو تم خود اس غرض سے تراشتے اور لکھتے ہو کہ دونوں کے درمیان فرق نہ ہو سکے یا یہ مراد ہے کہ حق کو خلط باطل کی وجہ سے مشتبہ نہ کرو وہ باطل جس کو تم حق کے درمیان لکھ دیتے ہو، گویا ان کو ایمان اور ترک ضلال کا حکم دیا ہے، اور اضلال و تضلیل سے منع کیا گیا، تاکہ سامعین حق کے ساتھ تلبیس نہ کریں۔ اور غیر سامعین سے حق کو چھپا کر نہ رکھیں۔

یا "تکتُموا الحق" منصوب بتقدیر آن ہے اس احتمال کی بنیاد پر ہے کہ واؤ جمع کے لئے ہو اور معنی یہ کئے جائیں،

لا تجمِعوا البس الحق بالباطل و کتمانہ

تلبیس حق بالباطل اور کتمان حق کے جامع نہ بنو۔ اس توجیہ کی تقویت اس سے ہوتی ہے کہ مصحف ابن مسعود میں "تکتُمون الحق" نون کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں تقدیر یہ نکلے گی "وانتم تکتُمون" یہ جملہ حالیہ ہوگا جو کاتبین کے معنی میں ہوگا، تو اس صورت میں ترجمہ کچھ یوں ہوگا، حق کو باطل کے ساتھ مخلوط نہ کرو اس حال میں کہ تم ان کو چھپا رہے ہو۔ اس ترکیب میں یہ آگاہی دینی ہے کہ حق و باطل کا خلط ملط اس لئے بھی قبیح ہے کہ اس سے کتمان حق لازم آتا ہے۔

وانتم تعلمون

اس حال میں کہ تم جانتے ہو کہ تم تلبیس اور کتمان کرنے والے ہو، اور باوجود علم کے ایسا کرنا بہت بُرا ہے کیونکہ جاہل و نادانف کو تو کبھی معذور بھی سمجھا جاتا ہے۔

لبس کا معنی:

(لبس) لبس الثوب (To put on, To wear)

کے معنی کپڑا پہننے کے ہیں اور البسہ کے معنی دوسرے کو پہنانا کے۔ قرآن میں ہے:

"يَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُطْرًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 31)

اور وہ سبز کپڑے پہنا کریں گے۔

اللباس واللبوس واللبس وہ چیز جو پہنی جائے۔ قرآن میں ہے:

"قَدْ آتَزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِي سُوَاتِكُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 26)

بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک لباس وہ اتارا کہ تمہاری شرم کی چیزیں چھپائے۔

اور لباس کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو انسان کے برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔ چنانچہ میاں بیوی میں سے ہر

ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو قہاح کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

"هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 187)

وہ تمہاری لباس ہیں اور تم ان کے لباس۔

چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے اپنی بیوی کو ازار کہا ہے۔

فدی لك من أئحى ثقة إزاری

اے میرے قابل اعتماد بھائی پر میری ازار یعنی بیوی قربان ہو۔

اور تمثیل و تشبیہ کے طور پر تقویٰ کو بھی لباس قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذٰلِكَ خَيْرٌ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 26)

اور جو پرہیزگاری کا لباس ہے۔

اور آیت کریمہ: "صَنَعَةَ لِبُوسٍ لَّكُمْ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 80)

اسے تمہارا ایک پہنا دینا سکھایا۔

میں لبوس سے زر ہیں مراد ہیں اور آیت کریمہ:

"فَاذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 112)

تو اللہ نے اسے یہ سزا چکھائی کہ اسے بھوک اور ڈر کا پہنا دینا سکھایا۔

اس میں جوع یعنی بھوک اور خوف کی تصویر کھینچنے کے لئے اس لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

تحقیق لفظ حق:

(ح ق ق) الحق (حق) (Right, Truth)

کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ

استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔

لفظ حق کا استعمال:

لفظ حق کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے

چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَرُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلَاَهُمْ الْحَقُّ" (سورۃ یونس آیت نمبر 30)

اور اللہ کی طرف پھیرے جائیں گے جو ان کا سچا مولیٰ ہے۔

(2) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔

قرآن میں ہے:

"هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ طَبِيبًا وَالْقَمَرَ نُورًا" (سورۃ یونس آیت نمبر 5)

وہی ہے جس نے سورج کو جگمگا تا بنایا اور چاند چمکتا۔

(3) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا، جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں۔ کہ بعثتو اب و

عقاب اور جنت دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 213)

تو اللہ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھادی جس میں جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے۔

(4) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے، اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس

مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن

میں ہے:

"كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ" (سورۃ یونس آیت نمبر 33)

یونہی ثابت ہو چکی ہے تیرے رب کی بات۔

تحقیق باطل:

(بطل) الباطل (Invalid, Null)

یہ حق کا بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ قرآن میں

ہے:

"ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ" (سورۃ الحج آیت نمبر 62)

یہ اس لئے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس کے سوا جسے پوجتے ہیں وہی باطل ہے۔

لفظ کتم کا معنی بالتحقیق:

(کتم) کتمہ (ن) (Hid)

کتمنا و کتمانا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 140)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس کتاب اللہ میں موجود ہے چھپائے۔

"وَأَنْ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 146)

مگر ایک فریق ان میں سچی بات جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 283)۔

اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ:

"الَّذِينَ يَبْنِعُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ"

(سورۃ النساء آیت نمبر 37)

جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) خدا نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں۔

اس میں کتمان فضل سے کفران نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:

"وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 37)

اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 42)

اور خدا سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو

رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔ تو جھٹ سے پکارا انھیں گے

"وَاللَّهُ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 23)

خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔

مگر اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالیٰ سے کوئی بات

نہ چھپائے ہوتی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ آخرت میں متعدد واقف ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش

کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی چھپانہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف

گواہی دیں گے۔

نوٹ: لفظ علم کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 43]

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (43)
 ”اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو“۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ یعنی صلاة المسلمین وزکاتہم فإن غیرہما کلا صلاة ولا زکاة. أمرهم بفروع الإسلام بعد ما أمرهم بأصوله، وفيه دليل على أن الكفار مخاطبون بها. والزكاة من زكا الزرع، إذا نما، فإن إخراجها يستجلب بركة في المال ويشمر للنفس فضيلة الكرم. أو من الزكاة بمعنى: الطهارة، فإنها تطهر المال من الخبث والنفس من البخل.

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ أي في جماعتهم، فإن صلاة الجماعة تفضل صلاة الفرد بسبع وعشرين درجة لما فيها من تظاهر النفوس، وعبر عن الصلاة بالركوع احترازاً عن صلاة اليهود. وقيل الركوع: الخضوع والانقياد لها يلزمهم الشارع. قال الاضبط السعدی:

لا تذلَّ الضَّعِيفُ عَظْمُكَ أَنْ تَرْكَعَ يَوْمًا وَالدهرُ قَدْرُ فَعِه

ترجمہ:

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو۔

یہاں :، زاد کرنے سے مراد مسلمانوں کی نماز قائم کرنا اور ان کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی نماز و زکوٰۃ کے سوا دوسری نماز و زکوٰۃ تو ایسی ہے جیسی کوئی نماز و زکوٰۃ ہے ہی نہیں۔

علماء یہود کو اصول اسلام کا حکم دینے کے بعد اب فروع اسلام کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ فروع کے کفار مخاطب ہیں۔ اور "زکاة" ماخوذ ہے زکاة الزرع سے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کھیتی میں نشوونما ہو جائے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال میں برکت پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی دل میں جو دو کرم جیسی صفات کا پھل دیتی ہے۔ یا یہ زکاء سے مشتق ہے جو طہارت کے معنی میں ہے، زکوٰۃ مال کو میل اور دل کو بخل سے پاک کرتی ہے۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

یعنی نماز باجماعت ادا کرو۔ کیونکہ تنہا نماز پڑھنے سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر ستائیس گنا زیادہ ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ اور اس میں ایک دوسرے کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور صلوٰۃ کو رکوع کے ساتھ تعبیر کرنا اس لئے ہے کہ یہود کی نماز سے گریز ہو جائے اور بعض نے کہا کہ رکوع سے مراد شارع علیہ السلام کی لازم کردہ چیزوں کی فرمانبرداری کرنا اور ان کے لئے اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے جس پر اضبط سعدی کا شعر بھی دلالت کرتا ہے،

لَا تَبْذُلُ الضَّعِيفَ عَلَيْكَ أَنْ..... تَزْكُوعَ يَوْمًا وَالذَّهْرُ قَدْ رَفَعَهُ

کسی کو حقیر و فقیر اور کمزور و ناتواں سمجھ کر ذلیل مت کرو، ہو سکتا ہے کہ کہ گردش زمانہ سے تم جھک جاؤ اور زمانہ اس کو اوپر اٹھا دے، تو تم کو اپنے کئے ہوئے پر ندامت ہوگی۔
تحقیق لفظ اقامت:

الاقامته (افعال) فی المکان (Devout)

کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اقامتہ الشیئی (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 68)

کہو کہ اے اہل کتاب جب تک تم توراہ اور انجیل کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے۔

یعنی جب تک کہ علم و عمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا:

"وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 66)

اور اگر وہ قائم رکھتے توراہ اور انجیل۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ وہاں اقامتہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیبت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اقیمو الصلوٰۃ اور المتقین الصلوٰۃ کہا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُتَّابًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 142)

ادت جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو ست اور کامل ہو کر۔

میں قاموا اقامتہ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت:

"رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ" (سورۃ بقرہ آیت نمبر 40)

اے میرے رب مجھے نماز کا قائم کرنے والا رکھ۔

میں دعا ہے کہ الہی مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور آیت کریمہ:

"فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 11)

پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامۃ سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے

کے ہیں۔

لفظ المقام کا معنی:

یہ مصدر میسی، ظرف، مکان ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر

میسی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"إِنَّمَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 66)

اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مقامتہ (بضم الیم) معنی اقامتہ ہے جیسے فرمایا:

"الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ" (سورۃ قاطر آیت نمبر 35)

جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اتارا۔

یہاں جنت کو دار المقامتہ کہا ہے جس طرح کہ اسے دار الخلد اور جنات عدن کہا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"لَا مَقَامَ لَكُمْ فَارِجُوعًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 13)

یہاں تمہارے لئے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں ہے تو لوٹ چلو۔

اس آیت میں مقام کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور ایک قرأت میں مقام (بضم الیم) اقام سے ہے

اور کبھی اقامتہ سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"عَذَابٌ مُّقِيمٌ" (سورۃ قعود آیت نمبر 39)

ہمیشہ کا عذاب۔

اور ایک قرأت میں آیت کریمہ:

"إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 51)

پیشک پر ہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔

مقام بضم میم ہے۔ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ تقویم الشی کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔

چنانچہ فرمایا:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" (سورۃ التین آیت نمبر 4)

کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

اس میں انسان کے عقل و فہم قد و قامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

الصلوة کا معنی:

(صلی) الصل (س) (Prayer)

کے اصل معنی آگ جلانے کے ہے ہیں صلی بالنار اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔ صلی بکذا اے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صلیت الشاة میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مصلیة کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"اَصْلُوْهَا الْيَوْمَ" (سورۃ قیلتس آیت نمبر 64)

آج اس میں داخل ہو جاؤ۔

الصلوة فی اللغت:

بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ صلاۃ کے معنی دعا دینے۔ تحسین و تبریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے صلیت علیہ میں نے اسے دعا دی نشوونما دی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے کہ،

"اِذَا دَعِيَ أَحَدٌ كُمْ إِلَى طَعَامٍ فَلْيَجِبْ، وَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ أَمْي: لِيَدْعَ لِأَهْلِهِ"

جب کسی کو کھانے پر بلا یا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کر لے اگر روزہ دار ہے تو وہ انکے لئے دعا کر کے واپس چلا آئے اور قرآن میں ہے:

"وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ" (سورۃ التوبة آیت نمبر 103)

اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صلاۃ کے معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 56)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے (نبی) پر۔

اور الصلوۃ جو کہ ایک عبادت مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اسلئے اسے صلوۃ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تسمیۃ الشنی باسم الجزء کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے ضمنی مفہوم کے نام سے موسوم

کرنا اور صلاۃ (نماز) ان عبادت سے ہے جن کا وجود شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 103)

بیشک نماز مومنوں پر مقرر اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔

باجماعت نماز کی فضیلت:

حضرت سیدنا عبید اللہ بن عمر قرظی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

میں نے ہمیشہ عشاء کی نماز باجماعت ادا کی، مگر افسوس! ایک مرتبہ میری عشاء کی جماعت فوت ہو گئی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ میرے ہاں ایک مہمان آیا، میں اس کی خاطر منڈازات (مہمان نوازی) میں لگا رہا۔ فراغت کے بعد جب مسجد پہنچا تو جماعت ہو چکی تھی۔ اب میں سوچنے لگا کہ ایسا کون سا عمل کیا جائے جس سے اس نقصان کی تلافی ہو۔ یکا یک مجھے اللہ کے پیارے حبیب، حبیب لیب عَزَّ وَجَلَّ وَصَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ کا یہ فرمان عالی شان یاد آیا کہ

"باجماعت نماز، مفرد کی نماز پر اکیس درجے فضیلت رکھتی ہے۔ اسی طرح پچیس اور ستائیس درجے فضیلت کی حدیث بھی مروی ہے۔"

(صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلاۃ الجماعة، الحدیث ۲۳۵-۲۳۶، ص ۵۲، "المجاد" باحدی و عشرين)

میں نے سوچا، اگر میں ستائیس مرتبہ نماز پڑھ لوں تو شاید جماعت فوت ہو جانے سے جو کمی ہوئی وہ پوری ہو جائے۔ چنانچہ میں نے ستائیس مرتبہ عشاء کی نماز پڑھی، پھر مجھے نیند نے آیا۔ میں نے اپنے آپ کو چند گھڑ سواروں کے ساتھ دیکھا، ہم سب کہیں جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک گھڑ سوار نے مجھ سے کہا:

تم اپنے گھوڑے کو مشقت میں نہ ڈالو، بے شک تم ہم سے نہیں مل سکتے۔ میں نے کہا:

میں آپ کے ساتھ کیوں نہیں مل سکتا؟ کہا:

اس لئے کہ ہم نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی ہے۔

لفظ زکوٰۃ کی تحقیق:

(زک و) الزکاة (Zakat)

اس کے اصل معنی اس نمود (افزونی۔ بڑھوتری) کے ہیں جو برکت البیہ سے حاصل ہو اس کا تعلق دنیاوی چیزوں سے بھی

ہے اور اخروی امور کے ساتھ بھی چنانچہ کہا جاتا ہے زکا الزرع عزیز کو کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا اور آیت:

"أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ" (سورۃ الکہف آیت نمبر ۱۹)

کس کا کھانا زیادہ صاف ستمرا ہے۔ میں ازکمی سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش انجام ہو اور اسی سے زکوٰۃ کا لفظ

مشتق ہے یعنی وہ حصہ جو مال سے حق الہی کے طور پر نکال کر فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس میں نمو ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے تسمیہ میں ان ہر دو کا لحاظ کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ دونوں خوبیاں زکوٰۃ میں موجود ہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 43)

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

اور تزکیہ نفس سے ہی انسان دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے اور فعل تزکیہ کی نسبت تو انسان کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے جیسے فرمایا:

"قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 9)

کہ جس نے اپنی روح کو پاک کیا (وہ ضرور اپنی) مراد کو پہنچا۔

اور کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا فاعل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 49)

بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔

اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:

"تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 103)

کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو۔

"يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 151)

کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا۔

اور کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے کیونکہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے۔ چنانچہ

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

"وَحَقًّا قَالُوا لَنَا وَرَكَعًا" (سورۃ مریحہ آیت نمبر 13)

اور اپنی طرف سے مہربانی اور سحرانی۔

"لَا هَبَّ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا" (سورۃ مریحہ آیت نمبر 19)

کہ میں تجھے ایک ستر ایٹا دوں۔

یعنی وہ فطرتاً پاکیزہ ہوگا اور فطرتی پاکیزگی جیسا کہ بیان کر چکے ہیں۔ بطریق اجتناب حاصل ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیتا ہے اور یہ پاکیزگی تعلیم و مہارت سے نہیں بلکہ محض توفیق الہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اکثر انبیاء اور رسل کے ساتھ ہوا ہے۔ اور آیت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ لڑکا آئندہ چل کر پاکیزہ اخلاق ہوگا لہذا زکیا کا تعلق زمانہ حال کے ساتھ نہیں بلکہ استقبال کے ساتھ ہے۔

قرآن میں ہے: "وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 4) اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔ یعنی وہ عبادت اس غرض سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کر دے یا وہ اپنے نفوس کو پاک کرنے کی غرض سے عبادت کرتے ہیں والعمال واحد۔ لہذا الزکوٰۃ میں لام تعلیل کے لیے ہے جسے لام علت و قصد کہتے ہیں اور لام تعدیہ نہیں ہے حتیٰ کہ یہ فاعلون کا مفعول ہو۔ انسان کے تزکیہ نفس کی دو صورتیں ہیں ایک تزکیہ بالفعل یعنی اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرنا یہ طریق محمود ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 9)

بے شک مراد کو پہنچایا جس نے اسے ستر کیا۔

اور آیت: "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى" (سورۃ الاعلیٰ آیت نمبر 14)

میں تزکیہ سے یہی مراد ہیں۔

دوسرے تزکیہ بالقول ہے جیسا کہ ایک ثقہ شخص دوسرے کے اچھے ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اگر انسان خود اپنے اچھا ہونے کا دعویٰ کرے اور خود ستائی سے کام لے تو یہ مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تزکیہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"فَلَا تَزُكُّوا الْفُسُكُ" (سورۃ النجم آیت نمبر 32)

اپنے آپ کو پاک نہ ٹھہراؤ۔

اور یہ نبی تادیبی ہے کیونکہ،

میاں مٹھو:

انسان کا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنانا تو عقلاً ہی درست ہے اور نہ ہی شرعاً۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دانش مند سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی بات ہے جو باوجود حق ہونے کے زیب نہیں دیتی تو اس نے جواب دیا مدح الانسان نفسه کہ خود ستائی کرنا۔

زکوٰۃ ادا کرنے کے جہاں بے شمار ثوابات ہیں نہ دینے والے کے لئے وہاں خوفناک عذابات بھی ہیں، چنانچہ اعلیٰ حضرت، امام اہلسنت، مولانا شاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن قرآن و حدیث میں بیان کردہ عذابات کا نقشہ کھینچتے ہوئے

فرماتے ہیں،

خلاصہ یہ ہے کہ جس سونے چاندی کی زکوٰۃ نہ دی جائے، روز قیامت جہنم کی آگ میں تپا کر اُس سے اُن کی پیشانیاں، کروٹیں، پٹھیں داغی جائیں گی۔ اُن کے سر، پستان پر جہنم کا گرم پتھر رکھیں گے کہ چھاتی توڑ کر شانے سے نکل جائیگا اور شانے کی ہڈی پر رکھیں گے کہ ہڈیاں توڑتا سینے سے نکل آئے گا، پیٹھ توڑ کر کرودٹ سے نکلے گا، گڈی توڑ کر پیشانی سے ابھرے گا۔ جس مال کی زکوٰۃ نہ دی جائے گی روز قیامت پُرانا خبیث خوانخوار اژدہا بن کر اُس کے پیچھے دوڑے گا، یہ ہاتھ سے روکے گا، وہ ہاتھ چبائے گا، پھر گلے میں طوق بن کر پڑے گا، اس کا منہ اپنے منہ میں لے کر چبائے گا کہ میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔ پھر اس کا سارا بدن چبا ڈالے گا۔ وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (فتاویٰ رضویہ جدید ج ۱۰ ص ۱۵۳)

گرم سکتہ:

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ زکوٰۃ نہ دینے والے کو قیامت کے عذاب سے ڈرا کر سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں، اے عزیز! کیا خدا اور رسول عَزَّ وَجَلَّ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے فرمان کو یونہی منسی ٹھٹھا سمجھتا ہے یا (قیامت کے ایک دن یعنی) پچاس ہزار برس کی مدت میں یہ جانکاہ مُصِیبتیں جھیلنی سہل جانتا ہے، ذرا یہیں کی آگ میں ایک آدھ روپیہ (چھوٹا سا سکتہ) گرم کر کے بدن پر رکھ کر دیکھ، پھر کہاں یہ خفیف (ہلکی سی) گرمی، کہاں وہ قہر آگ، کہاں یہ ایک ہی روپیہ کہاں وہ ساری عمر کا جوڑا ہوا مال، کہاں یہ مٹ بھر کی دیر کہاں وہ ہزار دن برس کی آفت، کہاں یہ ہلکا سا چبکا (یعنی معمولی ساداغ) کہاں وہ ہڈیاں توڑ کر پار ہونے والا غضب۔ اللہ تعالیٰ مسلمان کو ہدایت بخشنے۔ (فتاویٰ رضویہ از امام احمد رضا خان بریلوی جدید ج ۱۰ ص ۱۵۳)

لفظ رکوع کا مفہوم:

(رکوع) (Genuflection)

اس کے اصل معنی انحناء یعنی جھک جانے کے ہیں اور نماز میں خاص شکل میں جھکنے پر بولا جاتا ہے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے معنی میں آتا ہے خواہ بطور عبادت ہو یا بطور عبادت نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِرْكَعُوْا وَاَسْجُدُوْا" (سورۃ الحج آیت نمبر 77)

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو۔

"وَ اِرْكَعُوْا مَعَ الرَّٰكِعِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 43)

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

"وَ اَلْعٰكِفِيْنَ وَ الرَّكَّعِ الشُّجُوْدِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 125)

اعتکاف والوں اور رکوع و سجود والوں کے لئے۔

"الرَّٰكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 112)

رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے۔

شعر:

شاعر نے کہا ہے:

أخبر أخبار القرون التي مضت أدب كآتي كلما قمت راع
ترجمہ: میں گذشتہ لوگوں کی خبر دیتا ہوں (میں سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے) ریگ کر چلتا ہوں اور خمیدہ پشت کھڑا
ہوتا ہوں۔

صحابہ کرام اور رکوع:

امیر المؤمنین حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز میں میخ (ٹھوکنے) کی طرح اور حضرت سیدنا عبداللہ بن
زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ستون کی طرح کھڑے ہوتے اور بعض صحابہ رکوع میں اتنے پرسکون ہوتے کہ ان پر چڑیاں بیٹھ جاتیں
گویا وہ جمادات میں سے ہیں (جو حرکت نہیں کرتے)۔
نوٹ: لفظ آتی کا بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 44]

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (44)
”کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں۔“

متن:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ
الفضاء الواسع يتناول كل خير، ولذلك قيل البر ثلاثة: بر في عبادة الله تعالى، وبر في
مراعاة الأقارب، وبر في معاملة الأجانب.

وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَتَتْرَكُونَهَا مِنَ الْبِرِّ كَالْمَنْسِيَاتِ، وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا
أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي أَحْبَارِ الْمَدِينَةِ، كَانُوا يَأْمُرُونَ سِرًّا مِنْ نَصْحَةِ بَاتِبَاعِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ وَلَا يَتَّبِعُونَهُ، وَقِيلَ: كَانُوا يَأْمُرُونَ بِالصَّدَقَةِ وَلَا يَتَصَدَّقُونَ. وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ
الْكِتَابَ تَبَكِّيتَ كَقَوْلِهِ: وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ أَيْ تَتْلُونَ التَّوْرَةَ، وَفِيهَا الْوَعِيدُ عَلَى الْعِنَادِ
وَتَرَكِ الْبِرِّ وَمُخَالَفَةِ الْقَوْلِ الْعَمَلِ.

أَفَلَا تَعْقِلُونَ قَبْحَ صَنِيعِكُمْ فَيُصَدِّكُمْ عَنْهُ، أَوْ أَفَلَا عَقْلَ لَكُمْ يَمْنَعُكُمْ عَمَّا تَعْلَمُونَ

وخامة عاقبته.

والعقل في الاصل الحس، سمي به الإدراك الإنساني لأنه يحبس عما يقبح، ويعقله على ما يحسن، ثم القوة التي بها النفس تدرك هذا الإدراك، والآية ناعية على من يعط غيره ولا يتعظ بنفسه سوء صنيعه وخبث نفسه، وأن فعله فعل الجاهل بالشرع أو الاحق الخالي عن العقل، فإن الجامع بينهما تأتي عنه شكيبته، والمراد بها صف الواعظ على تزكية النفس والإقبال عليها بالتكميل لتقوم فيقيم غيره، لا منع الفاسق عن الوعظ فإن الإخلال بأحد الأمرين البأمور بهما لا يوجب الإخلال بالآخر.

ترجمہ:

اتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ كيا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں مقصود کا اقرار کرایا جا رہا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زجر و توبخ کی جا رہی ہے اور ان کو حیرت و تعجب کی دعوت بھی دی جا رہی ہے۔ "بر" کا معنی خیر میں وسیع ہونے کا ہے۔ یہ "بر" باء کے فتح کے ساتھ اباء سے مشتق ہے بمعنی کشادہ فضاء۔ "بر" ہر طرح کی خیر کو شامل ہے اسی لئے کہا گیا کہ "بر" تین ہیں۔ پہلی برنی عبادۃ اللہ۔۔۔ الخ یعنی ایک نیکی وہ ہے جس کا مظاہرہ اللہ کریم کی عبادت کی صورت میں ہوتا ہے، دوسری وہ نیکی ہے جس کا اظہار رشتہ داروں کا لحاظ رکھنے کی صورت میں ہوتا ہے تیسری قسم کی وہ نیکی ہے جو اجانب سے معاملات کرتے ہوئے ظاہر ہوتی ہے۔

تَنسُونَ انْفُسَكُمْ

کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو نیکی سے ایسا دور چھوڑ دیتے ہو جیسے بھولی بسری چیز کو چھوڑ دیا جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت علماء یہود کے متعلق نازل ہوئی جن کا عمل یہ تھا کہ جن کو ان کی خیر خواہی مقصود ہوتی انہیں چپکے سے حضرت محمد ﷺ کی اتباع کا حکم کرتے تھے اور خود اتباع نہیں کرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ وہ صدقہ و خیرات کا حکم دیتے تھے اور خود صدقہ نہیں دیتے تھے۔

حالا نکه تم کتاب پڑھتے ہو۔

وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ

اس جملہ کا مقصود عار دلانا اور دھمکی دینا مقصود ہے جیسا کہ ارشاد ہے "وانتم تعلمون" یہاں کتاب سے مراد تورات ہے، اور آیت میں عناد اور ترک برز اور مخالفت قول و عمل پر وعید ہے۔

کیا تمہیں عقل نہیں۔

أَفَلَا تَعْقِلُونَ

یعنی کیا تم اپنے عمل کی قباحت نہیں سوچتے کہ یہ سوچنا تم کو عمل قبیح سے باز رکھے یا کیا تمہیں ذرا بھی عقل نہیں ہے جو تم کو اس چیز سے روک دے جس کے انجام کی خرابی کو تم جانتے ہو۔

اور عقل دراصل روکنے اور مقید کرنے کا نام ہے۔ اور ادراک انسانی کو عقل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ فہم چیزوں سے انسان کو روکتا ہے۔ اور عمدہ چیزوں کو اس پر جمادیتا ہے۔ پھر عقل اس قوت کا نام ہے جس کے ذریعہ نفس انسانی ادراک کرتا ہے اور آیت کریمہ ان لوگوں کو بد عملی اور نجس نفس کا اظہار کر رہی ہے، جو دوسروں کو تو نصیحت کرتے ہیں لیکن خود نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ نیز آیت کریمہ یہ بتا رہی ہے کہ یہ عمل اسی شخص کا ہو سکتا ہے جو شریعت سے ناواقف ہے۔ یا ایسا احمق ہے جو عقل سے بالکل خالی ہے کیونکہ جو شخص عقل و شریعت دونوں کا جامع ہو اس کی طبیعت ایسے عمل سے اباء کرتی ہے۔

اور مقصود یہ ہے کہ واعظ کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے اور تزکیہ کی جانب پوری طرف متوجہ ہو جاتا کہ خود سیدھا ہو جائے، پھر دوسروں کو سیدھا کر سکے۔ مقصود یہ نہیں کہ فاسق کو وعظ گوئی سے روک دیا جائے، اس لئے کہ اگر دو چیزیں مامور بہ ہوں اور ان میں کسی ایک کی بجا آوری میں بھی کمی کی جائے۔

تحقیق حرف الف بالتکلف:

(۱): الف

بامعنی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔ تیسرا وہ جو آخر کلام میں

آئے۔

پہلی قسم:

وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے۔ اس کی چند قسمیں ہیں:

الف الاستخبار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے کہنا الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو

استفہام وانکار نفی تبکیت پر زجر و توبیخ تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا۔

" اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 30)

(انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے۔

اور تبکیت یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو، چنانچہ (قسم اول کے متعلق) فرمایا:

" اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ " (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 20)

تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

" اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 80)

کیا تم نے اللہ سے اقرار لے رکھا ہے؟

" اَلَا اِنَّ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلَ " (سورۃ یونس آیت نمبر 91)

کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟
اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:

"اَكَاٰنَ لِلنَّٰسِ عَجَبًا" (سورۃ یونس آیت نمبر 2)

کیا لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے؟

"اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

تو کیا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

"اَفَاِنْ مِتَّ فَهَمُّ الْخَالِدُوْنَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 34)

بھلا اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

"اَلَّذِکْرٰتِیْنَ حَرَّمَ اَمْرَ الْاَنْثٰثِیْنِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 143)

کیا اس نے دونوں نر حرام کئے یا دونوں مادہ۔

اور معنی تسویہ میں فرمایا:

"سَوَاءٌ عَلَیْنَا اَجْرٌ عَنَّا اَمْ صَبَرْنَا" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 21)

ہم پر ایک سا ہے چاہے بے قراری کریں یا صبر سے رہیں۔

"سَوَاءٌ عَلَیْهِمْ اَلَّذِکْرُ لَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 6)

انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں۔

اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اخراج (وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں

نفی خروج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر نفی کے معنی نہ ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا۔ اور جب

کلام منفی پر داخل ہوتا ہے مثبت بنا دیتا ہے۔ کیونکہ کلام منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی ہوتی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا

ہے چنانچہ فرمایا:

"اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 172)

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں (یعنی ضرور ہوں)۔

"اَلَا یَسُّ اَللّٰهُ بِاِحْکَمِ الْحَاکِمِیْنِ" (سورۃ التین آیت نمبر 8)

کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے یعنی ضرور ہے۔

"اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاتِی الْاَرْضَ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 41)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں۔

"أَوْلَمْ تَأْتِيهِمْ بَيِّنَةٌ" (سورۃ طہ آیت نمبر 133)

کیا ان کے پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔

"أَوَلَا يَتُوبُونَ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 126)

اور کیا یہ نہیں دیکھتے۔

"أَوْلَمْ نُعَيِّرْكُمْ" (سورۃ قفاطر آیت نمبر 37)

اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی۔

دوسری قسم:

الف جو مضارع کے صیغہ واحد منکلم کے شروع میں آتا ہے اور میں " کے معنی رکھتا ہے جیسے اسمع و ابصر یعنی میں

سنتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔

تیسری قسم:

ہمزہ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی جیسے فرمایا:

"أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 114)

ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

"رَبِّ ائْتِنِي لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ" (سورۃ التحریم آیت نمبر 11)

اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

چوتھی قسم:

الف جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے لئے آیا ہے جیسے فرمایا،

"الْعَالَمِينَ" (سورۃ الفاتحہ آیت نمبر 2)

تمام جہانوں۔

پانچویں قسم:

پھر اس کی تین اقسام ہیں:

1۔ الف نداء جیسے ازید (اے زید)

2۔ وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس کی پہلی قسم الف تشبیہی ہے (مثلاً جلان) اور دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی

جاتی ہے مثلاً مسلمات و مساکین۔

3۔ اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ یا تو تائید کے لئے ہوتا ہے جیسے جلی اور بیضاء میں آخری الف یا پھر تثنیہ میں ضمیر کے لئے جیسا کہ

"اُدْهَبَا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 36)

میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے جیسے

"وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونَا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

"فَاَصْلَحُوا الشَّيْبِلَا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 67)

تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لئے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے (جیسا کہ

آیات کے اواخر میں الف "اشباع بڑھا دیتے ہیں)

امر کا معنی:

(امر) الامر (اسم) (Behest)

کے معنی شان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع امور ہے اور امرتہ (ن) کا مصدر بھی امر آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے

ہیں امر کا لفظ جملہ اقوال و افعال کے لئے عام ہے۔ چنانچہ آیات:

"وَاللّٰهُ يُوَجِّعُ الْاَمْرُ كُلَّهُ" (سورۃ ہود آیت نمبر 123)

اور تمام امور کا رجوع اسی طرف ہے۔

لفظ بزرگ کا مفہوم:

(بر) البر (Goodness, Virtue)

یہ بحر کی ضد ہے (اور اس کے معنی خشکی کے ہیں) پھر معنی وسعت کے اعتبار سے اس سے البر کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جس

کے معنی وسیع پیمانہ پر نیکی کرنا کے ہیں اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جیسے،

"اِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ" (سورۃ الطور آیت نمبر 28)

بیشک وہ احسان کرنے والا مہربان ہے۔

اور کبھی بندہ کی طرف جیسے بد العبد رہ (یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ

تعالیٰ طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے البر

(نیکی) دو قسم پر ہے اعتقادی اور عملی اور آیت کریمہ؛

"لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُولُوْا وُجُوْكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 177)

کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔

دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر جب نبی کریم ﷺ سے برکی تفسیر دریافت کی گئی تو آپ ﷺ نے جو ابابہ کی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال فرائض و نوافل کی پوری تفصیل بتائی جاتی ہے۔ بر الوالدین کے معنی ہیں ماں اور باپ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ اور احسان کرنا اس کی ضد عقوق ہے۔ قرآن میں ہے۔

" لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ

تَبَرَّوْهُمْ " (سورۃ الممتحنہ آیت نمبر 8)

جن لوگوں میں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی کرنے سے خدام کو منع نہیں کرتا ہے۔

اور بڑے معنی سچائی بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی خیر ہے جس میں وسعت کے معنی پائے جانے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:-

بر فی یمنہ

اس نے اپنی قسم پوری کر دکھائی۔

اور شاعر کے قول،

ا کون مکان البر منہ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ بر بمعنی فؤاد یعنی دل ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی بد بمعنی نیکی ہے یعنی میرا مقام اس کے ہاں بمنزلہ بر کے ہوگا۔ بر ابابہ فہو بارو بر صیغہ صفت جو کہ صائف و صیغ و طائف و طیف کی مثل دونوں طرح آتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے،

" وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ " (سورۃ قمریہ آیت نمبر 32)

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔

اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا (بنا) بر فی یمنہ فہو یماز ابر تہ قسم پوری کرنا۔ برت یمنی میری قسم پوری ہو گئی۔ حج مبرور حج جس میں رفق و فسق اور جدال نہ ہو۔ البار کی جمع ابرار و برورہ آتی ہے قرآن میں ہے۔

" إِنَّ الْأَكْبَرَاءَ لَفِي نَعِيمٍ " (سورۃ انفطار آیت نمبر 13)

بے شک بزرگوں کا ضرور چین میں ہیں۔

مزید فرمایا: " كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَكْبَرِ لَفِي عِلِّيِّينَ " (سورۃ المطففین آیت نمبر 18)

ہاں ہاں بے شک بزرگوں کی لکھت سب سے اونچا محل علیین میں ہے۔

اور آیت کریمہ: " كِرَامًا بَرَرًا " (سورۃ عبس آیت نمبر 16)

جو سردار اور نیکو کاریں۔

برہ اور البربر:

مندرجہ بالا میں خاص کفرشتوں کو برہ کہا ہے کیونکہ ابرار (جمع) زیادہ بلخی ہے۔ اس لئے کہ برہ، برو کی نسبت عدل میں مبالغہ پایا جاتا ہے اسی طرح بد میں بار سے زیادہ مبالغہ ہے البربر خاص رپیلو کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں عام محاورہ ہے:

بلی اور چوہا:

"فلان لا يعرف البر من الهر"

وہ چوہے اور بلی میں تمیز نہیں کر سکتا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ حکایت کی صورت کے طور پر بولے جاتے ہیں مگر اس محاورہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خیر خواہ اور بد خواہ میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ البربر بڑبڑ کرنا یہ بھی حکایت صورت کے قبیل سے ہے۔۔

لفظ نسیان کی تحقیق:

(ن س ی) النسیان (Forget)

یہ سنیتہ نسیان کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کو ضبط میں نہ رکھنے کے ہیں خواہ یہ ترک ضبط ضعف قلب کی وجہ سے ہو یا از ارہ غفلت ہو یا قصد کسی چیز کی یاد بھلا دی جائے حتیٰ کہ وہ دل سے محو ہو جائے قرآن میں ہے:

"وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَتَنِيهِ وَلَمْ يُجِدْ لَهُ عَزْمًا" (سورۃ طہ آیت نمبر ۱۱۵)

ہم نے پہلے آدم (علیہ السلام) سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ دیکھا۔

"فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ" (سورۃ السجدۃ آیت نمبر ۱۴)

سو اب آگ کے مزے چکھو اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

"فَاتِي نَسِيَتِ الْحَوَاتِ وَمَا أَنْسَانِيَهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ" (سورۃ الکہف آیت نمبر ۶۳)

تو میں مچھلی وہیں بھول گیا۔ اور مجھے آپ سے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

"لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ" (سورۃ الکہف آیت نمبر ۷۳)

کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر مواخذہ نہ کیجئے۔

"فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۱۴)

مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ فراموش کر دیا۔

"ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ" (سورۃ الزمر آیت نمبر ۸)

پھر جب وہ اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دے دیتا ہے تو جس کام کے لئے پہلے اس کو پکارتا ہے اسے بھول جاتا ہے اور آیت:

"سَنُقَرِّبُكَ فَلَا تَنْسَى" (سورۃ الاعلیٰ آیت نمبر 6)

ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بنا دے گا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنو گے اسے بھولنے نہیں پاؤ گے پھر ہر وہ نسیان جو انسان کے قصد اور ارادہ سے ہو وہ مذموم ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ کے ہو اس میں انسان معذور ہے۔

حدیث پاک:

اور حدیث میں جو مروی ہے رفع عن امتی الخطاء والنسیان کہ میری امت کو خطا اور نسیان معاف ہے۔

تو اس سے یہی دوسری قسم کا نسیان مراد ہے یعنی جس میں انسان کے ارادہ کو دخل نہ ہو اور آیت کریمہ:

"فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا اِنَّا نَسِينَاكُمْ" (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 14)

سواب آگ کے مزے چکھو اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

اس آیت میں نسیان بمعنی اول ہے یعنی وہ جس میں انسان کے قصد اور ارادہ کو دخل ہو اور کسی چیز کو حقیر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا جائے۔ پھر جب نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے ازراہ اہانت انسان کو چھوڑینے اور احکام الہی کے ترک کرنے کی وجہ سے اسے سزا دینے کے معنی مراد ہوتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:

"قَالِيَوْمَ نُنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَذَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 51)

تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اس طرح آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔

"نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيْنَهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 67)

انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ" (سورۃ الحشر آیت نمبر 19)

اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔

میں متنبہ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے سے ہی معرفت الہی حاصل کر سکتا ہے لہذا انسان کا اللہ تعالیٰ کو

بھلا دینا خود اپنے آپ کو بھال دینے کے مترادف ہے اور آیت کریمہ:

"وَ اذْ كُرِّرْتُ لَكَ اِذَا نَسِيْتُ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 24)

اور جب خدا کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو۔

کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ معنی کئے ہیں کہ جب تم کوئی بات کہو اور اس کے ساتھ انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو

یا آنے پر انشاء اللہ کہہ لیا کرو۔ اسی لئے ابن عباس کے نزدیک حلف میں کچھ مدت کے بعد بھی انشاء اللہ کہنا جائز ہے اور عکرمہ نے کہا ہے کہ نسبت بمعنی ارتکب ذنبا کے ہے۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب تمہیں کسی گناہ کے ارتکاب کا خیال آئے تو اس وسوسہ کو دفع کرنے کے لئے اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جایا کرو تا کہ وہ وسوسہ دفع ہو جائے۔ النسبی کے اصل معنی ماینسی یعنی فراموش شدہ چیز کے ہیں جیسے تلفظ بمعنی ماینقض آتا ہے۔ مگر عرف میں نسبی اس معمولی چیز کو کہتے ہیں جو در خود اعتناء نہ بھی جائے۔

لفظ تلا (تلاوت) کا معنی:

(تلا و تلاوة) (ن) (Recate, Recital)

کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی اجنبی چیز حائل نہ ہو یہ کہیں تو جسمانی طور ہوتا ہے اور کہیں اس کے احکام کا اتباع کرنے سے اس معنی میں اس کا مصدر تلو اور تلو آتا ہے اور کبھی یہ متابعت کسی کتاب کی قراءت (پڑھنے) اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنے کی صورت میں ہوتی ہے اس معنی کے لئے اس کا مصدر تلاوة آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 2)

اور چاند کی جب اس کے پیچھے آئے۔

تلاوت قرآن کی فضیلت:

اللہ عزَّ وَّجَلَّ کی بارگاہ میں بروز قیامت قرآن پاک سے زیادہ کسی شفاعت کرنے والے کا مرتبہ نہ ہوگا۔ نہ کسی نبی کا، نہ فرشتے کا اور نہ ہی کسی اور کا۔

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

بے شک اللہ عزَّ وَّجَلَّ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے سورہ طہ اور سورہ یسین کی تلاوت فرمائی۔ جب فرشتوں نے قرآن کو سنا تو کہا: مبارک ہو اس امت کے لئے جن پر یہ قرآن نازل ہوگا، مبارک ہیں وہ سینے جو اسے اٹھائیں گے اور خوشخبری ہے ان زبانوں کے لئے جو اس کی تلاوت کریں گی۔

(سنن الداری، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل سورۃ طہ و یسین، الحدیث ۳۲۱۳، ج ۲، ص ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹)

تلاوت نہ کرنے والے کا انجام:

حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا:

بہت سے تلاوت قرآن کرنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے۔

حضرت سیدنا ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

دوزخ کے فرشتے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے نافرمان حاملین قرآن کو بت پرستوں سے بھی جلدی پکڑیں گے۔

قرآن اور دوست کا بیج:

تورات شریف میں ہے، اللہ عَزَّ وَجَلَّ ارشاد فرماتا ہے:

اے میرے بندے! کیا تجھے مجھ سے حیا نہیں آتی؟ تیرے پاس کسی دوست کا خط آتا ہے اور تو راستے میں چل رہا ہو تو راستے سے ہٹ کر اسے پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے ایک ایک حرف میں غور کرتا ہے حتیٰ کہ تو اس سے کچھ بھی نہیں چھوڑتا اور یہ میری کتاب ہے جسے میں نے تیری طرف اتارا ہے، دیکھ! میں نے اس میں تیرے لئے کتنی باتوں کو تفصیل سے بیان کیا اور کتنی باتوں کو تکرار سے بیان کیا تاکہ تو اس کے طول و عرض میں غور و فکر کرے پھر تو اس سے منہ پھیرتا ہے، کیا میں تیرے نزدیک تیرے بھائی سے بھی پیچھے ہوں؟

اے میرے بندے! تیرا بھائی تجھے کوئی واقعہ سناتا ہے تو تو پوری طرح متوجہ ہو کر سنتا ہے اور پوری دل جمعی سے اس کی باتوں کو سنتا ہے، اگر کوئی درمیان میں بات کرتا ہے یا تجھے اس کی بات سے بے توجہ کرتا ہے تو تو اشارے سے اسے روکتا ہے جب کہ میں تیری طرف متوجہ ہوں اور تجھ سے کلام کرتا ہوں اور تو اپنا دل مجھ سے پھیر لیتا ہے کیا تو نے مجھے اپنے بھائی سے بھی ہلکا سمجھ رکھا ہے؟ اللہ عَزَّ وَجَلَّ اس سے بہت زیادہ بلند و اعلیٰ ہے۔ (باب الاحیاء (احیاء العلوم کا خلاصہ) صفحہ نمبر 117)

موسیقی کے ساتھ قرآن کی تاوت:

مزامیر (یعنی آلات موسیقی) کے ساتھ قرآن پاک پڑھنا کفر ہے۔ (بہار شریعت حصہ 9 ص 182)

عقل کی تعریف:

(عقل) العقل (Intellect)

اس قوت کو کہتے ہیں جو قبول علم کے لئے تیار رہتی ہے اور وہ علم جو اس قوت کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اسے بھی عقل

کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 43)

اور انہیں نہیں سمجھتے مگر علم والے۔

عقل کے معانی:

اس کے کئی معانی ہیں لیکن ہمارے یہاں اس سے مراد دو معانی ہیں۔

پہلا معنی:

اشیاء کے حقائق کا علم۔

دوسرا معنی:

عقل سے مراد وہ عالم ہے جس کے لئے علم صفت کی طرح ہوتا ہے اور اس معنی سے مراد وہ لطیفہ ربانی ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور عقل سے پہلا معنی مراد لینا ممکن نہیں کیونکہ حضور نبی کریم، رؤوف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ عزَّ وَّجَلَّ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا پھر اس سے فرمایا: آگے بڑھ۔ تو وہ بڑھی، پھر فرمایا: پیچھے ہو۔

تو وہ پیچھے ہو گئی۔ (حلیۃ الاولیاء، سفیان بن عیینہ، الحدیث ۱۰۸۹۳، ج ۷، ص ۷۲، ۳)

حضرت سیّدنا اہل تسری رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

دل عرش (کی مثل) اور سینہ کرسی (کی طرح) ہے۔

یہ فرمان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی دل سے مراد صنوبری شکل کے گوشت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

آدمی دنیا سے زیادہ عقل:

حضرت سیّدنا علی بن عاصم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ارشاد فرمایا:

اگر نصف (یعنی آدمی) اہل زمین کی عقلوں سے امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عقل کا موازنہ کیا جائے تو بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عقل زیادہ ہوگی۔ (معین العمیۃ فی مناقب الامام ابی حنیفہ للسیوطی ص ۱۲۸)

[سورة البقرة (2) : آية 45]

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَأِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (45)

”اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بیشک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں۔“

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ متصل بما قبلہ، كأنہم لما أمرُوا بما يشق عليهم لما فيه من الكلفة وترك الرياسة والإعراض عن المال عولجوا بذلك، والمعنى استعينوا على حوائجكم بانتظار النجح والفرج توكلاً على الله أو بالصوم الذي هو صبر عن المفطرات لما فيه من كسر الشهوة، وتصفية النفس، والتوسل بالصلاة والالتجاء إليها، فإنها جامعة لأنواع العبادات النفسانية والبدنية، من الطهارة وستر العورة وصرف المال فيهما، والتوجه إلى الكعبة والعكوف للعبادة، وإظهار الخشوع بالجوارح وإخلاص النية بالقلب، ومجاهدة الشيطان، ومناجاة الحق، وقراءة القرآن، والتكلم

بِالشَّهَادَتَيْنِ وَكَفَّ النَّفْسَ عَنِ الْإِطْيَابِينَ حَتَّى تَجَاهُوا إِلَى تَحْصِيلِ الْمَأْرَبِ وَجِبْرِ
المصائب،

روى أنه عليه الصلاة والسلام كان إذا حَزَبَهُ أمر فزع إلى الصلاة
ويجوز أن يراد بها الدعاء:

وَأَنَّهَا: أَى وَإِنِ اسْتَعَانَ بِهَا أَوْ الصَّلَاةَ وَتَخْصِيصَهَا بِرَدِّ الضَّمِيرِ إِلَيْهَا، لِعَظَمِ شَأْنِهَا
وَاسْتِجْمَاعِهَا ضَرْوً بِأَمْنِ الصَّبْرِ، أَوْ جَمَلَةً مَا أَمَرُوا بِهَا وَنَهَوْا عَنْهَا.
لِكَبِيرَةِ لَثْقِيلَةِ شِاقَةِ كَقَوْلِهِ تَعَالَى: كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ.
إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ أَى الْمَخْبِتِينَ، وَالْخُشُوعَ الْإِخْبَاتَ وَمِنْهُ الْخُشْعَةُ لِلرَّمْلَةِ الْمَتَطَامِنَةِ.
وَالْخُضُوعَ اللَّيِّنَ وَالْإِنْقِيَادَ، وَلِذَلِكَ يُقَالُ الْخُشُوعَ بِالْجَوَارِحِ وَالْخُضُوعَ بِالْقَلْبِ.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ کا ماقبل سے تعلق ہے گویا ان کو جب اس چیز کا حکم دیا گیا جو آپ پر دشوار تھی کیونکہ اس میں کلفت تھی اور
سرداری کا ترک تھا اور مال سے اعراض تھا تو اس حکم کے ذریعے ان کا علاج کیا گیا، تو آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ کامیابی کا
انتظار کر کے اور کشادگی غم کا انتظار کر کے اللہ کریم پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی ضروریات پر اللہ کریم سے مدد طلب کرنا، یا معنی
یہ ہوگا کہ روزہ کے ذریعے مدد طلب کرو کیونکہ روزہ نام ہے مفطرات سے صبر کرنے کا اس لئے اس میں شہوت کو توڑنا اور نفس کو
پاک صاف رکھنا پایا جاتا ہے۔ اور مدد چاہو نماز کے ذریعے، نماز کو وسیلہ بناؤ، اور نماز کی جانب پناہ پکڑو، کیونکہ نماز عبادات قلبیہ و
بدنیہ کی تمام قسموں کو جارت ہے۔ اس میں طہارت ہے، ستر عورت ہے، صرف مال ہے، توجہ قبلہ ہے، عبادت کے لئے محبوس ہوتا
ہے، اعضاء و جوارح کے ذریعے خشوع کا اظہار ہے، دل کی نیت کا خالص رکھنا، شیطان سے مجاہدہ ہے، اللہ کریم سے شرف
مناجات کا حصول ہے، قرأت قرآن ہے، شہادتین کی ادائیگی ہے اور نفس کو اطیبیین یعنی دولت مند ترین چیزوں سے روکنا
ہے۔ الغرض نماز کو وسیلہ بناؤ تا کہ تمہاری ضرورتیں پوری کی جائیں اور مصائب کی تلافی کی جائے، حدیث شریف میں ہے کہ نبی
کریم ﷺ کو جب کوئی اہم بات درپیش ہوتی تو آپ ﷺ نماز کی جانب پناہ پکڑتے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ صلوة سے مراد
دعا ہو۔

وَأَنَّهَا الْكَبِيرَةُ

یعنی استعانت بالصبر والصلوة یا صرف صلوة اور صلوة کی تخصیص اور خاص طور پر اسی کی جانب ضمیر کا لوٹنا اس
لئے ہے کہ صلوة عظیم الشان ہے اور صبر کی بہت سی قسموں کو جامع ہے، یا "انہا" کا مرجع وہ تمام چیزیں ہیں جن کا،

یبنی اسرائیل اذ کروا نعمتی الّتی

وَابْتَغِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ
تک ٹھم دیا گیا ہے، اور وہ تمام چیزیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔

کبیرۃ

اس کا معنی ثقیل اور دشوار ہے، کیونکہ اللہ کریم کا ارشاد ہے،

كَذَّبُوا عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ.

مشرکین پر وہ چیز شاق اور دشوار ہے جس کی طرف آپ ان کو دعوت دے رہے ہیں۔

إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ

خاشعین وہ ہیں جو عاجزی کرنے والے ہیں۔ خشوع کے معنی عاجزی کرنے کے ہیں، اسی سے خشعہ لیا گیا ہے جس کا معنی

بچھا ہوا اور ز میں پر پھیلا ہوا ریت ہے۔ اور خضوع معنی نرم ہونا اور فرمانبردار ہونا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خشوع اعضاء و جوارح کا ہوتا ہے اور خضوع دل کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

استعانة:

الاستعانة

مدد طلب کرنا قرآن میں ہے:

"اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ" (سورة البقرة آیت نمبر 45)

صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

صبر کی تعریف:

(صبر) الصبر (Patience)

کے معنی ہیں کسی کوشش کی حالت میں روک رکھنا۔ لہذا الصبر کے معنی ہوئے عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک

کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا۔

"وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ" (سورة الاحزاب آیت نمبر 35)

صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور روزہ کو صبر کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبط نفس کی ایک قسم ہے۔

حدیث پاک:

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"صيام شهر الصَّيْرِ وثلاثة أيام في كل شهر يذهب وحر الصدق"
ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں۔

تحقیق خشوع:

(خ ش ع) الخشوع (ن) (Humility)

کے معنی ضواعة یعنی عاجزی کرنے اور جھک جانے کے ہیں۔ مگر زیادہ تر خشوع کا لفظ جوارح اور ضراعت کا لفظ قلب کی عاجزی پر بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے:

اذا ضرعت القلب خشعت الجوارح جب دل میں فروتی ہو تو اسی کا اثر جوارح پر ظاہر ہو جاتا ہے قرآن میں ہے:

"وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 109)

اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

"الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 2)
جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔

"وَكَانُوا النَّاسَ خَاشِعِينَ" (سورۃ الانبياء آیت نمبر 90)

اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔

"وَخَشَعَتِ الْأَبْصَارُهَا خَاشِعَةً" (سورۃ قطفہ آیت نمبر 108)

آوازیں پست ہو جائیں گے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ (سورۃ النازعات آیت نمبر 9)

یہ ان کی نظروں کے مضطرب ہونے سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ زمین و آسمان کے متعلق بطور کنایہ کے فرمایا۔

"إِذَا رَجَّبتِ الْأَرْضُ رَجًّا" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 4)

جب زمین کانپنے کی تھر تھرا کر۔

"وَإِذَا زُلْزِلتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا" (سورۃ الزلزلة آیت نمبر 1)

جب زمین تھر تھرا دی جائے جیسا اس کا تھر تھرا نا ٹھہرا ہے۔

"يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَورًا وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سِيرًا" (سورۃ الطور آیت نمبر 9-10)

جس دن آسمان ہلنا سا ہلنا ہلیں گے اور پہاڑ چلنا سا چلنا چلیں گے۔

[سورة البقرة (2) : آية 46]

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُم إِلَيَّ رَاجِعُونَ (46)
 ”جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا۔“

متن:

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُم إِلَيَّ رَاجِعُونَ أَيُّ يَتَوَقَّعُونَ لِقَاءَ اللَّهِ تَعَالَى وَنِيلَ مَا عِنْدَهُ أَوْ يَتَيَقِنُونَ أَنَّهُمْ يَحْشُرُونَ إِلَى اللَّهِ فِيجَازِيهِمْ، وَيُؤَيِّدُهُ أَنْ فِي مَصْحَفِ ابْنِ مَسْعُودٍ يَعْلَمُونَ وَكَانَ الظَّنُّ لَهَا شَابَهُ الْعِلْمُ فِي الرَّجْحَانِ أَطْلَقَ عَلَيْهِ لِتَضَمُّنِ مَعْنَى التَّوَقُّعِ، قَالَ أَوْسُ بْنُ حَجْرٍ:

فَأَرْسَلَتْهُ مُسْتَيَقِنَ الظَّنِّ أَنَّهُ... مُخَالِطٌ مَا بَيْنَ السَّيْفِ جَائِفٌ
 وَإِنَّمَا لَمْ تَثْقَلْ عَلَيْهِمْ ثِقَلَهَا عَلَى غَيْرِهِمْ فَإِنَّ نَفْسَهُمْ مَرْتَاضَةٌ بِأَمْثَالِهَا، مَتَوَقَّعَةٌ فِي مَقَابِلِهَا مَا يَسْتَحْقِرُ لِأَجَلِهِ مَشَاقِقَهَا وَيَسْتَلْذِبُ سَبَبَهُ مَتَاعِبَهَا، وَمِنْ ثَمَّةٍ
 قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ «وَجَعَلَتْ قِرَّةَ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ».

ترجمہ:

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُم إِلَيَّ رَاجِعُونَ:
 جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا

وہ اللہ کریم سے ملاقات کی امید رکھتے ہیں اور جو اجر ان کے پاس ہے اس کو پانے کی امید رکھتے ہیں۔ یا معنی یہ ہیں کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کو اللہ کریم کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا۔ پھر ان کو بدلہ عطا فرمائے گا۔ اس معنی کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں "یعلمون" آیا ہے اور ظن اعتقاد راجح ہونے میں چونکہ یقین سے مشابہ ہے اس لئے "ظن" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ تاکہ توقع کے معنی کی تفسیر ہو جائے اور اوس بن حجر کا شعر ہے،

فَأَرْسَلَتْهُ مُسْتَيَقِنَ الظَّنِّ أَنَّهُ... مُخَالِطٌ مَا بَيْنَ السَّيْفِ جَائِفٌ

میں نے تیر کو اس علم پر یقین کرتے ہوئے چھوڑا کہ وہ شکار کی پسلیوں کے درمیان سے جائے گا اور شکم میں نفوذ کرے گا۔ اور خاشعین پر نماز اتنی ثقیل نہیں جتنی کہ غیر خاشعین پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ نماز جیسی چیزوں کے خوگر ہیں اور نماز کے بدلے وہ ان جزاؤں کی توقع رکھتے ہیں جن کی وجہ سے نماز کی مشقتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان ہی جزاؤں کے سبب نماز کے تعجب میں ڈالنے والی چیزیں ان کو لذیذ معلوم ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وجعلت قرآءة عيني في الصلاة
ييري آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔

لفظ ظن کا مفہوم:

(ظنن) الظن (Doubt, To Presume)

گمان:

جس بات کی طرف نفس جھک جائے اور دل اس کی طرف مائل ہو جائے اسے گمان کہتے ہیں۔

اور ظن چونکہ عام طور پر برابر ہوتا ہے اس لئے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا" (سورہ قیونس آیت نمبر 36)

اور ان میں اکثر تو نہیں چلتے مگر گمان پر۔

بدگمانی کی حرمت کا سبب:

بدگمانی حرام ہونے کا سبب یہ ہے کہ دل کے بھیدوں کو سوائے اللہ عزَّ وَّجَلَّ کے کوئی نہیں جانتا اور جب تک کسی شخص کی برائی اس طرح ظاہر نہ دیکھو کہ اس میں تاویل کی گنجائش باقی نہ رہے اس وقت تک تمہارے لئے اس کے بارے میں برائی کا عقیدہ رکھنا جائز نہیں اور جب اس طرح دیکھو کہ اس میں کوئی تاویل کی گنجائش باقی نہ رہے تو اس وقت جو بات تمہیں معلوم ہوئی یا جس کا تم نے آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے اس کا اعتقاد رکھے بغیر تو کوئی چارہ نہیں لیکن جس بات کو تم نے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کانوں سے سنا پھر بھی وہ تمہارے دل میں آگئی تو یہ شیطان نے ڈالی ہے، لہذا اسے جھٹلانا چاہئے کہ شیطان سب سے بڑا قاتل ہے۔ (احیاء العلوم جلد نمبر 3 صفحہ نمبر 455)

[سورة البقرة (2): آية 47]

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَلِيَّ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (47)
”اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی۔“

متن:

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ كَرَّةً لِلتَّأْكِيدِ وَتَذْكَيرِ التَّفْضِيلِ
الذی ہو أجل النعم خصوصاً، وربطه بالوعيد الشديد تخويفاً لمن غفل عنها وأهل
بمقوقها.

وَأَلِيَّ فَضَّلْتُكُمْ عطف على نعمتي.

عَلَى الْعَالَمِينَ أَمْ عَالِمِي زَمَانِهِمْ، يَرِيدُ بِهِ تَفْضِيلَ آبَائِهِمُ الَّذِينَ كَانُوا فِي عَصْرِ مُوسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَبَعْدَهُ، قَبْلَ أَنْ يَضُرَّوْا بِمَا مَنَعَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى مِنَ الْعِلْمِ وَالْإِيمَانِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ، وَجَعَلَهُمْ أَنْبِيَاءَ وَمُلُوكًا مُقْسَطِينَ. وَاسْتَدَلَّ بِهِ عَلَى تَفْضِيلِ الْبَشَرِ عَلَى الْمَلَكِ وَهُوَ ضَعِيفٌ.

ترجمہ:

يَا أَيُّهَا إِسْرَائِيلُ اذْكُرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا۔

یہ خطاب مکرر اس لئے لایا گیا ہے تاکہ تاکید ہو جائے اور اس تفضیل و تکریم کی یاد دہانی ہو جائے۔ جو خاص طور پر ان انعامات کی وجہ سے متحقق ہوئی، نیز تکرار کا مقصود یہ بھی ہے کہ اس خطاب کو شدید وعید کے ساتھ جوڑ دیا جائے تاکہ جو نعمتوں سے غافل ہیں ان کی ادائیگی حقوق میں کوتاہی کر رہے ہیں ان کی تخویف ہو اور وہ ڈریں۔

وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ.

اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی۔

یہ عبارت "نعمتی" پر معطوف ہے۔ اور "العالمین" سے مراد ان کے دور کا عالم ہے، مراد یہ ہے کہ یہود کے وہ آباؤ اجداد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کے بعد ہوئے اور ابھی انہوں نے اللہ کریم کی عطا کردہ چیزوں مثلاً علم، ایمان اور عمل صالح میں تبدیلی نہیں کی تھی، ان کو فضیلت عطا کی، اور ان کو نبی بنایا اور منصف بادشاہ بنایا اور بعض نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ انسان افضل ہیں فرشتوں سے، لیکن یہ استدلال کمزور ہے۔

الذکرى کا معنی:

الذکرى۔ کثرت سے ذکر الہی کرنا اس میں الذکر سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن میں ہے:

"ذَكَرْتُهُ كَذَا"

قرآن میں ہے: "وَذَكَرْتُهُمْ بِآيَاتِهِمُ اللَّهُ" (سورۃ البراقہ آیت نمبر 5)

اور ان کو اللہ کے دن یاد دلاؤ۔

اور آیت کریمہ: "فَتَذَكَّرْهُمْ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 282)

تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا دے۔ اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر

بنادے گی۔ بعض علماء نے آیت کریمہ:-

"فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 152)

سو تم مجھے یاد کیا کریں تمہیں یاد کروں گا۔

"اَذْكُرُوا نِعْمَتِي" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 40)

یاد کرو میرا وہ احسان۔

میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ کے مخاطب نبی کریم ﷺ کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس نے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔ اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الہی میں غور فکر کرتے رہو حتیٰ کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔

تحقیق لفظ فضل:

(ف فضل) الفضل (Virtue) .

کے معنی کسی چیز کے اقتضا (متوسط درجہ سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے محمود جیسے علم و حلم وغیرہ کی زیادتی مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا لیکن عام طوراً الفضل اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے اور الفضول بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(1) برتری بلحاظ جنس کے جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔

(2) برتری بلحاظ نوع کے جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 70)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(3) فضیلت بلحاظ ذات مثلاً ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی فضیلت بلحاظ جوہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا مثلاً گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لئے اس کا اکتساب عین ممکن ہے

چنانچہ آیات کریمہ:

"وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 71)

اور اللہ نے رزق (دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

"لِيَتَّبِعُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 12)

تا کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔

میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نوٹ: لفظ عالم اور نعمت کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 48]

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ

وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (48)

”اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے اور نہ ان کی مدد ہو“۔

متن:

وَاتَّقُوا يَوْمًا أَمَّا فِيهِ مِنَ الْحِسَابِ وَالْعَذَابِ.

لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا لَا تَقْضَى عَنْهَا شَيْئًا مِنَ الْحَقُوقِ، أَوْ شَيْئًا مِنَ الْجِزَاءِ فَيَكُونُ نَصَبَهُ عَلَى الْمَصْدَرِ، وَقَرَأَ لَا تَجْزَى مِنْ أَجْزَاءِ عِنْدَ إِذَا أَغْنَى وَعَلَى هَذَا تَعَيَّنَ أَنْ يَكُونَ مَصْدَرًا، وَإِيرَادَةُ مَنْكَرًا مَعَ تَنْكِيرِ النَّفْسَيْنِ لِلتَّعْبِيمِ وَالْإِقْنَاتِ الْكُلِّيَّ وَالْجُمْلَةَ صِفَةً لِيَوْمًا، وَالْعَائِدُ فِيهَا مَحْذُوفٌ تَقْدِيرُهُ لَا تَجْزَى فِيهِ، وَمَنْ لَمْ يَجُوزْ حَذْفُ الْعَائِدِ الْمَجْرُورِ قَالَ: اتَّسَعَ فِيهِ فَحَذَفَ عَنْهُ الْجَارَ وَأَجْرَى مَجْرَى الْمَفْعُولِ بِهِ ثُمَّ حَذَفَ كَمَا حَذَفَ مِنْ قَوْلِهِ: أَمَّا مَالٌ أَصَابُوا.

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ أَيْ مِنَ النَّفْسِ الثَّانِيَةِ الْعَاصِيَةِ، أَوْ مِنَ الْاُولَى، وَكَانَ أُرِيدَ بِالْآيَةِ نَفْيَ أَنْ يَدْفَعَ الْعَذَابَ أَحَدٌ عَنْ أَحَدٍ مِنْ كُلِّ وَجْهِ مُحْتَمِلٍ، فَإِنَّهُ إِمَّا أَنْ يَكُونَ قَهْرًا أَوْ غَيْرَهُ، وَالْاُولَى النَّصْرَةَ، وَالثَّانِي إِمَّا أَنْ يَكُونَ مَهَانًا أَوْ غَيْرَهُ. وَالْاُولَى أَنْ يَشْفَعَ لَهُ وَالثَّانِي إِمَّا بِأَدَاءِ مَا كَانَ عَلَيْهِ وَهُوَ أَنْ يَجْزَى عَنْهُ، أَوْ بِغَيْرِهِ وَهُوَ أَنْ يُعْطَى عَنْهُ عَدْلًا. وَالشَّفَاعَةُ مِنَ الشَّفَعِ كَأَنَّ الْمَشْفُوعَ لَهُ كَانَ فَرْدًا فَجَعَلَهُ الشَّفِيعَ شَفْعًا بَضْمَ نَفْسِهِ إِلَيْهِ، وَالْعَدْلُ الْفِدْيَةُ. وَقِيلَ: الْبَدْلُ وَأَصْلُهُ التَّسْوِيَةُ سُمِّيَ بِهِ الْفِدْيَةُ لِأَنَّهَا سُوِّيَتْ بِالْمَفْدَى، وَقَرَأَ ابْنُ كَثِيرٍ وَأَبُو عَمْرٍو وَلَا تُقْبَلُ بِالْتَّاءِ.

وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ يَمْنَعُونَ مِنَ عَذَابِ اللَّهِ، وَالضَّمِيرُ لَهَا دَلَّتْ عَلَيْهِ النَّفْسُ الثَّانِيَةُ

المنكرة الواقعة في سياق النفس من النفوس الكفيرة، وتذكيرة بمعنى العباد، أو
الاناسي والنصر أخص من المعونة لاختصاصه بدفع الضرر، وقد تمسكت المعتزلة بهذه
الآية على نفي الشفاعة لأهل الكبائر، وأجيب بأنها مخصوصة بالكفار للآيات
والاحاديث الواردة في الشفاعة، ويؤيده أن الخطاب معهم، والآية نزلت ردًا لما كانت
اليهود تزعم أن آباءهم تشفع لهم.

ترجمہ:

وَاتَّقُوا يَوْمًا

اور ڈرو اس دن سے۔

یہاں یوماً سے مراد وہ دن ہے جس دن حساب اور جزا و عذاب ہوگا۔

لا تجزى نفس عن نفس

جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی۔

یعنی کوئی بھی شخص کسی دوسرے کی طرف سے کوئی حق ادا نہیں کرے گا، اس تقدیر پر شینیا کا نصب مصدر یعنی مفعول
مطلق ہونے کی بنا پر ہوگا اور ایک قرأت "لا تجزى" بھی ہے یہ "اجزاء عنہ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کام آیا۔ اس
صورت میں شینیا کا مفعول مطلق ہونا متعین ہے اور شینیا کو اور دونوں "نفس" کو نکرہ لانا عموم پیدا کرنے اور کلی طور پر مایوس
کرنے کے لئے ہے۔ اور "لا تجزى" الخ کا جملہ یوماً کی صفت واقع ہے۔ اور جملہ موصوف کی جانب رجوع ہونے والی
ضمیر مخذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی "لا تجزى فیہا" اور جو لوگ ضمیر عائد مجرور کا حذف جائز قرار نہیں دیتے وہ کہتے
ہیں کہ جملہ میں اتباع سے کام لیا گیا ہے یعنی "فیہ" کے حرف جار کو حذف کر کے عائد کو مفعول بہ کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔
پھر اس مفعول بہ کو بھی حذف کر دیا گیا جیسا کہ شاعر کے اس کلام میں اسی طرح کا تصرف اور حذف ہوا ہے، کلام ہے

أَمْ مَالٌ أَصَابُوا. وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَذْلٌ

اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے۔

یہاں ضمیر اس "نفس" کی طرف راجح ہیں۔ جو پہلے جملہ میں دوسرے نمبر پر مذکور ہیں یعنی نفس عاصی معنی یہ ہوں گے
نہیں قبول کی جائے گی نفس ثانیہ عاصیہ کی طرف سے کوئی سفارش الخ۔ یا یہ کہ ضمیر نفس اولیٰ کی جانب راجح ہے معنی یہ ہوں گے
کہ نفس اولیٰ اگر کوئی سفارش کرنا چاہے گا تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے گی اور گویا آیت کریمہ سے مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی
شخص ہو طرح کی کوشش کر لے تب بھی وہ کسی دوسرے سے عذاب کو دور نہیں کر سکتا اس لئے کہ دفع عذاب یا تو قہر اور غلبہ کے
ذریعہ ہوگا یا اس کے بغیر، پہلی صورت نصرت کی ہے، اور دوسری صورت کی دو قسمیں ہیں پہلی یہ کہ دفع عذاب بلا عوض ہو اور
دوسری یہ کہ بالعوض ہو۔

بلا عوض یہ ہے کہ اس کے لئے سفارش کی جائے اور بالعوض کی دو صورتیں ہیں یا تو اس حق کی ادائیگی کے ذریعہ جو اس پر عائد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مجرم کی جانب سے خود اپنے اعمال کو بدلے میں پیش کر دے یا اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت ہو اور وہ یہ ہے کہ اس کی طرف سے فدیہ ادا کر دے۔

"شفاعة" یہ مشتق ہے شفع سے جس کا معنی نشت ہے گویا مشفوع لہ تنہا تھا اور شفع نے اس کو جفت بنا دیا یا بس طور کہ خود کو اس کے ساتھ شامل کر دیا اور "عدل" کے معنی فدیہ کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی بدل ہے اور اس کا اصل معنی ہے برابر رکھنا۔ اس نام کے ساتھ فدیہ کو اسلئے موسوم کیا گیا ہے کہ فدیہ مفدی کے برابر ہوتا ہے اور ابن کثیر اور ابو عمر نے "ولا تقبل" تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور نہ ان کی مدد ہو۔

ولا ہم ینصرون

یعنی ان کو اللہ کریم کے عذاب سے نہیں بچایا جائے گا۔ اور "ولا ہم ینصرون" کی ضمیر ان نفوس کثیرہ کی جانب راجع ہے جن کے اوپر نفس ثانیہ دلالت کرتا ہے جو کہ نکرہ ہے اور نفی کے تحت داخل ہے اور اس کو مذکر لانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بندوں اور انسانوں کے معنی میں ہے۔ اور نصرت معونہ کے معنی میں خاص مطلق ہے، کیونکہ نصرت کے مفہوم میں مدد کے ساتھ ساتھ دفع ضرر کی خصوصیت بھی ہے۔ اور معتزلہ نے اس آیت کے ذریعہ اس پر استدلال کیا ہے کہ اہل کبار کی شفاعت نہیں ہو سکتی اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرینہ وہ آیات واحادیث ہیں جو شفاعت کے سلسلہ میں وارد ہیں اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ خطاب کفار سے ہے اور آیت کریمہ یہود کے اس دعویٰ کی تردید کے لئے اتری کہ ان کے اباؤ اجداد ان کے لئے سفارش کریں گے۔

تعریف لفظ یوم:

(یوم) الیوم (ن) (Day)

یہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے اور عربی زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا ایک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

"إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 155)

بے شک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں۔

لفظ جزاء کا معنی:

(جزی) الجزاء (ض) (Reward)

کافی ہونا۔ قرآن میں ہے:

"لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 48-123)

کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا۔

الجزاء کا معنی:

الجزاء (اسم)

کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو جیسے خیر کا بدلہ خیر سے اور شر کا بدلہ شر سے دیا جائے۔ کہا جاتا ہے۔ جزیتہ کذا بكذا میں نے

فلاں کو اس ک عمل کا ایسا بدلہ دیا قرآن میں ہے:

"وَذَلِكَ جَزَاءٌ مِّنْ تَزَوُّجِي" (سورۃ طہ آیت نمبر 76)

اور یہ صلہ ہے اس کا جو پاک ہوا۔

قبل و تقبل کی تحقیق:

قبل اور تقبل کے معنی کیس چیز کو اس طرح قبول کرنے کے میں کہ وہ عوض کی مقتضی ہو جیسے ہدیہ وغیرہ قرآن میں ہے:

"أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا سَعَوْا" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 16)

یہی لوگ ہیں جن کے اعمال نیک ہم قبول کریں گے۔

"إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 27)

اللہ اسی سے قبول کرتا ہے جسے ڈر ہے۔

میں اس بات پر تشبیہ ہے کہ ہر عیادت قبول نہیں ہوتی بلکہ وہی قبول کی جاتی ہے جو مخصوص طریق سے ادا کی جائے۔ فرمایا:

"مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلَ مِنِّي" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 35)

تو اسے میری طرف سے قبول فرما۔

کفالتہ کو قبالتہ کہا جاتا ہے کیونکہ کفالتہ کے معنی مؤ کی طور پر کسی چیز کو قبول کر لینے کے ہیں تو آیت فتقبل منی میں

کفالت کے معنی معتبر ہیں اور لکھے ہوئے عہد کو قبالتہ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

"فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 37)

تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تقبلہا کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تکلفہا کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

کہ اس نے درحقیقت مجھے بہت بڑی کفالت کا ذمہ دار بنا دیا ہے۔

لفظ شفاعت کی عمدہ تحقیق:

(To Mediate, Entreaty) الشفاعة

کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا سفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ عام طور پر کسی بڑے باعزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اسکی مدد کے لئے شامل ہو جانے پر بولا جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز شفاعت بھی اسی قبیل سے ہوگی۔ قرآن میں ہے،

"لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا" (سورہ قمر آیت نمبر 87)

اس دن کسی کی شفاعت کام نہ دے گی مگر اس کی جسے رحمن نے اذن دے دیا ہے۔

"لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ" (سورہ قطفہ آیت نمبر 109)

لوگ شفاعت کے مالک نہیں مگر وہی جنہوں نے رحمن کے پاس قرار کر رکھا ہے۔

"لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئاً" (سورہ النجم آیت نمبر 26)

جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی۔

"وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَى" (سورہ الانبیاء آیت نمبر 28)

وہ اس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر اس شخص کی جس سے خدا خوش ہو۔

"فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ" (سورہ المدثر آیت نمبر 48)

تو انہیں سفارش شیوں کی سفارش کام نہ دے گی۔

یعنی جن معبودوں کو یہ اللہ کے سوسفارش کے لئے پکارتے ہیں۔ وہ ان کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔

"مَنْ حَمِيحٌ وَلَا شَفِيعٌ" (سورہ قموں آیت نمبر 18)

نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارشی۔

"مَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً حَسَنَةً" (سورہ النساء آیت نمبر 85)

جو اچھی سفارش کرے۔

اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔ یعنی جو شخص اچھے یا برے کام میں کسی کی مدد اور سفارش کرے گا وہ بھی اس نفل کے نفع و نقصان میں اس کا شریک ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لئے کسی اچھے یا برے مسلک کی بنیاد رکھے اور وہ اس کی اقتداء کرنے کو وہ ایک طرح سے اس کا شفیع بن جاتا ہے۔

حدیث پاک:

جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من سنَّ سُنَّةَ حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا، وَمَنْ سنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وَزَرُّهَا
وَوَزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا"

کہ جس شخص نے اچھی رسم جاری کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اسے اجر ملے گا اور جس
نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

"مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهِ" (سورۃ یونس آیت نمبر 3)

کوئی (اس کے پاس) اس کا اذن لیے بغیر کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلا ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے
اور نظام کائنات کے چلانے میں کوئی اس کا سا جھمی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ امور کی تدبیر و تقسیم کرنے والے فرشتوں کو اجازت
دیتا ہے تو وہ اس کی اجازت سے تدبیر امر کرتے ہیں۔

شَفَعَهُ اور شَفَعَهُ كَمَا مَعْنَى:

"وَاسْتَشْفَعْتُ بِفُلَانٍ عَلَى فُلَانٍ فَتَشَفَّعَ لِي"

میں نے فلاں سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد لی۔

وَشَفَّعَهُ: کے معنی کسی کی سفارش قبول کرنے کے ہیں۔ اور اسی کا فرمان ہے،

الْقُرْآنُ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ

کہ قرآن شافع اور مشفع ہوگا یعنی قرآن کی سفارش قبول کی جائے گی۔

الشَّفَعَةُ کے معنی ہیں کسی مشترکہ چیز کے فروخت ہونے پر اس کی قیمت ادا کر کے اسے اپنے ملک میں شامل کر لینا۔ یہ

شفع سے مشتق ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"إِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ فَلَا شُفْعَةَ"

جب حدود مقرر ہو جائیں تو حق شفیعہ باقی نہیں رہتا۔

حافظ کتنے افراد کی شفاعت کرے گا؟

عرض: حضور حافظ کتنوں کی شفاعت کرے گا سنا گیا ہے کہ اپنے اَعْرَاضِ (یعنی رشتہ داروں میں) سے دس شخصوں کی؟

ارشاد: ہاں۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب فی فضل من تعلم القرآن وعلّمہ، الحدیث ۲۱۶، ج ۱، ص ۱۳۱)

اور اُس کے ماں باپ کو قیامت کے دن ایسا تاج پہنایا جائے گا جس سے مشرق سے مغرب تک روشن ہو جائے اور شہید پچاس شخصوں کی، حاجی ستر کی، اور علمائے گنتی لوگوں کی شفاعت کریں گے۔ حتیٰ کہ عالم کے ساتھ جن لوگوں کو کچھ بھی تعلق ہوگا، اُس کی شفاعت کریں گے۔ کوئی کہے گا:

میں نے وضو کے لئے پانی دیا تھا، کوئی کہے گا: میں نے فلاں کام کر دیا تھا۔ لوگوں کا حساب ہوتا جائے گا اور وہ جنت کو بھیجے جائیں گے، علما کا حساب کب کا ہو چکا ہوگا اور وہ روکے جائیں گے۔ عرض کریں گے:

الہی (عَزَّ وَجَلَّ) لوگ جارہے ہیں، ہم کیوں روکے گئے ہیں؟ فرمایا جائے گا:

تم آج میرے نزدیک فرشتوں کی مانند ہو شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت سے لوگ بخشے جائیں۔ ہر سنی عالم سے فرمایا جائے گا اپنے شاگردوں کی شفاعت کر اگر چہ آسمان کے ستاروں کے برابر ہوں۔ (ملفوظات اعلیٰ حضرت صفحہ نمبر 92)

لفظ اخذ کی تحقیق:

(اخذ) (Hold, To Catch)

کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 79)

کہا خدا کی پناہ کہ ہم لیں مگر اسی کو جس کے پاس ہمارا مال ملا۔

اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں جیسے فرمایا:

"لَا تَأْخُذُكَ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 255)

اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند۔

تحقیق عمیق للفظ العدل:

(عدل) (العدالة والمعادلة) (Justice)

کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں اور معنی اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے یعنی ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہوتا اور عدل عدل کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن عدل کا لفظ معنوی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے احکام شرعیہ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

"أَوْ عَدْلٌ ذَلِكَ صِيَاماً" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 95)

اور عدل ذلک صیاماً یا اس کے برابر روزے رکھنا اور عدل و عدیل کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بولے جاتے ہیں جن

کا اور اک حواس ظاہرہ سے ہوتا ہے جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق ماپ تول یا وزن سے ہوتا ہے پس عدل کے معنی دو چیزوں کا برابر ہونا کے ہیں چنانچہ اسی معنی میں مروی ہے،

"بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ"

کہ عدل ہی سے آسمان وزمین قائم ہیں یعنی اگر عناصر اربعہ جن کائنات نے ترکیب پائی ہے میں سے ایک عنصر میں بھی اس کی معینہ مقدار سے کمی یا بیشی ہو جائے تو نظام کائنات قائم نہیں رہ سکتا،

العدل دو قسم پر ہے

عدل مطلق:

جو عقلاً مستحسن ہوتا ہے یہ نہ تو کسی زمانہ میں منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے تعدی کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے مثلاً کسی کے احسان کے بدلہ میں اس پر احسان کرنا اور جو تمہیں تکلیف نہ دے اسے ایذا رسانی سے باز رہنا وغیرہ۔

عدل شرعی:

جسے شریعت نے عدل کہا ہے اور یہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے جیسے قصاص جنایات کی دیت اور مال مرتد کی اصل وغیرہ چنانچہ

آیات:

"فَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۹۴)

پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے۔ واپس ہی تم اس پر کرو۔

"وَجَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر ۴۰)

اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔ میں زیادتی اور برائی کی سزا کا کام بھی زیادتی اور برائی ہی قرار دیا ہے۔ اور

آیت کریمہ:

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ" (سورۃ النحل آیت نمبر ۹۰)

خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

میں عدل کے یہی معنی مراد کیونکہ کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینے کا نام عدل یعنی نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے اور نیکی کے مقابلہ میں زیادہ نیکی اور شر کے مقابلہ میں مسامحت سے کام لینے کا نام احسان ہے اور لفظ عدل واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے رجل عدل عادل ورجال عدل شاعر نے کہا ہے:

فهم رضا وهم عدل

وہ راضی رہنے والے اور عادل ہیں۔

در اصل عدل کا لفظ مصدر ہے چنانچہ آیت:

"وَأَشْهِدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنكُمْ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 2)

اور اپنے میں سے دو منصب مردوں کو گواہ بنا لو میں عدل کے معنی عدالہ ہیں قرآن میں ہے:

"وَأْمُرْنَا لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 15)

اور مجھے حکم ہوا کہ تم میں انصاف کروں۔

"لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 8)

اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر مادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو۔

اور آیت کریمہ: "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا ابْنِ النِّسَاءِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 129)

اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کر سکو گے۔

اس آیت میں انسان کے طبعی میلان کی طرف اشارہ ہے کہ تمام بیویوں سے برابر و جہ کی محبت اس کی قدرت سے باہر

ہے۔

اور آیت کریمہ: "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً" (سورۃ النساء آیت نمبر 3)

اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت کافی ہے۔

میں عدل سے نان و نفقہ اور ازواجی تعلقات میں برابری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

"أَوْ عَدْلٌ ذَلِكُمْ صِيَامًا" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 95)

اس کے برابر روزے رکھنا۔ میں عدل سے مراد یہ ہے کہ وہ روزے طعام سے فدیہ کے برابر ہوں کیونکہ فدیہ میں

مساوات کے معنی ملحوظ ہوں۔ اسے بھی عدل کہہ دیا جاتا ہے اور

لَا يَقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ

میں بعض نے کہا ہے کہ عدل کا لفظ فریضہ سے کنایہ ہے مگر اس کے اصل معنی وہی ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں اور صرف کا لفظ

نافلۃ سے اور یہ اصل فرض سے بڑھ کر کام کرنے کا نام ہے لہذا یہ باہم تقابل کے اعتبار سے عدل اور احسان کے ہم مثل ہیں اور

لَا يَقْبَلُ مِنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پاس کسی قسم کی نیکی ہوگی جو قبول کی جائے اور یہ آیت:

"بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 1)

کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسروں کو خدا کی مثل اور نظیر قرار دیتے ہیں۔

لہذا یہ آیت: "هُم بِهِ مُشْتَرِكُونَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 100)

کے ہم معنی ہوگی بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ وہ افعال الہیہ کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں بعض نے اللہ

تعالیٰ کی عبادت سے عدول کرنا مراد لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

”بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْبَدُونَ“ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 60)

بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

بھی اسی معنی پر محمول ہو سکتی ہے یعنی اس کے معنی بعد لون بہ کے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عدل عن الحق سے مشتق ہو جس کے معنی حق سے ہٹ جانا کے ہیں۔ ایام معتدلات معتدل زمانہ یعنی جب رات دن برابر ہوتے ہیں۔ عادل بین الامرین اس نے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کیا عادل الامر کسی معاملہ میں پھنس گیا اور کسی ایک جانب فیصلہ نہ کر سکا اور جب کسی شخص کی زندگی سے مایوسی ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے:

وضع علی یدی عدل
یعنی اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

نصرت کا معنی:

(نصر) النصر والنصر (Help, Support)

کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

”نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ“ (سورۃ الصف آیت نمبر 13)
اللہ کی مدد اور جلد آنے والی فتح۔

”إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ“ (سورۃ النصر آیت نمبر 1)

جب اللہ کی مدد آ پہنچی۔

نوٹ: لفظ وفتی، نفس اور شئی کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 49]

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُدَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ

نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (49)

”اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ تم پر بڑا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام۔“

متن:

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ تَفْصِيلٌ لِمَا أَجْلَهُ فِي قَوْلِهِ: اذْكُرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَعَطْفٌ عَلَى نِعْمَتِي، وَقِرَاءَةُ النِّجْمِ عَلَيْكُمْ. وَأَصْلُ آلٍ أَهْلٌ لِأَنَّ تَصْغِيرَهُ أَهْيَلٌ، وَخَصَّ

بالإضافة إلى أولى الخطر كالأنبياء والملوك. وفرعون لقب لمن ملك العمالة ككسرى
وقصر لملكي الفرس والروم. ولعتوهم اشتق منه تفرعن الرجل إذا عتا وتجبر. وكان
فرعون موسى، مصعب بن ريان، وقيل ابنه وليد من بقايا عاد. وفرعون يوسف عليه
السلام، ريان وكان بينهما أكثر من أربع مائة سنة.

يَسُومُونَكُمْ يَبْغُونَكُمْ، من سامه خسفاً إذا أؤلاه ظلماً، وأصل السوم الذهب في طلب
الشيء.

سوء العذاب أفضعه فإنه قبيح بالإضافة إلى سائره، والسوء مصدر ساء يسوء ونصبه
على المفعول ليسومونكم، والجملة حال من الضمير في نجيناكم، أو من آل فرعون أو
منها جميعاً لأن فيها ضمير كل واحد منها.

يَذُتُّونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ بيان ليسومونكم ولذلك لم يعطفه وقرء
«يَذُتُّونَ» بالتخفيف.

وإنما فعلوا بهم ذلك لأن فرعون رأى في المنام، أو قال له الكهنة: سيولد منهم من
يذهب بملكه، فلم يرد اجتهادهم من قدر الله شيئاً.

وَفِي ذَلِكَ بَلَاءٌ مَحْنَةٌ، إن أشير بذلكم إلى صنيعهم، ونعمة إن أشير به إلى الإنجاء، وأصله
الاختبار لكن لما كان اختبار الله تعالى عبادة تارة بالمنحة أطلق عليهما، ويجوز أن
يشار بذلكم إلى الجملة ويراد به الامتحان الشائع بينهما.

مِنْ رَبِّكُمْ بتسليطهم عليكم، أو ببعث موسى عليه السلام وتوفيقه لتخليصكم، أو
بهما. عَظِيمٌ صفة بلاء. وفي الآية تنبيه على أن ما يصيب العبد من خير أو شر اختبار
من الله تعالى، فعليه أن يشكر على مسارة ويصبر على مضارة ليكون من خير المختبرين.

ترجمہ:

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ

اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی۔

"اذ کرو انعمتی الٹی علیکم" میں جو بات مجمل تھی یہ اس کی تفصیل ہے وہاں مجھلایا فرمایا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل
میرے انعامات کو یاد کرو۔ لیکن وہ انعامات کیا ہیں؟ ان کی تفصیل "واذ نجیناکم" سے شروع ہوتی ہے۔ "اذ نجیناکم" کا
عطف نعمتی پر ہے نعمتی عام ہے اور اذ نجیناکم خاص ہے۔ کہذا یہ عطف خاص علی العام ہے۔ جیسے کہ الملائکہ پر

جبریل و میکائیل کا عطف، عطف خاص علی الغام ہے۔ ایک قرأت انجینا کم کی بھی ہے، مفہوم دونوں قراتوں کا ایک ہی ہے۔ آل کی اصل "اہل" ہے بدلیل اہیل کیونکہ یہ اس کی تصریح ہے اور تصریح اسماء کو ان کی اصل کی طرف لواتی ہے۔ آل کا مضاف الیہ ہمیشہ مشہور اور اہم شخصیت ہوتی ہے جیسا کہ انبیاء و ملائکہ وغیرہ۔ نیز مفسر ابن جریر کہتے ہیں کہ عرب کے استعمال عام سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا مضاف الیہ ہمیشہ ذی عقل ہوتا ہے۔ لہذا آل مدینہ یا آل مکہ نہیں کہیں گے اور اگر کہیں ایسا ہو تو شاذ و نادر ہی ہے۔ قوم عمالقہ کے بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسریٰ، شاہ فارس کا اور قیصر شاہ روم کا لقب ہے چونکہ شاہان عمالقہ سرکش تھے اس لئے فرعون سے مشتق کر کے

تفرعن الرجل

بولتے ہیں یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی سرکشی کرے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جو فرعون تھا اس کا نام مصعب بن ریان تھا بعض نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاصر مصعب کا بیٹا ولید ہے، یہ قوم عاد کی نسل میں سے بچے ہوئے لوگوں میں سے ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کے فرعون کا نام ریان ہے۔ فرعون موسیٰ اور فرعون یوسف کے درمیان چار سو سال (400) سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔

"سوء العذاب"

فتیح ترین عذاب تھا۔

تمام کا تمام فتیح اور شنیع ہے اس کی تمام اقسام فتیح ہیں لہذا سوء العذاب کی تفسیر عذاب فتیح سے نہیں کی جاسکتی ورنہ سوء کا مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کا مفہوم اسی وقت ادا ہوگا جب کہ اس کی تفسیر فتیح ترین عذاب سے کی جائے۔ "السوء"۔ یہ ساء یسوء سے مصدر ہے جس کا معنی ہے رنج پہنچانا، تکلیف دینا۔ "سوء العذاب یسومونکم" کا مفعول ثانی ہے اور اسی بناء پر منصوب ہے۔ جملہ "یسومونکم" نجینا کم کی ضمیر مفعول بہ یا آل فرعون سے حال ہے، یا یہ کہ دونوں سے حال واقع ہے کیونکہ اس میں دونوں کی ضمیریں موجود ہیں، ترجمہ یہ ہوگا، اور یاد کرو وہ وقت کہ جب ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات بخشی اس حال میں کہ وہ تم کو بدترین عذاب چکھا رہے تھے۔

"یذبھون ابناء کم ویستحیون نساء کم" یہ جملہ یسومونکم کا بیان ہے اور بیان و مبین کے درمیان چونکہ کمال اتصال ہوتا ہے اس لئے اس کا اُس پر عطف نہیں کیا گیا۔ اور ایک قرأت "یذبھون" بغیر تشدید کے ہے، اور آل فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ یہ سلوک اس لئے کیا کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا یا اس سے نجومیوں نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں وہ شخص پیدا ہونے والا ہے جو تمہاری سلطنت کو ختم کر دے گا۔ لیکن فرعونیوں کی یہ تمام تر کوششیں اللہ کریم کی تقدیر کو کچھ بھی دور نہ کر سکیں۔

وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٍ

یہاں پر اگر "ذالکم" کا مشار الیہ آل فرعون کا سلوک قرار دیا جائے تو "بلاء" سے مراد محنت اور آزمائش ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ فرعونوں کے اس سلوک میں تمہارے لئے بڑی آزمائش تھی، اور اگر "ذالکم" کا مشار الیہ "نجینا کم" کا مانا جائے تو بلاء کے معنی نعمت ہوں گے ہوں گے، تو دریں صورت ترجمہ یہ ہوگا، اور ہمارے نجات دینے میں بہت بڑا انعام تھا۔ "بلاء" کے اصل معنی امتحان لینے اور جانچنے کے ہیں لیکن اللہ کریم کا امتحان کبھی مصیبت کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی انعام اور عطیات کے ذریعہ، اس لئے "بلاء" کا اطلاق دونوں معانی پر ہو سکتا ہے۔ اور ایک تیسری صورت یہ ہے کہ "ذالکم" کا مشار الیہ دونوں چیزوں کا مجموعہ قرار دیا جائے یعنی حق تعالیٰ کا انجاء اور آل فرعون کی تعذیب اور "بلاء" سے امتحان اور آزمائش کے معنی مراد لئے جائیں جو دونوں کے درمیان مشترک ہیں۔

بلاء من ربکم

ابتلاء یا انعام جو تمہارے رب کی طرف سے تھا ابتلاء کا اللہ کریم کی طرف سے ہونا اس لئے تھا کہ اس نے آل فرعون کو تمہارے اوپر مسلط کر دیا تھا، اور انعام کا اللہ کریم کی طرف سے ہونا اس طرح تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان کو اس کی توفیق بخشی کہ تم کو نجات دلائیں۔ اور جب "ذالکم" کا مشار الیہ دونوں چیزوں کا مجموعہ قرار دیا جائے تو "بلاء من ربکم" کی تفسیر یہ ہوگی کہ اللہ کریم نے یہ دونوں موقعے دیئے۔ آل فرعون کو تمہارے اوپر مسلط بھی کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے تمہیں نجات بھی عطا کی۔

"عظیم" یہ بلاء کی صفت ہے اور آیت کریمہ میں اس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ بندہ کو جو خیر یا شر پیش آتا ہے وہ اللہ کریم کی جانب سے آزمائش ہے۔ بندے کا کام یہ ہے کہ اللہ کریم کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر ادا کرے اور اس کے بھیجے ہوئے مصائب پر صبر کرتا رہے تاکہ خیر المختبرین یعنی امتحان میں اچھا جانچا ہوا اور اچھا نکلا ہوا قرار پائے۔

نجو کا مفہوم:

(ن ج و) نجو (Forgiving)

اصل میں نجاء کے معنی کسی چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ اسی سے نجا فلان من فلان کا محاورہ ہے جس کے معنی نجات پانے کے ہیں اور انجیتہ و نجیتہ کے معنی نجات دینے کے چنانچہ فرمایا:

"وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" (سورۃ النمل آیت نمبر 53)

اور جو لوگ ایمان لائے ان کو ہم نے نجات دی۔

لفظ فرعون کا معنی:

فرعون (Pharoha)

یہ علم عجیب ہے اور اس سے سرکش کے معنی لے کر کہا جاتا ہے تفرعن فلان کہ فلاں فرعون بنا ہوا ہے جس طرح کہ ابلیس سے

ابلس و تبلس وغیرہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اس سے سرکشوں کو فرعون جمع فرعون کی اور ابالسة (جمع ابلیس کی) کہا جاتا ہے۔

لفظ ساء کی عمدہ تحقیق:

ساء (Bad, Evil)

اور ساءنی کذا و سوئنی کہا جاتا ہے۔ اور اسات الی فلان (صلہ الی) بولتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"سَيِّئَاتٍ وَجُوهٌ الَّذِينَ كَفَرُوا" (سورۃ الملک آیت نمبر 27)

تو کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔

"لَيْسُوا وَاَوْجُوهُكُمْ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 7)

تا کہ تمہارے چہروں کو بگاڑیں۔

اور آیت: "مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 123)

جو شخص برے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائیگا۔

میں سوء سے اعمال قبیحہ مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:

"زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ" (سورۃ التوبة آیت نمبر 37)

ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور آیت:

"عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السُّوءِ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 6)

انہیں پر ہے بڑی گردش۔

میں دائرۃ السوء سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے۔ جو انجام کار غم کا موجب ہو اور آیت:

"وَسَاءَتْ مَصِيرًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 97)

اور وہ بری جگہ ہے۔

"وَسَاءَتْ مُسْتَقَرًّا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 66)

(دوزخ) ٹھہرنے کی بری جگہ ہے۔

میں بھی یہی معنی مراد ہے۔ اور کبھی سائنس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی معنی ذم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذِرِينَ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 177)

مگر جب وہ ان کے مکان میں اترے گا تو جن کو ڈر سنا یا گیا تھا ان کے لئے برا دن ہوگا۔

"وَسَاءَ مَا يَحْمِلُونَ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۶۶)
ان کے عمل برے ہیں۔

"سَاءَ مَثَلًا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۷۷)
مثال بری ہے۔

اور آیت: "سَيَسْتَكْفُرُكَ وَجُوهَ الَّذِينَ كَفَرُوا" (سورۃ الملک آیت نمبر ۲۷)
(تو) کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔

میں سیئت کی نسبت وجوہ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ تزن و سرور کا اثر ہمیشہ چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور آیت:

"سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا" (سورۃ قہود آیت نمبر ۷۷)

تو وہ (ان کے آنے سے) غم ناک اور تنگدل ہوئے۔ یعنی ان مہمانوں کو وہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے اسے
صدمہ لاحق ہوا۔ اور فرمایا:

"سُوءُ الْحِسَابِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر ۲۱)
ایسے لوگوں کا حساب بھی برا ہوگا۔

"وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر ۲۵)
اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔

اور کنایہ کے طور پر سوء کا لفظ عورت یا مرد کی شرمگاہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"كَيْفَ يُؤَارِي سَوْآةَ أَخِيهِ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳۱)
اپنے بھائی کی لاش کو کیونکہ چھپائے۔

"فَأُوَارِي سَوْآةَ أَخِي" (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳۱)
کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔

"يُوَارِي سَوْآتِكُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۶)
کہ تمہارے ستر ڈھانکے،

"بَدَّتْ لَهَا سَوْآتُهَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۲)
تو ان کے ستر کی چیزیں کھل گئیں۔

"لِيُبْدِيَ لَهَا مَا وُورِيَ عَنْهَا مِنْ سَوْآتِهَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۰)
کہ ان پر کھول دے ان کی شرم کی چیزیں جو ان سے چھپی تھیں۔

لفظ ذبح کا اصل معنی:

(ذبح ح) الذبح (ف) (Sacrifice, Slaughter, Killing)

اصل میں اس کے معنی حیوانات کے حلق کو قطع کرنے کے ہیں اور ذبح بمعنی مذبح آتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَقَدْ يَنْبَأُ بِيذْحِ عَظِيمٍ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 107)

اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 67)

کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو۔

ذبحت الفارۃ۔ میں نے نافہ مشک کو کوچیرا۔ یہ حیوان کے ذبح کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

اسی طرح ذبح الدن کا محاورہ ہے جس کے معنی منگے میں شگاف کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"يَذْبَحُونَ أَبْنَاءَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 49)

تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔

میں میخہ تفعیل برائے بکھیر ہے یعنی وہ کثرت کے ساتھ یکے بعد دیگرے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر رہے تھے۔

سعد الدابح:

سعد الدابح (برج جدی کے ایک) ستارے کا نام ہے اور سیلاب کے گڑھوں کو مذبح کہا جاتا ہے۔

تحقیق لفظ الابن:

(Son)

یہ اصل میں بنو ہے کیونکہ اس کی جمع ابناء اور تصغیر بنی آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"يَا بَنِيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ اخْوَتِكَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 5)

کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔

"يَا بَنِيَّ إِنِّي آرِي فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 102)

اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔

"يَا بَنِيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 13)

کہ بیٹا خدا کے ساتھ شریک نہ کرنا۔

بیٹا شیطان کی عبادت نہ کرنا۔

"يَا بَنِيَّ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ"

اور بیٹا بھی چونکہ اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے اس لئے اسے ابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بانی بنایا ہے اور بیٹے کی تکلیف میں باپ بمنزلہ معمار کے ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسرے کے سبب اس کی تربیت دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہوا ہے اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہوا ہے بھی اس کا ابن کہا جاتا جیسے: فلان ابن حرب۔ فلان جنگ جو ہے۔ ابن السبیل مسافر ابن اللیل چور۔ ابن العلم پروردگار وہ علم۔ شاعر نے کہا ہے:

أولئك بنو مخير وشتر كليهما یہ لوگ خیر و زریعنی ہر حالت میں اچھے ہیں۔

فلان ابن بطنہ پیٹ پرست فلان ابن فرجہ شہوت پرست۔ ابن یومہ جوکل کی فکر نہ کرے۔ قرآن میں ہے:

"وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ" (سورة التوبة آیت نمبر 30)

اور یہودی بولے عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ اور نصرانی بولے مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

"إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي" (سورة قعود آیت نمبر 45)

میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے۔

"إِنَّ ابْنَكَ سَرَقٌ" (سورة یوسف آیت نمبر 81)

بیشک آپ کے بیٹے نے چوری کی۔

ابن کی جمع ابناء اور بنون آتی ہے قرآن میں ہے:

"وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً" (سورة النحل آیت نمبر 72)

اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

"يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابِ وَاحِدٍ" (سورة یوسف آیت نمبر 67)

کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔

"يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" (سورة الاعراف آیت نمبر 31)

اے آدم کی اولاد اپنی زینت لوجب مسجد میں جاؤ۔

"يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ" (سورة الاعراف آیت نمبر 27)

اے آدم کی اولاد خبردار تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈالے۔

اور ابن کی مؤنث ابنۃ و بنت اور ان کی جمع اور ابن کی مؤنث ابنۃ و بنت اور ان کی جمع بنات آتی ہے قرآن میں ہے:

"هُؤلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ" (سورة قعود آیت نمبر 78)

یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لئے ستھری ہیں۔

"لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَالَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقِّي" (سورة قعود آیت نمبر 79)

تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری قوم کی بیٹیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا قوم سے خطاب:

بعض کہتے ہیں کہ حضرت لوط (علیہ السلام) نے اکابر کو قوم خطاب کیا تھا اور ان کے سامنے اپنی بیٹیاں پیش کی تھیں۔ مگر یہ ناممکن سی بات ہے کیونکہ نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی چند لڑکیاں مجمع کثیر کے سامنے پیش کرے اور بعض نے کہا ہے کہ بنات سے ان کی قوم کی عورتیں مراد ہیں اور ان کو بنات ہی اس لئے کہا ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے بلکہ والدین سے بھی اس کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اب کی تشریح میں گزر چکا ہے اور آیت کریمہ:

"وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 57)

اور اللہ کے لئے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتی ہیں۔

لفظ حیاء کا مفہوم:

(حیاء) (Modesty, Regard, Shame)

الحیاء کے معنی قباح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور بعض نے استحیٰ فقہو مستح (نجیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

"إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

خدا اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ کی مثال بیان فرمائے۔

"وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 53)

لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔

بوڑھا مسلمان:

ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔ پس اللہ کی طرف جب حیاء نسبت ہو تو اس کے معنی انقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ معزوم ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ حی کہ اللہ حی ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ قباح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سرا انجام دینے والا ہے۔

لفظ نساء کا مفہوم:

نساء (Woman, Female)

النساء والنسوان والنسوة یہ تینوں امراء کی جمع من غیر لفظہ ہیں۔ جیسے مرء کی جمع قوم آجاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 11)

اے ایمان والو نہ مرد مردوں سے نہیں عجب نہیں کہ وہ ان بننے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے دور نہیں کہ وہ ان بننے والیوں سے بہتر ہوں۔

"مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 50)
کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

تحقیق بلی:

(بلی)

بلی الونب۔ بلی وبلاء کے معنی کپڑے کا بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں اسی سے بلاہ السفرہ ای ابلاہ۔ کاج اورہ ہے۔ یعنی سفر نے لاغر کر دیا ہے اور بلوتہ کے معنی ہیں میں نے اسے آزمایا۔ گویا کثرت آزمائش سے میں نے اسے کہنہ کر دیا اور آیت کریمہ:

"هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مِمَّا أَسْلَفَتْ" (سورۃ یونس آیت نمبر 30)

وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کر لے گا۔

میں ایک قرأت نبلوا (بسیغہ جمع متکلم) بھی ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہاں ہم ہر نفس کے اعمال کی حقیقت کو پہنچان لیں گے اور اسی سے ابلیت فلان کے معنی کسی کا امتحان کرنا بھی آتے ہیں۔ اور غم کو بلاء کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جسم کو کھلا کر لاغر کر دیتا ہے۔ قرآن میں ہے

"وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 49)

اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی سخت آزمائش تھی۔

عظم کا معنی:

(عظم) العظم (Bone)

عظم الشئی کے اصل معنی کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے ہیں مجازاً ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یا مونی قرآن میں ہے:

"عَذَابٌ يَوْمٍ عَظِيمٍ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 13)

بڑے سخت دن کا عذاب تھا۔

"قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ" (سورۃ ص آیت نمبر 67)

کہہ دو کہ وہ ایک سخت حادثہ ہے۔

نوٹ: لفظ عذاب اور رب کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 50]

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (50)

"اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچالیا اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا۔"

متن:

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ فَلَقْنَاهُ وَفصلنا بين بعضه وبعض حتى حصلت فيه مسالك
بسلو ککم فیہ، أو بسبب إنجائکم، أو ملتبساً بکم كقوله:
تَدْوِسُ بِنَا الْجَمَّاءِ وَالْثَرِيَا وَقَرءَ فَرَقْنَا عَلَى بِنَاءِ التَّكْثِيرِ لِأَنَّ الْمَسَالِكَ كَانَتْ اثْنَيْ عَشَرَ
بعدد الاسباط.

فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ أَرَادَ بِهِ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهُ، وَاقْتَصَرَ عَلَى ذِكْرِهِمْ لِلْعِلْمِ بِأَنَّهُ
كَانَ أَوَّلِيهِ،

وقيل شخصه كما

روى أن الحسن رضى الله تعالى عنه كان يقول: اللهم صل على آل محمد
أى شخصه واستغنى بذلك عن ذكر أتباعه.

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ذَلِكَ، أَيْ غَرَقَهُمْ وَأَطْبَقَ الْبَحْرَ عَلَيْهِمْ، أَوْ انْفَلَقَ الْبَحْرَ عَنْ طَرَفِ
يَابِسَةٍ مَذَلَّةٍ، أَوْ جَرَّهُمْ الَّتِي قَذَفَهَا الْبَحْرُ إِلَى السَّاحِلِ، أَوْ يَنْظُرُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا.

روى أنه تعالى أمر موسى عليه السلام أن يسرى ببني إسرائيل، فخرج بهم فصباحهم
فرعون وجنوده، وضاد فوهم على شاطئ البحر، فأوحى الله تعالى إليه أن اضرب بعصاك
البحر، فضربه فظهر فيه اثنا عشر طريقاً يابساً فسلكوها فقالوا: يا موسى نخاف أن

یفرق بعضنا ولا نعلم، ففتح الله فيها كوى فتراؤوا وتسامعوا حتى عبروا البحر، ثم لها وصل إليه فرعون وراة منفلقاً

اقتحم فيه هو وجنوده فالتطم عليهم وأغرقهم أجمعين.

واعلم أن هذه الواقعة من أعظم ما أنعم الله به على بنى إسرائيل، ومن الآيات الملجئة إلى العلم بوجود الصانع الحكيم وتصديق موسى عليه الصلاة والسلام، ثم إنهم بعد ذلك اتخذوا العجل وقالوا: لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَرَى اللَّهَ جَهْرَةً ونحو ذلك، فهم بمعزل في الفطنة والذكاء وسلامة النفس وحسن الاتباع عن أمة محمد صلى الله عليه وسلم، مع أن ما تواتر من معجزاته أمور نظرية مثل: القرآن والتحدى به والفضائل المجتعة فيه المشاهدة على نبوة محمد صلى الله عليه وسلم دقيقة تدركها الأذكىاء، وإخباره عليه الصلاة والسلام عنها من جملة معجزاته على ما مر تقريره.

ترجمہ:

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ

اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا۔

یعنی ہم نے دریا کو پھاڑ دیا اور اس کے بعض حصہ کو بعض حصہ سے جدا کر دیا، یہاں تک کہ تمہارے اس میں سے گزرنے کے سبب بہت سے راستے بن گئے، یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے دریا کو اس لئے پھاڑا تھا کہ تم کو نجات دینی تھی، یا یہ کہ "بکم" کی باء مصاحبت اور ملاہست کے لئے ہے اب معنی یہ ہوں گے کہ تمہاری دریا میں داخلہ کے ساتھ ہی ہم نے دریا کو پھاڑ دیا۔ یہ باء اسی طرح ملاہست کے لئے ہے جس طرح متنبی کا شعر،

تَدُوْسُ بِنَا الْجَمَّاءِ وَالثَّرِيَا

اس میں باء ملاہست کے لئے ہے۔

اور "فرقنا" میں ایک قرأت "فرقنا" مبالغہ اور تکثیر کے صیغہ کے ساتھ، اب معنی یہ ہوں گے کہ اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو بہت زیادہ پھاڑ دیا تھا، اور یہ تکثیر اس لئے ہے کہ بنی اسرائیل کے گھرانوں کی گنتی کے مطابق دریا میں بارہ (12) راستے ہو گئے تھے، "فانجینا کم واغرقنا آل فرعون" سے مراد فرعون اور فرعون کی قوم ہے اور ذکر صرف قوم فرعون کا کیا ہے، فرعون کا نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ فرعون تو اس سزا کا سب سے زیادہ مستحق ہے اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ آل فرعون سے مراد فرعون کی ذات ہے۔ جیسا کہ منقول ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے،

اللهم صل على آل محمد

اس سے مراد ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ گویا اتباع فرعون کے ذکر کی بجائے خود فرعون کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔

وانتم تنظرون

تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبویا۔

اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے، یہاں تنظرون کا مفعول بہ محذوف ہے پس اس سے مراد یا تو مذکورہ بالا چیزیں ہیں، یعنی تم یہ تمام مذکورہ واقعات مجسم خود دیکھ رہے تھے یا مفعول بہ ان کا ڈبویا جانا ہے، اب معنی یہ ہوں گے کہ تم ان کے ڈبویے جانے کو اور دریا کے ان پر ڈھک دینے کو دیکھ رہے تھے، یا یہ مراد ہے کہ دریا شق ہو رہا تھا اور قابو میں آنے والے خشک راستے ظاہر ہو رہے تھے یا یہ کہ تم آل فرعون کے جسم اور لاشے دیکھ رہے تھے جس کو دریا نے ساحل پر پھینک دیا تھا، یا یہ مراد ہے کہ تم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، منقول ہے کہ اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات نکل جائیں چنانچہ آپ ان کو لے کر نکل گئے صبح کے وقت فرعون اور لشکر فرعون نے ان کو آتیا، اور ان کو دریا کے کنارہ پر پایا تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب وحی بھیجی کہ اپنے عصا سے دریا کو مارو، چنانچہ انہوں نے دریا کو مارا تو اس میں سے بارہ خشک راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل کا قافلہ ان راستوں پر چل پڑا، پھر کہنے لگے اے موسیٰ ہم کو اندیشہ ہے کہ ہم میں سے بعض افراد ڈوب جائیں اور ہمیں پتہ نہ چلے، تو اللہ کریم نے ان کے درمیان روشن دان کھول دیئے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور ایک دوسرے کی بات سن سکیں اس طرح ان لوگوں نے دریا کو پار کر لیا۔ پھر جب فرعون دریا پر پہنچا اور دریا کا پانی پھٹا ہوا پایا تو اس میں اپنے لشکر سمیت گھس گیا، پس ان پر دریا مل گیا اور سب کو ڈبویا۔

یاد رہے یہ فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ اللہ کریم کی طرف سے بنی اسرائیل پر عظیم ترین احسان ہے اور ان نشانیوں میں سے ہے جو انسان کو اس جانب کھینچ لاتی ہیں کہ صنایع (اللہ کریم) کے وجود کا یقین کریں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کریم کا سچا نبی مانیں، پھر بھی بنی اسرائیل نے ہنجرے کو معبود بنایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تمہارے کہنے کی وجہ سے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تا وقتیکہ ہم خود اپنی آنکھوں سے بر ملا اللہ کریم کو نہ دیکھ لیں، اسی طرح ان کی اور بھی بہت سی باتیں تھیں، لہذا جو فطانت و ذکاوت، سلامت طبع اور حسن اتباع امت محمد کو ملا ہے اس سے بنی اسرائیل کو سوں دور ہیں۔ معجزات کو ہی دیکھئے کہ جو معجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اترے ثابت ہیں وہ نظری ہیں، دقیق ہیں بغیر غور و فکر اور وقت نظر کے ان کا ادراک نہیں ہو سکتا اور امور نظر یہ دقیقہ کا ادراک و اذعاناً ذکیاء کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ پس جب امت محمدیہ معجزات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتی ہے تو ثابت ہوا کہ یہ امت ذکاوت میں دوسری ام سے بدرجہا بہتر ہے، اسی واقعہ کو لے لیجئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اس واقعہ کی خبر دینا اور جس طرح یہ واقعہ سرزمین مصر میں پیش آیا تھا اسی طرح بیان کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ کتب

کا مطالعہ نہیں کیا نہ آپ کی کے یہودی عالم سے محبت رہی پھر بھی آپ ﷺ اتنا راست اور صحیح واقعہ بیان فرما رہے ہیں، یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اللہ کریم کے سچے رسول ہیں، اللہ کریم نے آپ ﷺ کے قلب پر اس کو نازل فرمایا۔
لفظ فرقنا کی تحقیق:

(ف ر ق) الفرق والغلق (To be Cracked, To Burst)

کے قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن معنی انشقاق یعنی پھٹ جانا کے لحاظ سے فلق کا لفظ بولا جاتا ہے اور معنی انفصال یعنی الگ الگ ہونے کے لحاظ سے فرق قرآن میں ہے:

"وَأَذَقْنَا بِكُمْ الْبَعْرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 50)

اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑ دیا۔

اور الفراق کے معنی الگ ہونے والا ٹکڑہ کے ہیں اسی سے فرقہ ہے جس کے معنی لوگوں کا گروہ یا جماعت کے ہیں۔ اور طلوع فجر پر فرق اور فلق دونوں لفظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے:

"فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 63)

تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا (کہ) گویا بڑا پہاڑ ہے۔

لفظ بحر کی تحقیق:

(ب ح ر) البحر (See, Ocean)

(سمندر) اصل میں اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں کثرت سے پانی جمع ہو پھر کبھی اس کی ظاہری وسعت کے اعتبار سے بطور تشبیہ بحرت کذا کا محارہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سمندر کی طرح کسی چیز کو وسیع کر دینا کے ہیں اسی سے بحرت البعیر ہے یعنی میں نے بہت زیادہ اونٹ کے کان کو چیز ڈالا یا پھاڑ دیا اور اس طرح کان چر ہے ہوئے اونٹ کو البحیرہ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:

"مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 103)

اللہ نے مقرر نہیں کیا ہے کان چراہوا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے بحیرہ جانور کا حکم نہیں دیا کفار کی عادت تھی کہ جو اونٹنی دس بچے جن چکتی تو اس کا کان پھاڑ کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے اور نہ بوجھ لادیتے۔ اور جس کو کسی صنعت میں وسعت حاصل ہو جائے اسے بحر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو بحر کہہ دیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک گھوڑے پر سواری کے بعد فرمایا:

کہ میں نے اسے سمندر پایا۔

وجداتہ بحرا

اسی طرح وسعت علمی کے اعتبار سے بھی بحر کہہ دیا جاتا ہے اور تب بحر فی کذا کے معنی ہیں اس نے فلاں چیز میں بہت وسعت حاصل کر لی اور البتہ بحر فی العلم علم میں وسعت حاصل کرنا۔ اور کبھی سمندر کی طوحت اور حکمین کے اعتبار سے کھاری اور کڑوے پانی کو بحرانی کہہ دیتے ہیں۔ بحر الماء۔ پانی کڑوا ہو گیا۔ شاعر نے کہا ہے:

قد عاد ماء الارض بحر فز ادنى الى مرض ان امحر المشراب العذاب
 زمین کا پانی کڑوا ہو گیا تو شریں گھاٹ کے تلخ ہونے سے میرے مرض میں اضافہ کر دیا۔
 اور آیت کریمہ:

"وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 53)

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے رواں کئے دو سمندر یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ۔

میں عذاب کو بحر کہنا تلخ کے بالمقابل آنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو قمران کہا جاتا ہے اور بنات بحر کے معنی زیادہ بارش برسانے والے بادلوں کے ہیں۔ اور آیت:

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (سورۃ الروم آیت نمبر 41)

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ بحر سے سمندر مراد نہیں ہے بلکہ بر سے جنگلات اور بحر سے زرخیز علاقے مراد ہیں۔ لقیہ صحرۃ بحرۃ میں اسے ایسے میدان میں ملا جہاں کوئی اوٹ نہ تھی؟

غرق کا معنی:

(غرق) الغرق (Drowned)

پانی میں تہ نشین ہو جانا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانا۔ غرق (س) فلان یغرق غرق فلان پانی میں ڈوب گیا۔ قرآن میں ہے:

"حَتَّىٰ إِذَا آخَذَتْهُ الْغُرُقُ" (سورۃ قیونس آیت نمبر 90)

یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے آیا۔

لفظ نظر کا مفہوم:

(نظر) النظر (Slight, Vision)

کے معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کا ادراک کرنے کے لئے آنکھ یا فکر کو جولانی دینے کے ہیں۔ پھر کبھی اس سے محض غور و فکر کرنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس معرفت کو کہتے ہیں جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ نظرت فلم تنظر۔ تونے دیکھا لیکن غور نہیں کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ" (سورہ بقرہ نمبر 101)
ان کفار سے کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔

اور النظر بمعنی انتظار بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ نظر تہ و انتظر تمدنوں کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

"وَأَنْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ" (سورہ قعود آیت نمبر 122)
اور راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں۔

نوٹ: لفظ نجا اور فرعون کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 51]

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ (51)
”اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور تم ظالم تھے۔“

متن:

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً لِّهَا عَادُوا إِلَىٰ مِصْرَ بَعْدَ هَلَاكِ فِرْعَوْنَ وَعَدَّ اللَّهُ مُوسَىٰ أَنْ يُعْطِيَهِ التَّوْرَةَ وَضَرَبَ لَهَا مِيقَاتًا ذَا الْقَعْدَةِ وَعِشْرَ ذِي الْحِجَّةِ وَعَبَّرَ عَنْهَا بِاللَّيَالِي لِأَنَّهَا غُررُ الشُّهُورِ. وَقَرَأَ ابْنُ كَثِيرٍ وَنَافِعٌ وَعَاصِمٌ وَابْنُ عَامِرٍ وَحَمْزَةُ وَالْكَسَائِيُّ وَعَدْنَا لِأَنَّهُ تَعَالَىٰ وَعَدَّةُ الْوَحْيِ. وَوَعَدَهُ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْمَجِيءَ لِلْمِيقَاتِ إِلَى الطُّورِ.
ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ إِلَيْهَا أَوْ مَعْبُودًا.
مِن بَعْدِهَا مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ، أَوْ مُضِيِّهِ.
وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ يَأْشُرُ أَكْمَرُ.

ترجمہ:

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً

اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا۔

فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر کو واپس لوٹے تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا کہ ان کو توریت عطا کی جائے گی اور اعطاء توریت کے لئے جو میعاد مقرر ہوئی تھی وہ ماہ ذی قعد اور ذی الحجہ گزر جانے کے بعد تھی۔ ایک ماہ دس دن کی مدت کو اللہ کریم نے چالیس راتوں سے تعبیر کیا ہے۔ تقویم عربی میں راتوں سے ہی مہینوں کا

آغاز ہوتا ہے۔ راتیں ہی "غرد الشہور" ہیں اس لئے حساب دنوں کی بجائے راتوں سے لگایا۔ ابن کثیر، نافع، ابن عامر، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے "واعدنا" بصیغہ مفاعلت کی قرات اختیار کی ہے کیونکہ یہاں وعدہ میں مشارکت تھی۔ اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وحی کا وعدہ کیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وقت مقررہ کے مطابق کوہ طور پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ

پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

یعنی تم نے بچھڑے کو الہ اور معبود بنا لیا، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات پر چلے جانے کے بعد۔

وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ

اور تم ظالم تھے۔

یعنی تم اپنے شرک

کی وجہ سے ظلم کر رہے تھے۔

تحقیق لفظ وعدہ:

(وعد) الوعد (Promise)

(وعدہ کرنا) کا لفظ خیر و شر یعنی اچھے اور برے (وعدہ دونوں پر بولا جاتا ہے اور اس معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر الوعد کا لفظ خاص کر شر (یعنی دھمکی اور تہدید) کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں باب اوعد (توقد استعمال ہوتا ہے۔ اور اوعدت مفاعلت) و تو اعدنا (تفاعل) کے معنی باہم عہد و پیمان کرنا کے ہیں (قرآن کریم میں ودع کا لفظ خیر و شر دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ وعدہ خیر کے متعلق فرمایا:

"إِنَّ اللَّهَ وَعَدَّكُمْ وَعَدَّ الْحَقِي" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 22)

جو وعدہ اللہ نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا۔

"أَقْمَرْنَ وَعَدْنَاهُ وَعَدًّا حَسَنًا فَهُوَ لَا قِيَهُ" (سورۃ القصص آیت نمبر 61)

بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا۔

لیل کا معنی:

(ال لیل) لیل و لیلۃ (Night)

کے معنی رات کے ہیں اس کی جمع لیل و لیلانل و لیلیات آتی ہے اور نہایت تاریک رات کو لیل لیل و لیلہ لیلیاء کہا

جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ لیلة صل میں لیلة ہے کیونکہ اس کی تصغیر لیلة اور جمع لیال آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" (سورۃ القدر آیت نمبر ۱)

ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع)۔

"وَسَعَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 33)

اور رات اور دن کو تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔

لفظ عجل کا معنی:

(عجل) (A Calf)

العجلۃ بچھڑے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پھرتی پائی جاتی ہے جو بیل کی عمر تک پہنچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں

ہے:

"عَجَلًا جَسَدًا لَهُ خُورًا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 148)

ایک بچھڑا بنا بیٹھی بے جان کا دھڑ۔

م عجل کے کہتے ہیں؟:

اور وہ گائے جس کے ساتھ اس کا بچھڑا ہوا سے عجل کہا جاتا ہے۔

نوٹ: امتحان اور ظلم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): الآيات 52 الى 53]

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ

لَعَلَّكُمْ يَهْتَدُونَ ۝

”پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی، کہ کہیں تم احسان مانو، اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و

باطل میں تمیز کر دینا کہ کہیں تم راہ پر آؤ۔“

متن:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ حِينَ تَبْتُمْ، وَالْعَفْوُ مَحْوُ الْجُرْمَةِ، مِنْ عَفَا إِذَا دَرَسَ. مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ أَيْ

الْإِتِّخَاذَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ أَيْ لِكَيْ تَشْكُرُوا عَفْوَةً.

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ يَعْنِي التَّوْرَةَ الْجَامِعَ بَيْنَ كَوْنِهِ كِتَابًا مَنْزِلًا وَحِجَّةَ

تَفَرُّقَ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ. وَقِيلَ أُرَادَ بِالْفُرْقَانَ مَعْجَزَاتِهِ الْفَارِقَةَ بَيْنَ الْمَحْقُوقِ وَالْمَبْطُلِ

فی الدعوی، أو بین الکفر والإیمان، وقیل الشرع الفارق بین الحلال والحرام، أو النصر
الذی فرق بینہ و بین عدوہ کقولہ تعالیٰ: یَوْمَ الْفُرْقَانِ یرید بہ یوم یردد.
لَعَلَّكُمْ یَهْتَدُونَ لکی تہتدوا بتدبر الکتاب والتفکر فی الآیات.

ترجمہ:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ

ہم نے تمہیں معافی دی۔

یہ اس وقت ہوا جب تم نے توبہ کی، "عفو" کے معنی ہیں جرم کو مٹا دینا۔ یہ عفو سے مشتق ہے جس کا معنی مٹا دینا، مٹ جانا

-

من بعد ذلك

پھر اس کے بعد

یعنی اس معبود سازی کے بعد۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

کہ کہیں تم احسان مانو۔

تا کہ تم اللہ کریم کی نعمت عفو کا شکر ادا کرو۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تیز کر دینا

کتاب فرقان کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تو ریت عطا کی جو دونوں وصفوں کی جامع تھی، وہ کتاب بھی تھی، اور ایک حجت بھی
تھی جو حق و باطل کے درمیان فرق کر رہی تھی۔ اور بعض نے کہا کہ فرقان سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔ جو
محقق و مبطل کے دعووں میں فرق کر رہے تھے۔ یا کفر و ایمان کے درمیان فرق کر رہے تھے، بعض نے کہا کہ شریعت موسیٰ مراد
ہے جو حلال و حرام کے درمیان فارق تھی۔ بعض نے وہ نصرت الہی مراد لی ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے
دشمنوں کے درمیان فرق و امتیاز قائم کر دیا تھا، جیسا اللہ کریم "یوم فرقان" سے یوم بدر مراد لیتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ يَهْتَدُونَ

کہ کہیں تم راہ پر آؤ۔

تا کہ تم کتاب میں تدبیر کر کے اور اس کی آیات میں غور کر کے راہ پاؤ۔

لفظ عفو کی تحقیق:

(ع ف و) العفو (Forgiveness, Pardon)

کے معنی کسی چیز کو لینے کا قصد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ عفاہ واعتقادہ کسی کے پاس جو کچھ ہے وہ لینے کا قصد کیا۔ عفت الريح الدراہوانے گھر کے نشانات مٹا دیے اسی معنی کے لحاظ سے شاعر نے کہا ہے۔

اخز البلی ایاہا

بوسیدگی نے اس کے نشانات مٹا ڈالے عفت الدار گھر کے نشانات مٹ گئے گویا ان اٹارنے از خود مٹ جانے کا قصد کیا عفا النبات والشجر نباتات اور درخت بڑھ گئے جیسا کہ آخذ النبات فی الذیاد کا محاورہ ہے یعنی پودے نے بڑھنا شروع کیا۔ عفوت عنہ کے معنی ہیں میں نے اس سے درگزر کرتے ہوئے اس کا گناہ مٹا دینے کا قصد کیا۔ لہذا یہاں اصل میں اس کا مفعول ترک کر دیا گیا ہے اور عن کا متعلق مخذوف ہے یا قصدت ازالہ ذنبہ سارفا عنہ پس عفو کے معنی گناہ سے درگزر کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

"فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 40)

مگر جو درگزر کرے اور معاملہ کو درست کر لے۔

"وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 237)

اور اگر تم ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔

"ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 52)

پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا۔

"إِنْ نَعْفَ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 66)

اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کر دیں۔

"فَاعْفُ عَنْهُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 159)

تو ان کی خطائیں معاف کر دو۔

اور آیت کریمہ: "خُذِ الْعَفْوَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 199)

(اے محمد) عفو اختیار کرو۔

میں العفو ہر اس چیز کو کہا گیا جس کا قصد کرنا اور لینا آسان ہو۔ اور بعض نے اس کے معنی کئے ہیں درگزر کیجئے۔ اور آیت

کریمہ:

"وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 219)

(اے محمد) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو جو مال خرچ کرو۔

اس آیت میں عفو سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ضروریات سے زائد ہو اور اس کے خرچ سے تکلیف نہ ہو اور اعطی عفو اس نے اسے بے مانگے دے دیا یہاں عفو مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے اور حال واقع ہوا ہے یعنی بخشش کرتے وقت اس کی حالت یہ تھی کہ گویا خود لے رہا ہے اور اس میں اس عمدہ معنی کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے،

كَانَكَ تَعْطِيهِ الَّذِي أَنْتَ سَائِلُهُ

یعنی جب سائل اس کے پاس آتا ہے تو اس طرح خوش ہوتا ہے گویا جو چیز تم اس سے لے رہے ہو وہ اسے دے رہے ہو۔ اور دعائے ماثورہ میں ہے

"اسئلك العفو والعافيته"

یعنی اے اللہ تجھ سے عفو اور تندرستی طلب کرتا ہوں اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو عفو کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُورًا غَفُورًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 43)

پیشک خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

اور حدیث میں ہے:

مَا أَكَلْتُكَ الْعَافِيَتَهُ فَهُوَ صَدَقَتَهُ

یعنی کھتی سے جو کچھ پرندہ چرند اور ضرورت مند انسان کھا جائیں وہ وہ صدقہ ہے۔

اعفیت کذا یعنی میں نے اسے بڑھنے دیا اسی سے۔ اعفوا الحیی ہے۔ یعنی ڈاڑھی کے بال بڑھنے دو۔ العفاء اون

یا پرند کے پر جو بڑھ جائیں۔

المعافی کے کہتے ہیں؟

کسی سے دیگ مستعار لینے والا جو شور بہ اس کی دیگ میں اسے بھیجتا ہے اس شور بہ کو المعافی کہا جاتا ہے۔

شکر کا معنی:

(شکر) الشکر (Thanks, Gratitude)

کے معنی کسی نعمت کا تصور اور اس کے اظہار کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کثر سے مقلوب ہے جس کے معنی کشف یعنی کھولنا کے ہیں۔ شکر کی ضد کفر ہے۔ جس کے معنی نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے ہیں اور دابة شکور اس چوپائے کو کہتے ہیں جو اپنی فریبی سے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ اس کے مالک نے اس کی خوب پرورش اور حفاظت کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عین شکرئی سے ماخوذ ہے جس کے معنی آنسوؤں سے بھر پورا آنکھ کے ہیں اس لحاظ سے شکر کے معنی ہوں گے منعم کے ذکر سے

بھرجانا۔

شکر کی قسمیں:

شکر تین قسم پر ہے۔

شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور کرنا۔

شکر لسانی یعنی زبان سے منعم کی تعریف کرنا۔

شکر بالجوارح یعنی بقدر استحقاق نعمت کی مکانات کرنا۔

اور آیت کریمہ:

"اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا" (سورۃ سبأ آیت نمبر ۱۳)

اے داود کی آل میرا شکر کرو۔

الفرقان کی تحقیق:

(فرق) الفرقان (The Holy Quran (as distinguished or separating truth

from falsehood

یہ فرق سے ابلغ ہے کیونکہ یہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ رجل وقنعان (یعنی وہ آدمی جس کے حکم پر قناعت کی جائے) کی طرح اسم صفت ہے مصدر نہیں ہے اور فرق کا لفظ عام ہے جو حق کو باطل سے الگ کرنے کے لئے بھی آتا ہے اور دوسری چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَشْكُرُوا اللَّهُ يُجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا" (سورۃ انفال آیت نمبر ۲۹)

اے ایمان والو اگر اللہ سے ڈرو گے تو تمہیں وہ دے گا جس سے حق کو باطل سے جدا کر لو۔

یعنی تم کو ممتاز کر دے گا۔ میں فرقان سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر نور اور توفیق پیدا کر دے گا جس کے ذریعہ تم حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے تو گویا یہاں فرقان کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ سکینقا اور روح کے الفاظ ہیں اور قرآن نے یوم الفرقان اس دن کو کہا ہے جس روز کہ حق و باطل اور صحیح و غلط کے مابین فرق اور امتیاز ظاہر ہوا چنانچہ آیت:

"وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ" (سورۃ انفال آیت نمبر ۴۱)

اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن اتارا۔

میں یوم الفرقان سے جنگ بدر کا دن مراد ہے کیونکہ وہ (تاریخ اسلام میں) پہلا دن ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا۔ اور کلام الہی (وحی) بھی فرقان ہوتی ہے کیونکہ وہ حق اور باطل عقائد میں فرق کر دیتی ہے سچی اور جھوٹی باتوں اور

اجھے برے اعمال کو بالکل الگ الگ بیان کر دیتی ہے اس لئے قرآن کریم تورات اور انجیل کو فرقان سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ توراہ کے متعلق فرمایا:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)
اور بیشک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ دیا۔

"شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ"

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 185)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتر لوگوں کے لئے ہدایت اور رہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں۔

"تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 1)

وہ خدائے عزوجل بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا۔

"وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 53)

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کئے۔

"وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

اور بیشک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اوجالا اور پرہیزگاروں کو نصیحت۔

لفظ اہتداء کی تحقیق بالتفصیل:

الاهتداء

(ہدایت پانا) کا لفظ خاص کر اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو دنیوی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 97)

اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں ان سے رستہ معلوم کرو۔

"إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ

سَبِيلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 98)

اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔

لیکن کبھی اہتداء کے معنی طلب ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 53)

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کئے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

"فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 150)
 سوان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ
 راست پر چلو۔

"فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 20)

اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بیشک ہدایت پالیں۔

"فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 137)

تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یاب ہو جائیں۔

المہتدی کی تعریف:

المہتدی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتدا کر رہا ہے ہو چنانچہ آیت:

"أُولَؤُكَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئاً وَلَا يَهْتَدُونَ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 104)

بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ کسی کی پیروی کرتے ہوں۔

اس میں تشبیہ کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔

اور آیت:

"فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ"

(سورۃ النمل آیت نمبر 92)

تو جو کوئی ہدایت حاصل کرے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی
 سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

میں اہتداء کا لفظ طلب ہدایت اقتدا اور تخری ہدایت تینوں کو شامل ہے اس طرح آیت:

"وَزَيَّنَّ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 24)

اور شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کر دھائے ہیں اور ان کو راستے سے روک رکھا ہے پس وہ راستے پر
 نہیں آتے۔

میں بھی سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے۔

اور آیت: "وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّبَن تَابٍ وَآمَنٍ وَعَمِلَ صَالِحاً ثُمَّ اهْتَدَىٰ" (سورۃ طہ آیت نمبر 82)

اور جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے پھر سیدھے راستے پر چلے اس کو میں بخش دینے والا ہوں۔

میں اہتدی کے معنی لگاتار ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے

کے ہیں۔ اور آیت:

"الَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ." (سورة البقرة آیت نمبر 157)

کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا، یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی ڈرودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔

میں مہتدون سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لئے کوشش کی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا چنانچہ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

"وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عٰهَدْتَ عِنْدَكَ إِنَّا لَمُهْتَدُونَ" (سورة الزخرف آیت نمبر 49) اور بولے کہ اے جادوگر ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر اس عہد کے سبب جو اس کا تیرے پاس ہے۔
نوٹ: آتی، کتب اور لعل کا ذکر گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 54]

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجَلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝
”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان“۔

متن:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجَلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ
فاعزموا على التوبة والرجوع إلى من خلقكم براء من التفاوت، ومميزاً بعضكم عن بعض بصور وهيئات مختلفة، وأصل التركيب لخلوص الشيء عن غيره، إما على سبيل التقصي كقولهم برء المريض من مرضه والمديون من دينه، أو الإنشاء كقولهم برأ الله آدم من الطين أو فتوبوا.

فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إتماماً لتوبتكم بالبخع، أو قطع الشهوات كما قيل من لم يعذب نفسه لم ينعمها ومن لم يقتلها لم يحيها، وقيل أمروا أن يقتل بعضهم بعضاً، وقيل

أمر من لم يعبد العجل أن يقتل العبد.

روی أن الرجل كان يرى بعضه وقريبه فلم يقدر على المضي لأمر الله، فأرسل الله ضباباً وسحابة سوداء لا يتباصرون، فأخذوا يقتتلون من الغداة إلى العشي حتى دعا موسى وهارون فكشفت السحابة ونزلت التوبة، وكانت القتل سبعين ألفاً. والفاء الأولى للتسبب، والثانية للتعقيب.

ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ مِنْ حَيْثُ إِنَّهُ طَهَّرَهُ مِنَ الشِّرْكِ، وَوَصَلَهُ إِلَى الْحَيَاةِ الْإِبْدِيَّةِ وَالْبَهْجَةِ السَّرْمَدِيَّةِ.

فَتَابَ عَلَيْكُمْ مُتَعَلِّقٌ بِمَحْذُوفٍ إِنْ جَعَلْتَهُ مِنْ كَلَامِ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ لَهُمْ تَقْدِيرَةٌ: إِنْ فَعَلْتُمْ مَا أَمَرْتُمْ بِهِ فَقَدْ تَابَ عَلَيْكُمْ، أَوْ عَطْفٌ عَلَى مَحْذُوفٍ إِنْ جَعَلْتَهُ خُطَاباً مِنْ اللَّهِ تَعَالَى لَهُمْ عَلَى طَرِيقَةِ الْإِلْتِفَاتِ، كَأَنَّهُ قَالَ: فَفَعَلْتُمْ مَا أَمَرْتُمْ بِهِ فَتَابَ عَلَيْكُمْ بَارِئِكُمْ. وَذَكَرَ الْبِنَاءَ وَتَرْتِيبَ الْأَمْرِ عَلَيْهِ إِشْعَارٌ بِأَنَّهُمْ بَلَّغُوا غَايَةَ الْجَهَالَةِ وَالْغِبَاوَةِ، حَتَّى تَرَكَوا عِبَادَةَ خَالِقِهِمُ الْحَكِيمِ إِلَى عِبَادَةِ الْبَقْرِ الَّتِي هِيَ مِثْلٌ فِي الْغِبَاوَةِ، وَأَنَّ مَنْ لَمْ يَعْرِفْ حَقَّ مَنَعِهِ حَقِيقِي بَأَنَّ لَا يَسْتَرِدُّ مِنْهُ، وَلِذَلِكَ أَمَرُوا بِالْقَتْلِ وَفَكَ التَّرْكِيبِ.

إِنَّهُ هُوَ التَّوَابُ الرَّجِيمُ

لِلَّذِي يَكْثُرُ تَوْفِيقُ التَّوْبَةِ، أَوْ قَبُولُهَا مِنَ الْمُنْذِبِينَ، وَيَبَالِغُ فِي الْإِنْعَامِ عَلَيْهِمْ.

ترجمہ:

وَأَذَقَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمْ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ
اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی
طرف رجوع لاؤ۔

یہاں توبہ کرو کا معنی یہ ہے کہ توبہ کا عزم کرو۔ اور اس ہستی کی طرف رجوع کرنے کا پکا ارادہ کرو جس نے تم کو تفاوت سے
بری بنا کر پیدا کیا۔ یعنی تمہارے اعضاء وغیرہ میں توازن و تناسب کو ملحوظ رکھا، اور تم کو ایک دوسرے سے مختلف صورتوں اور مختلف
ہیچوں کے ذریعے ممتاز کیا۔ اور برے کی اصل ترکیب یا اس مادہ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کر دینا۔ یہ جدائی
چھٹکارہ کے طور پر ہو۔ جیسا کہ،

برم المريض من مرضه

براء المدیون من ذینہ
مقرض نے اپنے قرض سے نجات پائی۔

براء اللہ آدم من الطین

اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ یعنی مٹ میں ہستی آدم کی صلاحیت موجود تھی۔ پس اللہ کریم نے اس سے پیدا کیا۔

"فتنونا" کے معنی اپنے ظاہر پر ہیں یعنی توبہ کرو، یعنی اپنوں کو قتل کرو، یہ قتل نفس تمہاری توبہ کی تکمیل کے لئے ہے، قتل کی تفسیر خود کشی کے ذریعے کی جائے یا نفس کشی کے ذریعے کی جائے جیسا کہ منقولہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کو عذاب نہیں دے گا وہ اس کو آسائش نہیں دے سکتا اور جس نے اپنے نفس کو قتل نہیں کیا اس نے اس کو زندگی نہیں دی۔ اور بعض کا قول ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں اور بعض کہتے ہیں کہ جنہوں نے بچھڑا کی پوجا نہیں کی تھی، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ بچھڑا کی پوجا کرنے والوں کو قتل کریں، منقول ہے کہ آدمی اپنے لخت ہائے جگر یعنی باپ بیٹوں کو اور رشتہ داروں کو اپنے سامنے پاتا تھا تو اس کو اس پر قدرت نہیں ہوتی تھی کہ اللہ کریم کے امر کو گزرے، تو اللہ کریم نے ایک ہلکی بدلی اور سیاہ بادل بھیجا جس کے سبب وہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے چھپ گئے، پھر قتل کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام نے دعا کی تو بادل چھٹ گیا اور توبہ قبول ہو گئی اس وقت تک مقتولین کی تعداد ستر ہزار (70000) ہو چکی تھی۔ آیت کریمہ میں پہلی فاء سیبیت پر دلالت کرنے کے لئے ہے اور دوسرے فاء تعقیب کے لئے ہے۔

ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ

یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے۔

یہ اس لئے بہتر ہے کہ حیات ابدی کا ذریعہ اور سرد سردی کا وسیلہ ہے، "فتاب علیکم" اگر یہ کلام موسیٰ کا جزو ہے تو جملہ محذوفہ کے متعلق ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی،

ان فعلتم ما امرتم به فقد تاب علیکم

اگر تم اس چیز کو بجالائے جس کا اس نے تمہیں حکم دیا ہے تو سمجھو کہ اللہ کریم نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ اور اگر یہ قوم موسیٰ کو التفات کے اسلوب میں خطاب ہے تو جملہ محذوفہ پر معطوف ہے، گویا یوں ارشاد فرمایا گیا،

ففعلمتم ما امرتم به فتاب علیکم بارئکم.

یعنی جن چیزوں کا حکم دیا گیا تھا وہ تم بجالائے تو پھر اللہ کریم نے تمہاری توبہ قبول کی۔ اور "بارئ" کا دوسری مرتبہ ذکر فرمانا اور امر توبہ کو اس پر مرتب کرنا، یہ بتانے کے لئے ہے کہ وہ جہالت اور غباوت میں استہاک و پہنچ چکے تھے، حتیٰ کہ اپنے خالق حقیقی کی عبادت کو چھوڑ کر گائے اور بیل کی عبادت پر آگئے تھے جو غباوت میں ضرب المثل ہے۔ نیز اس حقیقت پر آگاہ کرنے

کے لئے ہے جو اپنے منعم کا حق نہ پہچانے وہ اس لائق ہے کہ وہ نعمت اس سے واپس لے لی جائے اور اس وجہ سے یہ منعم اس کے قتل کر دیا جائے اور ان کی بندش جسم کو کھول دیا جائے۔

انہ هو التواب الرحيم

پیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

یعنی توبہ کی بہت زیادہ توفیق عطا کرنے والا، یا گنہگاروں کی طرف سے بہت زیادہ توبہ قبول فرماتے والا۔ اور "الرحيم"

جوان کے اوپر بہت زیادہ انعام کرنے والا ہے۔

لفظ قوم کا معنی :

(ق و م) قوم (Tribe, Nation)

القوم۔ یہ اصل میں صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ قرآنیہ

"يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُونَ قَوْمًا مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا يَسَاءُ قَوْمًا

نِسَاءً عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۱)

اے ایمان والو نہ مرد مردوں سے نہیں عجب نہیں کہ وہ ان بننے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے دور

نہیں کہ وہ ان بننے والیوں سے بہتر ہوں۔

اخذ اور اتخاذا کا معنی :

(اخذ) الاخذ (Grab, Forge)

الاتخاذ (افتعال) ہے اور یہ دو مفصلوں کی طرف متعدی ہو کر جعل کے جاری مجری ہوتا ہے جیسے قرآنیہ

"لَا تَتَّبِعُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أُولَٰئِكَ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۵۱)

یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

"وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ" (سورۃ الزمر آیت نمبر ۳)

جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے۔

"فَاتَّخَذُوا مِنْهُمْ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر ۱۱۰)

تو تم نے اس سے کچھ بنا لیا۔

"أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخَذُونِي وَأُمَّيَ الْهَدْيِ" (سورۃ النمل آیت نمبر ۲۶)

کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنا لو۔

اور آیت کریمہ: "وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ" (سورۃ النمل آیت نمبر ۲۷)

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر گرفت کرتا۔

میں صیغہ مفاعلہ لاکر معنی مہازات اور مقابلہ پر تشبیہ کی ہے جو انعامات اللہ کریم کی طرف سے انہیں ملنے کے مقابلہ میں انہوں نے شکر گزاری سے کام نہیں لیا۔

توبہ کا معنی اور اقسام:

(توب) التوب (ن) (Repentance)

کے معنی گناہ کے باحسن وجود ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لم افعلہ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔

دوسری صورت:

یہ ہے کہ اس کے لئے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشے لگ جائے۔

تیسری صورت:

یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلانے فرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے۔

شرعاً توبہ:

جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔ تاب الی اللہ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن میں ہے:-

"وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا" (سورۃ النور آیت نمبر 31)

سب اللہ کے آگے توبہ کرو۔

لفظ الباری کی تعریف:

الباری (Creator)

(پیدا کرنے والا) یہ اسماء حسنی سے ہے۔ جیسے فرمایا:

"الْبَارِي الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى" (سورۃ الحشر آیت نمبر 24)

ایجاد و اختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا۔

"فَتَوَبُّوا إِلَىٰ تَابِ رَبِّكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 54)

تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔

قتل کا معنی:

(قتل) القتل (ن) (kill)

الموت کی طرح اس کے معنی بھی جسم سے روح کو زائل کرنے کے ہیں لیکن موت اور قتل میں فرق یہ ہے کہ اگر اس فعل کو سرا انجام دینے والے کا اعتبار کیا جائے تو اسے قتل کہا جاتا ہے اور اگر صرف روح کے فوت ہونے کا اعتبار کیا جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"أَفِيَانٍ مَاتَ أَوْ قُتِلَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔

تحقیق خیر و شر:

(خیر) الخیر (Goodness)

وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو مثلاً عقل عدل و فضل اور تمام مفید چیزیں۔ یہ شر کی ضد ہے۔

اور خیر دو قسم پر ہے۔

خیر مطلق:

خیر مطلق جو ہر حال میں اور ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہو جیسا کہ آنحضرت نے جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خیر نہیں ہے جس کے بعد آگ ہو اور وہ شر کچھ بھی شر نہیں ہے جس کے بعد جنت حاصل ہو جائے

خیر و شر مقید:

خیر و شر مقید کی ہے۔ یعنی وہ چیز جو ایک کے حق میں خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو مثلاً دولت کہ بسا اوقات یہ زید کے حق میں خیر اور عمرو کے حق میں شر بن جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآن نے اسے خیر و شر دونوں سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"إِنْ تَرَكَ خَيْرًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 180)

اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتے۔

لفظ تَوَاب کس پر بولا جائے گا؟:

التوَاب

یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صنعت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہ کو ترک کر دے اور جب تواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 54)

یعنی وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اور آیت کریمہ:

"وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 71)

اور جو توبہ کرے اور اچھا کام کرے تو وہ اللہ کی طرف رجوع لایا جیسی چاہئے تھی۔

"عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَالْيَهُ مَتَابٌ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 30)

میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔

تحقیق لفظ رحم:

(رحم) الرحم (Merci, Kindness)

الرحمة وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔

اسی معنی میں نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے،

"انه لما خلق الله الرحم قال له انا الرحمن وانت الرحم شفقت اسمك من اسمي فمن

وصلك وصلته ومن قطعت قطعتة"

کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا: تین رحمان ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام

سے اخذ کیا ہے۔ پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کر لے گا میں

اسے پارہ پارہ کر دوں گا۔

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ پس رقت

تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کر دی ہے احسان کو اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔ تو جس طرح لفظ رحم رحمت سے مشتق ہے

اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں

کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے، یہ دونوں فعلان و فعیل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں

جیسے ندمان و ندیم پھر رحمن کا اطلاق ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سمایا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ

کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ۵

"إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۸۲)

بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا:

"لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۱۲۸)

بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان۔

بعض نے رحمن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمن کا لفظ دنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت:

"وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۵۶)

ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل و نائل) سب چیزوں کو شامل ہے۔ پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے۔ جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الہی عام ہے اور مومن و کافروں دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مومنین کے ساتھ مختص ہوگی اور کفار اس سے کلیتہً محروم ہوں گے۔

نوٹ: قول، ظلم، نفس اور عجل کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (۲): آیت ۵۵]

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ تَرَىٰ اللَّهُ جَهَنَّمَ فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝

"اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک اعلانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے۔"

متن:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ أَى لَأَجَلٍ قَوْلِكَ، أَوْلَنْ نَقْرَ لَكَ.

حَتَّىٰ تَرَىٰ اللَّهُ جَهَنَّمَ عِيَانًا وَهِيَ فِي الْأَصْلِ مَصْدَرٌ قَوْلِكَ: جَهْرَتٌ بِالْقِرَاءَةِ، اسْتَعِيرَتْ

للمعاينة، ونصبتها على المصدر لأنها نوع من الرؤية، أو الحال من الفاعل، أو المفعول، وقرء جهرة بالفتح على أنها مصدر كالغلبة، أو جمع جاهر كالكتابة فيكون حالاً من الفاعل قطعاً، والغائلون هم السبعون الذين اختارهم موسى عليه السلام للميقات، وقيل عشرة آلاف من قومه، والمؤمن به: إن الله الذي أعطاك التوراة وكلمك، أو إنك نبى.

فَأَخَذَتْكُمْ الصَّاعِقَةُ لفرط العناد والنعت وطلب المستحيل، فإنهم ظنوا أنه تعالى يشبه الاجسام فطلبوا رؤيته رؤية الاجسام في الجهات والاحياز المتقابلة للرائى وهى محال، بل الممكن أن يرى رؤية منزهة عن الكيفية، وذلك للمؤمنين في الآخرة ولأفراد من الانبياء في بعض الاحوال في الدنيا. قيل جاءت نار من السماء فأحرقتهم. وقيل صيحة. وقيل جنود سمعوا بحسيسها فخرروا صعقوا ميتين يوماً وليلة.

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ مَا أَصَابَكُمْ بِنَفْسِهِ أَوْثَرَةٌ.

ترجمہ:

وَأَذَقْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ تُوْمِنَ لَكَ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ، ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے۔

"لک" کا معنی ہے تمہارے کہنے کی وجہ سے، یعنی تمہارے کہنے کی وجہ سے ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یا یہ معنی ہیں کہ ہم تمہارا اقرار نہیں کریں گے۔ "جہرة" کا معنی ہے آنکھوں سے دیکھنا، دراصل یہ لفظ "جہرت بالقراءت" کا مصدر ہے جس کا معنی ہے با آواز بلند قرات کرنا، مجازاً مشاہدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور اس کا نصب مفعول مطلق ہونے کی بناء پر ہے، کیونکہ یہ روئے کی ایک قسم ہے، یا یہ "نرى الله" کے فاعل یا اس کے مفعول بہ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

اور ایک قرات جہرة بفتح الہاء بھی ہے اس صورت میں غلبہ کے وزن پر مصدر ہے یا جمع ہے جیسے "کتبة جمع ہونے کی صورت میں حال ہوگا، اور "حتى نرى الله جہرة" کہنے والے وہ ستر (70) آدمی ہیں جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میقات کے لئے منتخب کیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لوگ قوم موسیٰ کے دس ہزار (10000) آدمی تھے۔ اور "لن نؤمن لک" کا "مؤمن بہ" ان الله الذی الخ ہے۔ یعنی انہوں نے جس چیز پر ایمان لانے کی نئی کی تھی وہ یہ بات تھی کہ اللہ کریم نے آپ کو توریت عطا کی ہے، اور آپ سے کلام کیا ہے۔ یا یہ کہ آپ نبی ہیں۔

فأخذتكم الصاعقة

تو تمہیں کڑک نے آلیا۔

کڑک کا آ لینا، تمہاری انتہائی ہٹ دھرمی، دشوار کوش اور محال طلبی کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ اللہ کریم اجسام کے مشابہ ہے لہذا انہوں نے اللہ کریم کی رویت کا اس طرح مطالبہ کیا کیسے اجسام کی رویت ہوتی ہے کہ وہ رائی کی جہت اور اس کے سامنے کے چیز میں ہوتے ہیں۔ اور اللہ کریم کا اس طرح مرئی ہونا محال ہے۔ بلکہ ممکن یہ ہے کہ اللہ کریم کی رویت اس طرح حاصل ہو کہ وہ کسی قسم کی کیفیت سے پاک ہو، اور آخرت میں مومنین کو یہ رویت حاصل ہوگی اور بعض اوقات دنیا میں انبیاء کرام کو اس طرح کی رویت حاصل ہو جاتی ہے۔

"صاعقہ" نے آ لیا۔ بعض نے کہا کہ صاعقہ آسمان سے آنے والی ایک آگ تھی جس نے ان سب کو جلا دیا، اور بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک چنگھاڑ تھی، اور بعض نے کہا کہ لشکر تھے جن کے آنے کی انہوں نے آواز سنی اور بے ہوش و بے جان ہو کر زمین پر گر گئے اور ایک دن و ایک رات یوں ہی پڑے رہے۔

وانتم تنظرون

اور تم دیکھ رہے تھے۔

بعینہ اس چیز کو دیکھ رہے تھے جس نے تم کو پکڑ لیا تھا، یا اس کے آثار و نشانات کو دیکھ رہے تھے، پھر ہم نے تم کو تمہارے مرنے کے بعد زندہ کیا۔ یہ موت بجلی کی کڑک کی وجہ سے ہوئی تھی اور "بعث" کو موت کے ساتھ اس لئے مقید کیا کہ بعث کبھی بے ہوشی یا نیند کی وجہ سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ہے۔

تحقیق لفظ الرؤیتہ:

الرؤیتہ (Dream)

کے معنی کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا کے ہیں۔ اور قوائے نفس (قوائے مدرکہ) کہ اعتبار سے رؤیتہ کی چند قسمیں ہیں۔

اقسام رؤیت:

(1) حاسہ بصر یا کسی ایسی چیز سے ادراک کرنا۔

جو حاسہ بصر کے ہم معنی ہے جیسے قرآن میں ہے:

"لَتَرُونَ الْجِبَالَ مُمْدَوِّجَاتٍ لِّتَرَوْنَهَا عَيْنَ الْيَقِينِ" (سورۃ التکاثر آیت نمبر 6-7)

تم ضروری دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے پھر (اگر دیکھو گے بھی تو غیر مشتبہ) یقینی دیکھنا دیکھو گے۔

(2) وہم و خیال سے کسی چیز کا ادراک کرنا۔

جیسے۔ اری ان زیدا منطلق۔ میرا خیال ہے کہ زید جا رہا ہوگا۔ قرآن میں ہے:

"وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا" (سورۃ الانفال آیت نمبر 50)
 اوزکاش اس وقت کی کیفیت خیال میں لاؤ جب کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔

(3) کسی چیز کے متعلق تفکر اور اندیشہ محسوس کرنا

جیسے فرمایا: "إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 48)
 میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔

(4) عقل و بصیرت سے کسی چیز کا ادراک کرنا۔

جیسے فرمایا: "مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ" (سورۃ النجم آیت نمبر 11)
 دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔

جہر کا معنی:

(ج ۵) الجهر (ف)

اس کے اصل معنی کسی چیز کا حاسہ سمع یا بصر میں افراط کے سبب پوری طرح ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں چنانچہ حاسہ بصر یعنی نظروں کے سامنے کسی چیز کے ظاہر ہونے کے متعلق کہا جاتا ہے رایتہ جہر کہ میں نے اسے کھلم کھلا دیکھا قرآن میں ہے:

"لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَوَدَّىٰ اللَّهُ جَهْرَةً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 55)
 کہ جب تک ہم اللہ کو سامنے نمایاں طور پر نہ دیکھ لیں تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

"أَرِنَا اللَّهُ جَهْرَةً" (سورۃ النساء آیت نمبر 153)
 ہمیں نمایاں اور ظاہر طور پر خدا دکھاؤ۔

التفصیل الآخر للفظ الاخذ:

(اخذ) الاخذ

کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا

ہے۔ جیسے فرمایا:

"مَعَادَ اللَّهِ أَنْ تَأْخُذَ الْأَمَنُ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِندَهُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 79)

خدا کی پناہ کہ ہم لیں مگر اسی کو جس کے پاس ہمارا مال ملا۔

اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں جیسے فرمایا:

"لَا تَأْخُذُكَ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 255)

نہ اس پر اونگھ غالب آسکتی اور نہ نیند۔

الصاعقة کی تحقیق مع صقع اور صعق میں فرق:

(ص ع ق) الصاعقة (Explosion, A Crash)

اور صاعقتوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ۔ لیکن صقع کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور صعق اجسام علوی کے بارے میں۔

اقسام صاعقة:

بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صاعقتین قسم پر ہے۔

اول:

اول بمعنی موت اور ہلاکت،

جیسے فرمایا: "فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 68)
تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب کے سب مرجائیں گے۔

"فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 153)
سو تم کو موت نے آپکڑا۔

دوم:

دوم بمعنی عذاب جیسے فرمایا: "أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ" (سورۃ نعل آیت نمبر 13)
میں تم کو مہلک عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر وہ (عذاب) آیا تھا۔

سوم:

سوم بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک)

جیسے فرمایا: "وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 13)
اور کڑک بھیجتا ہے تو اسے ڈالتا ہے جس پر چاہے۔

لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صاعقہ کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو قضا میں سخت آواز کے ہیں پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

نوٹ: قول، ایمان، اللہ اور نظر کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): الآية 56]

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝
 "پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو۔"

متن:

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ بِسَبَبِ الصَّاعِقَةِ، وَقِيدَ لِلْبَعْثِ لِأَنَّهُ قَدْ يَكُونُ عَنِ إِغْمَاءٍ
 أَوْ نَوْمٍ كَقَوْلِهِتَعَالَى: ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ.
 لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ نِعْمَةَ الْبَعْثِ، أَوْ مَا كَفَرْتُمْ وَلِمَا رَأَيْتُمْ بِأَسْمَاءِ اللَّهِ بِالصَّاعِقَةِ.

ترجمہ:

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ
 پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا۔

"بعث" کو موت کے ساتھ اس لئے مقید کیا کہ بعث کبھی بے ہوشی یا نیند کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ اور زندہ اس لئے کیا کہ تم اس نعمت کا شکر ادا کرو۔ یا جس چیز کا تم نے انکار کیا تھا اس پر ایمان لانے کا شکر ادا کرو، کیونکہ بجلی اور کڑک کی صورت میں تم نے اللہ کریم کی طاقت کا کچھ اندازہ کر لیا ہے۔

تحقیق لفظ بعث:

(ب ع ث) البعث (ف) (Bring to Life)

اصل میں بعث کے معنی کسی چیز کو ابھارنے اور کسی طرف بچھانے کے ہیں اور انبعث دراصل مطاوع ہے بعث کا مگر متعلقات کے لحاظ سے اس کے معنی مختلف ہوتے رہتے ہیں مثلاً بعثت البعیر کے معنی اونٹ کو اٹھانے اور آزاد چھوڑ دینا کے ہیں اور مردوں کے متعلق استعمال ہو تو قبروں سے زندہ کر کے محشر کی طرف چلانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 36)

اور ان مردہ دلوں کو اللہ اٹھائے گا۔

"يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا" (سورۃ المجادلہ آیت نمبر 6)

جس دن اللہ ان سب کو جلا اٹھائے گا۔

"رَعِمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ" (سورۃ التغابن آیت نمبر 7)

"وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ" (سورۃ التغابن آیت نمبر 7)

جو لوگ کافر ہوئے ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

"مَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْلَمُكُمْ إِلَّا كَتَبْنَا وَإِحْدًا" (سورۃ اللہمان آیت نمبر 28)
تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص کے پیدا کرنے اور جلانے اٹھانے کی طرح ہے۔

بعث کی اقسام:

پس بعث دو قسم پر ہے۔

بعث بشری:

یعنی جس کا فاعل انسان ہوتا ہے جیسے بعث البعیر (یعنی اونٹ کو اٹھا کر چلانا) کسی کو کسی کام کے لئے بھیجنا)

بعث الہی:

یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں اول یہ کہ اعیان، اجناس اور فواع کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر کبھی کسی دوسرے کو قدرت نہیں بخشی۔
دوم مردوں کو زندہ کرنا۔ اس صفت کے ساتھ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بھی سرفراز فرمادیتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ہم مثل دوسری انبیاء کے متعلق مذکور ہے اور آیت کریمہ:

"فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ" (سورۃ الروم آیت نمبر 56)

اور یہ قیامت ہی کا دن ہے۔

بھی اسی قبیل سے ہے یعنی یہ حشر کا دن ہے اور آیت کریمہ:

"فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْعَثُ فِي الْأَرْضِ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 31)

اب خدا نے ایک کو ابھیجا جو زمین کو کریدنے لگا۔

میں بعث بمعنی قیض ہے۔ یعنی مقرر کر دیا اور رسولوں کے متعلق کہا جائے۔ تو اس کے معنی مبعوث کرنے اور بھیجنے کے

ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا" (سورۃ النحل آیت نمبر 36)

اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا۔

جیسا کہ دوسری آیت میں

"أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 44)

فرمایا ہے اور آیت:

"ثُمَّ بَعَثْنَا لَهُمْ لِيَتَعَلَّمُوا مِنْ رَبِّهِمْ كَلِمَاتٍ لِيَتَذَكَّرُوا فِيهَا وَلَسْتَ بِمُحِيطٌ بِمَا نَكْتُبُ إِلَّا مَن رَّبَّنَا يُنِذِرُ ۚ إِنَّكَ كَادِحٌ عَلَىٰ رَبِّكَ بِمَا تُكَذِّبُونَ" (سورۃ البقرہ آیت ۱۲۹)

پھر ان کا جگا اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (فار میں) رہے دلوں ہماعتوں میں سے اس کو مقدار کس کو خوب یاد ہے۔

میں بعثنا کے معنی صرف تہذیب سے) اٹھانے کے ہیں اور اس میں بھیجے کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

"وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا" (سورۃ النحل آیت نمبر ۸۴)

اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے۔

"قُلْ هُوَ الْقَائِدُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر ۶۵)

کہہ دو کہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے عذاب بھیجے۔

"فَأَمَّا تِلْكَ الْأُمَّةُ الَّتِي كَفَرُوا أَفَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ بَعْثَةٌ الْأُولَىٰ أَمْ لَمْ يُحِيطُوا بِمَا فِي سُلُوكِهِمْ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۵۹)

تو اللہ نے اسے مردہ رکھا سو برس پھر زندہ کر دیا۔

اور آیت کریمہ: "وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثِكُمْ فِيهِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر ۶۰)

(سورۃ الانعام آیت نمبر ۶۰)

اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کبھی تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔

میں زندہ کے متعلق توفی اور دن کو اٹھنے کے متعلق بعث کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر ۴۶)

لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا (اور نکلتا) پسند نہ کیا۔

میں انبعث کے معنی جانے کے ہیں۔

نوٹ: موت، بعلن اور شکر کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): الآية 57]

وَوَضَعْنَا عَنَابَكُمْ الْعِمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّانَ وَالسَّلْوَىٰ كُلُّوا مِنْ ظِلِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ

وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

"اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں، اور انہوں نے

کچھ ہمارا نہ بگاڑا ہاں اپنی ہی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے۔“

متن

وَوَضَعْنَا عَلَىٰ كُمُ الْعِصَمَ مَخْرُجًا مِّنْهُم مِّنَ الشَّمْسِ حِينَ كَانُوا فِي الْعِصَمِ.
وَأَنزَلْنَا عَلَىٰ كُمُ الْمَنِّ وَالسَّلْوَىٰ التَّرْنَجِيمِ وَالسَّمَاءِ قِيلَ كَانَ يَنْزِلُ عَلَيْهِمُ الْمَنُّ مِثْلَ
الضَّلْجِ مِنَ الْفَجْرِ إِلَى الْطُلُوعِ، وَتَبَعَتْهُ الْجَنُوبُ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ، وَيَنْزِلُ بِاللَّيْلِ عَمُودًا نَّارًا
يَسِيرُونَ فِي ضَوْئِهِ، وَكَانَتْ ثِيَابَهُمْ لَا تَتَسَخَّرُ وَلَا تَبْلَى.
كُلُّوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَا كُمْ عَلَىٰ إِرَادَةِ الْقَوْلِ.
وَمَا ظَلَمْنَا فِيهِ إِخْتِصَارًا، وَأَصْلُهُ فَظَلَمُوا أَبَانَ كَفَرُوا هَذِهِ النِّعْمَ وَمَا ظَلَمْنَا.
وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بِالْكَفْرِ لِأَنَّهُ لَا يَتَخَطَّاهُمْ ضَرَرٌ.

ترجمہ:

وَوَضَعْنَا عَلَىٰ كُمُ الْعِصَمَ

اور ہم نے ابر کو تمہارا سائے بان کیا۔

جس وقت بنی اسرائیل میدانِ تیبہ میں بھٹک رہے تھے اس وقت اللہ کریم نے ان کے لئے بادلوں کو حکم دیا کہ ان پر دھوپ سے سایہ کریں۔

"من" سے مراد ترنجبین اور "سلوی" سے مراد آسمانی پرندہ جو جو بٹیر کی مثل ہوتا ہے لیکن اس سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ طلوعِ فجر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک پالے اور برف کی طرح ان پر "من" اترتا تھا اور جنوبی ہوا ان کے لئے آسمانی پرندے لاتی تھی اور رات کے وقت روشنی کا ستون اترتا تھا جس کی روشنی میں چلتے تھے، اور ان کے کپڑے نہ میلے ہوتے تھے اور نہ ہی بوسیدہ ہوتے تھے۔

كُلُّوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَا كُمْ

کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں۔

اس سے پہلے قول کا کلمہ مراد ہے یعنی "قلنا" مقدر ہے۔ "وما ظلمونا" اس ترکیب میں اختصار ہے۔ اصل عبارت

یوں ہے،

فَظَلَمُوا أَبَانَ كَفَرُوا هَذِهِ النِّعْمَ وَمَا ظَلَمْنَا

تو انہوں نے ظلم کیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ ان نعمتوں کی ناشکری کی اور انہوں نے ہمارے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود

اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے کیونکہ ناشکری کر رہے تھے۔ کیونکہ ناشکری کا وبال ان پر ہی پڑنے والا تھا۔ ان سے ہٹ کر کسی اور پر نہیں پڑنے والا تھا۔

لفظ ظلل کا مفہوم:

(ظل ل) الظل (Shade, Shadow)

سایہ یہ الضح (دھوپ) کی ضد ہے اور فسی سے زیادہ عام ہے کیونکہ مجازاً الظل کا لفظ تورات کی تاریکی اور باغات کے سایہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

ظلل اور فسی میں فرق:

ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچنے سے ظل کہہ دیا جاتا ہے مگر فسی صرف اس سے سایہ کو کہتے ہیں جو زوال آفتاب سے ظاہر ہوتا ہے اور عزت و حفاظت اور ہر قسم کی خوشحالی کو ظل سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ" (سورۃ الرسالات آیت نمبر 41)

بے شک ڈروالے سایوں اور چشموں میں ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ پرہیزگار ہر طرح سے عزت و حفاظت میں ہوں گے۔

لفظ غم کی تحقیق:

(غم م) الغم (ن) (Grief, Sorrow)

کے بنیادی معنی کسی چیز کو چھپا لینے کے ہیں اسی سے الغمی ہے جس کے معنی غبار اور تاریکی کے ہیں۔ نیز الغمی جنگ کی شدت الغمام کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 210)

اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔

اسی سے غم الهلال (چاند ابر کے نیچے آگیا اور دیکھنا نہ جاسکا۔ ویوم غم سخت گرم دن و لیلۃ غم و غمی) (تاریک اور سخت گرم رات) وغیرہ ہا محاورات ہیں کسی شاعر نے کہا ہے:

لیلۃ غمی، طامس ہلالہا

تاریک رات جس کا چاند بے نور ہو۔

اور غمۃ الامر کے معنی کسی معاملہ کا پیچیدہ اور مشتبه ہونا ہیں، قرآن پاک میں ہے:

"لَمْ يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً" (سورۃ قیونس آیت نمبر 71)

پھر تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے۔

یعنی پھر وہ معاملہ تمہارے لئے قلق و اضطراب کا موجب نہ ہو اور غم و غمہ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حزن و کرب جیسے کرب و کرمہ اور غمہ اس چھتڑے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کی ناک اور آنکھوں پر باندھ دیا جاتا ہے تاکہ کسی چیز کو دیکھ یا سونگھ نہ سکے اور ناصیہ غمہ پیشانی کے بے بال جو چہرے کو چھالیں۔

من سلویٰ کیا تھا؟:

اس میں چند اقوال ہیں:

بعض نے کہا ہے: منہ بالقول بھی اسی سے ہے کیونکہ احسان جتانے نے نعمت کو قطع کر دیا تھا اور شکر گزراہی کی انقطاع کو مقتضی ہے اور آیت کریمہ:

"وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوٰی" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 57)

اور تمہارے لئے من سلویٰ اتارتے رہے۔

میں من سے شبہی گوند مراد ہے جو زرات کو درخت کو درخت کے پتوں پر جم جاتی تھی اور سلویٰ ایک پرندہ کا نام ہے بعض نے کہا ہے کہ من اور سلویٰ سے احسانات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کئے تھے اور یہ دونوں اصل میں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں؛ لیکن ان پر احسان کرنے کے لحاظ سے اسے من کہا ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ نعمت ان کے لئے باعث اطمینان تھی اسے سلویٰ فرمایا ہے جو کہ تسلی سے ماخوذ ہے۔ اس سے ذوی العقول مراد ہوتے ہیں اور غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق یا تو اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ ذوی العقول کے ملتبع مراد ہوں مثلاً آیت من فی الدار کہہ کر گھر کے لوگ اور بہائم دونوں مراد لئے جائیں۔ اور یا اس وقت جب اہل نطق کے ساتھ شامل کر کے پھر ان کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔

جیسے فرمایا: "وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْنِيهِ عَلَىٰ اَرْبَعٍ يَخْلُقِي اللّٰهُ مَا يَشَاءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

(سورۃ النور آیت نمبر 45)

تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔

اور یہ تنہا غیر ذوی العقول کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔

اکل کا معنی:

(الكل) الاكل (To Eat, To Suffer)

کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اكلت النار الحطب کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا

ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اكل بضم کاف و سکونا کہا جاتا ہے ارشاد ہے،

"أَكْلَهَا دَائِمٌ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 35)

اُس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

مفہوم طاب:

(ط ی ب) طاب (ض) (Chioce, Liking)

الشمی یطیب طیباً فہم طیب (کے معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور حلال ہونے کے ہیں) قرآن میں ہے،

"فَانِكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 3)

تو ان کے سوا عورتیں تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کرلو۔

"فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 4)

ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے تم کو چھوڑ دیں۔

اصل میں طیب اسے کہا جاتا ہے جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی اور شریعت کی رو سے الطعام الطیب اس کھانے کو کہا جائے گا جو جائز طریق سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز انداز کے مطابق لیا جائے کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل کی جائے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار ثابت ہوگی ورنہ دنیا کی خوشگوار چیزیں آخرت میں نقصان دہ ثابت ہوگی اسی بنا پر قرآن طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

"كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 172)

جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اور ان کو کھاؤ۔

نوٹ: نزل، رزق، ظلم اور نفس کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 58]

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَاَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا
حِطَّةً نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝

”اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ، پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے داخل ہو، اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں۔“

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ يَعْنِي بَيْتَ الْمَقْدِسِ، وَقِيلَ أَرِيحَا أَمْرًا بِهِ بَعْدَ التَّيْهِ.

فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَاسْعًا، وَنَصَبَهُ عَلَى الْمَصْدَرِ، أَوِ الْحَالِ مِنَ الْوَاوِ.

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا الْبَابَ أَي بَابَ الْقَرْيَةِ، أَوِ الْقُبَّةَ الَّتِي كَانُوا يَصِلُونَ إِلَيْهَا، فَإِنَّهُمْ لَمَّا دَخَلُوا بَيْتَ

المقدس في حياة موسى عليه الصلاة والسلام.

تُحَدِّثُكُمْ عَنْ عَمَلِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. وَأَمَّا أَنْتُمْ فَاعْبُدُوا اللَّهَ، وَارْتَضُوا الْحَدِيثَ الَّذِي نَزَّلْنَا بِهَذَا الْقُرْآنِ مُبْتَدِئًا وَإِسْتِخْرَافًا. وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا.

وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا.

وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا. وَقَوْلُوا لِمَنْ يُدْعِيكُمُ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ إِنَّا إِذْ بَنَيْنَاهُ إِنَّا كُنَّا عَلَى الْبَيْتِ حَاطَةً مِمَّا جَاءَ بِهِمْ مُبْتَدِئِيًّا وَإِسْتِخْرَافًا.

ترجمہ:

وَأَدْخَلْنَا فِي الْقُرْآنِ الْحَرَامِ الْقُرْبَانَ

اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ۔

قریب سے مراد بیت المقدس ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد اریحا ہے، اس میں داخلہ کا حکم میدان تیبہ کے بعد ہوا۔

فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا

پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ۔

"رغدا" کے معنی وسعت کے ہیں، یعنی وسعت کے ساتھ کھاؤ، یہ مفعول مطلق ہے اسی وجہ سے منصوب ہے۔ یا "کلوا" کی ضمیر مخاطب واؤ سے حال واقع ہے۔ "وادخلوا الباب سجدا" یہاں باب سے مراد باب القریبہ ہے یا باب القبلیہ ہے جس کی طرف رخ کر کے وہ لوگ نماز پڑھتے تھے۔ اس لئے کہ بیت المقدس میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات مبارکہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ "سجدا" یعنی تواضع کرتے ہوئے، جھکے ہوئے، یا میدان تیبہ سے نکالنے کے شکر یہ میں اللہ کریم کا

شکر یہ ادا کرتے ہوئے۔ "حطۃ" کا معنی ہے "مسنلتنا حطۃ" ہماری درخواست یہ ہے کہ ہمارے گناہ معاف فرمادے، یا معنی ہیں "امرک حطۃ" اے اللہ کریم تیری شانِ مفلوکی ہے، اور حطّ مشتق ہے فعلتہ سے، یعنی اہم ہیئت سے ہے۔ جیسے جلسۃ بمعنی ہیئتِ جلوس، اور ایک قرأت "حطۃ" لصب کے ساتھ ہے یہ اصل تقدیر کی بنیاد پر ہے۔ معنی ہوں گے،

حط عتًا ذنوبہا حطۃ

ہمارے گناہوں کو ہمارے اوپر سے اتار دیجئے، معاف فرما دیجئے۔ یا یہ منصوب ہے "قولوا" کا مفعول یہ ہونے کی بنا پر یعنی "قولوا هذه الكلمة" اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ معنی میں "امرنا حطۃ" یعنی ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اسی بستی میں اتریں اور اس میں قیام کریں۔

لغفر لکم خطایا کم

ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔

یعنی تمہارے سجدوں اور تمہاری دعا کی وجہ سے ہم تمہاری خطاؤں کو معاف فرمادیں گے۔ نافع کی قرأت "یغفر لکم" یاہ کے ساتھ بصیغہ مجہول ہے۔ اور ابن عامر نے "لغفر لکم" صیغہ مجہول مؤنث کے ساتھ قرأت کی ہے۔ ان دونوں قرأتوں کی روشنی میں معنی یہ ہوں گے کہ بخش دی جائیں گی تمہارے لئے تمہاری خطائیں۔

"خطایا" اصل میں خطایی بروزن فعال، بتقدیم یاہ علی اللہموا تھا کیونکہ یہ جمع ہے خطیئۃ کی جس میں یاہ ہمزہ پر مقدم ہے، جیسے خضایع جمع ہے خضیعة کی (بمعنی جانور کے پیٹ کا گڑاڑانا) کی یاہ الف کے بعد واقع ہے۔ اس لئے ہمزہ سے تبدیل ہو گئی خطانیسی، ہوا ہمزہ ثانیہ کو ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے یاہ سے بدل دیا خطائی ہوا ہمزہ خود حرف ثقیل ہے، مزید برآں یہ کہ اس پر کسرہ جیسی ثقیل حرکت اس پر مستزاد یہ کہ بعد میں کسرہ کی ہم جنس یاہ بھی ہے، گو یا ثقل در ثقل ہے لہذا کسرہ کو فتح سے بدل دیا "خطاء" ہو گیا۔ اب ہمزہ دو الفوں کے درمیان ہے اور ہمزہ اور الف مشابہ ہیں تو گو یا تین الف جمع ہو گئے لہذا ہمزہ کو الف سے تبدیل کر دیا خطایا ہو گیا۔ حاصل یہ کہ سیبویہ کے قول کے مطابق اس میں پانچ تغیرات ہوئے،

1- یاہ زائدہ کو ہمزہ سے تبدیل کرنا۔

2- ہمزہ اصلیہ کو یاہ سے تبدیل کرنا۔

3- کسرہ کو فتح سے تبدیل کرنا۔

4- یاہ اصلی کو الف سے بدل دینا۔

5- ہمزہ زائدہ کو یاہ سے بدلنا۔

خلیل محوی کے نزدیک خطایا کی اصل "خطانیہ" بتقدیم ہمزہ ہے اس کے بعد اس میں وہی تعلیل ہوئی جو ابھی ذکر ہوئی۔

اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں۔

یعنی مزید ثواب عطا کریں گے اللہ کریم نے امتثال امر کو گنہگاروں کے لئے توبہ اور مغفرت قرار دیا۔ اور نیکیوں کے لئے زیادتی اجر کا باعث قرار دیا۔ اور یہ ترکیب جواب امر کے طور پر نہیں ہے اگرچہ جواب امر ہوتا تو "نغفر لکم" کی طرح مجزوم ہونا اور یوں فرمایا جانا۔ "ونزد محسنین" غرض کہ جواب کی صورت سے نکال کر اس کو مستقل وعدہ قرار دیا یہ خیال دلانے کے لئے کہ کون کون کا اس زیادتی اجر کے درپے ہے، اس کو یہ اجر کی زیادتی مل کر رہے گی اگرچہ وہ امتثال امر نہ کرے، اس سے اندازہ کیجئے کہ جب وہ امتثال اجر کرے گا اس کے اجر کا کیا عالم ہوگا۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ امتثال امر ضرور کرے گا۔ امتثال امر سے مراد ہے باب القریہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ اور "حطۃ" کہنا اللہ کریم نے مغفرت کو تو "قولوا" اور "ادخلوا" پر موقوف کیا ہے، جس کی معنی یہ ہیں کہ اے بدکارو! اے گنہگارو! اگر تم باب القریہ سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوئے اور تم نے "حطۃ" کی صدائیں لگائیں، تو ہم تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ یہاں تک کہ امر و جواب امر کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب نئے سرے سے نیک لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

وسنزید المحسنین

اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محسنین کو زیادتی اجر کا ملنا سابقہ امتثال امر پر موقوف نہیں ہے۔ گو ان سے توقع یہی ہے کہ وہ امتثال امر کریں گے۔
دخول کی تحقیق:

(دخول) الدخول (ن) (Entered)

یہ خروج کی ضد ہے۔ اور مکان و زمان اور اعمال سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ دخل مکان کذا، فلاں جگہ میں داخل ہوا۔

قرآن میں ہے: "ادخلوا هذه القرية" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 58)
کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔

قریہ کی تعریف:

(قری) القرية (Town)

وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو جائیں تو بحیثیت مجموعی ان دونوں کو قریہ کہتے ہیں اور جمع ہونے والے لوگوں اور جگہ انفراد پر بھی قریہ بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَسئَلِ الْقَرْيَةَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 82)

بستی سے دریافت کر لیجئے۔

میں اکثر مفسرین نے اہل کالفظ محذوف مان کر قریہ سے وہاں کے باشندے مراد لئے ہیں۔

حیث کا استعمال:

(حیث) حیث

یہ ظرف مکان مبنی بر ضم ہے اور مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں

ہے:

"وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 144)

اور تم جہاں ہو کرو۔

تحقیق لفظ باب:

الباب (Door, Gate)

ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ دراصل امکانہ جیسے شہر، مکان، گھر وغیرہ میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے

ہیں۔ اس کی جمع ابواب ہے۔ قرآن میں ہے:-

"وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَالْفَيَا سَبَيْدَهَا لَدَى الْبَابِ"

(سورۃ یوسف آیت نمبر 25)

اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور عورت نے اس کا گرتا پیچھے سے چیر لیا اور دونوں کو عورت کا میاں دروازے کے پاس ملا۔

"لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَاَدْخُلُوا مِنْ اَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 67)

ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔

اور اسی سے (مجازاً) علم میں باب کذا کا محاورہ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ یعنی یہ علم فلاں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ایک حدیث

میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

"أنا مدينة العلم وعلی بابها"

کسی شاعر نے کہا ہے:

تم نے جو انردی کو اسی کی جگہ سے حاصل کیا۔

أتیت المروءة من بابها

قرآن میں ہے: "فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ ابْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 44)

تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

"بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 13)

جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے اس میں تو رحمت ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابواب جننا اور ابوب جہنم سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں قرآن میں

ہے:

"فَادْخُلُوا ابْوَابَ جَهَنَّمَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 29)

کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

مزید فرمایا:

"حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 73)

یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو اُس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ تو اُس کے داروغہ ان سے کہیں کہ تم پر سلام۔

اور جو چیز کسی کام کے لئے صلاحیت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ یہ اس کے مناسب ہے اس کی جمع بابت ہے ظلیل کا قول ہے کہ بابۃ کا لفظ حدود (اور حساب میں) استعمال ہوتا ہے بوقت بابا: میں نے دروازہ بنایا۔ نے بنے ہوئے دروازے قائم کئے ہوئے دروازے۔ البواب دربان بوقت بابا میں نے دروازہ بنایا۔ باب اصل میں بوب ہے اور اس میں الف واو سے مبدل ہے۔

تعریف سجدہ:

(س ج ۵) السجود (ن) (Prostration, Prayer)

اس کے اصل معنی عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو سجدہ کہا جاتا ہے اور یہ

انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔

اقسام سجدہ:

سجدہ کی دو قسمیں ہیں۔

سجدہ اختیاری:

جو انسان کے ساتھ خاص ہے اور اسی سے وہ ثواب الہی کا مستحق ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَاَسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا" (سورۃ النجم آیت نمبر 62)

سو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

بجود تخیری:

جوانسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُم بِالْغُدُوِّ وَالْاَصَالِ"

(سورۃ الرعد آیت نمبر 15)

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے خواہ مجبوری سے اور ان کی پرچھائیاں ہر صبح و شام۔

لفظ حط کا مفہوم:

(ح ط ط) الحط (ن)

کے معنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے حططت الرحل (میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا) جاربتہ محطوطہ المتن دوختر پست شکم کہ پشت دی دراز و ہموار باشد اور آیت کریمہ:

"وَقُولُوا حِطَّةٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 58)

اور حطتہ کہنا میں بنی اسرائیل کو یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے معنی ہیں اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی قولوا صوابا کے ہیں یعنی صحیح بات کہنا۔

لفظ غفر کا معنی:

(غ ف ر) الغفر (ض) (Forgiveness)

کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے اسی سے محاورہ ہے اغفر ثوبک فی ولوعاء اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں ڈال کر چھپا دو۔ اصبع ثوبک فانہ اغفر لوسخ کپڑے کو رنگ لو کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے اللہ کی طرف سے مغفرۃ یا غفران کے معنی ہوتے ہیں بندے کو عذاب سے بچالیا۔ قرآن میں ہے:

"غُفِرَ اِلَيْكَ رَبَّنَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 285)

اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں۔

تحقیق لفظ خطا:

(خ ط ا) الخطاء (Mistake)

والخطاء کے معنی صحیح جہت سے عدول کرنے کے ہیں۔

اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

کوئی ایسا کام بالا ارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔
یہ خطا تام ہے جس پر مواخزہ ہوگا اس معنی میں فعل خطئی بخطاء و خطاء بولا جاتا ہے قرآن میں ہے۔
"إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 31)
کچھ شک نہیں کہ ان کا مارڈالنا بڑا سخت جرم ہے۔
"وَإِنْ كُنَّا لَخَطِيئِينَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 91)
اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔

دوسری صورت:

ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے۔
کہا جاتا ہے: وَهَذَا قَدْ أَصَابَ فِي الْإِرَادَةِ وَأَخْطَأَ فِي الْفِعْلِ
اس میں اس کا ارادہ وہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے۔
اسی قسم کی خطا کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ
"رفع عن أمتي الخطأ والنسيان"
میری امت سے خطا اور نسیان اٹھائے گئے ہیں۔ نیز فرمایا: وَقَوْلُهُ
مَنْ اجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ
جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن میں ہے:
"وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطْئًا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ" (سورۃ النساء آیت نمبر 92)
اور جو غلطی سے مومن کو مار ڈالے تو ایک تو غلام کو آزاد کر دے۔

تیسری صورت:

غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہو جائے۔
اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہذا اس کا قصد مذموم ہوگا مگر فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا۔

الخطیئہ:

یہ قریب قریب سیئۃ کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَاحَاطَتْ بِهٖ حَاطِيْتُهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۸۱)

اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔ لیکن زیادہ تر خطنہ کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جو بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدر کا سبب بن جائے۔

مفہوم احسان:

(حسن ن) المحسن (Favour, Kindness)

الاحسان (افعال)

احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا کرنا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور انسان پر عدل و انصاف سے کام لینا تو واجب اور فرض ہے مگر احسان مندوب ہے۔ اسی بنا پر فرمایا:

"وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ" (سورۃ النساء آیت نمبر ۱۲۵)

اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے اللہ کا حکم قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔

اور فرمایا: "وَأَدَاءُ إِلَيْهِ بِأِحْسَانٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۷۸)

اور پسندیدہ طریق سے (قرارداد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خونہار) کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَأَنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر ۶۹)

اور اللہ تو نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

"إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۹۵)

بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

"مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۹۱)

نیکو کاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔

"لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ" (سورۃ النحل آیت نمبر ۳۰)

جنہوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے۔

نوٹ: قول، اکل، رغد، شئی، دخل اور زیادہ کا معنی زر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 59]

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ جُزْأٍ مِنَ السَّمَاءِ
بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝
”تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا، تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کی
بے حکمی کا۔“

متن:

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ بَدَلُوا بِمَا أَمَرُوا بِهِ مِنَ التَّوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ
بَطَلَبِ مَا يَشْتَهُونَ مِنْ أَعْرَاضِ الدُّنْيَا.
فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا كَرْرًا مَبَالِغَةً فِي تَقْبِيحِ أَمْرِهِمْ وَإِشْعَارًا بِأَنَّ الْإِنزَالَ عَلَيْهِمْ
لِظُلْمِهِمْ بِوَضْعِ غَيْرِ الْأُمُورِ بِهِ مَوْضِعَهُ، أَوْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِأَنَّ تَرْكُ مَا يُوجِبُ نَجَاتَهَا إِلَى مَا
يُوجِبُ هَلَاكَهَا.
رَجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ عَذَابًا مُقَدَّرًا مِنَ السَّمَاءِ بِسَبَبِ فَسُقِهِمْ، وَالرَّجْزُ فِي
الْأَصْلِ: مَا يَعْافِ عَنْهُ، وَكَذَلِكَ الرَّجْسُ. وَقُرءَ بِالضَّمِّ وَهُوَ لُغَةٌ فِيهِ وَالْمُرَادُ بِهِ الطَّاعُونَ.
رَوَى أَنَّهُ مَاتَ فِي سَاعَةٍ أَرْبَعَةٍ وَعِشْرُونَ أَلْفًا.

ترجمہ:

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ
تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا۔
یعنی جس توبہ و استغفار کا ان کو حکم دیا گیا تھا انہوں نے اس کے بدلے میں وہ چیزیں طلب کیں جن کی ان کے نفس میں
خواہش پیدا ہوئی یعنی سامان دنیا۔

فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا

"الذین ظلموا" کو مکرر ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان کے معاملات کی قباحت کے اظہار میں زور پیدا ہو اور یہ معلوم ہوا کہ ان
پر عذاب کا نازل کرنا ان کے اس ظلم کی وجہ سے تھا کہ انہوں نے اپنی جانوں پر یہ ظلم کیا تھا کہ جو امور ان کی نجات کا سبب تھے۔
ان کو چھوڑ کر ایسے امور اختیار کئے تھے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔

رَجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ

آسمان سے ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کی بے حکمی کا۔

یعنی ایسا عذاب جس کا آسمان سے نزول طے ہو چکا تھا اور یہ سب ان کے فسق کی وجہ سے تھا۔ "رجز" درحقیقت وہ چیز ہے جس سے ناگواری ہو اور "رجس" بھی اسی معنی میں ہے۔ اور "رجز" راہ کے ضمنہ کے ساتھ اسی کی ایک لغت ہے۔ اور "رجز" سے مراد طاعون ہے۔

چوبیس ہزار ہلاک:

منقول کے کہ ایک لمحہ میں چوبیس ہزار (24000) آدمی مر گئے تھے۔

لفظ بدل کی عمدہ تحقیق:

(ب بدل) الابدال والتبديل والتبديل الاستبدال (To Change, To Exchange)

کے معنی ایک چیز کو دوسری کی جگہ رکھنا کے ہیں۔ یہ عوض سے عام ہے کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں۔ خواہ اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ لائے قرآن میں ہے۔

"قَبَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 59)

تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا۔

"وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا" (سورۃ النور آیت نمبر 55)

اور ضرور ان کے اگلے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

اور آیت: "فَأُولَٰئِكَ يَبْدِلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 70)

تو ایسوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔

کے معنی بعض نے یہ کہے ہیں کہ وہ ایسے نیک کام کریں جو ان کی سابقہ برائیوں کو مٹادیں اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور ان کے نیک عملوں کا انہیں ثواب عطا کرے گا۔

"فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 181)

تو جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے۔

"وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ" (سورۃ النحل آیت نمبر 101)

جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔

"وَبَدَّلْنَا هُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ" (سورۃ قسماً آیت نمبر 16)

اور ان کے باغوں کے عوض دو باغ انہیں بدل دیئے۔

"ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 95)
پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔ اور آیت کریمہ:

"يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 48)
کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی موجودہ حالت تبدیل کر دی جائے گی۔

"أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ" (سورۃ شافر آیت نمبر 26)
کہ وہ (کہیں گی) تمہارے دین کو (نہ) بدل دے۔

"وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 108)
اور جس شخص نے ایمان چھوڑ کر اس کے بدلے کفر اختیار کیا۔

"وَأَنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ" (سورۃ محمد آیت نمبر 38)
اور اگر تم منہ پھرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔

اور آیت کریمہ: "مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ" (سورۃ ق آیت نمبر 29)
ہمارے ہاں بات بدلا نہیں کرتی۔

کا مفہوم یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتا پس اس میں تشبیہ ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وقوع پذیر ہوگی وہ اس کے علم کے مطابق ہی وقوع پذیر ہوگی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس کے وعدہ میں خلف نہیں ہوتا۔ اور فرمان باری تعالیٰ:

"وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ" (سورۃ الأنعام آیت نمبر 34)
تو ان میں خداوندی کو تبدیل کرنے والا نہیں۔

"لَا تَبْدِيلَ لِمَا خَلَقَ اللَّهُ" (سورۃ الروم آیت نمبر 30)
فطرت الہی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔

بھی ہر دو معانی پر محمول ہو سکتے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اس آخری آیت میں خبر بمعنی امر ہے اس میں اختصاء کی ممانعت ہے الا ابدال وہ پاکیزہ لوگ کہ جب کوئی شخص ان میں سے مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا قائم مقام فرمادیتے ہیں؟ درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں۔ درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں جنہوں نے صفات ذمیرہ کی بجائے صفات حسنہ کو اختیار کر لیا ہو۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف آیت:

"أَفَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 70)
تو ایسوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔

میں ارشاد فرمایا ہے۔

البادلہ کسے کہتے ہیں؟:

البادلۃ گردن اور ہنسل کے درمیان کا حصہ اس کی جمع بادل ہے قول شاعر،

ولارهل لباتہ وبادلہ

اس کے سینہ اور بظلوں کا گوشت ڈھیلانہیں تھا۔

لفظ غیر کی تعریف:

(غی ر) غیر (Alien, Beside)

اور محض نفی کے لئے یعنی اس سے کسی دوسرے معنی کا اثبات مقصود نہیں ہوتا جیسے مردت برجل غیر قائم یعنی میں ایسے

آدمی کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن میں ہے:

"وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغْيًا هُدًى مِنَ اللَّهِ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 50)

اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

تحقیق لفظ رجز:

(رجز) الرجز

اس کے اصل معنی اضطراب کے ہیں اور اسی سے رجز البعیر ہے جس کے معنی ضعف کے سبب چلتے وقت اونٹ کی ٹانگوں

کے کپکپائی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے ہیں ایسے اونٹ کو رجز اور ناقہ کو رجزاء کہا جاتا ہے۔

راجز، رجاز اور رجازة:

شعر کے ایک بحر کا نام بھی رجز ہے جس میں شعر پڑھنے سے زبان میں اضطراب سا معلوم ہوتا ہے اور جو قصیدہ اس بحر میں

کہا جائے اسے رجزہ کہا جاتا ہے اس کی جمع راجیز آتی ہے اور رجز فلان وار تجز کے معنی بحر رجز پر شعر بنانے یا رجزہ

پڑھنے کے ہیں اور رجز گو شاعر کو راجز، رجاز اور رجازة کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

"عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ" (سورۃ سبأ آیت نمبر 5)

(ان کے لئے) عذاب دردناک کی سزا ہے۔

میں لفظ رجز زلزہ کی طرح عذاب سے کنایہ ہے۔ اور فرمایا:

"إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 34)

ہم ان پر ایک آسمانی آفت نازل کرنے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ: "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" (سورۃ المدثر آیت نمبر 5) اور نجاست سے الگ رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رجز سے بت مراد ہیں۔ بعض نے اس سے ہر وہ عمل مراد لیا ہے جس کا نتیجہ عذاب ہو اور گناہ کو بھی مال کے لحاظ سے عذاب کہا جاسکتا ہے جیسے ندی بمعنی شحم آجاتا ہے اور آیت:

"وَيُنزِلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَ كُفْرًا بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ"

(سورۃ انفال آیت نمبر 11)

اور آسمانوں سے تم پر پانی برسار ہا تھا تا کہ اس کے ذریعہ سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی کو تم سے دور کرے۔ میں رجز الشیطان سے مراد خواہشات نفسانی ہیں جیسا کہ اس کے محل میں بیان کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے کفر بہتان طرازی فساد انگیزی وغیرہ گناہ مراد ہیں جن کی کہ شیطان ترغیب دیتا ہے۔

رجازة کے کہتے ہیں؟:

رجازة وہ کھل جس میں پتھر وغیرہ باندھ کر اونٹ کے ہودہ کا توازن قائم رکھنے کے لئے ایک طرف باندھ دیتے ہیں اس میں بھی حرکت واضطراب کے معنی ملحوظ ہیں۔

لقی کی تحقیق:

(ل ق ی) لقیہ (س) (To be Mixed, Mingled)

یلقاہ لقاء کے معنی کسی کے سامنے آنے اور اسے پالینے کے ہیں اور ان دونوں معنی میں سے ہر ایک الگ الگ بھی بولا جاتا ہے اور کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 143)

اور تم موت (شہادت) آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے اور ملاقات الہی سے مراد قیامت کا پاپا ہونا اور اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جانا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے: "وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُواهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 223)

اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے۔

رجع اور رجوع میں فرق:

(رج ع) الرجوع (To Return Back)

اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے میدان حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور

خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز کے اور یا باعتبار فعل کے ہو الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رجوع کے معنی لوٹانے کے۔

نوٹ: ظلم، قول ساء، فسق اور لفظ رب کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 60]

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشَرَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعَثُوا فِي الْأَرْضِ مُمْسِدِينَ ۝
”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو فوراً اس میں سے بارہ چشمے بہ نکلے، ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو“۔

متن:

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ لَهَا عَطَشُوا فِي التَّيْه.

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ اللَّام فِيهِ لِلْعَهْدِ عَلَىٰ مَا رَوَىٰ أَنَّهُ كَانَ حَجْرًا طُورِيًّا. مَكْعَبًا حَمَلَهُ مَعَهُ. وَكَانَتْ تَتَّبِعُ مِنْ كُلِّ وَجْهِ ثَلَاثَ أَعْيُنَ، تَسِيلُ كُلَّ عَيْنٍ فِي جَدُولٍ إِلَىٰ سَبْطٍ. وَكَانُوا سِتْمِائَةَ أَلْفٍ وَسَعَةَ الْمَعْسُكِرِ اثْنَا عَشَرَ مِيلًا، أَوْ حَجْرًا أَهْبَطَهُ آدَمُ مِنَ الْجَنَّةِ. وَوَقَعَ إِلَىٰ شَعِيبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَأَعْطَاهُ لِمُوسَىٰ مَعَ الْعَصَا، أَوْ الْحَجَرَ الَّذِي فَرَّ بِشُوبِهِ لَهَا وَضَعَهُ عَلَيْهِ لِيُغْتَسَلَ وَيُرَأَىٰ اللَّهُ بِهِ عَمَّا رَمَوْهُ بِهِ مِنَ الْإِدْرَةِ. فَأَشَارَ إِلَيْهِ جَبْرِئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِحَمَلِهِ، أَوْ لِلْجِنْسِ وَهَذَا أَظْهَرَ فِي الْحُجَّةِ. قِيلَ لَمْ يَأْمُرْهُ بِأَنْ يَضْرِبَ حَجْرًا بَعَيْنِهِ. وَلَكِنْ لَهَا قَالُوا:

كَيْفَ بَنَالُوا أَفْضَيْنَا إِلَىٰ أَرْضٍ لَا حَجَارَةَ بِهَا، حَمَلُ حَجْرًا فِي مَخْلَاتِهِ. وَكَانَ يَضْرِبُهُ بِعَصَاةٍ إِذَا نَزَلَ فَيَنْفَجِرُ، وَيَضْرِبُهُ بِهَا إِذَا ارْتَحَلَ فَيَبْسُ. فَقَالُوا: إِنْ فَقَدَ مُوسَىٰ عَصَاةَ مَتْنَا عَطَشًا، فَأَوْحَىٰ اللَّهُ إِلَيْهِ لَا تَقْرَعِ الْحَجَرَ وَكَلِمَهُ يَطْعَكَ لَعَلَّهُمْ يَعْتَبِرُونَ. وَقِيلَ كَانَ الْحَجَرُ مِنْ رِخَامٍ وَكَانَ ذِرَاعًا فِي ذِرَاعٍ، وَالْعَصَا عَشْرَةَ أَذْرَعٍ عَلَىٰ طُولِ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ أَسِ الْجَنَّةِ وَلَهَا شَعْبَتَانِ تَتَّقِدَانِ فِي الظُّلْمَةِ.

فَإِنْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشَرَ عَيْنًا مَتَعَلِقًا بِمَحْذُوفٍ تَقْدِيرُهُ: فَإِنْ ضَرَبْتَ فَقَدْ أَنْفَجَرْتَ، أَوْ فَضْرِبْ فَانْفَجَرْتَ، كَمَا مَرَّ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: فَتَابَ عَلَيْكُمْ. وَقُرءُ «عَشْرَةَ» بِكَسْرِ الشَّيْنِ

وفتحها وهما الفتان فيه.

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ كُلِّ سَبْطٍ. مَشْرَبَهُمْ عَيْنَهُمُ الَّتِي يَشْرَبُونَ مِنْهَا. كُلُّوا وَاشْرَبُوا عَلَي
تقدير القول:

مِنْ رِزْقِ اللَّهِ يُرِيدُ بِهِ مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ مِنَ الْمَنِّ وَالسَّلْوَى وَمَاءَ الْعَيْونِ. وَقِيلَ الْمَاءُ وَحْدَهُ
لأنه يشرب ويؤكل مما ينبت به. وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ لَا تَعْتَدُوا حَالِ
إِفْسَادِكُمْ، وَإِنَّمَا قَيْدُهُ لِأَنَّهُ وَإِنْ غَلَبَ فِي الْفَسَادِ قَدْ يَكُونُ مِنْهُ مَا لَيْسَ بِفَسَادٍ. كِمُقَابَلَةِ
الظَّالِمِ الْمُعْتَدِي بِفَعْلِهِ وَمِنْهُ مَا يَتَضَمَّنُ صِلَاحاً رَاجِحاً كَقَتْلِ الْخَضِرِ عَلَيْهِ السَّلَامِ
الغلام وخرقه السفينة، ويقرب منه العيث غير أنه يغلب فيما يدرك حساً، ومن أنكر
أمثال هذه المعجزات فلغاية جهله بالله وقلة تدبره في عجائب صنعه، فإنه لما أمكن أن
يكون من الأحجار ما يخلق الشعر وينفر عن الخل ويجذب الحديد، لم يمتنع أن يخلق الله
حجراً يسغره لجذب الماء من تحت الأرض، أو لجذب الهواء من الجوانب ويصيره ماء
بقوة التبريد ونحو ذلك.

ترجمہ:

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ان کو میدان تیرے میں پیاس لگی تھی، "الحجر" اس میں لام عہد خارجی کا ہے، یعنی "الحجر"
سے ایک معینہ پتھر مراد ہے جو کوہ طور سے لیا گیا تھا، اس کے چار (4) کونے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ پتھر اپنے
ساتھ لے لیا اس سے تین چشمے نکلتے تھے۔ ہر چشمہ ایک نالی کی صورت میں ایک خاندان تک پہنچتا تھا۔ بنی اسرائیل کی تعداد چھ
لاکھ (600000) تھی، اور لشکر کی وسعت بارہ (12) میل پر پھیلی ہوئی تھی، یا اس سے وہ پتھر مراد ہے جو حضرت آدم علیہ
السلام جنت سے لے کر آئے تھے، پھر وہ حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا، پھر حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ
علیہ السلام کو عصا کے ساتھ یہ پتھر بھی عنایت فرمایا، یا یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بوقت غسل کپڑے رکھے
تھے اور وہ کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عیب سے بری کرنا چاہتا
تھا جس کی بنی اسرائیل نے آپ علیہ السلام پر تہمت لگائی ہوئی تھی۔ یعنی انشراح خصیتین، یعنی جب وہ پتھر کپڑے لے کر بھاگ
گیا تو لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ لیا کہ وہ اس عیب سے پاک ہیں۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے یہ مشورہ
دیا کہ اس کو اٹھا لیجئے اور اپنے ساتھ رکھئے۔

یا "الحجر" کا لام تعریف جنس کے لئے ہے تو جیہہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے حجت پوری طرح قائم ہو جاتی
ہے۔ اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پانی کا پھوٹ نکلنا کسی خاص پتھر کی کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ خالص معجزہ نبی تھا۔

قِيلَ لِمَ يَأْمُرُكَ أَنْ يَضْرِبَ حَجْرًا بِعَيْنِهِ

وہ پتھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس حیثیت سے نہیں لیا تھا کہ معین طریقہ پر اسی کو لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ بلکہ اس لئے تھا کہ جنس حجر کا وہ بھی ایک فرد ہے۔ بنی اسرائیل جب حجر کے بارے میں مطمئن ہوئے تو انہوں نے عصا کے بارے میں اندیشے ظاہر کرنا شروع کر دیئے، کہنے لگے اگر عصاے موسیٰ گم ہو گیا تو ہم پیاس سے مرجائیں گے تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ پتھر کو مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے صرف کہہ دو وہ تمہاری اطاعت کرے گا۔ شاید بنی اسرائیل اس سے ہدایت حاصل کریں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر پتلا سا تھا ایک ہاتھ لبا اور ایک ہاتھ چوڑا تھا، اور عصادس (10) ہاتھ کا تھا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد جتنا تھا۔ یہ جنت کے درخت مورد کی لکڑی کا تھا اس میں دو (2) شاخیں تھیں جو رات کو روشن ہو جاتی تھیں۔

"فانفجرت" کا تعلق جملہ مخذوفہ سے ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی،

فان ضربت فقد انفجرت

یعنی اگر تم نے عصا کو پتھر پر مارا۔ تو بس ادھر مارا ادھر چشمہ پھوٹ پڑا۔ یا تقدیر عبارت ہے،

فضرب فانفجرت

یعنی موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا اور چشمہ پھوٹ نکلے۔ یہ مخذوفات و مقدرات ایسے ہی ہیں جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان "فتاب علیکم" میں بیان ہوئے ہیں اور عشرہ کا لفظ جب اثنان یا ثالثہ وغیرہ کے ساتھ مرکب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ تو اس کے شین میں دو لغتیں اور بھی ہیں۔ سین کا کسرہ اور شین کا فتح۔ اور قرآن نے ان دونوں لغات کے ساتھ پڑھا ہے۔

"کل انبیین" سے مراد بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ اور خاندان ہے۔ "مشر بہم" یعنی وہ چشمہ جس سے اس خاندان کو پانی پینا ہے۔ "کلوا واشربوا" اس سے پہلے "قلنا لہم" مقدر ہے۔ "من رزق اللہ" رزق سے مراد وہ رزق ہے جو اللہ کریم نے ان کو عطا کیا تھا، یعنی من و سلوئی اور چشموں کا پانی، پس کلوا متوجہ ہے من و سلوئی کی جانب اور اشروا متوجہ ہے ماء العیون کی جانب، یعنی من و سلوئی کھاؤ اور چشموں کا پانی پیو۔ بعض کے نزدیک رزق سے مراد صرف پانی ہے کیونکہ خود پانی پیا جاتا ہے اور پانی سے جو کچھ اگتا ہے اس کو کھایا جاتا ہے لہذا کلوا واشربوا کا امر اس تفسیر پر بھی منطبق ہے۔

ولا تعشوا فی الارض مفسدین

اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو۔

"لا تعشوا" کے معنی ہیں کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ اور مفسدین "لا تعشوا" کی ضمیر فاعل سے حال واقع ہے لہذا ترجمہ ہوگا کہ تم اپنے فساد کرنے کی حالت میں حد سے تجاوز نہ کرو، شاید مقصود یہ ہے کہ نہ فساد کرو اور نہ حد سے تجاوز کرو۔ اور "لا تعشوا" کو مفسدین کے ساتھ مقید کرنے کی وجہ یہ ہے کہ "عشی" جس سے "لا تعشوا" مشتق ہے۔ اگرچہ فساد کے معنی میں

اس کا استعمال غالب ہے لیکن کبھی اسکی چیز پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جو فساد نہیں ہوتی۔ جیسے عالم متحدی کے بدلہ میں اس پر اعتداء کرنا باوجودیکہ فساد نہیں ہے لیکن اس پر عصا کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس صورت میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جس میں صلاح کا پہلو غالب ہو جیسے حضرت حضرت علیہ السلام کا لڑکے کو قتل کرنا، اور کشتی میں شگاف ڈالنا، پس مفسدین کے ساتھ مقید کرنے کے معنی یہ ہیں کہ مخاطبین کو اس چیز سے منع کرنا مقصود ہے جس میں صرف فساد ہی کے معنی ہیں کوئی دوسرا پہلو اس میں نہیں ہے۔

ومن أنكر أمثال هذه المعجزات

عصا کا سانپ بن کر دوڑنے لگنا، چھوٹے سے پتھر سے بارہ چشمے نکلنا، وغیرہ معجزات ہیں۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ان معجزات کے منکر ہیں۔ لیکن یہ انکار اس پر مبنی ہے کہ منکر اللہ کریم کی شان سے جاہل ہیں اور اس عجیب و غریب مخلوقات میں اس نے بہت کم غور کیا ہے۔ لیکن جو لوگ فاعل مختار کے وجود کا اعتقاد رکھتے ہیں یہ شبہات ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے اور جو قادر مختار کے وجود پر ایمان نہیں رکھتے ان کے اوپر جہل اور غباوت کی ظلمت چھائی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ یہ غور کر سکتے ہیں کہ جب ہمارے سامنے پتھروں کی ایک ایسی قسم موجود ہے جن کو بالوں پر رکھ دیا جائے تو بال غائب ہو جائیں، اسی طرح ایک قسم پتھروں کی ایسی ہے جس کی طبیعت سرکہ کے منافی ہے، اس کو سرکہ میں ڈالنے تو اچھل کر باہر آجائے گا۔ ایک پتھر ایسا ہے جو مقناطیسی خاصیت رکھتا ہے اور لوہے کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے جب اللہ کریم نے ہمارے سامنے ایسی چیزیں رکھ دیں تو کیا اس قادر و توانا کے یہاں یہ بعید ہے کہ ایسا پتھر پیدا فرما دے جو پانی کو زمین کے نیچے سے کھینچ لے یا اپنے چاروں طرف سے ہوا کو جذب کر لے، اور قوت تبرید یا اس جیسی مخفی تدبیر سے اس کو پانی بنا دے۔

استسقاء کا معنی:

الاستسقاء (Ask for Water)

کے معنی کسی سے پانی طلب کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔

"وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 60)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو۔

لفظ ضرب کی عمدہ تحقیق:

(ضرب) الضرب (Struck. Beat)

کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر واقع کرنا یعنی مارنا کے ہیں اور مختلف اعتبارات سے یہ لفظ بہت سے معانی میں استعمال

ہوتا ہے۔ ہاتھ لاشی کو اور دھیرہ سے مارنا۔ قرآن میں ہے:

"فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَدَانٍ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 12)

ان کے سر مار کر اڑا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ دو۔

"فَقَطْرَبِ الرَّقَابِ" (سورۃ محمد آیت نمبر 4)

تو انکی گردنیں اڑا دو۔

"فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 73)

تو ہم نے کہا کہ اس بل کا سا ٹکڑا متول کو مارو۔

"أَنْ اضْرِبَ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 160)

اپنی لاشی پتھر پر مارو۔

"فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 93)

پھر ان کو داہنے ہاتھ سے مارنا اور توڑنا شروع کیا۔

"يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ" (سورۃ محمد آیت نمبر 27)

ان کے مونہوں پر مارتے ہیں۔

اور ضرب الارض بالمطر کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔ اور ضرب الدرہم (دراہم کو ڈھالنا) کا محاورہ الضرب

بالمطرۃ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور نکسال کے سکھ میں اثر کرنے کے مناسبت سے طبع الدرہم کہا جاتا ہے اور

تشبیہ کے طور پر انسان کی عادت کو ضربیۃ اور طبیعۃ بھی کہہ دیتے ہیں۔ ضرب فی الارض کے معنی سفر کرنے کے ہیں۔

کیونکہ انسان پیدل چلنے وقت زمین پر پاؤں رکھتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 101)

اور جب سفر کو جاؤ۔

"وَقَالُوا الْإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ" (سورۃ قال عمران آیت نمبر 156)

اور ان کے مسلمان بھائی جب خدا کی راہ میں سفر کریں تو ان کی نسبت کہتے ہیں۔

"لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 273)

اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اور یہی معنی آیت:

"فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا" (سورۃ طہ آیت نمبر 77)

اور ان کے لئے دریا میں سوکھا راستہ نکال دے۔

یعنی انہیں سمندر میں خشک راستے سے لے جاؤ۔

ضرب الفحل ناقۃ (زکا مادہ سے جفتی کرنا) یہ محاورہ ضرب بالمطرقة (ہتھوڑے سے کوٹنا) کی مناسبت سے طرق الفحل الناقۃ کا محاورہ بولا جاتا ہے۔ ضرب الخیمۃ خیمہ لگانا کیونکہ خیمہ لگانے کے لئے میخوں کو زمین میں ہتھوڑے سے ٹھونکا جاتا ہے اور خیمہ کی مناسبت سے آیت:

"ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ النَّيْلَةُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 112)

اور آخر کار ذلت ان سے چٹا دی گئی۔

میں ذلت کے متعلق ضرب کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی کہ ذلت نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسا کہ کسی شخص پر خیمہ لگا ہوا ہوتا ہے اور یہی معنی آیت:

"وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 112)

اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے۔

کے ہیں اور آیت:

"فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 11)

تو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئے برس تھپکا۔

نیز آیت کریمہ: "فَضْرِبْ بَيْنَهُمْ يَسُورًا" (سورۃ الحديد آیت نمبر 13)

پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائیگی۔

میں ضرب کا لفظ ضرب الخیمۃ کے محاورہ سے مستعار ہے۔ ضرب العود والنای والبوق عود اور نے بجان یا زنگھے

میں پھونکنا۔

ضرب اللبن:

ایشیں چننا، ایک اینٹ کو دوسری پر لگانا ضرب المثل کا محاورہ ضرب الدرہم ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی بات کو

اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے۔

"ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 29)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے:

"وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 32)

اور ان سے قصہ بیان کرو۔

"صَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ" (سورۃ الروم آیت نمبر 28)

وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَلَقَدْ صَرَبْنَا لِلنَّاسِ" (سورۃ الروم آیت نمبر 58)

اور ہم نے ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

"وَلَقَدْ صَرَبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 57)

اور جب مریم (علیہ السلام) کے بیٹے (عیسیٰ) کا حال بیان کیا گیا۔

"مَا صَرَبُوا لَكَ إِلَّا جَدَلًا" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 58)

انہوں نے عیسیٰ کی جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

"وَاصْرَبْ لَهُمْ مَثَل الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 45)

اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کر دو۔

"أَفَنظُرُ بَعْنَكُمْ الَّذِي كُرَّ صَفْحًا" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 5)

بھلا (اس لئے کہ تم حد سے نکلے ہوے لوگ ہو) ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے۔

مضاربة:

المضاربة ایک قسم کی تجارتی شرکت (جس میں ایک شخص کا سرمایہ اور دوسرے کی محنت ہوتی ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں) المضاربة (دلالتی رضائی) جس پر بہت سی سلائی کی گئی ہو۔ التضرب اکسانا گویا اسے زمین میں سفر کی ترغیب دی جاتی ہے۔

اضطراب:

الاضطراب کثرت سے آنا جانا حرکت کرنا یہ معنی ضرب الارض سے ماخوذ ہیں۔ استضرب الناقة سانڈھے نے ناقہ پر جفتی کھانے کی خواہش کی۔

لفظ عصا کا معنی:

(عصی) العصا (Mace)

(لاٹھی) یہ اصل میں ناقص وادی ہے کیونکہ اس کا تشبیہ عصوان جمع عصی آتی عصوتہ میں نے اسے لاٹھی سے

مارا۔ عصیت بالسيف تلوار کو لاٹھی کی طرح دونوں ہاتھ سے پکڑ کر مارا۔ قرآن میں ہے:

"وَأَلْقِ عَصَاكَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 10)

اپنی لاشمی ڈال دو۔

"فَأَلْقَى عَصَاهُ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 107)

موتی نے اپنی لاشمی (زمین پر) ڈال دی۔

"قَالَ هِيَ عَصَائِي" (سورۃ قطفہ آیت نمبر 18)

انہوں نے کہا یہ میری لاشمی ہے۔

"فَأَلْقُوا جِبَالَهُمْ وَعَصِيَّتَهُمْ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 44)

تو انہوں نے اپنی رسیاں اور لاشمیاں ڈالیں۔

القی فلان عصاہ کسی جگہ پڑاؤ ڈالنا کیونکہ جو شخص سفر سے واپس آتا ہے وہ اپنی لاشمی ڈال دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

والقت عصاها واستقر بها النوى

فراق نے اپنی لاشمی ڈال دی اور جم کر بیٹھ گیا۔

عصی عصیانہ کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں دراصل اس کے معنی ہیں اس نے لاشمی (عصا) سے اپنا بچاؤ

کیا۔ قرآن میں ہے:

"وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ" (سورۃ قطفہ آیت نمبر 121)

اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی۔

"وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 14)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔

"الآن وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ" (سورۃ یونس آیت نمبر 91)

کیا اب اور پہلے سے نافرمان رہا۔

اور اس شخص کے متعلق جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے اسے کہا جاتا ہے فلان شق لعصا۔

حجر کی تعریف:

(حجر الحجر) (Stone)

سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع احجار و حجارة آتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَقَوْذُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 24)

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

تعریف فجر:

(فجر) الفجر (Dawn, Morning)

کے معنی کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں جیسے محاورہ ہے فجر الانسان السکری اس نے بند میں وسیع شکاف ڈال دیا فجر تہ فان فجر تہ فت فجر شدت کے ساتھ پانی کو پھاڑ کر بہا یا قرآن میں ہے:

"وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا" (سورۃ القمر آیت نمبر 12)

اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے۔

"وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهْرًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 33)

اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو۔

"تَفَجَّرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 90)

جب تک کہ ہمارے لئے زمین میں سے چشمے جاری (نہ) کر دو۔

اور ایک قرأت میں فجر (بصیغہ تفعیل) ہے۔

فجر کی وجہ تسمیہ:

"فَإِنْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشَرَ عَيْنًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 60)

تو پھر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اور اسی سے صبح کو فجر کہا جاتا ہے۔

کیونکہ صبح کی روشنی بھی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے،

"وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشِيرٍ" (سورۃ الفجر آیت نمبر 1-2)

فجر کی قسم اور دس راتوں کی۔

"إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 78)

کیونکہ صبح کے وقت قرآن پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے۔

فجر کی اقسام:

بعض نے کہا ہے کہ فجر دو قسم پر ہے ایک فجر کاذب جو بھیڑیے کی دم کی طرح سیدھی روشنی سی نمودار ہوتی ہے دوم فجر صادق جس کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ احکام تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے،

"حَتَّىٰ يَتَّبِعَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتَمُوا الصِّيَامَ إِلَىٰ"

اللَّيْلُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 187)

یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کر دو۔

تحقیق بالتفصیل للفظ العین:

(عین) العین (Person)

اور عین کے معنی شخص اور کسی چیز کا محافظ کے بھی آتے ہیں اور فلان بعینی کے معنی ہیں۔ فلاں میری حفاظت اور نگہبانی میں ہے جیسا کہ ہو معر ای منی و مسمع کا محاورہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا" (سورۃ الطور آیت نمبر 48)

تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔

وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی۔

"وَلِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي" (سورۃ قطہ آیت نمبر 39)

اور اس لئے کہ تو میری نگاہ کے سامنے تیار ہو۔

اور اسی سے عین اللہ علیک ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت اور نگہداشت فرمائے یا اللہ تعالیٰ تم پر اپنے

نگہبان فرشتے مقرر کرے جو تمہاری حفاظت کریں اور اعین و عیون دونوں عین کی جمع ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدِرِي أَعْيُنُكُمْ" (سورۃ قہود آیت نمبر 31)

اور میں انہیں نہیں کہتا جن کو تمہاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں۔

"رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 74)

اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔

اور استعارہ کے طور پر عین کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو مختلف اعتبارات سے آنکھ میں پائے جاتے ہیں۔

پہلا معنی:

مکینزہ کے سوراخ کو عین کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیئت اور اس سے پانی بہنے کے اعتبار سے آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پھر اس

سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے۔

دوسرا معنی:

سقاء عین و معین پانی کی مٹک جس سے پانی ٹپکتا ہو عین قرینک اپنی نئی مٹک میں پانی ڈالو اتا کہ تر ہو کر اس میں سلامتی کے

سوراخ بھر جائیں، جاسوس کو عین کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دشمن پر آنکھ لگائے رہتا ہے جس طرح کہ عورت کو فرج اور سواری کو ظہر

کہا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں سے مقصود یہی دو چیزیں ہوتی ہیں چنانچہ محاورہ ہے،

فلان يملك كذا فرجا و كذا ظهرا
فلاں کے پاس اس قدر لونڈیاں اور اتنی سواریاں ہیں۔

تیسرا معنی:

عین بمعنی سونا بھی آتا ہے کیونکہ جو جو اہر میں افضل سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اعضاء میں آنکھ سب سے افضل ہوتی ہے اور ماں باپ دونوں کی طرف سے حقیقی بھائیوں کو اعیان الاخوة کہا جاتا ہے۔

چوتھا معنی:

بعض نے کہا ہے کہ عین کا لفظ جب ذات شے کے معنی میں استعمال ہو جیسے کل مالہ عین تو یہ معنی مجاز ہی ہوگا جیسا کہ غلام کو رقبة (گردن) کہہ دیا جاتا ہے اور عورت کو فرج (شرمگاہ) کہہ دیتے ہیں کیونکہ عورت سے مقصود ہی یہی جگہ ہوتی ہے۔

پانچواں معنی:

پانی کے چشمہ کو بھی عین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پانی ابلتا ہے جس طرح کہ آنکھ سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور عین الماء سے ماء عین کا محاورہ لیا گیا ہے جس کے معنی جاری پانی کے ہیں جو صاف طور پر چلتا ہوا دکھائی دے۔ اور عین کے معنی جاری چشمہ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

"عَيْنًا فِيهَا تُسْمَى سَلْسَبِيلًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر 18)

یہ بہشت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔

"وَأَخْرَجْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا" (سورۃ القمرا آیت نمبر 12)

اور زمین میں چشمے جاری کر دیے۔

"فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيَانِ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 50)

ان میں دو چشمے بہ رہے ہیں۔

"عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 66)

دو چشمے ابل رہے ہیں۔

"وَأَسْلَمْنَا لَهُ عَيْنَ الْقَطْرِ" (سورۃ قسما آیت نمبر 12)

اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا تھا۔

"فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 45)

باغ اور چشموں میں۔

"مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 57)

باغ اور چشمے اور کھیتیاں۔

عنت الرجل کے معنی ہیں میں نے اس کی آنکھ پر مارا جیسے راستہ کے معنی ہوتے ہیں میں نے اس کے سر پر مارا فادتہ میں نے اس کے دل پر مارا نیز عنتہ کے معنی ہیں میں نے اسے نظر بد لگا دی جیسے سفتہ کے معنی ہیں میں نے اسے تلواری سے مارا یہ اس لئے کہ اہل عرب کبھی تو اس عضو سے فعل مشتق کرتے ہیں جس پر مارا جاتا ہے اور کبھی اس چیز سے جو مارنے کا آلہ ہوتی ہے جیسے سفتہ ورمحتہ چنانچہ دیدینکا لفظ ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی میں نے اسے ہاتھ سے مارا یا اس کے ہاتھ پر مارا اور عنت البئر کے معنی ہیں کنواں کھودتے کھودتے اس کے چشمہ تک پہنچ گیا قرآن پاک میں ہے۔

"إِلَى زَبُورَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ" (سورۃ المؤمن آیت نمبر 50)

ایک اونچی جگہ پر جو رہنے کے لائق تھی اور ہوا پانی جاری تھا۔

"فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ" (سورۃ الملك آیت نمبر 30)

تو (سوائے خدا کے) کون ہے جو تمہارے لئے شیریں پانی کا چشمہ بہالائے۔

بعض نے کہا ہے کہ معین میں لفظ میم حروف اصلہ سے ہے اور یہ معنت سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں کسی چیز کا سہولت سے چلنا یا بہنا اور پر بھی بولا جاتا ہے اور وحشی گائے کو آنکھ کی خوب صورتی کی وجہ سے اعین دعیناء کہا جاتا ہے اس کی جمع عین سے پھر گاوان وحشی کے ساتھ تشبیہ دے کر خوبصورت عورتوں کو بھی عین کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 48)

جو نگاہیں نیچی رکھتی ہوں (اور) آنکھیں بڑی بڑی۔

"وَحُورٌ عِينٌ" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 22)

اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

شراب کی تعریف:

(شرب) الشراب (To Drink)

کے معنی پانی یا کسی اور مائع چیز کو نوش کرنے کے ہیں۔ قرآن نے ہی جنت کے متعلق فرمایا:

"وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر 21)

اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

اور اہل دوزخ کے متعلق فرمایا:

"لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ" (سورۃ یونس آیت نمبر 4)

ان کے لئے پینے کو کھولتا ہوا پانی۔

شراب کی جمع اشربۃ ہے اور شربتہ شرابا و شرابا کے معنی پینے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:

"فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّيْ إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ"

تو جو اس کا پانی پیے وہ میرا نہیں اور جو نہ پیے وہ میرا ہے مگر وہ جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے لے لے تو سب نے اس سے پیا مگر تھوڑوں نے۔

چنانچہ انہوں نے اس سے پی لیا۔ نیز فرمایا:

"فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهَيْمِ" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 55)

اور پیو گے بھی تو ایسے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

الشراب پانی کا حصہ پینے کی باری۔

قرآن میں ہے:

"هَذِهِ نَاقَةٌ لِّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبٌ يَوْمَ مَعْلُومٍ" (سورۃ اشراء آیت نمبر 155)

یہ اونٹنی ہے (ایک دن) اس کی پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین تمہاری باری۔

"كُلُّ شِرْبٍ مُّخْتَصِرٌ" (سورۃ القمر آیت نمبر 28)

ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیے۔

المشرب کی تعریف:

المشرب مصدر پانی پینا (ظرف زمان یا مکان) پانی پینے کی جگہ یا زمانہ قرآن میں ہے:

"قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 60)

تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر کے پانی پی لیا۔

الشراب تم پیالہ یا شراب کو کہتے ہیں اور مونچھ کے بالوں اور حلق کی اندرونی رگ کو شارب کہا جاتا ہے گویا ان کو پینے والا

تصور کیا گیا ہے اس کی جمع شوارب آتی ہے۔ حزلی نے گورخر کے متعلق کہا ہے۔

صضب الشوارب لا يزال كانه

اس کی مونچھیں سخت گویا وہ۔

اور آیت کریمہ: "وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 93)

اور ان (کے کفر کے سبب) بچھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رنج گیا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اشربت البعیر کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گلے میں رسی باندھنے کے ہیں

شاعر نے کہا ہے:

واشربتها الاقران حتى وقصتها بقرح وقد القين كل جنين

میں نے انہیں باہم باندھ لیا حتیٰ کہ قرح (منڈی) میں لا ڈالا اس حال میں کہ انہوں نے حمل گرا دیئے تھے۔

تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ گویا بچھڑا ان کے دلوں پر باندھ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ بچھڑے کی

محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہے کیونکہ عربی محاورہ میں جب کسی کی محبت یا بغض دل کے اندر سرایت کر جائے تو اس کے

لئے لفظ شراب کو بطور استعارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ بدن میں نہایت تیزی سے سرایت کرتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

تغلغل حيث لم يبلغ شرابه ولا حزن ولم يبلغ

سرور اس کی محبت وہاں تک پہنچ گئی جہاں کہ نہ شراب اور نہ ہی حزن و سرور پہنچ سکتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ

بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر زیادہ نہیں تھی تو ہم کہیں گے کیوں نہیں؟ عجل کا لفظ بول کر ان کی فرط محبت پر تشبیہ کی

ہے کہ بچھڑے کی صورت ان کے دلوں میں اس طرح نقش ہو گئی تھی کہ محو نہیں ہو سکتی تھی مثل مشہور ہے۔ اشربتني ما لم اشرب

یعنی تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔

فساد کی تعریف:

(فساد) الفساد (ن) (Quarrel)

یہ فساد الشئی فہو فاسد کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ

تجاوز کم ہو یا زیادہ قرآن میں ہے:

"لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 71)

تو آسمان و زمین سب درہم برہم ہو جائیں۔

نوٹ: اذا، قد، ناس، اکل اور رزق

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 61]

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ
مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِيهَا وَبَصِلِهَا قَالَ أَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَكْثَرُ بِالَّذِي هُوَ

خَيْرٌ اَهْبِطُوا مِصْرَ اَقْرَابِكُمْ مَا سَأَلْتُمْ وَطَرَبْتُمْ عَلَيْهِمُ الدَّلِيلَةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَاؤُكُمْ بِغَضَبِ
 مِنْ اَللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّكُمْ كَانْتُمْ اِيْكَافُوْنَ اِيْهَا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْنَ الْاَسْوَاقَ الَّتِيْ هِيَ كَذٰبَةٌ
 وَكَانُوا اِيْعْتَدُوْنَ ۝

”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز مبر نہ ہو گا تو آپ اپنے رب سے دعا کہتے کہ زمین کی
 لگائی ہوئی چیزیں ہمارے لئے نکالے کچھ ساگ اور گڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہت سے
 بدلے مانگتے ہو اچھا مصرف یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور
 ناداری، اور خدا کے غضب میں لوٹے، یہ بدلہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو لاقی فرماتے
 کرتے، یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا،“

متن:

وَ اِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسٰى لَنْ نُّصِيْبَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ يَّرِيْدُوْنَ بِهٖ مَا رَزَقُوْا فِى التِّيْهٖ مِنْ الْمَن
 وَالسَّلٰوٰى.

و بوحده انه لا يختلف ولا يتبدل، كقولهم طعام مائدة الامير واحد يريدون انه لا
 تتغير ألوانه وبذلك أجمعوا أو ضرب واحد، لأنها طعام أهل التلذذ وهم كانوا فلاحه
 فنزعوا إلى عكرهم واشتهوا ما ألفوه. فادع لنا ربك

سله لنا بدعائك إياه يُجْرِحُ لَنَا يَظْهَرُ وَيُوجَدُ، وَجَزَمَهُ بِأَنَّهُ جَوَابُ فَادِعٍ فَإِنْ دَعَوْتَهُ
 سَبَبُ الْإِجَابَةِ.

مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنَ الْإِسْنَادِ الْمَجَازِيِّ، وَإِقَامَةُ الْقَابِلِ مَقَامَ الْفَاعِلِ، وَمِنْ اللَّتَبْعِيضِ.
 مِنْ بَقْلِهَا وَقُقَائِهَا وَفُومِهَا وَعَدْسِهَا وَبَصْلِهَا تَفْسِيرٌ وَبَيَانٌ وَقَعُ مَوْجِعُ الْحَالِ، وَقِيلَ بَدَلُ
 بِإِعَادَةِ الْجَارِ. وَالْبَقْلُ مَا أَنْبَتَتْهُ الْأَرْضُ مِنَ الْخَضِرِ وَالْمِرَادُ بِهِ أَطَايِبُهُ الَّتِي تُوَكَّلُ وَالْفُومُ
 الْحَنْطَةُ وَيُقَالُ لِلخَبْزِ وَمِنْهُ فُومُ الْوَالِدِ، وَقِيلَ الثُّومُ وَقُرءُ «قُقَائِهَا» بِالضَّمِّ، وَهُوَ لُغَةٌ فِيهِ.

قَالَ أَيْ اَللّٰهُ، أَوْ مُوسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ. اَلَّذِيْ تَتَّبِعُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَقْرَبُ مَنزَلَةٍ وَّأَدْوَنُ
 قَدْرًا. وَأَصْلُ الدَّنُوِّ الْقُرْبُ فِى الْمَكَانِ فَاسْتَعِيرَ لِلخُسَّةِ كَمَا اسْتَعِيرَ الْبَعْدُ لِلشَّرْفِ
 وَالرَّفْعَةِ، فَقِيلَ بَعِيدُ الْمَجَلِّ بَعِيدُ الْهَيْبَةِ، وَقُرءُ «أَدْنَا» مِنَ الدَّنَاءَةِ. بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ يَّرِيْدُ بِهِ
 السَّنَّ وَالسَّلٰوٰى فَإِنَّهُ خَيْرٌ فِى اللَّذَّةِ وَالنَّفْعِ وَعَدَمِ الْحَاجَةِ إِلَى السَّعْيِ. اَهْبِطُوا مِصْرًا اُنْحَدَرُوا
 إِلَيْهِ مِنَ التِّيْهِ، يُقَالُ هَبَطَ الْوَادِي إِذَا نَزَلَ بِهِ، وَهَبَطَ مِنْهُ إِذَا خَرَجَ مِنْهُ، وَقُرءُ بِالضَّمِّ

والمصر البلد العظيم وأصله الحد بين الشيبين، وقيل أراد به العلم، وإنما صرفه لسكون وسطه أو على تأويل البلد، ويؤيده أنه غير ممنون في مصحف ابن مسعود. وقيل أصله مصر ائيم فعرب.

فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ أُحِيطَ بِهِمْ إِحَاطَةَ الْقَبَةِ بِمَنْ ضُرِبَتْ عَلَيْهِ، أَوْ أُلْصِقَتْ بِهِمْ، مِنْ ضَرْبِ الطَّيْنِ عَلَى الْحَائِطِ، مَجَازًا لَهُمْ عَلَى كُفْرَانِ النِّعْمَةِ. وَالْيَهُودُ فِي غَالِبِ الْأَمْرِ أَذْلَاءُ مَسَاكِينٍ، إِمَّا عَلَى الْحَقِيقَةِ أَوْ عَلَى التَّكْلِيفِ مَخَافَةَ أَنْ تَضَاعَفَ جَزَيْتَهُمْ. وَبِأَوْ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ رَجَعُوا بِهِ، أَوْ صَارُوا أَحْقَاءَ بِغَضَبِهِ، مِنْ بَاءِ فَلَانٍ بِفَلَانٍ إِذَا كَانَ حَقِيقًا بِأَنْ يَقْتُلَ بِهِ، وَأَصْلُ الْبُوءِ الْمَسَاوَاةُ.

ذَلِكَ إِشَارَةٌ إِلَى مَا سَبَقَ مِنْ ضَرْبِ الذِّلَّةِ وَالْمَسْكَنَةِ وَالْبُوءِ بِالْغَضَبِ.

بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ

بسبب كفرهم بالمعجزات، التى من جملتها ما عد عليهم من فلق البحر، وإظلال الغمام، وإنزال النمل والسلوى، وانفجار العيون من الحجر، أو بالكتب المنزلة: كالإنجيل، والفرقان، وآية الرجم، والتى فيها نعت محمد صلى الله عليه وسلم من التوراة، وقتلهم الانبياء فإنهم قتلوا شعياً وذكرياً ويحياً وغيرهم بغير الحق عندهم، إذ لم يروا منهم ما يعتقدون به جواز قتلهم، وإنما حملهم على ذلك اتباع الهوى وحب الدنيا كما أشار إليه بقوله: ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ أى: جرهم العصيان والتماذى والاعتداء فيه إلى الكفر بالآيات، وقتل النبيين. فإن صغار الذنوب سبب يؤدى إلى ارتكاب كبارها، كما أن صغار الطاعات أسباب مؤدية إلى تحرى كبارها. وقيل كرر الإشارة للدلالة على أن ما لحقهم كما هو بسبب الكفر، والقتل فهو بسبب ارتكابهم المعاصى واعتدائهم حدود الله تعالى. وقيل الإشارة إلى الكفر والقتل، والباء بمعنى مع وإنما جوزت الإشارة بالمفرد إلى شيئين فصاعداً على تأويل ما ذكر، أو تقدم للاختصار، ونظيرة فى الضمير قول رؤبة يصف بقرة:

فِيهَا خُطُوطٌ مِنْ سَوَادٍ وَبَلَقٌ... كَأَنَّهُ فِي الْجِلْدِ تَوْلِيحُ الْبَهَقِ

والذى حسن ذلك أن تشنية المضمرات والمبهمات وجمعها وتأنيتها ليست على الحقيقة، ولذلك جاء الذى بمعنى الجمع.

ترجمہ:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُصِيبَكَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ

،، اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا۔

طعام واحد سے وہ چیزیں مراد ہیں جو ان کو میدان تیرہ میں عطا کی گئی تھیں۔ یعنی من وسلویٰ۔ اور اس کے واحد ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ متنوع اور متہذ ل نہیں ہوتا۔ جیسے کہا جاتا ہے "طعام الامیر واحد" مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس کھانے میں ایک ہی رنگ ہوتا ہے، مختلف رنگ نہیں رہتے، اور ایک رنگ ہونے کی وجہ سے وہ اکتا گئے تھے۔ یا طعام واحد سے مراد قسم واحد ہے۔ یعنی امیرانہ قسم کا کھانا۔ کیونکہ دونوں کھانے اہل تنعم کے تھے جس کی معیشت ترفع ہوتا ہے وہ اس قسم کا کھاتے ہیں۔ اور یہ لوگ کاشتکار تھے، لہذا اپنی اصلیت کی جانب ان کی طبیعت کا ابھار ہوا اور جن چیزوں کی ایام زراعت میں عادت تھی۔ ان کی خواہش پیدا ہوئی۔

"فادع لنا ربک" یعنی اپنے رب سے دعا کر کے ہمارے لئے یہ چیزیں مانگئے۔ "یخرج لنا" ہمارے لئے وہ ظاہر فرما دے، ان چیزوں کو موجود کرے۔ اور "یخرج" مجزوم اس لئے ہے کہ "فادع" کا جواب ہے اور چونکہ امر سبب ہوتا ہے جو اب امر کے لئے، اس لئے یہ ترکیب استعمال ہوئی تاکہ واضح ہو کہ حضرت کی دعا اس قبولیت کا سبب بنی۔

"مما تنبت الارض" ارض کی جانب انبات کی نسبت مجازاً ہے اور علت فاعلہ کی جگہ پر علت قابلہ یعنی ارض کو رکھ دیا گیا ہے۔ اور "مما" کا من تبعیض کے لئے ہے، کیونکہ وہ تمام نباتات ارض کے طالب نہیں تھے، صرف بعض کے تھے۔

مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَاءِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصِلِهَا

کچھ ساگ اور گلثری اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔

یہ "مما" تنبت الارض کی تفسیر اور اس کا بیان ہے اور ترکیب نحوی کے لحاظ سے مال کے درجے میں ہے، اور بعض نے کہا کہ باعادہ حرف جار بدل ہے۔ اور بقل زمین سے اگنے والی سبزی ہے، لیکن اس سے مراد لذیز سبزیاں ہیں۔ جو کھائی جاتی ہیں۔ اور فوم گیہوں ہے اور روٹی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک فوم لہسن ہے اور "قثاء" میں ایک لغت قثاء ہے۔

قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ

کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو۔

"قال" کا فاعل اللہ کریم کی ذات ہے یا موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ "ادنیٰ" یعنی نیچے درجہ اور کم مرتبہ کی چیز اور "دنو" کے اصل معنی قرب مکانی کے ہیں، پھر مجازاً خسر و حقارت کے لئے استعمال ہونے لگا جیسے کہ "بعد" شرافت اور بندی رتبہ کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں،

بعید المحل، بعید الہمہ

بلند مرتبہ بلند ہمت۔ اور ایک قرأت ادناء مہوز اللام کی ہے یہ "دناۃ" سے مشتق ہے۔ "بالذی ہو خیر" الذی ہو خیر سے مراد من و سلوکی ہے، کیونکہ لذت اور نفع میں بھی وہ بہتر ہے اور اس کے لئے کوشش و محنت کی بھی ضرورت نہیں۔

"أهبطوا مصرًا" یعنی میدان تیرے سے نکل کر شہر میں اترو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "هبطوا وادی" جبکہ وادی میں اترے اور اس میں ٹھہرے اور "هبط من الواد" اس وقت کہتے ہیں جب وادی سے نکل جائے۔ اور ایک قرأت أہبطو ہے ہمزہ اور باء کے طعمی کے ساتھ۔ اور مصر بڑے شہر کو کہتے ہیں اور اصل معنی دو چیزوں کے درمیان حد فاصل کے ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ مصر علم ہے اور اس سے متعین شہر مراد ہے۔ اب رہی یہ بات کہ یہ منصرف کیوں ہے تو اس کی وجہ اس کا ساکن الاوسط ہونا ہے، یا یہ کہ مصر الباء کی تاویل میں ہے کہ ہذا مذکور ہونے کی بناء پر صرف ایک سبب کا عامل ہے۔ اور علمی معنی کے مراد لئے جانے کی تائید اس سے ہوتی کہ مصحف ابن مسعود میں "مصرًا" بغیر تنوین کے آیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مصر دراصل مصرائیم بروزن اسرائیل تھا، پھر اس کو معرب بنا دیا گیا۔"

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ

اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری۔

یعنی ذلت اور محتاجی نے ان کے اوپر اس طرح گھیرا ڈالا کہ جیسے خیمہ اور قبہ کا گھیرہ ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس کے نیچے ہوتے ہیں اور ذلت اور محتاجی ان کے اوپر اس طرح لپ دی گئی جیسے مٹی دیوار پر لپ دی جاتے ہے، یہ کفرانِ نعمت کی سزا تھی جو ان کو دی گئی۔ اور عموماً وہ نسل ذلیل اور مسکون ہے یا تو حقیقتاً یا تکلف کہ کہیں ان پر جزیہ زیادہ نہ کر دیا جائے۔

وَبَاؤُاْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

اور خدا کے غضب میں لوٹے۔

یہ باء مشتق ہے، فلان بفلان سے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب فلاں اس لائق ہو کہ اس کو فلان کے عوض قتل کر دیا جائے اور "بؤء" کے اصل معنی ہیں مساوی اور ہم پلہ ہونا۔

ذٰلِكَ اِشَارَةٌ اِلٰی مَا سَبَقَ مِنْ ضَرْبِ الذِّلَّةِ

"ذالک" سے سابقہ اشیاء کی جانب اشارہ ہے یعنی ذلت اور محتاجی کو لازم کر دینا اور بنو اسرائیل کا غضب الہی کو لے کر

لوٹنا۔

بِآثِمِهِمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ

یعنی یہ سبب اس کے کہ انہوں نے ان معجزات کا انکار کیا جن میں سے بعض معجزات وہ ہیں جن کو اللہ کریم نے شمار کروایا ہے یعنی دریا کو پھاڑ کر راستہ دینا اور بادلوں کا سایہ کرنا اور من و سلوکی کا اتارنا اور پتھر سے چشموں کا جاری ہونا، یا اس سے کتب

منزلہ کا انکار ہے جیسے انجیل، قرآن آیت رجم اور وہ آیات تورات ہیں جن میں حضرت محمد ﷺ کے اصحاب کتے دے ہیں۔۔ اور انبیاء کرام کو قتل کرنا کیونکہ انہوں نے حضرت شعیب، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام اور ان کے پیاروں بھی انبیاء کرام کو قتل کیا، اور یہ قتل خود قاتلوں کی نظر میں بھی ناحق تھا، کیونکہ قتل کرنے والوں نے ان انبیاء کرام میں سے کسی کو بھی بات نہیں دیکھی تھی۔ جس کی بناء پر انہیں قتل کرنا جائز سمجھتے۔ قتل پر آمادہ کرنے والی چیز صرف اور صرف "تواریخ" کی طرف سے ہے۔ صحت دنیا تھی۔ جیسا کہ اللہ کریم نے خود اپنے اس قول سے اس کی جانب اشارہ فرمایا ہے،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا كَانُوا يَعْتَدُونَ

یعنی ان کی معصیت شعاری اور معصیت میں حد سے تجاوز ان کو یہاں تک پہنچائی لایا کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو قتل کیا اور انبیاء کو قتل کیا، کیونکہ چھوٹے گناہوں کا ارتکاب ایسا سبب ہے جو بڑے گناہوں کے ارتکاب تک پہنچا دیتا ہے جیسے۔ چھوٹی باتیں وہ اسباب ہیں جو بڑی طاغیوں کی جستجو تک پہنچاتی ہیں۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "ذالک" کے ساتھ یہ تواریخ حقیقت پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ بنی اسرائیل کو جو کچھ پیش آیا، وہ جیسا کہ کفر اور قتل کے سبب سے بنی اسرائیل کے معصیتوں کے ارتکاب اور اللہ کریم کی حدود سے تجاوز کرنے کی وجہ سے بھی ہے۔ اور بعض کے نزدیک "ذالک" کا ساتھ ساتھ اور قتل کی جانب ہے اور "بما عصوا" کی باء بمعنی "مع" ہے اور دو یا دو زائد چیزوں کی جانب لفظ مفرد کے ذریعے اشارہ اس لئے جائز ہے کہ مشارالیه اختصار کے پیش نظر "ما ذکر" یا "ما تقدم" میں موجود ہے بشاعر کا قول،

فِيهَا خُطُوْطٌ مِّنْ سَوَادٍ وَبَلَقَى... كَأَنَّهُ فِي الْجِيلِ تَوَلِيْعُ الْبَهَقِ

گھوڑے کے جسم پر سفید اور سیاہ دھاریاں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں رنگ بھورے رنگ میں تھوٹ اور لگتی پیدا کر رہے ہیں۔

یہاں "کأنه" کی ضمیر کا مرجع بظاہر ثنی ہے۔ اور مشارالیه کے ثنی ہونے کے باوجود اسم اشارہ کو مفرد لانے کا جواز یہ ہے کہ مضمرات اور مبہمات یعنی اسمائے اشارہ و اسمائے موصولہ کا ثنی اور جمع لانا اور مؤنث لانا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ یعنی وہ حقیقت وہ نہ ثنی ہوتے ہیں اور نہ جمع اور نہ مؤنث، یہی وجہ ہے کہ "الذی" جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تعریفِ صبر:

(صبر) الصبر (Patience)

کے معنی ہیں کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا۔ لہذا الصبر کے معنی ہوئے عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا۔

"وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ" (سورة الاحزاب آیت نمبر 35)

صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔

اور روزہ کو صبر کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبط نفس کی ایک قسم ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
 "صِيَامُ شَهْرِ الصَّبْرِ وَثَلَاثَةُ أَيَّامٍ فِي كُلِّ شَهْرٍ يَذْهَبُ وَحَرُّ الصَّدْرِ"
 ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں۔

لفظ طعام کی بہترین تحقیق:

(ط ع م) الطعم (س) (Food, Diet)

کے معنی غذا کھانے کے ہیں۔ اور ہر وہ چیز جو بطور غذا کھائی جائے اسے طعم یا طعام کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:
 "وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 96)
 اور اس کا طعام جو تمہارے فائدہ کے لئے۔

اور کبھی طعام کا لفظ خاص کر گیہوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ ابو سعید خدری سے۔

روایت ہے: "ان النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امر بصدقة الفطر صاعا من طعام
 او صاعا من شعیر"

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر میں ایک صحابی طعام یا ایک صاع جو دینے کے حکم دیا۔ قرآن میں ہے:

"وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسِيلِينَ" (سورۃ الحاقہ آیت نمبر 36)
 اور نہ پیپ کے سوا (اس کے) لئے کھانا ہے۔

"طَعَامًا إِذَا غُضِّتِ" (سورۃ المزمل آیت نمبر 13)
 اور کلو گیر کھانا ہے۔

"طَعَامُ الْأَثِيمِ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 44)
 گنہگار کا کھانا ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا يَخُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ" (سورۃ الماعون آیت نمبر 3)

اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔

میں طعام بمعنی او طعام یعنی کھانا کھلانا کے ہے۔

"فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 53)

اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔

"لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 93)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی طعمت بمعنی شربت آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 249)

جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا تو وہ مجھ دے نہیں ہے اور جو شخص اس سے پانی نہ پیے گا (اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ) میرا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں من لم بشر به بجائے ومن لم يطعمه کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح چلو بھر سے زیادہ محض پانی کا استعمال ممنوع ہے اسی طرح طعام کے ساتھ بھی اس مقدار سے زائد پانی پینا ممنوع ہے کیونکہ جو پانی کھانے کے ساتھ پیا جاتا ہے اس پر بھی طعمت کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔ لہذا اگر من لم بشر به لایا جاتا تو اس سے کھانے کے ساتھ پانی پینے کی ممانعت ثابت نہ ہوتی اس کے برعکس يطعمه کے لفظ سے یہ ممانعت بھی ثابت ہو جاتی اور معین مقدار سے زائد پانی کا پینا بہر حالت ممنوع ہو جاتا ہے۔

اور ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زم زم کے پانی کے متعلق فرمایا،

انه طعام طعم وشفاء سقم

کہ یہ کھانے کا کھانا اور بیماری سے شفا ہے، فرما کر تنبیہ کی ہے کہ بیزمزم کے پانی میں غذا نیت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے پانی میں نہیں ہے۔ استطعمته فاطعمنی میں نے اس سے کھانا مانگا چنانچہ اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ قرآن میں ہے:

"اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 77)

اور ان سے کھانا طلب کیا۔

"وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" (سورۃ قلمج آیت نمبر 36)

اور قناعت سے پیشے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

"وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ" (سورۃ الانسان آیت نمبر 8)

اور وہ کھانا کھلاتے ہیں۔

"أَنْطَعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ" (سورۃ قیس آیت نمبر 47)

بھلا ہم ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا۔

"الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ" (سورۃ ققریش آیت نمبر 4)

جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا۔

"وَهُوَ يُطْعِمُهُ وَلَا يُطْعَمُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 14)

وہی سب کو کھانا کھلاتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔

"وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُونِ" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 57)

اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھانا کھلائیں۔

اور فرمایا: "اِذَا اسْتَطَعْتُمْ الْاِمَامَ فَاطْعُوهُ"

یعنی جب امام (نماز میں) تم سے لقمہ طلب کرے یعنی بھول جائے تو اسے بتا دو۔

رجل طاعم عرش حال آدمی رجل مطعم جس کو وافر رزق ملا ہو مطعم نیک خوردہ۔ مطعم بہت کھلانے والا، مہمان

تو از طعمہ کھانے کی چیز رزق۔

تحقیق لفظ نبت:

(نبت) النبات والنبات (To Grow)

ہر وہ چیز جو زمین سے اگتی ہے۔ اسے نبت یا نبات کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ تنہ دار ہو جیسے درخت۔ یا بے تنہ جیسے جڑی بوٹیاں

لیکن عرف میں خاص کر نبات اسے کہتے ہیں جس کے تنہ نہ ہو۔ بلکہ عوام تو جانوروں کے چارہ پر ہی نبات کا لفظ بولتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ:

"لِنُعْرِجَ بِهِ حَبًا وَنَبَاتًا" (سورۃ النبا آیت نمبر 15)

تا کہ اس سے اناج اور بزرہ پیدا کریں۔

میں نبات سے مراد چارہ ہی ہے۔ لیکن یہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہر پڑھنے والی چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔

اور نباتات حیوانات اور انسان سب پر بولا جاتا ہے۔ اور انبات (افعال) کا لفظ سب چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے۔

"فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعَنْبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا"

(سورۃ یس آیت نمبر 27-31)

پھر ہم نے اس میں اناج اگایا اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گنے گنے باغ اور میوے اور چارہ۔

تعریف لفظ بقل:

(بقل) (Vegetable)

قرآن میں ہے: "بَقْلِهَا وَقِثَآئِهَا" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 61)

کہ ترکاری اور کلزی بقل۔

ان سبزیوں کو کہتے ہیں۔ جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں۔ اس سے فعل مشتق کر کے بقل بمعنی نبت

استعمال ہوتا ہے اور تشبیہ کے طور پر بقل و جد الصبی کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں لڑکے کے چہرہ پر بززہ نمودار ہونے لگا۔ ابن السکیت کے نزدیک بقل ناب البعیر کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کے لئے نکل آئے جگہ کا سربز ہو بقل البقل میں نے سبزی کاٹی۔

المبقلۃ:

المبقلۃ (ظرف) سبزیوں کی جگہ کو کہتے ہیں۔

قثانہا کی تعریف:

قثانہا

مضاف مضاف الیہ۔ قثانہ اسم جنس ہے، اس کی جمع نہیں آتی۔ کڑی یا کڑیاں۔
فومہا مضاف مضاف الیہ۔ فوم گیہوں (راغب، ابن عباس) بنو ہاشم کی زبان میں بھی فوم گیہوں کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ بعض کے نزدیک جس اناج کی روٹی پکتی ہو اسے فوم کہتے ہیں۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ اصل میں فوم تھا۔ جس کے معنی لہسن کے ہیں۔ ثناء کو فاء سے بدل دیا ہے اور یہ جائز ہے جیسا کہ مغائیر (مغز کی جمع ایک قسم کی گوند ہے) مغافیر (مغز کی جمع ایک درخت کی گوند) کہا جاتا ہے۔

عدسہا مضاف مضاف الیہ عدس بمعنی مسور۔

بصلہا مضاف مضاف الیہ۔ بصل بمعنی پیاز۔

فوم کی تعریف:

(فوم) الفوم (Garlic)

گیہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فوم اصل میں ٹوم بی ہے۔ یعنی فاء، ثناء سے بدل دی گئی ہے جیسا کہ جذف میں ہے اور

اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَقَوْمِهَا وَعَدَسِهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۶۱)

اور گیہوں اور مسور۔

عدس کی تعریف:

(عدس) العدس (A Pakistani Pulse)

مسور کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۶۱)

اور سور اور پیاز اور عدسہ ایک قسم کی پھنسی ہے جو مسور کی شکل پر ہوتی ہے اور عدس (اسم صوت) نخر وغیرہ کو ہانکنے کی آواز کو کہتے ہیں اسی سے عدس فی الارض و هو عدوس کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں جانے کے ہیں۔

بصل کی تعریف:

(بصل) البصل (Onion)

پیاز

قرآن میں ہے: "وَعَدَسِيهَا وَبَصَلِيهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۶۱)

اور مسور اور پیاز اور تشبیہ کے طور پر لوہے کے خود کو بھی بصل کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:
وترکاکا البصل اور پیاز جیسی خود۔

حرف الف کی مفصل تحقیق:

الف بمعنی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔ تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

(۱) وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے۔ اس کی چند قسمیں ہیں:

اول:

الف الاستخبار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو استفہام وانکاری تہکیت پرز جروتو بخ تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا۔

"أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۳۰)

(انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے۔ اور تہکیت یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو چنانچہ (قسم اول کے متعلق) فرمایا:

(۱) "أَكْفَبْتُمْ ظَلِيمَاتِكُمْ" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر ۲۰)

تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

(۲) "أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۸۰)

کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے؟

(۳) "أَلَا إِنَّ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ" (سورۃ بولس آیت نمبر ۹۱)

کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟

اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:

(4) " اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا " (سورۃ یونس آیت نمبر 2)

کیا لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے؟

(5) " اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

تو کیا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

(6) " اَفَاِنْ مِتَّ فَهُمْ الْخَالِدُونَ " (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 34)

بھلا اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

(7) " اَلَّذِي كَرِهْتَ حَرََّمَ اِمْرَ الْاُنْثَىٰ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 143)

بتاؤ تو (خدا نے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادوں کو۔

اور معنی تسویہ میں فرمایا:

" سَوَاءٌ عَلَيْنَا اَجْرٌ عَنَّا اَمْ صَبْرًا " (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 21)

اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

" سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 6)

انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے کے نہیں۔

اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اخراج (وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں

نفی خروج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر نفی کے معنی نہ ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا۔ اور جب کلام

منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا ہے۔ کیونکہ کلام منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے

چنانچہ فرمایا:

" اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ " (سورۃ الاعراف آیت نمبر 172)

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں (یعنی ضرور ہوں)

" اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ " (سورۃ العن آیت نمبر 8)

کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے۔ یعنی ضرور ہے۔

" اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ كَاتِبِي الْاَرْضِ " (سورۃ الرعد آیت نمبر 41)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں۔

" اَوَلَمْ تَأْتِيَهُمْ بَيِّنَةٌ " (سورۃ قطعہ آیت نمبر 133)

کیا ان کے پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔

"أَوَلَا يَرَوْنَ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 126)
اور کیا یہ نہیں دیکھتے۔

"أَوَلَمْ نَعْتَبِرْكُمْ" (سورۃ قاطر آیت نمبر 37)
اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی۔

دوم:

الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم کے شروع میں آتا ہے اور "میں" کے معنی رکھتا ہے جیسے اسمع و ابصر یعنی میں سنتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔

سوم:

ہمزہ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی جیسے فرمایا:

"أَنْزَلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 114)
ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

"رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ" (سورۃ التحریم آیت نمبر 11)
اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

چہارم:

(الف) جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے لئے آیا ہے جیسے فرمایا

"الْعَالَمِينَ" (سورۃ الفاتحہ آیت نمبر 2)
تمام جہانوں۔

پنجم:

الف نداء جیسے ازید (اے زید)

(ب) وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس کی پہلی قسم الف ثننیہ ہے (مثلاً رجلان) اور دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں

پائی جاتی ہے مثلاً مسلمات و مساکین۔

(ج) اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لئے ہوتا ہے جیسے حبلی اور بیضاء میں آخری الف یا

پھر ثننیہ میں ضمیر کے لئے جیسا کہ

"أَذْهَبًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 36)

میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے جیسے

"وَتَكْفُرُونَ بِاللَّهِ الظُّنُونًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

"فَأَضَلُّوْكَ السَّبِيلًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 67)

تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لئے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے (جیسا کہ

آیات کے اوخر میں الف اشباع پڑھا دیتے ہیں)

لفظ دنی کا معنی:

دنا (دنو) الدنو (ن) (Near)

کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی اور قرب بلحاظ مرتبہ سب کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 99)

اور کھجور کے گائے سے پاس پاس کچے اور انگور کے باغ۔

اور آیت کریمہ: "ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى" (سورۃ النجم آیت نمبر 8)

پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔ میں قرب حکمی مراد ہے۔ اور لفظ ادنیٰ کبھی معنی اصغر آتا ہے۔ اس صورت میں اکبر کے

بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"وَلَا آذَنِي مِنْ ذَلِكَ وَلَا آكْفُرُ" اور نہ اس سے کم نہ زیادہ۔

اور کبھی ادنیٰ بمعنی ارذل استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ خبر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"أَلَمْ تَسْتَبْدِلْهُمُ الَّذِي هُوَ آذَنِي بِالَّذِي هُوَ حَكِيمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو۔

اور کبھی بمعنی اول (نشأۃ اولیٰ) استعمال ہوتا ہے اور الآخر (نشأۃ ثانیہ) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

کہ اگر اس کے پاس ایک دینا بھی امانت رکھو۔

"خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ" (سورۃ الحج آیت نمبر 11)

اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔

اور آیت کریمہ:

"وَأَتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" (سورۃ المل آیت نمبر 122)

اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔

اور بھی دنی یعنی اقرب آتا ہے اور اسی کے بالقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى" (سورۃ الانفال آیت نمبر 42)

جس وقت تم (مہینے کے) قریب کے تھے اور کافر بھید کے تھے۔

الدنیا کی جمع الدنی آتی ہے جیسے الکبریٰ کی جمع الکبر والصفوی کی جمع الصفیر۔ اور آیت کریمہ:

"ذٰلِكَ اَكْلُ اَنْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ" (سورۃ السائدۃ آیت نمبر 108)

اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح شہادت ادا کریں۔

میں دنی یعنی اقرب ہے یعنی یہ اقرب ہے۔ کہ شہادت ادا کرنے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں۔ اور آیت کریمہ:

"ذٰلِكَ اَكْلُ اَنْ تَقْرَءَ اَعْيُنُهُمْ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 51)

یہ (اجازت) اس لئے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہیں۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:

"لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 220)

تا کہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت کی باتوں میں غور کرو۔

دنیا اور آخرت کے تمام احوال کو شامل ہے کہا جاتا ہے ادنیٰ بین الامرین و ادنیٰ احدہما من الآخر۔ یعنی

دو چیزوں کو باہم قریب کرنا۔

یا ایک چیز کو دوسری کے قریب کرتا۔ قرآن میں ہے:

"يُنذِرُنَّ عَلٰیٰٓہُمْ مِنْ جَلَاۤیِہُمْ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 59)

کہ باہر نکلا کریں تو اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔

ادنت الفرس۔ گھوڑی کے وضع حمل کا وقت قریب آپہنچا۔ الدنی خاص کر حقیر اور ذلیل آدمی کو کہا جاتا ہے اور یہ سیسے

کے بالقابل استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: ہودنی یعنی نہایت رزیل ہے۔ اور حومروی ہے تو یہ دونوں سے ہے یعنی جب کھانا

کھاؤ تو اپنے سامنے سے کھاؤ۔

مصر کی تعریف:

(مصر) المصر (City)

ہر محدود شہر کو (جس کے گرد فصیل ہو) مصر کہتے ہیں۔ اور مصرت مصر اور چیزوں کے مابین حد کو کہتے ہیں۔ اور آیت

کریمہ:

"اٰھْبِطُوْا مِصْرًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

مصر میں داخل ہو جائے۔

میں مصر سے مشہور شہر مصر مراد ہے۔

سوال کا معنی:

(سئل) السؤال

کے معنی کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کے ہیں۔ جو مودی الی العرفۃ معنی مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کو بھی سوال کہا جاتا ہے جو مودی الی العال جو پھر کس چیز کی معرفت کی استدعا کا جواب اصل من تو زبان سے دیا جاتا ہے لیکن کتابت یا اشارہ اس کا قائم مقام بن سکتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب اصل میں تو ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن زبان سے وعدہ یا انکار اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

ضرب المثل:

(Proverb)

ضرب اللبن الدرہم سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں کسی بات کو اس طرح بیان کرنے کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے۔

"ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 29)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 32)

اور ان سے قصہ بیان کرو۔

"ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ أَنْفُسِكُمْ" (سورۃ الروم آیت نمبر 28)

وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ" (سورۃ الروم آیت نمبر 58)

اور ہم نے ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

ذلت کیا ہے؟:

(Disgrace, Insult)

بغیر تاء کے ذل اور تار کے ساتھ ذلتہ کہا جاتا ہے جیسا کہ قل اور قلنتہ ہے۔ قرآن میں ہے۔

"تَرَاهُمْ ذِلَّةً" (سورۃ المعارج آیت نمبر 44)

اور ان کے مونہوں پر ذلت چھا جائے گی۔

"ظُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری۔

"سَيَسْأَلُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 152)

عقرب انہیں ان کے رب کا غضب اور ذلت پہنچنا ہے۔

اور اس قسم کی مطیع اور معقاد سواری کا ذلول (صفت فاعلی) کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"لَا ذُلُّ لَ الَّذِينَ يُبَدِّلُونَ الْأَرْضَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 71)

کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے۔

تحقیق سکون:

(سك ن) السكون (ن) (Quietness, Silence)

حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سکون کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سکون فلان مکان کذا کے معنی ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کر لی۔ اسی اعتبار سے جائے رہائش کو مسکن کہا جاتا ہے اس کی جمع مساکن آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"لَا يُرَى إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 25)

کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اور فرمایا: "وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 13)

اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔

"وَلِتَسْكُنُوا فِيهِ" (سورۃ یونس آیت نمبر 67)

تا کہ اس میں آرام کرو۔

تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سکنتہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اس سکنتہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 37)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد دلا بسائی ہے۔

"أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وَجْدِكُمْ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 6)

عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو اپنی طاقت بھر۔

البواء کی مفصل تحقیق:

(ب وء) البواء

کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا کا مساوی (اور سازگار موافق) ہونے کے ہیں۔ یہ نبوت کی ضد ہے جس کے معنی اجزا میں ناہمواری (نا سازگاری) کے ہیں۔ لہذا مکان البواء اس مقام کے کہتے ہیں۔ جو اس جگہ پر اترنے والے کے سازگار اور موافق ہو۔ بوات لہ مکانا میں نے اس کے لئے جگہ کو ہموار اور درست کیا اور تبوات اس کا مطاوع ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں قرآن میں ہے:-

"وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّءَ الْقَوْمَ مَكْنًا" (سورۃ یونس آیت نمبر 87)

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لئے مصر میں گھر بناؤ۔

"وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مَبَوَّءَ صِدْقٍ" (سورۃ یونس آیت نمبر 98)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کو عمدہ جگہ دی۔

"تَبَوَّءُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 121)

ایمان والوں کو لڑائی کے لئے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کرنے لگے۔

"يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 56)

وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔

ایک روایت میں ہے:

انه كان عليه السلام يتبوء لبو له كما يتبوء المنزله

کہ نبی کریم ﷺ پیشاب کرنے کے لئے ہموار اور مناسب جگہ تلاش کرتے جیسے کوئی شخص اقامت کے لئے جگہ تلاش

کرتا ہے۔

بوات الرمح میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا۔

ایک حدیث میں ہے:

من كذا على متعبدا فليتبوء مقعدا من النار جو عمدا

مجھ پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے الراعی نے اونٹوں کی صفت میں کہا ہے،

لها امرها حتى اذا ماتت بوات باحفا فها ماؤى تبوءا مضجعا

یعنی چرواہا اونٹ چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ چرنے کے لئے جگہ ہموار پالیتے ہیں تو وہ اپنی آرام گاہ پر آ کر

سوجاتا ہے۔

اور تبواء فلان (کنایہ) کے معنی نکاح کرنے کے ہیں جیسا کہ بنی باہلو وغیرہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بواء کا لفظ مصاہرت یا قصاص میں برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

مجاورہ:

چنانچہ مجاورہ ہے فلان بواء لفلان۔ وہ فلان کا ہمسر ہے یعنی رشتہ مصاہرت میں اس کا کفو ہے یا قصاص میں اس کے مساوی ہے اور آیت کریمہ:-

"بَاءً يَغْضَبُ مِنَ اللَّهِ" (سورۃ الانفال آیت نمبر ۱۶)
تو وہ اللہ کے غضب میں پلٹا۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی جگہ پر اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب یعنی عقوبت ہے۔ تو یہاں بغضب موضع حال میں ہے جیسے خرج بسینفہ میں ہے اور مرزبید کی طرح مفعول نہیں ہے۔ اور بغضب پر بادلا کر تشبیہ کی ہے کہ موافق جگہ میں ہونے کے باوجود غضب الہی میں گرفتار بے توانا موافق جگہ میں بالاولیٰ اس پر غضب ہوگا۔ لہذا یہ فبشر ہم بعد اب کی مثل ہے اور آیت کریمہ:-

"إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوءَ بِأِثْمِي وَإِثْمِكَ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۲۹)
میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرا اور تیرا گناہ۔

میں بتو بئامی کے معنی یہ ہیں کہ تو اس حالت کے ساتھ ہمیشہ رہے شاعر نے کہا ہے:

انكرت باطلها ويؤت بحقها

میں نے اس کے باطل کے انکار کیا اور اس کے حق پر اقرار کیا۔

جن لوگوں نے اس کے معنی اقرارت بحقها (یعنی اس کے حق کا اقرار کیا) کئے ہیں تو یہ تفسیر مقتضی لفظ کے مطابق نہیں

ہے۔

الباءۃ کا معنی:

کنایہ از جماع خلف الاحمر

منقول ہے کہ حینا ک اللہ و بیبا ک اللہ میں بیبا ک اصل میں بوؤ ک منزلا ہے جیسا کہ اتیتہ الغدایا والعشایا میں

ہے یعنی عشایا کی مناسبت سے غدایا کہا جاتا ہے۔

تحقیق لفظ نبی:

(ن ب و) النبی (Prophet)

بدون ہمزہ کے متعلق بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہوز ہے لیکن اس میں ہمزہ متروک ہو چکا ہے اور اس پر وہ مسلیمتبنی سوء کے محاورہ سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر بعض علمائے کہا ہے کہ یہ نبوہ بمعنی رفعت سے مشتق ہے اور نبی کو نبی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر معزز اور بلند اقداد کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

"وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا" (سورہ مریم آیت نمبر 57)

اور ہم نے ان کو بلند درجات سے نوازا۔

کے مفہوم سے سمجھاتا ہے پس معلوم ہوا کہ نبی بدوں ہمزہ (مہوز) سے ابلغ ہے کیونکہ ہر نبی لوگوں میں بلند قدر اور صاحب مرتبہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے فرمایا،

لست ينبي الله ولكن نبى الله

کہ میں نبی اللہ نہیں ہوں بلکہ نبی اللہ ہوں۔

النبوة والنباوة کے معنی:

النبوة والنباوة کے معنی بلندی کے ہیں اسی سے محاورہ ہے۔ نبا بفلان مکانہ کہ اسے یہ جگہ اس نہ آئی جیسا کہ قض علیہ مضجعة کا محاورہ ہے جس کے معنی بے چینی سے کروٹیں لینے کے ہیں نبا السيف عن لضرية تلوار کا اچٹ جانا پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر نبا بصرہ عن کذا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے کراہت کرنے کے ہیں۔

لفظ حق کا معنی:

(ح ق ق) الحق (حق) (Justice, Right)

کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے اور لفظ، حق، کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے

اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَرُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلَاَهُمْ الْحَقِّ"

پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدا تعالیٰ کے پاس واپس بلائیں جائیں گے۔

(2) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔

اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا" (سورہ یونس آیت نمبر 5)

دی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں۔

یہ (سب کچھ) خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔

(3) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا۔ جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں۔ کہ باعث ثواب

و عقاب اور جنت دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَهَدَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا إِلِيمًا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 213)

تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی۔

(4) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے۔ اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس

مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن

میں ہے:

"كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ" (سورۃ قیونس آیت نمبر 33)

اسی طرح اللہ کا ارشاد ثابت ہو کر رہا۔

لفظ عدد کی تحقیق:

(ع ۲۲) العدد (Number)

الاعداد تیار کرنا مہیا کرنا یہ عد سے ہے جیسے سقی سے اسقاء اور اعدادت ہذا لک کے معنی ہیں کہ یہ چیز میں نے

تمہارے لئے تیار کر دی ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے ہو اور جس قدر چاہو اس سے حسب ضرورت لے سکتے ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَظَعْتُمْ" (سورۃ انفال آیت نمبر 60)

اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت سے) ان کے (مقابلے کے لئے مستعد رہو۔ اور جو) کافروں کے لئے تیار کی گئی

ہے۔

اور اس نے ان کے لئے باغات تیار کئے ہیں۔

"أُولَئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا آَلِيمًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 18)

ایسے لوگوں کے لئے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

"وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَبَ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 11)

اور ہم نے جھٹلانے والوں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ مُثَمَّكَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 31)

اور ان کے لئے ایک محفل مرتب کی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اعتدات بھی اسی (عد) سے ہے اور آیت کریمہ:

"وَلْيَسْأَلُوا الْعِدَّةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 185)

تم روزوں کا شمار پورا کر لو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کر لو۔

"اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 184)

گنتی کے چند روز میں ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 203)

اور گنتی کے دنوں میں خدا کو یاد کرو۔

میں سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ایام

معدودة سے یوم النحر اور اس کے بعد گے دو دن مراد ہیں اس صورت میں یوم النحر بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔

العداد اس مقرر وقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ما زالت امة خيبر تعادني

کہ خیبر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار بار عود کرتی رہی ہے عدان الشئی کے معنی کسی چیز کے موسم یا

زمانہ کے ہیں۔

نوٹ: لفظ قول، دعا، رب، خرج، بدل، خیر، هبط، غضب، لفظ اللہ، کفر، قتل، غیر اور عصا کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 62]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

”بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر

ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم۔“

متن:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بِالسُّنَّةِ، يَرِيْدُ بِهِ الْمَتَدِيْنِيْنَ بِدِيْنِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَخْلِصِيْنَ مِنْهُمْ

وَالْمُنَافِقِيْنَ، وَقِيلَ الْمُنَافِقِيْنَ لِأَنَّهُمْ فِي سَلَكِ الْكُفْرَةِ وَالَّذِيْنَ هَادُوْا يَهُودُ، يُقَالُ

ہاد و یہود إذا دخل فی اليهودیة، ویہود:

إما عربی من ہاد إذا تاب، سموا بذلك لبا تابوا من عبادة العجل، وإما معرب یہودا
وكانهم سموا باسم أكبر أولاد یعقوب علیه السلام وَالتَّصَارِي جمع نصران كندامی
وندمان، والیاء فی نصرانی للیبالغة كما فی أحمري، سموا بذلك لأنهم نصروا المسیح
علیه السلام، أو لأنهم كانوا معه فی قرية یقال لها نصران أو ناصرة فسموا باسمها، أو
من اسمها. وَالضَّالِّين قوم بین النصاری والمجوس. وقیل أصل دینهم دین نوح
علیه السلام. وقیل هم عبدة البلائكة. وقیل عبدة الكواكب، وهو إن كان عربياً
فمن صبأ إذا خرج. وقرأ نافع وحده بالیاء إما لأنه خفف الهمزة وأبدلها یاء، أو لأنه من
صبأ إذا مال لأنهم مالوا عن سائر الادیان إلى دینهم، أو من الحق إلى الباطل.
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا

من كان منهم فی دینہ قبل أن ینسخ. مصداقاً بقلبه بالببدا والبعا، عاملاً بمقتضى
شرعه. وقیل من آمن من هؤلاء الكفرة إيماناً خالصاً، ودخل فی الإسلام دخولاً صادقاً:
فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ الَّذِي وَعَدَلَهُمْ عَلَى إيمانهم وعملهم.

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ حین یخاف الكفار من العقاب، ویحزن المقصرون على
تضييع العمر وتفويت الثواب. ومن مبتداً خبره فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ وَالجملة خبر إن، أو بدل
من اسم إن وخبرها فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ والغاء لتضمن السند إليه معنى الشرط، وقد منع
سببويه دخولها فی خبر إن من حیث إنها لا تدخل الشرطية، ورد بقوله تعالى: إِنَّ
الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمَ.

ترجمہ:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا بِشك ایمان والے

ایمان لائے یعنی اپنی زبان سے ایمان لائے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا، خواہ
نفاق کے ساتھ کیا ہو، خواہ اخلاص کے ساتھ، لہذا اس میں منافق اور مخلص دونوں داخل ہو گئے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس
سے منافقین مراد ہیں کیونکہ وہ کافروں کی فہرست میں شامل ہیں، اس قول کے تقابہ ہے کہ "إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا" معنی میں "إِنَّ
الَّذِينَ كَفَرُوا" کے ہیں۔ اب "الَّذِينَ هَادُوا" سے اس کا جوڑ اس طرح ہو گیا کہ پہلے کفار کا ذکر ہوا، پھر اہل کتاب
کا۔ "ہادوا" یعنی جنہوں نے یہودیت اختیار کی، "ہاد" اور "تہود" اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص یہودیت میں داخل

ہوتا ہے۔ یہود کا لفظ اگرچہ عربی ہے تو "ہاد" بمعنی "تاب" سے ماخوذ ہوگا۔ یہود کا نام یہود اس لئے ہوا کہ انہوں نے پھرائی پوجا سے توبہ کی تھی۔ اور اگر یہ لفظ غیر عربی ہے اور پھر عربی میں لایا گیا ہے تو اس کی اصل یہودا ہے یہودا سے عربی بنائی گئی تو یہود ہو گیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام یہودا تھا، گویا ان کے نام پر سارے یہودیوں کا نام رکھا گیا۔

"والنصارى" نصاریٰ جمع ہے نصران کی جیسے ندمان کی جمع ندائی ہے۔ اور نصرانی کی یاء مبالغہ کے لئے ہے۔ جس کا معنی پرلے درجے کا نصرانی ہے جیسے احمری کہ گہرا سرخ، نصاریٰ یا نصانی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انہوں نے نصرت مسیح کی نصرت کی تھی، یا وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ حضرت مسیح کے ساتھ ایک بستی میں رہتے تھے جس کا نام نصران یا نصرہ ہے، اگر اس بستی کا نام نصران ہے تو اسی نام کی جانب بغیر کسی تغیر کے نسبت کر دی گئی اور نصرانی کہہ دیا گیا۔ اور اگر اس بستی کا نام ناصرہ ہے تو اس کے مادہ سے نصرانی بنا لیا گیا۔

"والصائبين" یہ نصاریٰ اور مجوس کے درمیان ایک قوم ہے اس کے عقائد و اعمال نصرانیوں اور مجوسیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے دین کی اصل بنیاد حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فرشتوں کی پوجا کرنے والے ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ ستاروں کے پجاری ہیں۔ اور یہ لفظ اگر عربی ہے تو صبا سے ماخوذ ہے، صبا کے معنی ہیں "خروج" تمام قرآنی نے ان کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے صرف نافع نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع کی قرأت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمزہ میں تخفیف کی ہے اور اس کو حذف کر کے صابین پڑھا ہے۔ اور یا یہ وجہ ہے کہ یہ کلمہ صبا بمعنی "مآل" سے ماخوذ ہے چونکہ یہ لوگ تمام ادیان سے اعراض کر کے اپنے وضع کردہ دین کی طرف مائل ہوئے اس لئے ان کو صابی کہا گیا، یا یہ کہ حق سے اعراض کر کے باطل کی طرف مائل ہوئے اس لئے صابی کہلائے۔

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا

وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں۔

جو لوگ بھی اللہ کریم اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کئے یعنی اپنے دین پر اس کے منسوخ ہونے سے پہلے پر قرار رہے اور اپنے دل سے مبداء و معاد کی تصدیق کی اور اپنی شریعت کے مقتضی پر عمل کیا۔ بعض حضرات "من عمل صالحاً" کی تفسیر میں یہ فرماتے ہیں کہ ان کافروں میں سے جن لوگوں نے سچا اور مخلصانہ ایمان قبول کیا اور ایمان میں سچائی کے ساتھ داخل ہوئے وہ مراد ہیں۔

فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

اجر سے مراد وہ اجر ہے جس کا اللہ کریم نے ایمان اور عمل کی بنیاد پر وعدہ فرمایا ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

یعنی جس وقت کفار کا عذاب کا اندیشہ ہوگا اور کوتاہی کرنے والوں کو عمر کے ضائع کرنے اور ثواب سے محروم ہونے پر رنج

ہوگا اس وقت ان کو نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ کوئی رنج ہوگا۔ اور "من امن" الموصول صلیل کر مبتداء ہے اور "فلہم اجرہم" اس کی خبر ہے، پھر مبتداء خبر مل کر پورا جملہ "ان الذین امنوا" کی خبر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ "من امن" کو "ان" کے اسم کا بدل قرار دیا جائے، اور "فلہم اجرہم" کو "ان" کی خبر اور خبر کے اوپر فاء کا دخول اس لئے ہے کہ اس خبر کا مسند الیہ شرط کے معنی کو متضمن ہے۔ اور سیبویہ نے "ان" کی خبر پر "فاء" کے دخول سے منع کیا کیونکہ "ان" جملہ شرطیہ پر داخل نہیں ہوتا لیکن اللہ کریم کا ارشاد،

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوْا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ لَئِمَّا لَمْ یَتُوبُوْا فَلَهُمْ عَذَابٌ جَہَنَّمٌ.

بے شک جنہوں نے ایذا دی مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو، پھر توبہ نہ کی، ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔

(سورۃ البروج آیت نمبر 10)

اس قول سے سیبویہ کے قول کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ اس آیت کریمہ میں "ان" کی خبر پر فاء داخل ہے۔

لفظ یہود کا معنی:

(Jew) اليهود

کے معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا کے ہیں اور اسی سے التہدید (تفعلیل) ہے جسکے معنی ریختنے کے ہیں لیکن عرف میں

ہود بمعنی توبہ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هٰکُوْا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 62)

پیشک ایمان والے نیز یہودیوں۔

بعض نے کہا ہے لفظ یہود بھی سے ماخوذ ہے یہ اصل میں ان کا تعریفی لقب تھا لیکن ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد ان پر بطور علم جنس کے بولا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے لئے جیسا کہ لفظ نصاریٰ اصل میں سے ماخوذ ہے پھر ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد انہیں اسی نام سے اب تک پکارا جاتا ہے ہاں فلان کے معنی یہودی ہو جانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

"عَلٰی شَفَا جُرْفٍ هٰٓءِیْ فَاِنَّهَا رِبَہٌ فِیْ نَارٍ جَہَنَّمِ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 109)

ایک گراؤ گڑھے کے کنارے تو وہ اسے لے کر جہنم کی آگ میں ڈھے پڑا۔

جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی کیونکہ کبھی اسم علم سے بھی کسی کے اخلاق و عادات کا لحاظ کر کے فعل کا اشتقاق کر لیتے ہیں مثلاً ایک شخص فرعون کی طرح ظلم و تعدی کرتا ہے تو اس کے متعلق تفرعن فلان کہ فلان فرعون بنا ہوا ہے کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح تطفل فلان کے معنی طفیلی یعنی طفیل نامی شخص کی طرح بن بلانے کسی کا مہمان بننے کے ہیں۔ تہودا فی مشیہ کے معنی نرم رفتاری سے چلنے کے ہیں اور یہود کے توراہ کی تلاوت کے وقت آہستہ آہستہ جھومنے سے یہ معنی لئے گئے

ہیں۔ ہوہ الرانض اللہہ دارالکفن کا سواری کوئی سے پلا تا سوہ اصل میں ہاڑد کی جمع ہے جس کے معنی تائب کے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ایک ظہیر کا نام ہے۔

لفظ انصاری کا معنی:

نصرانی (Christian)

بعض کے نزدیک عیسائیوں کو بھی انصاری اس لئے کہا گیا ہے کہ انہوں نے نحن انصار اللہ کا نعرہ لگا دیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"كُونُوا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيسٰى ابْنُ مَرْيَمَ لِحَوَارِيْهِمْ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلٰى اللّٰهِ قَالَ الْخَوَارِثُ يَوْمَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" (سورۃ الصف آیت نمبر ۱۴)

دین خدا کے مددگار رہو جیسے عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کون ہے جو اللہ کی طرف ہو کر میری مدد کریں حواری بولے ہم دین خدا کے مددگار ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نصرانی کی جمع ہے جو نصران (قریہ کا نام) کی طرف منسوب ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ الْنَّصْرٰنِي عَلٰى نَحْنُ يٰ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۱۳)

اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں۔

نصر ارض بنی فلان کے معنی ہارش برسنے کے ہیں کیونکہ ہارش سے بھی زمین کی مدد ہوتی ہے اور نصرت غلاتنا جس کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں یہ یا تو نصر الارض سے مشتق ہے اور یا نصر بمعنی عون سے۔

تحقیق لفظ صبی:

(ص ب و) الصبی (Child)

نابالغ لڑکا رجل مصب عمال دار جس کے بچے نابالغ ہوں۔ قرآن میں ہے:

"قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" (سورۃ صافات آیت نمبر ۲۹)

(وہ بولے کہ) ہم اس سے جو کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

صبا فلان بصبو صبا و صبوة کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنے لگا قرآن میں ہے:

"اَصْبَبُ الْاَنْهٰرِ وَاَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر ۳۳)

تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا۔

اصبانی فصوت اس نے مجھے گرویدہ کیا چنانچہ میں گرویدہ ہو گیا۔

الصَّابِئِينَ كَامَعْنَى:

الصبا۔ پروائی ہوا۔ صابیت السیف الئی تلوار نیام میں ڈالی۔ صابیت الرمخ نیزہ مارنے کے لئے جھکا دیا۔ الصابئون ایک فرقے کا نام ہے جو نوح (علیہ السلام) کے دین پر ہونے کا مدعی تھا اور ہر وہ آدمی جو ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے اسے صابئی کہا جاتا ہے صباء ناب البعیر کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کچلی نکل آئی۔ قرآن میں ہے:

"وَالصَّابِئِينَ وَالتَّصَارِي" (سورۃ الحج آیت نمبر 17)
اور ستارہ پرست اور عیسائی۔

"والتَّصَارِي وَالصَّابِئِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 62)
اور عیسائی یا ستارہ پرست۔

اور ایک قرأت میں صابین (بدوں ہمزہ کے) ہے بعض نے کہا ہے کہ ہمزہ تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت:
"لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِطُونَ" (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 37)
جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

میں الخاطون اصل میں خاطون ہے۔ اور بعض نے کہا نہیں بلکہ یہ صبا یصبو سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونا اور جھکنے کے ہیں۔

تعریف العمل:

(عمل) العمل (Work)

ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃ صادر ہو یہ فعل سے اخص ہے کیونکہ فعل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے۔ مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف البقر العوامل ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لئے استعمال ہوا ہے نیز عمل کا لفظ اچھے اور بری دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے، قرآن میں:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 277)
جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے۔

تعریف لفظ صالح:

(صلح) الصالح

(درست، با ترتیب) یہ فساد کی ضد ہے عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں قرآن کریم میں لفظ صلاح کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سینئہ کے چنانچہ فرمایا:

"خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 102)

انہوں نے اچھے اور برے عملوں کے ملا دیا تھا۔

لفظ اجر کی تحقیق:

(اجر) الاجر والاجرۃ (Wages, Charges)

کے معنی جزائے عمل کے ہیں خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اخروی۔ چنانچہ فرمایا:

"إِنَّ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ" (سورۃ قعود آیت نمبر 29)

میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔

"وَأْتَيْنَا أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 27)

اور ان کو دنیا میں بھی ان کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔

"وَلَا جُزْءُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا" (سورۃ قیوسف آیت نمبر 57)

اور جو لوگ ایمان لائے ان کے لئے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

الاجرۃ (مزدوری) یہ لفظ خاص کردنیوی بدلہ پر بولا جاتا ہے اجر کی جمع اجور ہے اور آیت کریمہ:

"وَأَتَوْهُنَّ أَجُورَهُنَّ" (سورۃ النساء آیت نمبر 25)

اور ان کے مہر بھی انہیں ادا کر دو۔

میں کنایہ عورتوں کے مہر کو اجور کہا گیا ہے پھر اجر اور اجرۃ کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے جو کسی عہد و پیمان یا تقریر یا ای قسم کے عقد کی وجہ سے دیا جائے۔ اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ ضرر رساں اور نقصان دہ بدلہ کو اجر نہیں کہتے جیسے فرمایا،

"لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 277)

ان کو ان کے کاموں کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا۔

"فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ" (سورۃ الشوری آیت نمبر 40)

تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے۔

الجزاء ہر بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی عہد کی وجہ سے ہو یا بغیر عہد کے اچھا ہو یا برا دونوں پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

"وَجَزَاءُ هُمْ مِمَّا صَبَرُوا جَنَّةٌ وَحَرِيمٌ" (سورۃ الانسان آیت نمبر 12)

اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت کے باغات اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کریں گے۔

"فَجَزَاؤُهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 93)

اس کی سزا دوزخ ہے۔

محاورہ:

محاورہ میں ہے: اجر (ن) زید عمر ایاً جرہ اجرا

کے معنی میں زید نے عمر کو اجرت پر کوئی چیز دی اور اجر عمر زید کے معنی ہوں گے عمر نے زید کو اجرت دی، قرآن میں

ہے:

"عَلَىٰ أَنْ تَأْجُرَنِي تَمَّانِي حَجَّج" (سورۃ القصص آیت نمبر 27)

کہ تم اس کے عوض آٹھ برس میری خدمت کرو۔

اور یہی معنی اجر (مفاعلہ) کے ہیں لیکن اس میں معنی مشارکت کا اعتبار ہوتا ہے اور مجرد (اجرتہ) میں مشارکت کے معنی

لمحوظ نہیں ہوتے ہاں مال کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ محاورہ ہے۔

اجرة الله واجرة

دونوں طرح بولا جاتا ہے یعنی خدا سے بدلہ دے۔ الاجیرہ بروزن فعیل بمعنی فاعل یا مفاعل ہے یعنی معاوضہ یا اجرت کا

پر کام کرنے والا۔ الاستیجار کے اصل معنی کسی چیز کو اجرت پر طلب کرنا پھر یہ اجرت پر رکھ لینے کے معنی میں بولا جاتا ہے

جس طرح کہ استیجاب (استفعال) بمعنی اجاب آجاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"اسْتَأْجِرْكَ إِنْ خَيْرَ مَنْ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ" (سورۃ القصص آیت نمبر 26)

اسے اجرت پر ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہتر ملازم جو آپ رکھیں وہ ہے جو توانا اور امانت دار ہو۔

میں (استیجار کا لفظ) ملازم رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

عندک استعمال:

(عند) ظرف (Near)

عندیدہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے اور کبھی

اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عندی کذا اور کبھی کسی شخص کی قرب و منزلت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"هَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 169)

بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہے۔

خوف کی تعریف:

(خوف) الخوف (مس) (Fear)

کے معنی ہیں قرآن و شواہد سے کسی آنے والے کا خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ کالفظ قرآن و شواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور آخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے: قرآن میں ہے:

"وَيَذُجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 57)

اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اگر حالات سے واقفیت کی بنا پر تمہیں اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔ اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے۔ اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہو سکتا۔

الخوف کا معنی:

الخوف (تفعیل) ڈرانا) اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچتے رہنے کی

ترغیب دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"ذَلِكَ يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَكُمْ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 16)

اس سے اللہ ڈراتا ہے اپنے بندوں کو۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے اور باری تعالیٰ نے شیطان سے ڈرنے اور اس کی تخویف کی پرواہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حزن کی تعریف:

(حزن) الحزن والحزن (Grief, Sorrow)

کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بیقراری سے طبیعت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اسے بھی حزن کہا جاتا ہے اس کی ضد فوج ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنی معتبر ہوتے ہیں اس لئے غم زدہ ہوئے کے لئے خشنت بصرہ بھی کہا جاتا ہے حزن (س) غمزہ ہونا ٹمگین کرنا۔ قرآن میں ہے:

"لِيَكَيْلًا تَمْحُوْنَ اَعْلٰی مَا فَاتَكُمْ" (سورۃ قال عمران آیت نمبر 153)

تا کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اس سے تم اندوہناک نہ ہو۔

نوٹ: ایمان اور لفظ رب کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): الآيات 63]

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا لہذا جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے اور اس کے مضمون یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔“

متن:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ بَاتِّبَاعِ مُوسَى وَعَمَلِ بِالتَّوْرَةِ. وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ حَتَّى
أَعْطَيْتُمُ الْمِيثَاقَ.

روی أن موسى عليه الصلاة والسلام لما جاءهم بالتوراة فرأوا ما فيها من التكليف الشاقة كبرت عليهم وأبوا قبولها، فأمر جبرئيل عليه السلام فقلع الطور فظلمه فوقهم حتى قبلوا. خُذُوا عَلَى إِرَادَةِ الْقَوْلِ: مَا آتَيْنَاكُمْ مِنَ الْكِتَابِ بِقُوَّةٍ بِجِدٍّ وَعَزِيمَةٍ. وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ إِدْرَسُوهُ وَلَا تَنْسُوهُ، أَوْ تَفَكَّرُوا فِيهِ فَإِنَّهُ ذَكَرَ بِالْقَلْبِ، أَوْ أَعْمَلُوا بِهِ. لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ لِكَيْ تَتَّقُوا الْمَعَاصِيَ، أَوْ رَجَاءَ مِنْكُمْ أَنْ تَكُونُوا مُتَّقِينَ، وَيَجُوزُ عِنْدَ الْمُعْتَزِلَةِ أَنْ يَتَعَلَّقَ بِالْقَوْلِ الْمَحْذُوفِ، أَي: قَلْنَا خُذُوا وَإِذْ كُرُوا إِرَادَةَ أَنْ تَتَّقُوا.

ترجمہ:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا۔

اس عہد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع اور تورات پر عمل کرنے کا عہد مراد ہے،

وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ

اور تم پر طور کو اونچا کیا۔

اس کا معنی یہ کہ ہم نے تم سے عہد اس حال میں لیا کہ تمہارے اوپر کوہ طور لا کر کھڑا کر دیا کہ جب تک توریت پر عمل کرنے کا پختہ عہد نہیں کرو گے اس وقت تک یہ پہاڑ تمہارے سروں کے اوپر سے نہیں ہٹے گا۔ منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب توریت نے کر آئے اور بنی اسرائیل نے اس میں مشقت کے احکام دیکھے تو وہ کتاب ان پر شاق ہوئی اور انہوں نے اسکو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو اللہ کریم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ کوہ طور کو جڑ سے اکھاڑ کر سایہ کی طرح ان کے

اوپر لے آئیں، چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، تب انہوں نے قبول کیا۔

خذوا ما اتینا کم

اس سے مراد توریث ہے، "بقوۃ" سے مراد محنت و کوشش اور عزم مصمم ہے، "واذکروا ما فیہ" یعنی جو کچھ توریث میں ہے اس کو پڑھتے رہو۔ اور اس کو نہ بھلاؤ۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی آیات میں غور و حوض کرو کیونکہ کسی چیز میں غور و حوض کرنا اس کو دل سے یاد کرنا ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔

لعلکم تتقون

اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔

"لعل" بمعنی "لکنی" ہے، یعنی "لکنی تتقون" تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔ اور معصیوں سے بچ جاؤ، یا یہ کہ لعل توجی کے لئے ہے اب معنی یہ ہوں گے کہ اے بنی اسرائیل تم کو کتاب دے کر اور اس کے مضامین کو یاد کرنے کا حکم دے کر، ہم تم سے یہ امید کرتے ہیں کہ تم متقی ہو جاؤ۔ اور معترکہ "لعل" کو ارادہ کے معنی میں لیتے ہیں۔ اور "خذوا" سے پہلے "قلنا" کو محذوف مانتے ہیں۔ یعنی،

قلنا خذوا واذکروا إرادة أن تتقوا.

تحقیق لفظ فوق:

(فوق) (Above, Up)

یہ مکان ازمان جسم عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے،

پہلی قسم:

اوپر جیسے فرمایا:

"وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 63)

اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا۔

"مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 16)

کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے۔

"وَجَعَلَ فِيهَا رَواسِيَ مِنْ فَوْقِهَا" (سورۃ فصلت آیت نمبر 10)

اور اسی نے زمین میں اس کے پہاڑ بنائے۔

اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا:

"قُلْ هُوَ الْعَاجِزُ عَلَىٰ أَنْ يُبَدِّلَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ"

(سورۃ الانعام آیت نمبر 65)

کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔

دوسری قسم:

صعود یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں چنانچہ فرمایا:

"إِذْ جَاؤُكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔

تیسری قسم:

کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے فرمایا:

"فَإِنَّ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ الْاُنْتَذِينَ" (سورۃ النساء آیت نمبر 11)

اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔

چوتھی قسم:

جسمانیت کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"مَثَلًا مَا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

مچھریا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً کبھی۔ مکڑی کی مثال بیان فرمائے۔

پانچویں قسم:

بلحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ كَذَّابٍ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 32)

اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے جیسے فرمایا:

"وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 212)

لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر پرفائق ہوں گے۔

"فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 55)

کافروں پر فائق۔

پانچویں قسم:

فوقیت معنی غلبہ اور تسلط کے جیسے فرمایا:

"وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 18)

اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

"وَإِنَّا فَوقَهُمْ قَاهِرُونَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 127)

فرعون سے اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

لفظ طور کی تحقیق:

(طور) (A Name of a Mountain)

طوار الدار و طوارہ کے معنی گھر کی عمارت کے امتداد یعنی لمبا ہونے اور پھیلنے کے ہیں محاورہ ہے:

عدا فلان طوارہ فلاں

اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔

لا و طور یہ میں اُس کے مکان کے صحن کے قریب تک نہیں جاؤں گا۔ فعل کذا طوراً بعد طور اس نے ایک بار کے بعد

دوسری بار یہ کام کیا اور آیت کریمہ:

"وَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ أَطْوَاراً" (سورۃ نوح آیت نمبر 14)

حالانکہ اس نے تمہیں طرح طرح بنایا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ کہ اطوار سے ان مختلف منازل و مدارج کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:

"خَلَقْنَاكُمْ مِنْ نُورٍ ابْتَدَأَ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ" (سورۃ الحج آیت نمبر 5)

ہم نے تم کو (پہلی بار بھی) تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتداء میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا

بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر۔

میں مذکور ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مختلف احوال مراد ہیں جن کی طرف آیت:

"وَإِخْتِلَافِ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ" (سورۃ الروم آیت نمبر 22)

اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔

میں اشارہ فرمایا ہے یعنی جسمانی اور اخلاقی تفاوت جو کہ ہر معاشرہ میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔

الطور سے کون سا پہاڑ مراد ہے؟:

الطور (ایلیہ کے قریب ایک خاص پہاڑ کا نام ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ ہر پہاڑ کو طور کہہ سکتے ہیں اور بعض کے نزدیک

طور سے وہ سلسلہ کوہ مراد ہے جو کہہ ارض کو محیط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ" (سورۃ الطور آیت نمبر 1-2)

کوہ طور کی قسم اور کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے۔

"وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ" (سورۃ القصص آیت نمبر 46)

اور نہ تم اس وقت طور کے کنارے تھے۔

"وَطُورِ سِينِينَ" (سورۃ العن آیت نمبر 2) اور طور سین کی۔

"وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ" (سورۃ قمریم آیت نمبر 52)

اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب سے پکارا۔

"وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ" (سورۃ النساء آیت نمبر 154)

اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کر کھڑا کیا۔

نوٹ: اخذ، وثق، رفع، ما، تینا، قوۃ، تقویٰ اور لعلن کی بحث گزر چکی ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): الآيات 64]

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○
”پھر اس کے بعد تم پھر گئے تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں ہو جاتے۔“

متن:

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ أَعْرَضْتُمْ عَنِ الْوَفَاءِ بِالْمِيثَاقِ بَعْدَ أَخْذِهِ. فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ بِتَوْفِيقِكُمْ لِلتَّوْبَةِ، أَوْ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوكُمْ إِلَى الْحَقِّ وَيَهْدِيكُمْ إِلَيْهِ. لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ الْمَغْبُونِينَ بِالْأَنْهَمَاكَ فِي الْمَعَاصِي، أَوْ بِالْخَبْطِ وَالضَّلَالِ فِي فِتْرَةٍ مِنَ الرِّسَالِ. وَلَوْ فِي الْأَصْلِ لَامْتِنَاعِ الشَّيْءِ لَامْتِنَاعِ غَيْرِهِ، فَإِذَا دَخَلَ عَلَى لَا أَفَادَ إِثْبَاتًا وَهُوَ امْتِنَاعُ الشَّيْءِ لِثَبُوتِ غَيْرِهِ، وَالْإِسْمُ الْوَاقِعُ بَعْدَهُ عِنْدَ سَبَبِيهِ مَبْتَدَأُ خَبْرَةٍ وَاجِبِ الْحَذْفِ لِدَلَالَةِ الْكَلَامِ عَلَيْهِ وَسَدِّ الْجَوَابِ مَسْدًا، وَعِنْدَ الْكُوفِيِّينَ فَاعِلُ فِعْلِ مَحْذُوفٍ.

ترجمہ:

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ

پھر اس کے بعد تم پھر گئے۔

یعنی تم نے پختہ عہد کر لینے کے بعد اس کو پورا کرنے سے اعراض کیا۔

فلولا فضل الله عليكم ورحمته

اللہ کریم کا تم پر فضل یہ تھا کہ اس نے تمہیں توبہ کی توفیق عطا کر دی، یا تمہارے اس عہد میں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ جو تمہیں حق کی طرف بلا تے ہیں اور حق کی جانب تمہاری رہبری کرتے ہیں۔

لكنتم من الخاسرين

خاسرین کے معنی ہیں نقصان پہنچائے ہوئے، یہ نقصان ان کو گناہوں میں انہماک کی وجہ سے پہنچا یا جس مدت میں رسولوں کی آمد منقطع رہی اس زمانہ فطرت میں بھٹکتے رہنے کی وجہ سے پہنچا۔ "لو" اس معنی پر دلالت کرنے کے لئے وضع ہوا ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کے منتهی ہونے کی وجہ سے منتهی ہے۔ جب اس کے ساتھ "لا" شامل ہو گیا تو نفی کی نفی ہونے کی بناء پر اس کے اثبات کے معنی کا فائدہ دیا اب اس کا مفہوم ہوا کہ ایک چیز دوسری چیز کے وجود کی وجہ سے منتهی ہے، اور "لو لا" کے بعد جو اسم واقع ہے وہ سیبویہ کے نزدیک مبتداء ہے۔ اور اس کی خبر کا حذف کرنا واجب ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور "لو لا" کا جواب اس کے قائم مقام ہے، پس قرینہ کے وجود کی وجہ سے اس کا حذف جائز ہوا اور قائم مقام کے موجود ہونے کی وجہ سے اس کا حذف واجب ہوا، تقدیر عبارت یوں ہوگی،

فلولا فضل الله موجود

کو فیوں کا کہنا ہے کہ "لو" حرف شرط ہے اور "لا" حرف نفی ہے، اور شرط اور نفی فعل کا تقاضا کرتے ہیں۔ لہذا "لو لا" کے بعد فعل محذوف ہے۔ اور جو اسم "لو لا" کے بعد مذکور ہے، وہ اس فعل محذوف کا فاعل ہے، اب عبارت یوں ہوگی،

فلولا وُجِدَ فضل الله

لفظ ولی کی تحقیق:

(ولی) الولاء والتوالی (Lord, Saint)

اور جب بذریعہ عن کے متعدی ہو تو خواہ وہ عن لفظوں میں مذکورہ ہو یا مقدر و اس کے معنی اعراض اور دور ہونا کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ تعدیہ بذاتہ کے متعلق فرمایا:

"وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَيَأْتِهِ مِنْهُمْ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 51)

اور جو شخص تم میں ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں سے ہوگا۔

"وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 56)

اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر سے دوستی کرے گا۔ اور تعدیہ بعن کے متعلق فرمایا:

"فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِ اللّٰهُ عَلَيْهِم بِالْمُفْسِدِينَ" (سورۃ توبہ آیت نمبر 69)
تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔

حرف لولا کا استعمال:

(لولا) لولا (حرف)

اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک شے کے پائے جانے سے دوسری شے کا متنازع ہونا اس کی خبر ہمیشہ محذوف رہتی ہے۔ اور لولا کا جواب قائم مقام خبر کے ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"لَوْلا اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ" (سورۃ سبأ آیت نمبر 31)
اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہو جاتے۔

دوم بمعنی ہلا کے آتا ہے۔ اور اس کے بعد محصل فعل کا آنا ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"لَوْلا اَرْسَلْنَا الْيَنَّا رَسُوْلًا" (سورۃ قحط آیت نمبر 134)
تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا۔

وغیره ذالک من الامثله

تحقیق فضل:

(ف فضل) الفضل (Blessing)

کے معنی کسی چیز کے اقتضا متوسط درجہ سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے محمود جیسے علم و حلم وغیرہ کی زیادتی مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا لیکن عام طوراً الفضل اچھی باتوں پر یولا جاتا ہے اور الفضول بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(1) برتری بلحاظ جنس کے جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔

(2) برتری بلحاظ نوع کے جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (سورۃ اسراء آیت نمبر 70)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(3) فضیلت بلحاظ ذات مثلاً ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی فضیلت بلحاظ جو ہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا مثلاً گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل

نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لئے اس کا اکتساب عین ممکن ہے

چنانچہ آیات کریمہ:

"وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 71)

اور اللہ نے رزق (دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

"لِقَبَلْتُمْ مِمَّا فَضَّلْنَا مِنْ رِزْقِكُمْ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 12)

تا کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔

میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

لفظ خسران کا معنی:

(خس ر) الخسر والخسران (Loss)

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسے مال و جہاد وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت و سلامتی عقل و ایمان اور ثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالیٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَا ذَلِكُمْ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ"

(سورۃ الزمر آیت نمبر 15)

جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا، دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔

نوٹ: لفظ حرم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): الآيات 65]

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ○
”اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے وہ جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے ان سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر
دھنکارے ہوئے، تو ہم نے اس بستی کا یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لئے عبرت کر دیا اور پرہیزگاروں
کے لئے نصیحت“۔

متن:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ اللّٰم مَوْطِئَةٌ لِّقَسْمٍ، وَالسَّبْتِ مَصْدَرٌ
قَوْلِكَ سَبَيْتَ الْيَهُودَ إِذَا عَظَمْتَ يَوْمَ السَّبْتِ، وَأَصْلُهُ الْقَطْعُ أَمْرًا بِأَنْ يَجْرُدُوا لِلْعِبَادَةِ
فَاعْتَدَى فِيهِ نَاسٌ مِنْهُمْ فِي زَمَنِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَاشْتَغَلُوا بِالصَّيْدِ، وَذَلِكَ أَنَّهُمْ

كانوا يسكنون قرية على ساحل يقال لها ايلة، واذا كان يوم السبت لم يبيت حوت في البحر الا حضر هناك وأخرج خرطومهم، فاذا مضى تفرقت فحفروا حياهاً وشرعوا اليها الجداول وكانت الحيتان تدخلها يوم السبت فيصطادونها يوم الاحد. فقلنا لهم كونوا قِرْدَةً خَاسِئِينَ جامعين بين صورة القردة والخسوء: وهو الصغار والطرود وقال مجاهد ما مسخت صورهم ولكن قلوبهم، فمثلوا بالقردة كما مثلوا بالحمار في قوله تعالى: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَجْمَلُ اَسْفَاراً وقوله: كُونُوا لَيْسَ بِاَمْرٍ اِذْ لَا قُدْرَةَ لَهُمْ عَلَيْهِ، وانما المراد به سرعة التكوين، وانهم صاروا كذلك كما أراد بهم، وقرء "قردة" بفتح القاف وكسر الراء، و"خاسين" بغير همزة.

ترجمہ:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ

اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے وہ جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی۔

اس آیت کریمہ میں لام قرینہ ہے قسم مخدوف کا، اور السبت مصدر ہے۔ "سبتت اليهود" یعنی یہود نے یوم سبت کی تعظیم کی اور اس کے اصل معنی ہیں قطع کرنا، کاٹ دینا۔ یہود کو حکم دیا گیا تھا کہ اس دن کو عبادت کے لئے خالی رکھیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد مبارک میں کچھ لوگوں نے اس مسئلہ میں حد سے تجاوز کیا اور شکار میں مشغول ہو گئے، بات یہ تھی کہ وہ ساحل دریا پر ایک بستی میں رہتے تھے بستی کا نام "ایلہ" تھا، اور جب شنبہ (ہفتہ) کا دن ہوتا تھا تو کوئی بھی مچھلی دریا کی تہہ میں نہیں جاتی تھی۔ بلکہ پانی کے اوپر رہتی تھی اور اپنا منہ نکال دیتی تھی۔ اور جب شنبہ کا دن گزر جاتا تھا تو منتشر ہو جاتی تھیں۔ تو ان لوگوں نے یہ کیا کہ حوض کھودے، اور حوضوں سے دریا کی جانب نالیاں بنالیں۔ وہ مچھلیاں شنبہ کے دن حوض میں آ جاتی تھیں پھر یہ لوگ یک شنبہ یعنی اتوار کے دن ان کا شکار کر لیتے تھے۔

"قردة خاسئين"

یعنی ایسے بن جاؤ کہ دونوں باتیں تمہارے اندر جمع ہو جائیں، بندر بن جاؤ اور دھتکارے ہوئے، اور مجاہد نے فرمایا کہ ان کی صورتیں اور شکلیں مسخ نہیں کی گئیں بلکہ ان کے دل مسخ کئے گئے، مسخ قلوب میں ان کو بندروں کے ساتھ تشبیہ دے دی گئی ہے جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد،

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَجْمَلُ اَسْفَارًا

میں گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اللہ کریم کا فرمان "كونوا" سے مقصود سرعت تکوین و ایجاد کو بیان فرماتا ہے۔ اور یہ ظاہر فرماتا ہے کہ اللہ کریم نے ان کے حق میں جیسا ارادہ فرمایا ویسے ہی وہ ہو گئے، اور ایک قرأت "قردة" بفتح القاف

اور بکسرہ راء کی بھی ہے۔ نیز "خاسنین" بغیر ہمزہ کے بھی پڑھا گیا ہے۔

السبت کی تحقیق:

(سبب (السبت (ہفتہ) (Saturday)

کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں اور اسی سے کہا جاتا ہے سبت السیر اس نے تمہ کو قطع کیا سینت شعرة اس نے اپنے بال موٹے سبت انفہ اس کی کاٹ ڈالی۔ بعض نے کہا ہے کہ ہفتہ کے دن کو یوم السبت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق اتوار کے دن شروع کی تھی اور چھ دن میں تخلیق عالم فرما کر سینچر کے دن اسے ختم کر دیا تھا اسی سے سبت فلان ہے جس کے معنی ہیں وہ ہفتہ کے دن میں داخل ہوا۔

اور آیت کریمہ: "يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 163)

سینچر کے دن (مچھلیاں) سینہ پر ہو کر ان کے سامنے آجائیں۔

میں بعض نے یوم سبتہم سے ان کے کاروں بار کو چھوڑنے کا دن مراد لیا ہے اس اعتبار سے یوم لایسبتون کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز وہ کارو بار چھوڑتے اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ روز سینچر نہ ہوتا ان ہر دو معنی کا مال ایک ہی ہے اور آیت:

"إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ" (سورۃ النحل آیت نمبر 124)

میں سبت سے مراد سینچر کے دن عمل کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سینچر کے روز کام چھوڑنے کا حکم صرف،

"لِتَسْكُنُوا فِيهِ" (سورۃ یونس آیت نمبر 67)

اس لئے دیا گیا تھا اور آیت: "وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا" (سورۃ النبا آیت نمبر 9)

اور نیند کو (موجب) راحت بنایا۔

میں سبات کے معنی ہیں حرکت و عمل کو چھوڑ کر آرام کرنا اور یہ رات کی اس صفت کی طرف اشاریہ ہے جو کہ آیت:

"لِتَسْكُنُوا فِيهِ" (سورۃ یونس آیت نمبر 67)

تا کہ تم رات میں راحت کرو۔

میں مذکور ہے یعنی رات کو راحت و سکون لے لئے بنایا ہے

قردة کی تحقیق:

(قرد) القردة (Monkey)

بندر اس کی جمع قروود و قرودة ہے اور آیات کریمہ:

"كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 65)
ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ۔

"وَجَعَلْ مِنْهُمْ الْفِرْدَقَ وَالْحَنَابِلَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 60)
اور جن کو ان میں سے بندر بنا دیا۔

کو بعض نے ظاہری معنی پر حمل کیا ہے یعنی انہیں سچ بچ بندر بنا دیا گیا تھا بعض نے کہا ہے کہ انکے اخلاق و اطور بندروں ایسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ سچ بچ بندر بنا دیئے گئے تھے۔

القراد کا معنی:

القراد چیچڑی۔ جمع قردان۔ صرف قردا بھی ہوئی اون (جو کاتی نہ جاسکے) اسی سے تہ برتہ چھائے ہوئے بادل کو سحاب قرده کہا جاتا ہے۔

اقرد چیچڑی کی طرح زمین کے ساتھ چٹ جانا قرد چیچڑی کی طرح ساکن ہو جانا اور قدرت الابل کے معنی اونٹ سے چیچڑ دور کرنے کے ہیں مخذ جیسے قذبت و مرضت کا محاورہ ہے اور استعار کے طور پر قراد کے معنی چا پلوسی کے ذریعہ کیس کو دھو کا دینا بھی آتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ فلاں مدارات سے اسے فریب دے رہا ہے اور پستان کے سرے کو قراد کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکلی بھی چیچڑی جیسی ہوتی ہے۔

لفظ خساء کا مفہوم:

(خسء) (Disgrace. Insult)

خسات الکلہب فخسء میں نے کتے کو دھتکارا تو وہ دور ہو گیا۔ اور کسی کو دھتکارنے کے لئے عربی میں اخسء کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں کفار کے متعلق فرمایا۔

"اٰخَسُّوْا فِيْهَا وَلَا تَكَلِّمُوْنَ" (سورۃ المؤمن آیت نمبر 108)

اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

"قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 65)

تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ۔

اسی سے خساء البصر کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں نظر در ماندہ ہو کر منقبض ہو گئی۔ قرآن میں ہے:

"خَاسِئًا وَهُوَ خَسِيْرٌ" (سورۃ الملك آیت نمبر 4)

کہ وہ نظر در ماندہ اور تھک کر لوٹ آئے گے۔

نوٹ: قد، عدد اور علم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 66]

فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ○

متن:

فَجَعَلْنَاهَا أَى الْمَسْخَةِ أَو الْعُقُوبَةِ. نَكَالًا عِبْرَةٌ تَنْكَلُ الْمَعْتَبَرُ بِهَا. أَى تَمْنَعُهُ. وَمِنْهُ النِّكَلُ

لِلْقَيْدِ

لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا لِمَا قَبْلَهَا وَمَا بَعْدَهَا مِنَ الْأَمْرِ إِذْ ذَكَرْتَ حَالَهُمْ فِي زَبْرِ الْأَوَّلِينَ. وَاشْتَهَرَتْ قِصَّتُهُمْ فِي الْآخِرِينَ أَوْ لِمَعَاصِرِهِمْ وَمِنْ بَعْدِهِمْ. أَوْ لِمَا يَحْضُرُهَا مِنَ الْقُرَى وَمَا تَبَاعَدَ عَنْهَا. أَوْ لِأَهْلِ تِلْكَ الْقَرْيَةِ وَمَا حَوَالِيهَا. أَوْ لِأَجْلِ مَا تَقْدُمُ عَلَيْهَا مِنْ ذُنُوبِهِمْ وَمَا تَأْخُرُ مِنْهَا. وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ مِنْ قَوْمِهِمْ. أَوْ لِكُلِّ مَتَّقٍ سَمِعَهَا.

ترجمہ:

"فجعلناها" سے مراد یہ مسخ اور عقاب ہے۔ "نکالاً" یعنی ایسی عبرت جو عبرت حاصل کرنے والوں کو ارتکاب جرم سے روک دے، اسی سے اخذ کر کے "نکل" ہے جس کا معنی بیڑی اور قید ہے۔

"ما بین یدیہا وما خلفہا"

"ما بین یدیہا" سے مراد وہ قومیں ہیں جو اس واقعہ کے بعد پیدا ہوئیں۔ پہلی قوموں نے جب انگوں کے صحیفوں میں ان کا حال پڑھا تو اس سے عبرت حاصل کی اور بعد کی قوموں میں جب ان کا قصہ مشہور ہوا تو بعد کے لوگوں نے اس سے سبق لیا، یا یہ کہ "ما بین یدیہا" سے معاصرین مراد ہیں، جو اس وقت دوسری جگہوں پر موجود تھے۔ اور "وما خلفہا" سے وہ مراد ہیں جو بعد میں آئے، یا جو بستیاں قریب موجود تھیں وہ اور جو اس سے دور واقع تھیں وہ مراد ہیں۔ یا یہ کہ "ما بین یدیہا" سے خود اس بستی کے لوگ مراد ہیں۔ اور "وما خلفہا" سے مضافات کے لوگ مراد ہیں۔ یا یہ کہ "ما بین یدیہا" سے وہ گناہ مراد ہیں جو پہلے صادر ہوئے تھے اور ان کے اثرات ختم ہو گئے تھے۔ اور "وما خلفہا" سے وہ گناہ مراد ہیں جو بعد میں صادر ہوئے اور ان کے اثرات اس واقعہ کے بعد بھی باقی رہے۔

موعظة للمتقين

یہاں متقین سے مراد ان ہی کی قوم کے متقی ہیں یا جس کسی متقی نے اس واقعہ کو سنا۔

لفظ نکل کا مفہوم:

(نكَل) نكل عن الشيء (Exemplary)

کسی کام سے کمزور اور عاجز ہو جانا۔ نکلتہ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینا۔ اور نکل۔ جانور کی بیڑی اور لگام کے لوہے کو کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بھی چلنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اس کی جمع نکال ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَحَجَبًا" (سورۃ المزمّل آیت نمبر 12)

کچھ ٹنگ نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ ہے۔

نکلتہ کسی کو عبرت ناک سزا دینا۔ اس سے اسم نکال سے۔ جس کے معنی عبرت ناک سزا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيَّنَّ يَدَيِّهَا وَمَا خَلَفْهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 66)

اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لئے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے، عبرت بنا دیا۔

"جَزَاءِ مَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 38)

ان کے فعلوں کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔

حدیث پاک:

اور حدیث میں ہے:

ان الله يحب النكل على النكل

کہ قوی آدمی جو طاقت ور گھوڑے پر سوار ہو اللہ تعالیٰ کو پیارا لگتا ہے۔

تحقیق بین:

بین کا لفظ یا تو وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں مسافت پائی جائے جیسے (دو شہروں کے درمیان) یا جہاں دو یا دو سے زیادہ

چیزیں موجود ہوں جیسے اور واحد کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں بین کو کمر لانا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ" (سورۃ حم سجدۃ آیت نمبر 5)

اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔

"فَأَجْعَلْ بَيْنِنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا" (سورۃ قطفہ آیت نمبر 58)

تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو۔

اور کہا جاتا ہے، یعنی یہ چیز شیرے قریب اور سامنے ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:

"ثُمَّ لَا تَأْتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 17)

پھر ان کے آگے (غرض ہر طرف سے) آؤنگا۔

"وَلَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِيَنَا وَمَا خَلْفَنَا" (سورۃ بقرہ آیت نمبر 64)
جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے سب اسی کا ہے۔

"وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا" (سورۃ بقرہ آیت نمبر 9)
اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی، اور ان کے پیچھے بھی۔

"مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْ مِنَ التَّوْرَةِ" (سورۃ المائدہ آیت نمبر 46)
جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔

"الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَهُمْ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ" (سورۃ ص آیت نمبر 8)
کیا ہم سب میں سے اسی نصیحت (کی کتاب) اتری ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ"

(سورۃ سنا آیت نمبر 31)

اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان کتابوں کو جو اس سے پہلے کی ہیں۔
میں سے انجیل اور دیگر کتب سادہ یہ مراد ہیں اور آیت کریمہ:

"فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 1)
اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔

کے معنی یہ ہیں کہ صلہ رحمی، قرابت، دوستی وغیرہ باہمی رشتوں کا لحاظ کر دو جو باہم تم سب کے درمیان مشترک ہیں اور بین
کم، الحد یا الف کا اضافہ کر کے عین کے معنی میں استعمال کر لینے ہیں
خلف کا معنی:

(خلف) خلف (پیچھے) (Successor)

یہ قدم کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:

"يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 255)
جو کچھ ان کے رو برو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔

"لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 11)
آدی کے لئے بدلی والے فرشتے ہیں اس کے آگے اور پیچھے۔

لفظ وعظ کی تحقیق:

(وعظ) الوعظ (Preaching)

کے معنی ایسی زجر تو بیخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو خلیل نے اس کے معنی کئے ہیں خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہو اعظمت و موعظت دونوں اسم ہیں قرآن میں ہے:

"يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 90)

نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

نوٹ: لفظ جعل اور تقویٰ کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 67]

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُؤًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ○

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔“

متن:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً أُولَٰئِكَ هِيَ الْقِصَّةُ قَوْلَهُ تَعَالَى: وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَآذَرْتُمْ فِيهَا وَإِنَّمَا فَكَّتْ عَنْهُ وَقَدِمَتْ عَلَيْهِ لِاسْتِقْلَالِهَا بَنُو عَآخِرٍ مِّنْ مَّسَاوِيهِمْ، وَهُوَ الْاسْتِهْزَاءُ بِالْأَمْرِ وَالِاسْتِقْصَاءُ فِي السُّؤَالِ وَتَرَكَ الْمَسَارِعَةَ إِلَى الْإِمْتِثَالِ. وَقِصَّتُهُ: أَنَّهُ كَانَ فِيهِمْ شَيْخٌ مُّوسَى فَقَتَلَ ابْنَهُ بَنُو أَخِيهِ طَمَعًا فِي مِيرَاثِهِ، وَطَرَحُوهُ عَلَى بَابِ الْمَدِينَةِ، ثُمَّ جَاءُوا يَطَالِبُونَ بَدْمَهُ، فَأَمَرَهُمُ اللَّهُ أَنْ يَذْبَحُوا بَقَرَةً وَيَضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا لِيَحْيَا فَيُخْبِرَ بِقَاتِلِهِ.

قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُؤًا أَيْ مَكَانَ هُزُؤٍ، أَوْ أَهْلَهُ وَمَهْزُوءًا بِنَا، أَوْ الْهَزَاءُ نَفْسَهُ لِفِرَاطِ الْاسْتِهْزَاءِ اسْتِبْعَادًا لِّهَا قَالَهُ وَاسْتِخْفَافًا بِهِ، وَقَرَأَ حَمْزَةً وَإِسْمَاعِيلُ عَنْ نَافِعٍ بِالسُّكُونِ، وَحَفْصٌ عَنْ عَاصِمٍ بِالضَّمِّ وَقَلْبُ الْهَمْزَةِ وَأَوْ. قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ لِأَنَّ الْهَمْزَ فِي مِثْلِ ذَلِكَ جَهْلٌ وَسَفَهٌ، نَفَى عَنِ نَفْسِهِ مَا رَمَى بِهِ عَلَى طَرِيقَةِ الْبِرْهَانِ، وَأَخْرَجَ ذَلِكَ فِي صُورَةِ الْاسْتِعَاذَةِ اسْتِفْظَاءً عَلَيْهِ.

ترجمہ:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔

اس آیت کا شروع کا حصہ یہ ہے،

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَآذَارَ أَنْتُمْ فِيهَا

لیکن قصہ کو اس سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اور "واذ قال موسى لقومه" کے قصہ کو مقدم ذکر کر دیا گیا ہے۔ یعنی ترکیب قوی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس طرح ارشاد فرمایا جاتا،

فآذَرْتُمْ فِيهَا فَقَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً

لیکن "قال موسى لقومه" کے قصہ کو پہلے جز سے الگ کر کے مقدم ذکر کیا گیا ہے۔ اس تفریق اور تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ یہ جز بھی مستقل ظاہر ہو اور بنی اسرائیل کی برائیوں کی ایک الگ نوع پر دلالت کرے ورنہ سلسلہ قصہ میں رہتے ہوئے اس کا استقلال اور تشخص ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ قصہ کے اجزاء کے خصوصی مشتملات قصہ کے تسلسل کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اور قصہ کو پڑھنے والا ان خصوصیات کی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب قصہ کے اجزاء میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے تو ہر جز و ملتفت الیہ بذات ہو جاتا ہے

وہو الاستہزاء بالامر یعنی انہوں نے امر موسیٰ یا امر الہی کا استہزاء کیا اور سوال کرنے میں بہت دور تک چلے گئے اور امثال امر کے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کو چھوڑ بیٹھے۔

مال دار بوڑھا:

وقصته: أنه كان فيهم شيخ موسر فقتل ابنه

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مال دار بوڑھا تھا، اس کی میراث اس کے بیٹے کو پہنچتی تھی اس کے بھتیجوں نے میراث کی لالچ میں آکر اس کے بیٹے کو قتل کر دیا، اور اس کی لاش کو فصیل شہر کے دروازے پر لا کر ڈال دیا اور خود اس کے خون کا مطالبہ کرنے کے لئے پہنچے۔ تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک گائے ذبح کریں اور اس کے کسی حصہ کو لاش کے ساتھ لگائیں تو وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کی خبر دے گا۔

قَالُوا اتَّخَذْنَا هُزُؤًا

"اتخذ" کے دو مفعول ہوتے ہیں، اور معنوی حیثیت سے مفعول اول مبتداء اور مفعول ثانی خبر ہوتا ہے یہاں "انا" مبتداء ہوا اور "هزو" خبر ہوا، خبر مصدر ہے اور مصدر کسی ذات کے لئے خبر نہیں ہوتا اس لئے مفسرین کے اس لفظی اشکال کو دور کرنے کے لئے "هزوا" کے معنی اور اس کی تقدیرات بیان کرنے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں کہ "هزو" سے پہلے مکان یا اہل کا لفظ مقدر ہے، اب معنی ہوئے "انا مکان هزو" ہم محل تمسخر ہیں۔ اسی کو جب "اتخذ" کا مفعول بنا دیا گیا تو معنی ہوئے، کیا بناتے ہو تم ہم کو محل تمسخر، اسی طرح اہل کا لفظ جب مقدر مانا جائے تو معنی ہونگے "انا اهل تمسخر" ہم تمسخر والے

ہیں۔ جب "اتخذ" کا مفعول بنایا جائے تو "اتخذنا هزو" کے معنی ہونے کیا تم ہم کو تمسخر کا اہل ٹھہراتے ہو، ایک تاویل یہ ہے کہ "هزو" کو "مہزوبہ" کے معنی میں لیا جائے۔ مہزوبہ وہ شخص ہے جس کا مذاق اڑایا جائے۔ اب معنی ہوں گے۔ کیا ہم کو آپ مذاق اڑایا ہوا اور تمسخر کیا ہوا بناتے ہیں۔ آخری تاویل یہ ہے کہ شدت استہزاء کے اظہار کے لئے انہوں نے خود کو نفس تمسخر قرار دیا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو یہ حکم دے کر ان کا اتنا تمسخر کیا کہ وہ خود کو مرپا تمسخر سمجھنے لگے۔

اَلتَّخِذْنَا هُزُوًا

یہ انہوں نے اس لئے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو انہوں نے مستبعد سمجھا، یا یہ کہ نعوذ باللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استخفاف مقصود تھا۔ اور حضرت نافع سے حمزہ اور اسماعیل نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے "زاء" کے سکون کے ساتھ "هزء" پڑھا ہے اور حفص عاصم کی قرأت میں "زاء" کا ضمہ ہے، اور حمزہ کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے یعنی "هزء" کی بجائے "هزوا" ہے۔

قَالَ اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ

فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔

جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم مذاق نہیں کر رہے تھے، بلکہ فرمایا،

اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر تمسخر کرنا جہل اور کم عقلی ہے۔ اس لئے جو تہمت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر لگائی گئی اس کی نفی استدلالی انداز میں فرمائی۔ استدلالی انداز یہ ہے کہ نفی صراحت پر نفی کنایہ کو ترجیح دی ہے۔ یہاں نفی کنائی سے ہماری مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے اصل سبب کی نفی کر دی جائے۔ تمسخر کا اصل سبب کم عقلی اور جہالت ہے۔ اور جب اصل سبب کے سے منقہ ہو جائے تو اس پر متفرع ہونے والے تمام مسببات منقہ ہو جاتے ہیں۔ کسی کا تمسخر کرنا کسی کی مصیبت کا احساس نہ کرنا، کسی کی فریاد اور مطالبہ کو اہمیت نہ دینا، قوم کے مسائل سے لاپرواہی برتنا وغیرہ جہل پر متفرع ہے۔ یہ سب باتیں جہل سے پیدا ہوتی ہیں۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کا معنی یہ ہوا کہ یہ یا اس جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور "اعوذ باللہ" یعنی استعاذہ کی صورت میں نفی کرنے میں استہزاء کی قباحت کا اظہار جیسے اردو میں کہتے ہیں تو بہ تو بہ استغفر اللہ ایسا ہو سکتا ہے۔

لفظ بقر کی تعریف:

(بقر) البقر (Cow)

(اسم جنس) کے معنی (بیل یا) گائے کے ہیں اس کا واحد بقرة ہے۔ قرآن میں ہے۔

"اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهٌ عَلَيْنَا" (سورة البقرة آیت نمبر 709)

کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔

لفظ استہزاء کی تعریف:

(Joke, Bunter) الاستہزاء

اصل میں طلب ہزع کو کہتے ہیں اگرچہ کبھی اس کے معنی مذاق اڑانا بھی آجاتے ہیں جیسے استجابة کے اصل معنی طلب جواب کے ہیں اور یہ اجابہ جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"قُلْ اِيَّا اللّٰهَ وَايَاتِهِ وَرَسُوْلِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِؤْنَ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 65)

تم فرماؤ کیا اللہ اور اسکی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنتے ہو۔

جہالت اور اس کی اقسام:

(Ignorance, Blindness) الجہل

(جہالت) نادانی جہالت تین قسم پر ہے:

- (1) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کے اصل معنی ہیں اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا مقضیٰ بھی یہی معنی جہالت ہے۔
 - (2) کسی چیز کے خلاف واقع یقین و اعتقاد قائم کر لینا۔
 - (3) کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہئے اس کے خلاف سرانجام دینا ہم ان سے کہ متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیا۔ دانستہ نماز ترک کر دے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت:
- "اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ اٰیٰتًا مُّزِيْنًا ۗ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَا ۗ مَا كُنَّا لِنَعْبُدَ اِلٰهًا اِلَّا هُوَ ۗ كُنَّا كٰفِرِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 67)
- فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔ میں ہزوا کو جہالت قرار دیا گیا ہے۔
- نوٹ: قول بقوم، امر، ذبح، اخذ اور اعوذ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیت 68]

قَالُوْا اِذْ عَلَّمْنَا رَبَّنَا الَّذِيْ لَمْ يَلْمِزْ اَنْفُسَنَا اَمَّا تَمْتَلِكُ اَمْ يَلْمِزُكَ اَمْ يَلْمِزُنَا ۗ اَمْ يَلْمِزُكَ اَمْ يَلْمِزُنَا ۗ اَمْ يَلْمِزُكَ اَمْ يَلْمِزُنَا ۗ اَمْ يَلْمِزُكَ اَمْ يَلْمِزُنَا ۗ

ذٰلِكَ فَاَفْعَلُوْا اَمْ اَنْتُمْ مُّرْسِلُوْنَ ۝

”بولے اپنے رب سے دعاء کیجئے کہ وہ ہمیں تلامذے گئے کسی کہاؤ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بولتی اور نہ
 لاؤ عمر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کہو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے۔“

متن:

قَالُوْا اِذْ عَلَّمْنَا رَبَّنَا الَّذِيْ لَمْ يَلْمِزْ اَنْفُسَنَا اَمْ يَلْمِزُكَ اَمْ يَلْمِزُنَا ۗ

اُمی ما حالها وصفتها، وكان حقهم أن يقولوا: أُمی بقرة هي؟ أو كيف هي؟ لأن ما يسأل به عن الجنس غالباً، لكنهم لما رأوا ما أمروا به على حال لم يوجد بها شيء من جنسه، أجرة مجرى ما لم يعرفوا حقيقته ولم يروا مثله. قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لِأَفَارِطٍ وَلَا يَكْرُ لَا مَسْنَةَ وَلَا فَتِيَةَ، يقال فرضت البقرة فروطاً من الفرض وهو القطع، كأنها فرضت سنها، وتر كيب البكر للأولية ومن البكرة والبكورة والبكورة.

عَوَانٌ نَصْفٌ. قَالَ شَعْرٌ: نَوَاعِمٌ بَيْنَ أَبْكَارٍ وَعَوُونٍ.

بَيِّنَ ذَلِكَ أُمی بَيْنَ مَا ذَكَرَ مِنَ الْفَارِطِ وَالْبَكْرِ وَلِذَلِكَ أُضِيفَ إِلَيْهِ بَيْنَ، فَإِنَّهُ لَا يُضَافُ إِلَّا إِلَى مُتَعَدِّ وَعَوْدِ هَذِهِ الْكِنَايَاتِ وَإِجْرَاءِ تِلْكَ الصِّفَاتِ عَلَى بَقَرَةٍ يَدُلُّ عَلَى أَنَّ الْمُرَادَ بِهَا مَعِينَةٌ، وَيَلْزِمُهُ تَأْخِيرُ الْبَيَانِ عَنِ وَقْتِ الْخُطَابِ، وَمَنْ أَنْكَرَ ذَلِكَ زَعَمَ أَنَّ الْمُرَادَ بِهَا بَقَرَةٌ مِنْ شَقِ الْبَقْرِ غَيْرِ مَخْصُوصَةٌ ثُمَّ انْقَلَبَتْ مَخْصُوصَةٌ بِسُؤَالِهِمْ، وَيَلْزِمُهُ النَّسْخُ قَبْلَ الْفِعْلِ، فَإِنَّ التَّخْصِيصَ إِبْطَالٌ لِلتَّخْيِيرِ الثَّابِتِ بِالنَّصِّ وَالْحَقُّ جَوَازُهُمَا، وَيُؤَيِّدُ الرَّأْيَ الثَّانِي ظَاهِرُ اللَّفْظِ

وَالْمَرْوِيُّ عَنْهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ «لَوْ ذَبَحُوا أُمی بَقَرَةً أَرَادُوا الْأَجْزَاءَ مِنْهُمْ، وَلَكِنْ شَدَّدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ»

وَتَقْرِيْعُهُمْ بِالْتَّمَادِي وَزَجْرُهُمْ عَلَى الْمَرَاجِعَةِ بِقَوْلِهِ:

فَأَفْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ أُمی مَا تُؤْمَرُونَ، مَعْنَى تَأْمُرُونَ بِهِ مِنْ قَوْلِهِمْ: أَمَرْتُكَ الْخَيْرَ فَأَفْعَلْ مَا أَمَرْتُ بِهِ، أَوْ أَمَرْتُكُمْ بِمَعْنَى مَأْمُورِكُمْ.

ترجمہ:

قَالُوا اذْغُ لَنَا رَبُّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ

بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے گائے کیسی۔

"ماہی" کا معنی ہے کس اس (گائے) کا حال کیا ہو؟ اس کی صفت کیسی ہو؟ حقیقی سوال یہ تھا بنی اسرائیل کہتے "ای بقرہ ہی کیسی" وہ کون سی گائے ہے یا کیسی ہے؟ اس لئے کہ عموماً "ما" کے ذریعے جنس اور حقیقت کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ بنی اسرائیل نے مامور بہ کو ایسے حال اور ایسی صفت پر سمجھا کہ اس حال کے رہتے ہوئے مامور بہ کی جنس کا کوئی بھی فرد نہیں پایا جاسکتا، اس لئے انہوں نے مامور بہ کو اس مقام پر رکھا کہ گویا اس کی ماہیت اور حقیقت کو ہی نہ پہچان سکے اور نہ اس کی مثال ان کی نظر سے گذری۔

"لا فارض ولا بکر"

یعنی نہ تو سن دراز ہو اور نہ کم سن ہو، عرب والے کہتے ہیں "فرضت البقرة فرضاً" گائے اپنی عمر گزار چکی۔ یہ فرض سے مشتق ہے جو قطع کرنے کے معنی میں ہے۔ گویا گائے نے اپنی عمر کو قطع کر دیا۔ اور بکر کی ترکیب اذلیت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ اور اسی سے اخذ کر کے البقرة آغاز صبح کو اور الباکوره آغاز شمر کو کہتے ہیں۔

عوان

کا معنی ہے درمیانی، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

نواعمه بين اَبكارٍ وَعُونٍ... بين ذالك

ذالک سے مراد جو نہ کور ہو یعنی فارض اور بکر۔ اور اسی وجہ سے بین کو ذالک کی جانب منضاف کیا گیا ہے، کیونکہ بین کی اضافت متعدد ہی کی جانب ہوتی ہے اور ان ضمیروں کا بقرہ کی طرف راجع ہونا اور ان صفات کو بقرہ پر جاری کرنا اس پر دلیل ہے کہ بقرہ سے اللہ کریم کی مراد بقرہ معینہ تھی۔ اس قول کی بناء پر یہ لازم آتا ہے کہ تفسیر و توضیح کو حکم دینے کے وقت سے مؤخر کر دیا گیا تھا۔ اور جو لوگ تاخیر بیان کے منکر ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ بقرہ سے مراد بقرہ غیر معینہ تھی، جو بقرہ کی کوکھ سے پیدا ہوئی، خواہ وہ کیسی بھی ہو۔ پھر بنی اسرائیل کے سوال کی وجہ سے وہ غیر معینہ، معینہ میں تبدیل کر دی گئی، یعنی مامور بہ اب غیر معینہ نہیں بلکہ معینہ ہو گئی، اس قول کی بنیاد پر نسخ قبل العمل لازم آتا ہے کیونکہ غیر محسوس کو خاص کر دینا اس اختیار کو باطل کر دینا ہے جو نص سے حاصل ہوا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں جائز ہیں۔ قول ثانی کی تائید قرآن حکیم کے ظاہری الفاظ سے ہوتی ہے اور حضور نبی کریم ﷺ سے جو حدیث منقول ہے اس سے بھی قول ثانی کی تائید ہوتی ہے، آپ ﷺ سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل اگر کسی بھی گائے کو ذبح کر دیتے تو ان کے لئے کافی ہوتا لیکن انہوں نے اپنے حق میں شدت برتی، تو اللہ کریم نے ان پر معاملہ کو شدید کر دیا، اور قول ثانی کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ کریم نے اپنے فرمان "فافعلوا ما تؤمرون" کے ذریعہ ان کو ان کی انتہا پسندی پر ڈانٹا ہے اور سوالات کی طرف عود کرنے سے جھڑکا ہے۔

فافعلوا ما تؤمرون

اس کے معنی ہیں "فافعلوا ما تؤمرونہ" اور یہ تؤمرون بہ کے معنی میں ہے، یہ استعمال شاعر کے اس شعر سے ماخوذ ہے،

أَمْرُكَ الْخَيْرُ فَأَفْعَلْ مَا أَمَرْتَهُ

یابہ کہ "ما تؤمرون"، "امرکم" کے معنی میں ہے اور امرکم، مامورکم کے معنی میں ہے۔

لفظ بیان کی تحقیق:

(Explanation)

البيان کے معنی کسی چیز کو واضح کرنے کے ہیں اور یہ نطق سے عام ہے۔ کیونکہ نطق انسان کے ساتھ مختص ہے اور کبھی جس

چیز کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اسے بھی بیان کہہ دیتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ بیان دو قسم پر ہے۔ ایک بیان بالتحجیر یعنی وہ اشیا جو اس کے آثار صنعت میں سے کسی حالت پر دل ہوں، دوسرے بیان بالا اختیار اور یہ یا تو زبان کے ذریعہ ہوگا اور یا بذریعہ کتابت اور اشارہ کے چنانچہ بیان حالت کے متعلق فرمایا۔

"وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 62)
اور (کہیں) شیطان تم کو (اس سے) روک نہ دے وہ تو تمہارا علانیہ دشمن ہے۔

یعنی اس کا دشمن ہونا اس کی حالت اور آثار سے ظاہر ہے۔ اور بیان بالا اختیار کے متعلق فرمایا:

"فَسئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ"

اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اور ان پیغمروں (کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔

"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" (سورۃ النحل آیت نمبر 43-44)

اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو۔ اور کلام کو بیان کہا جاتا ہے کیونکہ انسان اس کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے جیسے فرمایا:

"هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 38)

قرآن لوگوں کے لئے بیان صریح ہو۔

اور مجمل مہیم کلام کی تشریح کو بھی بیان کہا جاتا ہے جیسے

"ثُمَّ إِنْ عَلَيْنَا بَيَانُهُ" (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 19)

پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

بینہ وابتنہ کسی چیز کی شروع کرنا۔ جیسے فرمایا:

"لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" (سورۃ النحل آیت نمبر 44)

تاکہ جو ارشادات لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو۔

"تَذِيرٌ مُّبِينٌ" (سورۃ ص آیت نمبر 70)

کھول کر ڈرانے والا ہوں۔

"إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 106)

بیشک یہ روشن جانچ تھی۔

"وَلَا يَكَادُ يُبَيِّنُ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 52)

اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔

"وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر ۱۸)
اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

نوٹ: قول، دعا اور لفظ رب کی بحث گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 69]

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْتُهَا تُسْرُ
التَّائِظِينَ ○

"بولے اپنے رب سے دعاء کیجئے ہمیں بتادے اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک پہلی گائے ہے جس کی
رنگت ڈھبھاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی۔"

متن:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْتُهَا الْفَقُوعُ
نصوع الصفرة

ولذلك تؤكد به، فيقال: أصفر فاقع كما يقال أسود حالك، وفي إسنادة إلى اللون وهو
صفة صفراء لئلا يسته بها فضل تأكيد كأنه قيل صفراء شديدة الصفرة صفرتها، وعن
الحسن سوداء شديدة السواد، وبه فسر قوله تعالى: جِئَاكُم بِصَفْرٍ.

قال الاعشى:

تِلْكَ خَيْلِي مِنْهُ وَتِلْكَ رِكَابِي... هُنَّ صُفْرٌ أَوْلَادُهَا كَالزَّبِيبِ

ولعله عبر بالصفرة عن السواد لأنها من مقدماته، أو لأن سواد الإبل تلعوة صفرة
وفيه نظر، لأن الصفرة بهذا المعنى لا تؤكد بالفقوع تُسْرُ التَّائِظِينَ أي تعجبهم،
والسرور أصله لذة في القلب عند حصول نفع، أو توقعه من السر.

ترجمہ:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْتُهَا

"الفقوع" کا معنی ہے زردی کا بے میل اور خالص ہونا، اسی لئے صفت کی شدت و قوت کو فقوع کے مشتقات کے
ذریعہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صفر "فاقع" بمعنی گہرا زرد، اسی طرح بولا جاتا ہے جس طرح اسود حاک بمعنی گہرا سیاہ بولا

جاتا ہے۔ فاقع کو لون کی طرف منہ کیا گیا ہے اور لون کو فاقع کا قائل بنایا گیا ہے، حالانکہ وضع کے اعتبار سے فاقع وصف ہے صفراء کا، یعنی اسفرفاقع، یا صفراء فاقعة بولا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ استاد ابی اللون مجازاً ہے۔ اور مجاز کی وجہ یہ ہے کہ لون صفراء کا ملا بس اور اس سے تعلق و اتصال رکھنے والا ہے ہے کیونکہ لون حال (حلول کرنے والا) اور بقرة صفراء محل (جائے حلول ہے) اور حال محل کے درمیان اتصال ہوتا ہے۔ اس لئے لون اور صفراء کے درمیان اتصال ہے۔ اس استاد مجازی میں حکمت اور بلاغت یہ ہے کہ اس سے صفت کی مزید تاکید اور شدت ثابت ہوتی ہے۔

فاقع لونہا

یہ فرمانا ایسا ہے گویا کہ یوں فرمایا گیا،

صفراء شدید الصفرۃ صفرہا

یعنی ایسی زرد کہ اس کی زردی شدید ہے۔ اس تاکید کو شیخ زادہ نے اس طرح سمجھایا ہے کہ فتوح یا شدت صفت پورے جسم میں سرایت کر گئی ہے، اور یہ شدت کی انتہاء ہے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں کہ صفراء کے معنی سوداء شدیدۃ السواد کے ہیں یعنی کالی، اور انتہائی کالی اور فرمان باری تعالیٰ "جمالات صفر" کی یہی تفسیر لی گئی ہے یعنی کالے اونٹ۔ اعشی کہتے ہیں،

تِلْكَ حَيْبِي مِنْهُ وَتِلْكَ رِكَابِي ... هُنَّ صُفْرٌ أَوْلَاهَا كَالزَّبِيبِ

میرے وہ گھوڑے اور میرے وہ اونٹ معد کیرب سے حاصل ہوئے ہیں۔ اونٹوں کے بچے کشمشی رنگ کی طرح سیاہ ہیں۔ یہ شعر قیس بن معد کیرب کی تعریف میں ہے۔ اور غالباً سیاہی کو زردی سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ زردی، سیاہی کا پیش خیمہ ہے، یا اس لئے کہ اونٹوں کی سیاہی پر زردی چھائی رہتی ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ الہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو تفسیر حضرت حسن سے منقول ہے، اس میں اشکال ہے، اشکال کی وجہ یہ ہے کہ اگر صفرۃ کے یہی معنی مراد ہوتے تو اس کی تاکید کے لئے "فقوع" کا لفظ نہ آتا بلکہ سواد کی تاکید کے لئے جو لفظ ہے یعنی "حالك" وہ آتا۔

تسر النظرین

یعنی دیکھنے والوں کو گائے اچھی لگے۔ اس کا حسن قامت اور وفور صحت نظروں کو بھائے، سرور کے اصل معنی اس لذت کے ہیں۔ جو کسی نفع کے حاصل ہونے کے وقت یا کسی نفع کی توقع کے وقت دل میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ "سُر" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ باطنی اور اندرونی لذت کا نام سرور ہے۔

تحقیق لون:

(لون) اللون (Colour)

کے معنی رنگ کے ہیں اور یہ سیاہ سفید اور ان دونوں سے مرکب یعنی ہر قسم کے رنگ پر بولا جاتا ہے۔ تلون کے معنی رنگ بدلنے کے ہیں قرآن میں ہے۔

"وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَمُحْمَرٌّ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا" (سورۃ فاطر آیت نمبر 27)

اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کی دھاریاں ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"وَإِخْتِلَافٌ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ" (سورۃ الروم آیت نمبر 22)

اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف انواع و اقسام کے رنگوں اور شکلوں کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور باوجود اس قدر تعداد کے ہر انسان اپنی ہیئت کذائی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز کذاہی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس سے اللہ کریم کی وسیع قدرت پر تشبیہ کی گئی۔ اور کبھی الوان سے کسی چیز کے انواع و اقسام مراد ہوتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے،

فلان آتی بالالوان من الاحادیث، وتناول كذا ألوانا من الطعام.
اس نے رنگارنگ کی باتیں کیں اور الوان من الطعام سے مراد ہیں قسم قسم کے کھانے۔

صفرة کیا ہے؟

(ص فر) الصفرة (Yellow)

(زرری) ایک قسم کا رنگ جو سیاہی اور سفیدی کے مابین ہوتا ہے مگر اس پر چونکہ سیاہی غالب ہوتی ہے اس لئے کبھی اس کے معنی سیاہی بھی آتے ہیں۔ اسی بنا پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے آیت۔

"بَقْرَةٌ صَفْرَاءٌ فَاقِعٌ لَوْنُهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)

اس کا رنگ گہرا زردہ ہو۔

میں صفراء کے معنی سیاہی کے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اگر اس کے معنی سیاہ ہوتے تو اس کی صفت فاقع نہ آتی بلکہ صفراء

کے بعد حالکتہ کہا جاتا ہے۔ نیز فرمایا:

"لَمَّا يَهِيْجُ فَتْرَاةٌ مُّصْفَرًّا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 21)

پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے۔

اور آیت کریمہ: "كَأَنَّهُ جَمَالَاتٌ صُفْرٌ" (سورۃ المرسلات آیت نمبر 33)

گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صفرا صفر کی جمع ہے اور بعض نے کہا جاتا ہے کہ صفرا ایک دھات کا نام ہے جس

کے ساتھ زرری میں تشبیہ دی گئی ہے۔

نحاس، سفار، صفیر اور پیٹ کا سانپ:

اسی سے نحاس (تیل) کو صفر اور خشک تھمی (گھاس) کو سفار کہا جاتا ہے اور کبھی صفیر کا لفظ ہر اس آواز کی حکایت پر بولا جاتا ہے جو (دور سے) سنائی دے اسی سے صفر الاناء کا محاورہ ہے جس کے اصل معنی تو اس خالی برتن کے ہیں جس سے صفیر کی سی آواز سنائی لگے ہیں خواہ وہ برتن ہو یا اور کوئی چیز اور پیٹ اور رگوں کے غذا سے خالی ہونے کی صفر کہا گیا ہے اور ان رگوں کو جو جگر اور معدہ کے مابین پھیلی ہوئی ہیں جب غذا میسر نہ ہو تو وہ معدہ کے اجزا کو چوسنے لگتی ہیں اس بنا پر جاہل عربوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ صفر پیٹ میں ایک سانپ کا نام ہے جو بھوک کے وقت پسلیوں کا کاٹتا ہے۔ حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کو لاصفر کہہ کر اس عقیدہ کی نفی کرنا پڑی، یعنی پیٹ میں اس قسم کا سانپ نہیں ہوتا جس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے:

ولا يعرض على شرسوفه الصَّفَرُ
اور نہ اس کی پسلیوں کی صفر سانپ کا ٹٹا ہے۔
ماہ صفر کی وجہ تسمیہ:

اور ماہ صفر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں ان کے گھر تو شہ خالی ہو جاتے تھے اس لئے اسے صفر کہتے تھے اور جو بچہ ماہ صفر میں پیدا ہوا اسے صفری کہا جاتا ہے۔

لفظ فقع کا مفہوم:

(ف ق ع) اصفر فاقع کے معنی گہرے زرد رنگ کے ہیں اور یہ اصفر کی تاکید ہے جس طرح اسود حالک میں حالک کا لفظ اسود کی تاکید بن کر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"صَفْرَاءُ فَاقِعٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)

گہرا زرد رنگ۔

فقع اور فقاہ کا معنی:

ایک قسم کی کھمبی ہے جس کے ساتھ ذلیل آدمی کو تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ ہواذل من فقع فقاہ: وہ جنگل کی کھمبی سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ شراب کو فقاہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس پر جھاگ ابھر آتی ہے۔
پانی کا بلبہ:

اور تشبیہ کے طور پر پانی کے بلبے کو بھی فقاہ فقاہ الما بولتے ہیں۔

سرور کیا ہے؟:

(Taste, Grace)

السرور قلبی فرحت کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔

"وَلَقَدْ لَقِئْنَا نَظْرَةً وَّسُرُورًا" (سورۃ الدھر آیت نمبر ۱۱)
(تو خدا) ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔

"تَسْرُّرُ الْقَاطِرِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)
کہہ دیکھنے والے (دل) کو خوش کر دیتا ہو۔

اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"وَيُنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا" (سورۃ الانشاق آیت نمبر 9)
اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔

اور اہل نار کے متعلق فرمایا:

"إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا" (سورۃ الانشاق آیت نمبر 13)
یہ اپنے اہل و عیال میں مست رہتا تھا۔

تو اس میں تمبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔

السریر:

السریر (تخت) وہ جس پر کہ (ٹھاٹھ سے) بیٹھا جاتا ہے یہ سرور سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں

اس کی جمع اسرۃ اور سرر آتی ہے۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"مُتَّكِمِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ" (سورۃ الطور آیت نمبر 20)

تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔

"فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ" (سورۃ العاشیۃ آیت نمبر 13)

وہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے۔

"وَلَبِئْسَ مَا يَكُونُ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 34)

اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنادیے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔

سریر المیت:

اور میت کے جنازہ کو اگر سریر المیت کہا جاتا ہے تو یہ سریر (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک

شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پا کر جو راہی میں خوش و خرم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے،

سجن المؤمن:

نبی کریم ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"الدنيا سجن المؤمن"

کہ مؤمن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

نوٹ: لفظ نظر کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 70]

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ○
 ”بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کرے وہ گائے کیسی ہے بیشک گائیں میں ہم کو شبہ
 پڑ گیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے۔“

مقن:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ تَكَرِّرُ لِلسُّؤَالِ الْاَوَّلِ وَاسْتِكْشَافِ زَائِدٍ. وَقَوْلُهُ: إِنَّ
 الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا اعْتِدَارٌ عَنْهُ. أَيْ إِنَّ الْبَقَرَ الْمَوْصُوفَ بِالتَّعْوِينِ وَالصَّفْرَةِ كَثِيرٌ
 فَاشْتَبَهَ عَلَيْنَا، وَقَرَأَ «إِنَّ الْبَاقِرَ» وَهُوَ اسْمُ لِحْيَةِ الْبَقَرِ وَالْبَاقِرُ وَالْبَوَاقِرُ، وَيَتَشَابَهُ
 وَتَتَشَابَهُ بِالْيَاءِ وَالتَّاءِ، وَتَشَابَهُ وَيَشَابَهُ وَتَشَابَهُ بِطَرَحِ التَّاءِ وَادْغَامِهَا فِي الشَّيْنِ عَلَى
 التَّذْكِيرِ وَالتَّأْنِيثِ، وَتَشَابَهَتْ وَتَشَابَهَتْ مَخْفَفًا وَمَشْدَدًا، وَتَشَبَهَ بِمَعْنَى تَتَشَبَهَ وَتَشَبَهَ
 بِالتَّذْكِيرِ وَتَشَابَهَ وَتَشَابَهَتْ وَتَشَبَهَ وَتَشَبَهَتْ.

وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ إِلَى الْمَرَادِ ذَمِّهَا، أَوْ إِلَى الْقَاتِلِ

وَفِي الْحَدِيثِ «لَوْ لَمْ يَسْتَفْهِنُوا لَمَا بَيَّنَّتْ لَهُمْ آخِرَ الْاِبْدِ». وَاحْتِجَ بِهِ أَصْحَابُنَا عَلَى أَنْ
 الْحَوَادِثُ بِإِرَادَةِ اللَّهِ سَبَّحَانَهُ وَتَعَالَى، وَأَنَّ الْأَمْرَ قَدْ يَنْفَكُ عَنِ الْإِرَادَةِ وَالْاَلْمَ يَكُنُ لِلشَّرْطِ
 بَعْدَ الْأَمْرِ مَعْنَى. وَالْمَعْتَزَلَةُ وَالْكَرَامِيَّةُ عَلَى حَدُوثِ الْإِرَادَةِ، وَأَجِيبُ بِأَنَّ التَّعْلِيْقَ
 بِاعْتِبَارِ التَّعْلِيْقِ.

ترجمہ:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ

یہ سوال اول کا تکرار ہے۔ اور مزید وضاحت کا مطالبہ ہے اور اللہ کریم کا ارشاد،

إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا

اس سوال کرر کی طرف معذرت ہے یعنی وہ گامیں جو عوام اور اصغر کا وصف رکھتی ہیں، بہت ہیں۔ لہذا مطلوبہ گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی ہے۔ اور ایک قرأت "ان البقرہ" کی ہے۔ باقر، بقر کی جماعت کا نام ہے جیسا کہ "اباقر" اور "بواقر"، اور عشاہ یا کے ساتھ اور تاء کے ساتھ ہے، اور تشاہ تاء کے حذف بھی ہے۔ اور تاء کو شین کے ساتھ مدغم کرنے کے ساتھ بھی ہے۔ یہ ادغام مؤنث کے صیغہ میں ہو تو قرأت "تشابہ" ہوگی، اور اگر مذکر کے صیغہ میں ہو تو قرأت یشابہ ہوگی اور تشابہت شین کی تخفیف کے ساتھ اور تشابہت شین کی تشدید کے ساتھ، اور ایک قرأت تشہ ہے جو معنی میں "تشبہ" کے ہے۔ اور ایک قرأت یشبہ مذکر کے صیغہ کے ساتھ ہے اور بقیہ قرأتیں متشابہ، متشابہة، متشبهة اور متشبه ہے۔

وَإِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ

"لمہتدون" کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس بقرہ تک ہدایت پا جائیں گے، جس کا ذبح کرنا مقصود ہے، یا مراد یہ ہے کہ قاتل تک ہدایت پا جائیں اور حدیث پاک میں ہے کہ اگر وہ لوگ ان شاء اللہ نہ کہتے تو بقرہ کی توضیح قیامت تک نہ ہوتی۔ اور اس آیت سے ہمارے محکمین اسلام نے اس پر استدلال کیا ہے کہ تمام حوادث اللہ کریم کے ارادہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ ہر باری تعالیٰ کبھی ارادہ باری تعالیٰ سے جدا ہوتا ہے ورنہ امر کے بعد ان شاء اللہ کی شرط کے کوئی معنی نہ ہوں گے اور معتزلہ اور کرامیہ نے ارادہ کے حادث ہونے پر استدلال کیا ہے، اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ ارادہ باری تعالیٰ پر کسی چیز کو معلق کرنا تعلق کے اعتبار سے ہے۔

لفظ شبہ کی تحقیق:

(ش ب ہ) (Doubt, Suspicion)

الشبهة والشبة کے اصل معنی مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں باہم مماثل ہونا یا عدل ظلم میں اور دو چیزوں کا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکیں شبہة کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:

"وَأَتُوا بِهٖ مُّتَشَابِهًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 25)

اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے میں متشابہا کے معنی یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔

نوٹ: لفظ شاء اور احدہ کی تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 71]

قَالَ إِنَّهُ يُقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لِأَنَّ لَوْلَ تُلْبِذُ الْأَرْضِ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلِّمَةً لَا شِيبَةَ فِيهَا قَالُوا
الآن جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبِّحْهَا وَمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ○

”کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے ہے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔“

متن:

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقْرَةٌ لَا ذَلُولَ تُدِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ أُمِّي لَمْ تَذَلِّلْ لِكِرَابِ
الارض وسقى الحرث، ولا ذلولُ صفة لبقرة بمعنى غير ذلول، ولا الثانية مزيدة لتأكيد
الاولى والفعالان صفتا ذلول كأنه قيل: لا ذلول مثيرة وساقية، وقرء «لا ذلول» بالفتح
أى حيث هي، كقولك مررت برجل لا بخيل ولا جبان، أى حيث هو.

وتسقى من أسقى. مُسَلَّمَةٌ سَلِمَهَا اللهُ تَعَالَى مِنَ الْعِيُوبِ، أَوْ أَهْلِهَا مِنَ الْعَمَلِ، أَوْ أَخْلَصَ
لونها، من سلم له كذا إذا خلص له لا شِيَةَ فِيهَا لِأَنَّ لونها فيها يخالف لون جلدها، وهي في
الاصل مصدر، وشاة وشيا وشية إذا خلط بلونه لوناً آخر.

قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ أُمِّي بِحَقِيقَةٍ وَصَفَ الْبَقْرَةَ وَحَقَّقْتُهَا لَنَا، وَقَرَأَ «الآن» بِالْمَدِّ عَلَى
الاستفهام، و «لان» بحذف الهزة والقاء حركتها على اللام. فَذَبَّحُوهَا فِيهِ اخْتِصَارًا
والتقدير: فصلوا البقرة المنعوتة فذبحوها.

وَمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ لِتَطْوِيلِهِمْ وَكَثْرَةَ مَرَاجِعَاتِهِمْ، أَوْ لَخُوفِ الْفُضِيحَةِ فِي ظُهُورِ الْقَاتِلِ
أَوْلِغَاءِ ثَمْنِهَا إِذْ

روى: أن شيخاً صالحاً منهم كان له عجلة، فأتى بها الغيضة وقال: اللهم إني استودعتكها
لابنى حتى يكبر، فشبت وكانت وحيدة بتلك الصفات، فساوموها من اليتيم وأمه
حتى اشتروها بملء مسكها ذهباً، وكانت البقرة إذ ذاك بثلاثة دنانير. وكاد من أفعال
المقاربة وضع لذنو الخبر حصولاً، فإذا دخل عليه النفي قيل معناه الإثبات مطلقاً.
وقيل ماضياً، والصحيح أنه كسائر الأفعال ولا ينافي قوله:

وَمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ قَوْلُهُ فَذَبَّحُوهَا لِاخْتِلَافِ وَقْتَيْهِمَا، إِذِ الْمَعْنَى أَنَّهُمْ مَا قَارَبُوا أَنْ
يَفْعَلُوا حَتَّى انْتَهَتْ سَوَآلَاتُهُمْ، وَانْقَطَعَتْ تَعَلُّلَاتُهُمْ، فَفَعَلُوا كَالْمِضْطَرِّ الْمَلْجَأِ إِلَى الْفَعْلِ.

ترجمہ:

”لاذلول“ یعنی وہ زمین جوتے اور کھیتی کو سیراب کرنے کے کام میں نہ لائی گئی ہو۔ اور ”لاذلول“ صفت ہے ”بقرة“

کی، غیر ذلول کے معنی میں ہے اور دوسرا "لا" پہلے "لا" کی تاکید کے لئے بڑھایا گیا ہے۔ اور "تثیر الارض" اور "تسقی الجرت" دونوں کے دونوں ذلول کی صفت ہیں۔ گویا یوں ارشاد فرمایا گیا،

لا ذلول مشيرة وساقية

اور ایک قرأت ہے، "لا ذلول" فتح کے ساتھ، اس صورت میں لائمی جنس کے لئے ہوگا۔ اور خبر حیث ہی مقدر مانی جائے گی، عبارت یہ نکلے گی۔

لا ذلول حیث ہی

جیسے آپ کہتے ہیں "مرت برجل لا بخیل ولا جبان" یعنی "لا بخیل ولا جبان حیث ہی" یہاں بظاہر ذلول کی نفی اس مقام سے ہو رہی ہے جس مقام پر "بقوة" موجود ہے۔ نیز بخل اور جبن کی نفی اس مکان اور جگہ سے ہو رہی ہے جس جگہ پر وہ آدمی موجود ہے، کیونکہ ترجمہ ہوگا کوئی ذلول اور کیری نہیں ہے۔ جہاں وہ بقرہ موجود ہے۔ یا کوئی بخیل اور بزدل نہیں ہے جہاں وہ آدمی موجود ہے۔ لیکن مقصود اس بقرہ سے ذلول کی نفی ہے، اسی طرح دوسری مثال میں مقصود بخل اور جبن کی نفی ہے خود اس شخص سے، کیونکہ جب کسی چیز کے مکان سے کوئی چیز منہی ہے تو لازمی طور پر خود اس چیز سے بھی اس کی نفی ہوگی۔ پس ان دونوں مثالوں میں نفی بطور کنایہ ہے۔

وتسقی من اسقی

یعنی ایک قرأت اسقی ہے، یہ باب افعال اسقی سے فعل مضارع کا صیغہ ہے۔ "مسلمة" یعنی اس کو اللہ کریم نے عیوب سے صحیح سالم رکھا ہو، جن لوگوں کے یہاں وہ پرورش پا رہی ہے۔ ان لوگوں نے اس کو محنت سے محفوظ رکھا ہو، اس سے محنت کا کام نہ لیتے ہوں۔ یا مسلمة کے معنی یہ ہیں کہ اس کے رنگ کو خالص رکھا گیا ہو۔ اس صورت میں یہ سلم لہ کذا سے ماخوذ ہوگا یہ اس وقت بولتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی شخص کے لئے خالص ہو جائے۔

لا شية فيها

یعنی اس میں کوئی دوسرا رنگ نہ پایا جاتا ہو۔ جو اس کی جلد کے رنگ کے برخلاف ہو، شية دراصل و شيا و شية کا مصدر ہے۔ و شيا کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کسی کے رنگ میں دوسرے رنگ کو مخلوط نہ کر دیا جائے۔

قالوا الآن جئت بالحق

آیت کریمہ کے اس جزو میں بقرہ کے حقیقی اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں، جن کی روشنی میں بقرہ متحقق ہو سکے اور پورے طور پر اس کا تعین ہو سکے۔ اور ایک قرأت "الآن" ہمزہ استفہام کے مد کے ساتھ ہے، لیکن یہ انکار و تعجب کے لئے نہیں۔ بلکہ تقریر و تحقیق کے لئے ہے، اور ایک قرأت میں الآن ہے۔ اس میں ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت کو لام دے دی گئی ہے۔

فلذبحوها

اس تعبیر میں اختصار ہے اور اس کی تہہ میں ایک جملہ پوشیدہ ہے، اس کو ظاہر کرنے کی صورت میں مہارت اس طرح ہے گی۔

فحصلوا البقرۃ المنعوتۃ فلذبحوها

یعنی ان تفصیلات کے بعد یہ ہوا کہ بنی اسرائیل مذکورہ بالا بقرہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس کو ذبح کر دیا۔

وما کادوا یفعلون

اور وہ کرنے کے قریب نہیں تھے، کیونکہ معاملہ کو طول دے رہے تھے اور بار بار مراجعت کر رہے تھے، یا یہ وجہ تھی کہ ان کو قاتل کے ظہور میں رسوائی کا اندیشہ تھا، یا اس کی وجہ قیمت کی گرانی تھی، اس لئے روایات میں آتا ہے کہ ایک صالح بزرگ کے پاس ایک بچھیا تھی، اس کو وہ بیابان میں لے کر آیا، اور اس نے دعا کی کہ اے اللہ کریم یہ بچھیا میں تیرے پاس امانت رکھتا ہوں، تا آنکہ وہ بیٹا بڑا ہو جائے، اور وہ بچھیا جوان ہوئی اور ان اوصاف میں وہ منفرد تھی تو بنی اسرائیل نے اس یتیم اور اس کی ماں سے اس بقرہ کے سلسلہ میں بھاؤ تاؤ کیا یہاں تک کہ اس کو کھال بھر سونے کے ساتھ خرید لیا، حالانکہ کہ اس وقت گائے کی عمومی قیمت تین دینار تھی۔

وکاد من افعال مقاربه

اور "کاد" افعال مقاربه میں سے ہے اور خبر کے قریب الحصول ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پھر جب اس پر حرف نفی داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی مطلقاً اثبات کے ہوتے ہیں۔ مطلقاً کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ اس کا مدخول ماضی ہو، خواہ مضارع اور بعض نے کہا کہ جب کاد ماضی پر حرف نفی داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی اثبات کے ہوتے ہیں۔ "ما کاد" دالت کرتا ہے۔ اس پر کہ خبر حاصل ہوگئی، اور اگر مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی اثبات کے نہیں ہوتے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ "کاد" دیگر افعال کی طرح ہے۔ جس طرح دیگر افعال پر اگر حرف نفی داخل ہوتا ہے تو فعل منفی ہوتا ہے۔ اور حرف نفی نہیں داخل ہوتا تو مثبت ہوتا ہے۔ اسی طرح کاد بھی ہے۔ اور غالباً جن حضرات نے اثبات کے معنی کئے ہیں، ان کی مراد لازمی معنی سے ہے، یعنی نفی داخل ہونے کی صورت میں ظاہری معنی تو نفی قرب کے ہیں، لیکن لازم جو آتا ہے وہ اثبات ہے،

ولا یبغی قولہ وما کادوا یفعلون قولہ فلذبحوها

یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ ہے کہ جب کاد دوسرے افعال کی طرح ہے تو "ما کاد" کے معنی قرب کی نفی کے ہوئے۔ پس "وما کادوا یفعلون" کے معنی ہوئے کہ وہ کرنے کے قریب نہیں تھے، اور فلذبحوها سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے ذبح کر ڈالا، پس دونوں میں بظاہر منافات اور تناقض ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دونوں جملے دو مختلف وقتوں کے بارے میں ہیں۔
 "وما کادوا یفعلون" ایک ایسے وقت کے بارے میں ہے اور "فذبحوھا" دوسرے وقت کے بارے میں ہے۔
 تناقض اس وقت ہوتا ہے جب دونوں کا وقت ایک ہوتا ہے، جب ان کے سوالات کا سلسلہ چل رہا تھا اس وقت کے لئے تو وہا
 کادوا یفعلون ہے اور جب سوالات ختم ہو گئے، تو ان کو وہ کام انجام دینا پڑا، اس وقت کے لئے "فذبحوھا" فرمایا گیا۔
 اسی کو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں۔ اور اللہ کریم کا فرمان "وما کادوا یفعلون" اللہ
 کریم کے فرمان "فذبحوھا" کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کا وقت الگ الگ ہے۔ اس لئے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسا کرنے
 کے قریب نہیں تھے، یہاں تک کہ ان کے سوالات ختم ہو گئے اور ان کی نال مثل کا سلسلہ منقطع ہو گیا، تو انہوں نے یہ کام اس
 طرح انجام دیا جیسا کہ کوئی مضطر اور مجبور آدمی کسی کام کو انجام دیتا ہے۔

تشیر کا معنی:

تشیر (To plough or Cultivate)

مضارع واحد مؤنث غائب اثارۃ (باب افعال) مصدر بمعنی براہیختہ کرنا۔ ابھارنا۔ زمین میں جوتنے اور ہواؤں کے
 بادلوں کو لانے میں چونکہ یہ معنی موجود ہیں اس لئے ان دونوں کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جوتنے کے لئے آیت
 ہذا اور ہواؤں کے بادلوں کو لانے کے لئے

"اِنَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُؤْتِي سَحَابًا مَّيْبُتًا فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ" (سورۃ روم آیت نمبر 48)

اللہ ہے کہ بھیجتا ہے ہوائیں کہ ابھارتی ہیں بادل پھر اسے پھیلا دیتا ہے آسمان میں جیسا چاہے۔

ارض کے کہتے ہیں؟:

(ارض) الارض (Earth)

(زمین) سماء (آسمان) کے بالقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع ارضون ہے۔ جس کا صیغہ قرآن میں نہیں ہے کبھی
 ارض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔

لفظ سقی کا مفہوم:

(س ق ی) السقی (Irrigated)

والسقیاء کے معنی پینے کی چیز دینے کے ہیں اور اسقاء کے معنی پینے کی چیز پیش کر دینے کے ہیں تاکہ حسب منشاء لے کر پی
 لے لہذا اسقاء یا سقی کے زیادہ طبع ہے کیونکہ اسقاء میں مایسقی منہ کے پیش کر دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ پینے
 والا جس قدر چاہے اس سے نوش فرمانے مثلاً اسقیتہ نہرا کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اسے پانی کی نہر پر لے جا کر کھڑا

کردیا چنانچہ قرآن میں سقی کے متعلق فرمایا:

"وَسَقَاهُمْ وَسَقَاهُمْ زُبُجُهُمْ شَرَابًا ظَهُورًا" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 21)

اور ان کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

"وَسُقُوا مَاءً نَّجِيًّا" (سورۃ محمد آیت نمبر 15)

اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائیگا۔

لفظ حرث کی تعریف و تحقیق:

(حرث) (الحرث) (ن) (Agriculture, Field)

کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لئے تیار کرنے کے پاس اور کھیتی کو بھی حرث کہا جاتا ہے۔ قرآن میں

ہے۔

"أَنْ اَعْدُوا عَلَى حَرْثِكُمْ أَنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ" (سورۃ العلم آیت نمبر 22)

کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویری ہی جا پہنچو۔

اور کھیتی سے زمین کی آبادی ہوئی ہے اس لئے حرث بمعنی آبادی آجاتا ہے۔

قرآن میں ہے:

"مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ، وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا

لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ" (سورۃ الشوری آیت نمبر 20)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طلب گار ہے اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔ اور جو دنیا کی کھیتی کا کو خواستگار ہو اس کو ہم

اس میں سے دے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

ایک روایت میں ہے:

"اصدق الاسماء الحارث"

کہ سب سے سچا نام حارث ہے۔

کیونکہ اس میں کسب کے معنی پائے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے۔

"اثرث في دنياك لاخرتك"

کہ اس دنیا میں آخرت کے لئے کاشت کرلو۔

حرث الارض (زمین کرنا) سے صحیح بھڑکانا کے معنی کے پیش نظر حرث النار کہا جاتا ہے میں نے آگ بھڑکائی اور جس

لکڑی سے آگ کریدی جاتی ہے اسے محوٹ کہا جاتا ہے۔ کسی کا قول ہے۔ احرث القرآن یعنی قرآن کی خوب تحقیق سے کام

لو۔ حرث ناقتہ اونٹنی کو کام اور محنت سے دہلا کر دیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انصار سے دریافت کیا کہ تمہارے پانی کھینچنے والے اونٹ کیا ہوئے تو انہوں نے جواب دیا:

حرثناھا

یوم بدر کہ ہم نے بدر کے دن انہیں دہلا کر دیا۔

اور آیت کریمہ:

"نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 223)

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ۔

میں استعارہ عورتوں کو حرث کہا ہے کہ جس طرح زمین کی کاشت پر افراد انسانی بقا کا مدار ہے اس طرح نوع انسان اور اس کی نسل کا بقا عورت پر ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَيَهْلِكُ الْخَرْتَبُ وَالنَّسْلُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 205)

اور کھیتی اور جانیں تباہ کر دے۔

دونوں قسم کی کھیتی کو شامل ہے۔

شیۃ کا مفہوم اور اس کی اصل:

شیۃ (Stain, Mark)

داغ۔ نشان، علامت۔ شیات جمع شیۃ اصل میں وشیۃ تھا۔ اور وشی بشی (باب ضرب) کا مصدر ہے۔ اس کی حاواؤ محذوف کے عوض میں ہے وشی کے اصل معنی کسی چیز میں اس کی تمام رنگوں کے خلاف اور رنگ لگانے کے ہیں۔ یعنی ایسا رنگ جو سارے بدن کے رنگ کے خلاف ہو، وشی مادہ۔ لاشیۃ فیہا اس میں اپنے رنگوں کے علاوہ کوئی خلاف رنگ نہ ہو۔ یعنی بے داغ ہو، یہ صفت چہارم ہوئی بقرۃ کی۔

لفظ جاء کی تحقیق:

(ج ی ء) جاء (ض) (Arrive, Come)

جاء یعنی ءو مجینا والمجی ء کا لاتیان کے ہم معنی ہے جس کے معنی آنا کے ہیں لیکن مجی کا لفظ اتیان سے زیادہ عام ہے کیونکہ اتیان کا لفظ خاص کر کسی چیز کے بہولت آنے پر بولا جاتا ہے نیز اتیان کے معنی کسی کام مقصد اور ارادہ کرنا بھی آجاتے ہیں گو اس کا حصول نہ ہو۔ لیکن مجی ء کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب وہ کام واقعہ میں حاصل بھی ہو چکا ہو نیز جاء کے معنی مطلق کسی چیز کی آمد کے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ آمد بالذات ہو یا بالا مر اور پھر یہ لفظ اعیان و اعراض دونوں کے متعلق

استعمال ہوتا ہے۔ اور اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی جگہ یا کام یا وقت کا قصد کرے قرآن میں ہے: ﴿

”وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى“ (سورہ قیس آیت نمبر 20)

اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آ پہنچا۔

تعریف الفعل:

(فعل) الفعل (Infinitive, Work)

کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصد کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دو سے حیوانات اور جمادات کی طرف سے ہو یہی معنی لفظ فعل کے ہیں۔

نوٹ: ذلت، حرف لا، الآن، حق، وزن اور کادکا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): الآيات 72]

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ○

”اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا جو تم چھپاتے تھے۔“

متن:

وَإِذْ قَتَلْتُمْ

نَفْسًا خَطَابًا لِلْجَمِيعِ لَوْجُودِ الْقَتْلِ فِيهِمْ فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا اخْتَصَبْتُمْ فِي شَأْنِهَا، إِذِ

الْمِتَخَاصِمَانِ يَدْفَعُ بَعْضُهُمَا بَعْضًا، أَوْ تَدَافَعْتُمْ بِأَنْ طَرَحَ كُلُّ قَتْلِهَا عَنِ نَفْسِهِ إِلَى

صَاحِبِهِ، وَأَصْلُهُ تَدَارَأْتُمْ فَادْعَمْتَ التَّاءُ فِي الدَّالِ وَاجْتَلَبَتْ لَهَا هَمْزَةُ الْوَصْلِ

وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ

مَظْهَرَةٌ لَا مَحَالَةَ، وَأَعْمَلُ مَخْرَجٌ لِأَنَّهُ حِكَايَةٌ مُسْتَقْبَلٌ كَمَا أَعْمَلُ بِأَسِطٍ ذِرَاعِيُو لِأَنَّهُ حِكَايَةٌ

حَالٍ مَاضِيَةٍ.

ترجمہ:

وَإِذْ قَتَلْتُمْ

یہ خطاب جمع کا ہے، کیونکہ قتل ان سب کے درمیان پایا گیا تھا۔

فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا

پھر تم اس نفسِ مقتولہ کے بارے میں جھگڑنے لگے، جھگڑنے کی تعبیر "اذارنتم" سے اس لئے کی گئی کہ دو جھگڑنے والے ایک دوسرے کو دفع کرتے اور دھکیلتے ہیں۔ یا "اذارنتم" کے معنی "تدافعتم" کے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک قتل کو اپنے اوپر سے دوسرے پر ڈال رہا تھا اور "اذارنتم" کی اصل تدارنتم ہے تاء کو دال میں مدغم کر دیا گیا اور دال ساکنہ کے لئے ہمزہ وصل آئی۔

وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ

مخرج کے معنی لامحالہ ظاہر کرنے کے ہیں، اور "مخرج" کو عمل اس لئے دیا گیا کہ وہ فعلِ مستقبل کی حکایت کر رہا ہے۔ جیسا کہ باسط ذراعیہ کو اس لئے عمل دیا گیا کہ وہ حال ماضی کی حکایت کر رہا ہے،

نفس کا معنی:

(ن ف س) النفس (Breath, Spirit)

کے معنی روح کے آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"أَخْبِرْ جُوا أَنفُسِكُمْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 93)

کہ نکال لو اپنی جانیں۔

"وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 235)

اور جان رکھو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ کو سب معلوم ہے۔

اور ذیل کی دونوں آیتوں:

"تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 116)

اور جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے اور جو تیرے علم میں ہے میں اسے نہیں جانتا ہوں۔

"وَيُحِذِرْكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 30)

اور اللہ تم کو اپنے غضب سے ڈراتا ہے۔

میں نفس بمعنی ذات ہے اور یہاں نفسہ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرہ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی ذوائی سے پاک ہے بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی اضافت اضافتِ ملک ہے اور اس سے ہمارے نفوس امارہ مراد ہیں جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

تحقیق لفظ درء:

(درء) الداء (ف)

کے معنی و نیزہ وغیرہ کے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کی کچی کو درست کر دیا میں نے اس سے دفع کیا قرآن میں ہے:

"وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ الشَّيْئَةَ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 22)

اور نیکی کے ذریعہ برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

"وَيَذَرُوا عَنْهَا الْعَذَابَ" (سورۃ النور آیت نمبر 8)

اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے۔

حدیث پاک:

حدیث میں ہے: "ادْرَأْ وَالْمَحْدُودَ بِالشَّبَهَاتِ"

شرعی حدود کو شبہات سے دفع کرو۔

اداراتم کا معنی:

اصل میں تدارء تم تھا تدارء (تفاعل) مصدر جس کے معنی لڑائی میں ایک دوسرے پر سے ہٹانا۔ متفق نہ ہونا۔ ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنا ای تدافع۔ تدارء تم کی تاء کو دال میں بدل کر دال مابعد میں مدغم کر دیا۔ پھر ابتداء بالسکون کی دشواری کی وجہ سے شروع میں ہمزہ وصل لائے۔ ادارؤ تم ہو گیا۔ معنی یہ ہے کہ: تم ایک دوسرے پر (اس قتل کا) الزام لگانے لگے۔

لفظ کتمان کی تحقیق:

(لث م) کتمہ (ن) (To Hide, To Cover)

کتمان و کتمان کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 140)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

"وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 146)

مگر ایک فریق ان میں سچی بات جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 283)

اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ:

"الَّذِينَ يَبْغُلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُغْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ"

(سورة النساء آیت نمبر 37)

جو آپ بخل کریں اور اوروں سے بخل کے لئے کہیں اور اللہ نے جو انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپائیں۔

میں کتمان فضل سے کفران نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:

"وَاعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا" (سورة النساء آیت نمبر 37)

اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا" (سورة النساء آیت نمبر 42)

اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپائیں گے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو

رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔ تو چھٹ سے پکارا انھیں گے۔

"وَاللَّهُ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ" (سورة الانعام آیت نمبر 23)

خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔

مگر اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالیٰ سے کوئی بات

نہ چھپائے ہوتی حسن بصری فرماتے ہیں کہ آخرت میں متعدد واقف ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش

کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی چھپانہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف

گواہی دیں گے۔

نوٹ: قول اور خرج کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): الآيات 73]

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

"تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اللہ یونہی مردے جلانے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو۔"

متن:

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ

عطف علی اداراتہم وما بینہا اعتراض، والضمیر للنفس والتذکیر علی تأویل الشخص

أَوِ الْقَتِيلِ بِبَعْضِهَا

أى بعض كان، وقيل: بأصغريها، وقيل بلسانها، وقيل بفخذها اليمنى، وقيل بالأذن،
وقيل بالعجب كذلك يُحْيِي اللهُ الْمَوْتَى

يدل على ما حذف وهو فطر بوه فحبي، والخطاب مع من حضر حياة القتيل، أو نزول الآية
وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ

دلالتہ علی کمال قدرتہ.

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

لکی یکمل عقلکم وتعلیوا أن من قدر علی إحياء نفس قدر علی إحياء الانفس کلها، أو
تعلیوا علی قضیتہ. ولعلہ تعالیٰ إنما لم یحیہ ابتداء وشرط فیہ ما شرط لها فیہ من
التقرب وأداء الواجب، ونفع الیتیم والتنبیہ علی برکة التوکل والشفقة علی

الاولاد، وأن من حق الطالب أن یقدم قربة، والمتقرب أن یتحرى الاحسن ویغالی
بشمنہ. كما روى عن عمر رضى الله تعالى عنه: أنه ضمی بنجیبة اشتراها بثلاثمائة
دينار. وأن المؤثر فی الحقيقة هو الله تعالى، والاسباب أمارات لا إثر لها، وأن من أراد
أن یعرف أعدى عدوة الساعی فی إماتتہ الموت الحقیقی، فطریقہ أن ینضح بقرة نفسه
التي هی القوة الشهویة حين زال عنها شره الصبا، ولم یلحقها ضعف الکبر، وكانت
معجبة رائقة المنظر غیر منللة فی طلب الدنيا، مسلبة عن دنسها لا سمة بها من
مقاصها بحيث یصل أثره إلى نفسه، فتحیا حياة طیبا، وتعرب عما به ینکشف الحال،
ویرتفع ما بین العقل والوهم من التدارؤ والنزاع.

ترجمہ:

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ

یہ عطف ہے "آدرائتم" پر، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے یعنی "والله ینخرج ما کنتم تکتُمون" وہ جملہ معترضہ
ہے اور "اضربوا" کی ضمیر مفعول بہ "نفساً" کے لئے ہے۔ اور یہاں اس کو مذکر اس لئے لایا گیا کہ وہ شخص کی تاویل میں ہے۔
یا "المحی علیہ" (جس پر زیادتی کی گئی) کی تاویل میں ہے۔

ببعضها

بعض سے مراد کوئی بھی جزو ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے دو چھوٹے اعضاء یعنی قلب ولسان مراد ہیں، اور بعض کہتے

ہیں کہ اس کی زبان اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی داہنی ران اور بعض کہتے ہیں کہ کان اور بعض کے نزدیک اس کی دُم کی جڑ مراد ہے۔

كُنْذُكْ يَحْيٰى اَللّٰهُ الْمَوْتٰى

یہ ایک مخدوف عبارت پر دلالت کرتا ہے، اور وہ عبارت ہے "فَضْرِبُوا فِجْحًا" یعنی بنو اسرائیل نے اس کو بقرہ کا وہ حصہ لگایا، اور وہ زعمہ ہو گیا۔ گویا اس عبارت کے بعد فرمایا جا رہا ہے،

كُنْذُكْ يَحْيٰى اَللّٰهُ الْمَوْتٰى

اور یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو مقتول کی حیات کے وقت موجود تھے۔ یا خطاب ان لوگوں سے ہے، جو نزول آیت کے وقت وہاں موجود تھے۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ

اور وہ اپنی آیات دکھاتا ہے۔ یعنی اپنے کمال قدرت کی دلیلیں دیتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

تا کہ تم سوچو یعنی تاکہ تمہاری عقل کامل ہو جائے، اور تم جان لو کہ جو ہستی ایک شخص کو زندہ کرنے پر قادر ہے، وہ تمام نفوس کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، یا اس لئے کہ تم اس کے تقاضے پورے کرو۔ اور اللہ کریم نے اس مقتول کو براہ راست زندہ نہیں کیا، اور اس کے لئے مذکورہ شرطیں رکھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تقرب یعنی مامور بہ کی ادائیگی اور واجب کو بجالانا پایا جا رہا ہے۔ نیز اس میں یتیم کی نفع رسانی اور توکل کی برکت پر تنبیہ کرنا ہے، اور اولاد پر شفقت کرنی ہے، اور یہ تعلیم دینی ہے کہ طالب پر یہ عائد ہوتا ہے کہ پہلے کائی قربت و عبادت کی چیز پیش کرے، اور جو قربانی پیش کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ عمدہ ترین چیز تلاش کرے، اور اس کی بھاری قیمت کو ادا کرے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے قیمتی اور محبوب اونٹنی کی قربانی کی جن کو تین سو (300) دینار میں خریدا تھا۔ اور یہ بھی تعلیم دینا مقصود ہے کہ مؤثر در حقیقت اللہ کریم ہی کی ذات مبارکہ ہے اور اسباب تو صرف علامات ہیں۔ ان کی تاثیر کچھ نہیں ہے، اور یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ جو شخص اپنے بدترین دشمن کو پہچاننا چاہتا ہے، ایسا دشمن جو اس کو حقیقی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس کی گائے کو یعنی قوت شہوانیہ کو اس وقت ذبح کر دے جس وقت اس سے بچپن کی نیم پختگی یا حرص جا چکی ہو، اور بڑھاپے کا ضعف، اس کو لاحق نہ ہوا ہو۔ اور جس وقت وہ قوت شہوانیہ خوش نما اور خوش منظر ہو، طلب دنیا کے لئے اس کو استعمال نہ کیا گیا ہو، وہ اپنے عیوب سے پاک ہو، اس میں قبائح شہوت کا کوئی ایسا داغ و صہبہ نہ ہو جس کا اثر نفس تک پہنچتا ہو، جب بقرہ نفس ذبح ہو جائے گی تو آدمی پاکیزہ اور ستھری زندگی بسر کرے گا اور اس کی روح سے ان چیزوں کا اظہار ہوگا جن سے حقیقت حال منکشف ہو جائے گی اور عقل وہم کے درمیان جو تداخل اور نزاع رکھتا ہے وہ اٹھ جائے گا۔

لفظ بعض کا معنی:

(بعض) بعض الشئ (Certain, Some)

ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اس لئے کل کے بالقابل استعمال ہوتا ہے جیسے:
بعضہ وکلہ اس کی جمع ابعاض آتی ہے قرآن میں ہے:

"بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)

تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

نوٹ: ضرب، حی، موت، رویت، عقل اور آیت کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 74]

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدَّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشْقُقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○

”پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کڑے اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے گونگوں سے بے خبر نہیں۔“

متن:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ

القساوة عبارة عن الغلظ مع الصلابة، كما في الحجر. وقساوة القلب مثل في نبوة عن الاعتبار، وثم لاستبعاد القسوة من بعد ذلك يعني إحياء القليل، أو جميع ما عد من الآيات فإنها مما توجب لين القلب. فهي كالحجارة في قسوتها أو أشد قسوة منها، والمعنى أنها في القساوة مثل الحجارة أو أزيد عليها، أو أنها مثلها، أو مثل ما هو أشد منها قسوة كالحديد، فحذف المضاف وأقيم المضاف إليه مقامه، ويعضده قراءة الحسن بالجر عطفاً على الحجارة، وإنما لم يقل أقسى لها في أشد من المبالغة، والدلالة على اشتداد القسوتين واشتغال المفضل على زيادة وأول للتخيير، أو للترديد بمعنى: أن من عرف حالها شبهها بالحجارة أو بما هو أقسى منها.

وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشْقُقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ

تعلیل للتفضیل، والمعنی: أن الحجارة تتأثر وتنفعل فإن منها ما يتشقق فينبع منه الماء، وتنفجر منه الأنهار، ومنها ما يتردى من أعلى الجبل انقياداً لما أراد الله تعالى به. وقلوب هؤلاء لا تتأثر ولا تنفعل عن أمره تعالى. والتفجر التفتح بسعة وكثرة. والخشية هجاز عن الانقياد، وقرء إن على أنها المخففة من الثقيلة وتلزمها اللام الفارقة بينها وبين إن النافية، ويهبط بالضم.

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ

وعید علی ذلك، وقرأ ابن کثیر ونافع وبعقوب وخلف وأبو بکر بالياء ضمّاً إلى ما بعده. والباقون بالتاء.

ترجمہ:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔

قساوت کا معنی ہے سختی کے ساتھ موٹا ہونا، جیسا کہ پتھر میں ہے۔ اور قلب کی قساوت تمثیل ہے، اس کے عبرت پذیری سے دور ہونے کے سلسلے میں اور "ثم" قساوت کو مستبعد ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

من بعد ذالك

یعنی مقتول کو زندہ کرنے کے بعد یا ان تمام نشانیوں کے بعد جو شمار کی جا چکی ہیں کیونکہ وہ نشانیاں ایسی ہیں جو واجب طور پر نرمی پیدا کرتی ہیں۔

فهي كالحجارة

تو دل پتھر کی طرح سختی میں "او اشد قسوة" یا زیادہ سخت ہیں پتھروں کے مقابلے میں اور معنی یہ ہے کہ قبول سختی میں پتھروں جیسے ہیں۔ ان چیزوں جیسے ہیں جو پتھروں سے زیادہ سخت ہیں جیسے لوہا، تو مضاف کو حذف کر دیا گیا، اور مضاف الیہ کو اس کی جگہ قائم کر دیا گیا۔ اور اس معنی کی تقویت اس سے ہوتی ہے کہ ایک قرأت حالت جری کی ہے۔ جس میں اشد کو حجارۃ پر عطف کرتے ہوئے مفتوح پڑھا گیا۔ اور یہاں "اشد" فرمایا ہے "اقسى" انہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ "اشد" کے اندر مبالغہ ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے دونوں قساوتیں شدید ہیں۔ اور مفضل زیادتی پر مشتمل ہے اور تخمیر یا تردید کے لئے ہے، بایں معنی کہ جو شخص ان قلوب کا حال جانتا ہو وہ ان کو چاہے پتھروں کے ساتھ تشبیہ دے یا چاہے تو اس چیز کے ساتھ تشبیہ

دے جو پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہے،

وان من الحجارة

یہاں سے قلوب کو اشد قرار دینے کی علت بیان ہو رہی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ پتھر متاثر اور منفعل ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی بہتا ہے، اور نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کریم کے ارادہ کی اطاعت کی وجہ سے پہاڑ کے اوپر سے گر پڑتے ہیں۔ اور ان بنی اسرائیل کے دل میں کہ وہ اللہ کریم کے حکم سے منفعل اور متاثر نہیں ہوتے۔ اور "تفجر" کے معنی کشادگی اور کثرت کے ساتھ کھل جانا کے ہیں۔

اور "خشية: انقياد کی مجازی تعبیر ہے۔ اور ایک قرأت میں "ان" تخفیف نون ہے۔ اور ان مشقلہ سے مخففہ بنا لیا گیا ہے۔ اور ان مخففہ کے لام کا ہونا ضروری ہے جو "ان" مخففہ اور "ان" تانیہ کے درمیان فرق کرے۔ اور "یهبط" باء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

وما الله بغافل عما تعملون

یہ کیفیت مذکورہ پر وعید ہے۔ اور ابن نافع، یعقوب، خلف، ابو بکر اور حماد نے یعملون کے ساتھ قرأت کی ہے، انہوں نے اس صیغہ کو بعد والے صیغوں کے ساتھ ملا دیا ہے، اور باقی قراء نے یعملون تاء کے ساتھ قرأت کی ہے۔

تحقیق قست:

(ق س د) القسوة (Cruel, Stony or Hard-hearted)

کے معنی سنگ دل ہونے کے ہیں یہ اصل میں حجر قاس سے ہے جس کے معنی سخت پتھر کے ہیں۔ المقاساة سختی جھیلنا۔ قرآن میں ہے:

"ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 74)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے۔

"فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 22)

پس ان پر افسوس ہے جن کے دل اللہ کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔

"وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ" (سورۃ الحج آیت نمبر 53)

اور جن کے دل سخت ہیں۔

"وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 13)

اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

ایک قرأت میں قسیۃ ہے یعنی ان کے دل خالص نہیں ہیں یہ درہم قسی سے مشتق ہے جس کے معنی کھوٹے درہم کے

ہیں جس میں (سکہ) کی ملاوٹ کی وجہ سے صلابت پائی جائے۔ شاعر نے کہا ہے:

صاح القسیات فی ایدی الصیاریف
کھوئے درہم صرافوں کے ہاتھ میں آواز دیتے ہیں۔

قلب کا معنی:

(قل ب) قلب الشئی (Turn, Change)

کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قلب الثوب (کپڑے کو الٹنا) اور قلب الانسان کے معنی انسان کو اس کے راستے سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَالْيَه تَقْلِبُونَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 21)
اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

حجر کی تعریف:

(ح ج ر) الحجر (Stone)

سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع احجار و خجارة آتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 24)
جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

شد کا معنی:

(ش د د) الشد (Knot)

یہ شدت الشئی (ن)

کا مصدر ہے جس کے معنی مضبوط گرہ لگانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ" (سورۃ الانسان آیت نمبر 28)
اور ان کے مفاصل کو مضبوط بنایا۔

لفظ شق کا معنی:

(ش ق ق) الشق (Lacerate)

الشق۔ شگاف کو کہتے ہیں۔ شقیقہ بنصفین میں نے اسے برابر دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن میں ہے:

"لُحْمٌ شَقِقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا" (سورۃ عبس آیت نمبر 26)

پھر ہم نے زمین کو چیرا پھاڑا۔

"يَوْمَ نَشَقُّ الْأَرْضَ سُدًّا" (سورۃ البقرہ آیت نمبر 44)

اس روز زمین (ان سے) پھٹ جائے گی۔

"وَأَنْشَقَّتِ السَّمَاءُ" (سورۃ الحاقة آیت نمبر 16)

اور آسمان پھٹ جائے گا۔

"إِذَا السَّمَاءُ أَنْشَقَّتْ" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 1)

جب آسمان پھٹ جائیگا۔ اور آیت کریمہ:

"وَأَنْشَقَّ الْقَمَرُ" (سورۃ القمر آیت نمبر 1)

اور چاند شق ہو گیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ انشقاق قمر نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور بعض نے انشق القمر کے معنی وضع الاسر کئے ہیں یعنی معاملہ واضح ہو گیا۔

الشقة پھاڑا ہوا ٹکڑا۔ اسی سے محاورہ ہے۔

طار فلان من الغضب شقاً

فلاں غصہ سے پھٹ گیا۔

جیسا کہ قطع غضب کا محاورہ ہے۔ طارت منهم شقة۔ ان کا ایک حصہ اڑ گیا۔ یعنی غضب ناک ہوئے۔ الشق اس مشقت کو کہتے ہیں جو تنگ و دو سے بدن یا نفس کو ناحق ہوتی ہے جیسا کہ الانكسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی در ماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 7)

زحمت شاقہ کے بغیر۔

الشقة وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔

قرآن میں ہے:

"بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 42)

لیکن مسافت ان کو دور (دراز) نظر آئی۔

خشية کی تعریف:

(خش ی) الخشية (Fear of ALLAH)

اس غفل کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہو جائے، یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:-

"إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" (سورہ لقمان آیت نمبر 28)
اور خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔
میں خشیت الہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے۔

غفلت کی تعریف:

(غ ف ل) الغفلة

اس سہو کو کہتے ہیں جو قلت تحفظ اور احتیاط کی بنا پر انسان کو عارض ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔
"لَقَدْ كُنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَذَا" (سورہ لقمان آیت نمبر 22)
بیشک تو اس سے غافل ہو رہا تھا۔

غفلت شرمندگی:

غفلت سے شرمندگی بڑھتی ہے اور نعمت زائل ہوتی ہے، خدمت کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے، حسد زیادہ ہوتا ہے اور ملامت و پشیمانی کی فراوانی ہوتی ہے۔

بڑی حسرت:

ایک نیک آدمی نے اپنے استاد کو خواب میں دیکھا اور پوچھا:
آپ کے نزدیک سب سے بڑی حسرت کونسی ہے؟ استاد نے جواب دیا غفلت کی حسرت سب سے بڑی ہے۔
روایت ہے کہ کسی شخص نے حضرت ذوالنون مصری رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ کو خواب میں دیکھا اور سوال کیا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھے اپنی بارگاہ میں کھڑا کیا اور فرمایا،
اے جھوٹے دعویدار! تو نے میری محبت کا دعویٰ کیا اور پھر مجھ سے غافل رہا۔

شعر:

انت في غفلة و قلبك ساھيذھب العمر و الذنوب كماھي
تو غفلت میں مبتلا ہے اور تیرا دل بھولنے والا ہے، عمر ختم ہوگئی اور گناہ ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں۔

حکایت:

ایک صالح آدمی نے اپنے باپ کو خواب میں دیکھ کر پوچھا:

اے ابا جان! آپ کیسے ہیں اور کیا حال ہے؟

باپ نے جواب دیا:

ہم نے زرنگی غفلت میں گزاری اور غفلت ہی میں مر گئے۔

نوٹ: فجر، نہر، ماء، صہبہ اور حیوان کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 75]

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ
مَا عَقَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○

”تو اے مسلمانو! کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے اور ان میں کا تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے۔“

متن:

أَفَتَطْمَعُونَ

الخطاب لرسول الله صلى الله عليه وسلم والمؤمنين

أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ أَنْ يصدقوكم، أو يؤمنوا لأجل دعوتكم. يعنى اليهود.

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ

طائفة من أسلافهم يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ يعنى التوراة.

ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ كنعن محمد صلى الله عليه وسلم، وآية الرجم. أو تأويله فيفسرونه بما

يشتهون. وقيل هؤلاء من السبعين المختارين سمعوا كلام الله تعالى حين كلم موسى

عليه السلام بالطور، ثم قالوا سمعنا الله تعالى يقول في آخره: إن استطعتم أن تفعلوا

هذه الأشياء فافعلوا وإن شئتم فلا تفعلوا. مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوا أى فهموه بعقولهم

ولم يبق لهم فيه ريبه. وَهُمْ يَعْلَمُونَ أنهم مفترون مبطلون، ومعنى الآية: أن أحبار

هؤلاء ومقدميهم كانوا على هذه الحالة، فما ظنك بسفلتهم وجهالهم، وأنهم إن كفروا

وحرّفوا فلهم سابقة في ذلك.

ترجمہ:

یہ خطاب نبی کریم ﷺ اور مومنین سے ہے "ان یؤمنوا لکم" کے معنی ہیں یہ کہ تمہاری تصدیق کریں گے یا یہ کہ

تمہاری دعوت کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے، ان سے مراد یہودی ہیں۔
 "فریق منهم" سے مراد ان کے اسلاف کی ایک جماعت ہے۔

يسمعون كلام الله

سے مراد توریت ہے، "ثم يحزفونه" تحریف کی مثال حضرت محمد ﷺ کے اوصف اور احکام رجم کی تحریف ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ وہ کلام اللہ کی تاویل کرتے ہیں اور اس کی من چاہی تفسیر کرتے ہیں اور برض کہتے ہیں یہ ان ستر منتخب لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اللہ کریم کا کلام سنا جس وقت اللہ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر کلام فرمایا۔ پھر کہنے لگے کہ ہم نے اللہ کریم کو آخر میں یہ بھی کہتے سنا ہے، اگر تم لوگ یہ چیزیں کر سکو تو کرنا اگر نہ کرنا چاہو تو نہ کرنا۔

من بعد ما عقلوه

یعنی اس کے بعد کہ انہوں نے اسے اپنی عقلوں کے ذریعے سمجھ لیا۔ اور ان کے لئے اس کے بارے میں کوئی شک باقی نہیں رہا۔

وهم يعلمون یعنی اس بات کو جانتے تھے کہ وہ افتراء کر رہے ہیں اور باطل پر ہیں اور پوری آیت کریمہ کا مقصود یہ ہے کہ ان یہودیوں کے علماء اور ان کے اسلاف اس حالت پر تھے، تو تمہارا ان کے نیچے درجہ لوگوں اور جاہلوں کے بارے میں کیا گمان ہے؟ اور یہ بھی مقصود ہے اگر ان لوگوں نے کفر کیا، اور تحریف کی تو کیا تعجب ہے۔ اس بارے میں ان کا سابقہ ریکارڈ یہی رہا ہے۔

فریق کی تعریف:

(فرق) الفریق (Class, Party)

اور فریق اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُؤُونَ إِلَيْنَا أَلِيًّا كَذٰبًا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 78)

اور ان میں کچھ وہ ہیں جو زبان پھیر کر کتاب میں میل کرتے ہیں۔

کلام کا معنی:

(كلام) الكلمہ (Word, Speech)

یہ اصل میں اس تاثیر کو کہتے ہیں جس کا ادراک دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کیساتھ ہوتا ہے۔ اور کلم (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔

محاورہ:

محاورہ ہے۔ کلمتہ میں نے اسے ایسا زخم لگایا۔ جس کا نشان ظاہر ہوا اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور کلم) معنی تاثیر

میں مشترک ہیں۔

التحریر الشئ کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک جانب مائل کر دینا۔ جیسے تحریر القلم قلم کو ٹیڑھا لگانا۔ اور تحریر الکلام کے معنی ہیں کلام کو اس کے موقع و محل سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں۔ قرآن میں ہے:

"يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 46)

یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔

اور دوسرے مقام پر

"وَيُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ" (سورۃ البائتہ آیت نمبر 41)

ہے یعنی ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد۔

"مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 75)

(حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے کچھ لینے کے بعد اس کو (جان بوجھ کر)

بدل دیتے رہے ہیں۔

الحرف:

وہ چیز جس میں تلخی اور حرارت ہو گو یا وہ حلاوت اور حرارت سے پھیر دی گئی ہے۔ طعام حریف چہ چراہٹ (والا کھانا)

ایک روایت میں ہے۔ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔

نوٹ: الف، ایمان، قد، سمع، عقل اور علم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): الآيات 76]

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِغُضُوبِهِمْ إِلَىٰ بَعْضِ قَالُوا اسْتَجِدُّونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○

”اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر

کھولا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں کیا تمہیں عقل

نہیں۔“

متن:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا

یعنی منافقینہم۔ قَالُوا آمَنَّا بِأَنْكُم عَلَى الْحَقِّ، وَإِنْ رَسُولَكُمْ هُوَ الْمُبَشِّرُ بِهِ فِي التَّوْرَةِ وَإِذَا

خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ قَالُوا أَيُّ الدِّينِ لَمْ يَنَالِقُوا مِنْهُمْ عَاتِبِينَ عَلَىٰ مَنْ نَافَىٰ. ائْتَدُوا نَفْسَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ. بَمَا بَيْنَ لَكُمْ فِي التَّوْرَةِ مِنْ نِعْمَتِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَوِ الدِّينِ نَافِقُوا لِأَعْقَابِهِمْ إِظْهَارًا لِلتَّصَلُبِ فِي الْيَهُودِيَّةِ، وَمَدْعًا لَهُمْ عَنِ إِهْدَاءِ مَا وَجَدُوا فِي كِتَابِهِمْ، فَيَنَالِقُونَ الْفَرِيقَيْنِ. فَالاستفهام على الأول تقرير وعلى الثاني إنكار ونهي لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ لِيُحْتَجُّوا عَلَيْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ فِي كِتَابِهِ، جَعَلُوا مُحَاجَّتَهُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ وَحُكْمِهِ مُحَاجَّةَ عُنْدِهِ كَمَا يُقَالُ عِنْدَ اللَّهِ كَذَا، وَيُرَادُ بِهِ أَنَّهُ جَاءَ فِي كِتَابِهِ وَحُكْمِهِ، وَقِيلَ عِنْدَ ذِكْرِ رَبِّكُمْ، أَوْ بَيْنَ يَدَي رَسُولِ رَبِّكُمْ. وَقِيلَ عِنْدَ رَبِّكُمْ فِي الْقِيَامَةِ وَفِيهِ نَظَرٌ إِذَا الْإِخْفَاءُ لَا يَدْفَعُهُ. أَفَلَا تَعْقِلُونَ إِمَّا مِنْ تَمَامِ كَلَامِ اللَّائِمِينَ وَتَقْدِيرًا: أَفَلَا تَعْقِلُونَ أَنَّهُمْ يُحَاجُّونَكُمْ بِهِ فَيُحْجُونَكُمْ، أَوْ خُطَابٍ مِنْ اللَّهِ تَعَالَى لِلْمُؤْمِنِينَ مُتَّصِلٌ بِقَوْلِهِ: أَفَتَتَّبِعُونَ، وَالمعنى: أَفَلَا تَعْقِلُونَ حَالَهُمْ وَأَنْ لَا مَطْبَعَ لَكُمْ فِي إِيمَانِهِمْ.

ترجمہ:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا

"لقوا" کے فاعل سے مراد منافقین یہود ہیں۔ "قالوا امنا" ہم اس بات پر ایمان لائے کہ تم حق پر ہو، اور تمہارے رسول ہی ہیں جن کی توریت میں بشارت دی گئی ہے۔

وَإِذَا خَلَا بِبَعْضِهِمْ إِلَى بَعْضٍ قَالُوا

یہاں قالوا کا فاعل وہ یہود ہیں جنہوں نے نفاق نہیں کیا، یہ ان لوگوں کو عتاب کر رہے ہیں جنہوں نے نفاق کیا۔ "بما فتح الله عليكم" یعنی جو چیزیں اللہ کریم نے تمہارے لئے توریت میں واضح فرمادی ہیں۔ جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کے اوصاف، یا قالوا کا فاعل منافقین ہیں جو اپنے بعد کے پیروکاروں سے یہ کہہ رہے ہیں تاکہ یہودیت میں ان کی سختی ظاہر ہو اور اپنے پیروکاروں کو ان چیزوں کے اظہار سے بھی روک سکیں جن کو وہ اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔ اس طرح وہ منافق دونوں فریقوں سے نفاق کرتے ہیں۔ پس استفہام تفسیر اڈل کی بناء پر تفریع و تویح کے لئے ہے۔ اور تفسیر ثانی کی بنیاد پر انکار و نفی کے لئے ہے۔

لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ

تاکہ وہ لوگ تم پر اس چیز کے ذریعے حجت قائم کریں جس کو تمہارے رب نے اپنی کتاب میں اتارا ہے، کتاب اللہ کے ذریعے حجت قائم کرنے اور فیصلہ کرنے کو انہوں نے اللہ کریم کے سامنے حجت قائم کرنا قرار دیا۔ جیسا کہ بولا جاتا ہے، "عند

اللہ کذا" اور مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ بات اللہ کریم کی کتاب اور اس کے پھیلے میں ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ "عند ربکم" کے معنی "ذکر ربکم" کے ہیں۔ یا معنی ہیں "بما عند ربکم" یعنی اس چیز کے ذریعے جو تمہارے رب کے پاس ہے، یا معنی ہیں کہ تمہارے رب کے رسول کے سامنے، اور بعض کہتے ہیں کہ معنی یہ ہیں۔ تمہارے رب کے سامنے قیامت کے دن، لیکن اس توجیہ میں اشکال ہے کیونکہ احناف اس کو دفع نہیں کر سکتا۔

افلا تعقلون

یہ جملہ یا تو ملامت کرنے والوں کے کلام کا جزو ہے اور تقدیر عہارت کچھ اس طرح ہے،

افلا تعقلون انہم یحاجونکم ؤ فیحجونکم

کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ وہ تمہارے اوپر اس کے ذریعے جنت قائم کر دیں گے۔ پھر تم کو مغلوب کر دیں گے۔ یا یہ کہ اللہ کریم کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے، اور اس کا "افتطمعون" سے تعلق ہے۔ اب معنی یہ ہوں گے، کیا تم ان کے حال میں غور نہیں کرتے اور یہ نہیں سوچتے کہ تمہارے لئے ان کے ایمان کے سلسلہ میں کوئی توقع کی چیز نہیں ہے۔
خلاء کی لغوی واصطلاحی تحقیق:

(خ ل و) الخلاء (Empty, Cavity)

خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور الخلو کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں ماضی (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت خلا الزمان کے معنی زمانہ گزر گیا کر لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

اور محمد تو ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول ہو چکے۔

"وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ السُّفَلَاتُ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 6)

حالانکہ اس سے پہلے عذاب (واقع) ہو چکے ہیں۔

"تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 141)

یہ جماعت گزر چکی۔

تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں۔

"إِلَّا خَلَا فِيهَا نِدَائِي" (سورۃ فاطر آیت نمبر 24)

مگر اس میں ہدایت کرنے والا گزر چکا ہے۔

"مَقَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 214)

تم کو پہلے لوگوں کی سی۔

"وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 119)

اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غمے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: "يَخْلُلُ لَكُمْ وَجْهَ أَبِيكُمْ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 9)

پھر ابا کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔

کے معنی یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے رہ جائے گی۔ خلا الانسان تنہا ہوتا۔

خلافلان بفلان کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔ خلا الیہ کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن میں ہے:

"وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 14)

اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔ خلت فلانا کے اصل معنی کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ

دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ فرمایا:

"فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 5)

تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

ناقۃ خلیتہ۔ اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔ امرأۃ خلیتہ مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی اور

جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خلیتہ کہا جاتا ہے۔ الخلی جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مطلقۃ کا لفظ سکون و اطمینان کے

معنی میں آجاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا۔

تطلقة طورا طورا تراجع

میں (کسی اسے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ دو عود کر آتی ہے) میں تطلقة کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ الخلاء۔

خشک گھاس۔ کہا جاتا ہے: خلیت الخلاء۔ میں نے خشک گھاس کاٹی۔ خلیت الدابتہ جانور کو خشک گھاس ڈالی۔ سیف

یختلی۔ تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

حدوث کی تعریف:

(ح دث) الحدوث (ن) (To be Produced to grow)

کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے نہ ہو عام اس سے کہ وہ جو ہر ہو یا عرض اور احداث صرف ذات باری تعالیٰ

کے ساتھ مخصوص ہے۔ محدث (صیغہ صفت مفعول) ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور کسی چیز کا احداث کبھی تو نفس شے کے

اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی اس شخص کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جسے وہ حاصل ہوئی ہو۔ جیسے۔ احداثت ملکا میں نے نیا ملک

حاصل کیا، چنانچہ آیت کریمہ:-

"مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحَدَّثٍ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 2)

ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی۔

میں اسی دوسرے معنی کے اعتبار ذکر کو محدث کہا گیا ہے اور ہر وہ قول و فعل جو نیا ظہور پذیر ہوا ہو اسے بھی محدث کہہ دیتے ہیں۔

قرآن میں ہے: "حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 70)
جب تک میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات نہ کروں۔

"لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 1)
شاید اللہ اس کے بعد کوئی نیا حکم بھیجے۔

ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعہ پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری، قرآن میں ہے:

"وَ اِذْ اَسْرٰ النَّبِيُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهِ حَدِيْثًا" (سورۃ التحریم آیت نمبر 3)

اور جب نبی نے اپنی ایک بی بی سے ایک راز کی بات فرمائی۔

لفظ الفتح کی عمدہ تحقیق:

(ف ت ح) الفتح (Victory, Success)

کے معنی کسی چیز سے بندش اور پیچیدگی کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ ازالہ دو قسم پر ہے ایک وہ جس کا آنکھ سے ادراک ہو سکے جیسے۔ فتح الباب (دروازہ کھولنا) اور فتح القفل (قفل کھولنا) اور فتح المتاع اسباب کھولنا قرآن میں ہے:

"وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 65)

اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

"وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 14)

اور اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھولتے۔

دوم جس کا ادراک بصیرت سے ہو جیسے: فتح الهم (یعنی ازالہ غم) اس کی چند قسمیں ہیں،

قسم اول:

وہ جس کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے مال وغیرہ دے کر غم و اندوہ اور فقر و احتیاج کو زائل کر دینا۔ جیسے فرمایا:

"فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِم اَبْوَابَ كُلِّ نَسِيٍّ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 44)

پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی۔ فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

یعنی ہر چیز کی فراوانی کر دی۔ نیز فرمایا:

"لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 96)

تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔

یعنی انہیں ہر طرح سے آسودگی اور فارغ البالی کی نعمت سے نوازتے۔

قسم دوم:

علوم و معارف کے دروازے کھولنا جیسے محاورہ ہے۔

فلان فتح من العلم بابا مغلقا

فلاں نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔ یعنی شہادت کو زائل کر کے ان کی وضاحت کر دی۔ اور آیت کریمہ:

"إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا" (سورۃ الفتح آیت نمبر 1)

بے شک ہم نے تمہارے لئے روشن فتح دی۔

میں بعض نے کہا ہے یہ فتح کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ اس سے علوم و معارف اور ان ہدایات کے

دروازے کھولنا مراد ہے جو کہ ثواب اور مقامات محمودہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے غفران ذنوب کا

سبب ہے۔

الفاتحہ کے کہتے ہیں:

الفاتحہ ہر چیز کے مبدء کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کے مابعد کو شروع کیا جائے اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کو فاتحہ

الکتاب کہا جاتا ہے۔

"افتح فلان کذا فلاں" نے یہ کام شروع کیا فتح علیہ کذا کسی کو کوئی بات بتانا اور اس پر اسے ظاہر کر دینا قرآن میں ہے:

"أَمْحَدُّ ثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 76)

جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمائی ہے وہ تم ان کو بتائے دیتے ہو۔

"مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 2)

جو لوگوں کے لئے کھول دے فتح۔

القضية فتاحا یعنی اس نے معاملے کا فیصلہ کر دیا اور اس سے مشکل اور پیچیدگی کو دور کر دیا۔ قرآن میں ہے:

"رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 89)

اے ہمارے پروردگار ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے

والا ہے۔

اسی سے: "الْفَتْاحُ الْعَلِيمُ" (سورۃ سنا آیت نمبر 26)

ہے یعنی خوب فیصلہ کرنے والا اور جاننے والا۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

وَالِي مِنْ فَتَا حَتَّكُمْ غَنِي

اور میں تمہارے فیصلہ سے بے نیاز ہوں۔ بعض نے نزدیک فتاحہ فا کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ صحیح ہے اور آیت

کریمہ:

"إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ" (سورۃ النصر آیت نمبر 1)

جب اللہ کی مدد آ پہنچیں اور فتح حاصل ہوگئی۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الفتح سے نصرت، کامیابی اور حکم مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ علوم و معارف کے دروازے کھول

دینا مراد ہو۔ اسی معنی ہیں میں فرمایا:

"نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ" (سورۃ الصف آیت نمبر 13)

جو تمہیں پیاری ہے اللہ کی مدد اور جلد آنے والی فتح۔

"فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 52)

تو قریب ہے اللہ فتح بھیجے۔

"وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْفَتْحُ" (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 28)

اور کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا۔

"قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ" (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 29)

کہہ دو کہ فیصلے کے دن۔

یعنی حکم اور فیصلے کے دن بعض نے کہا ہے کہ الفتح سے قیامت پیا کر کے ان کے شک و شبہ کو زائل کرے کا دن مراد ہے

اور بعض نے یوم عذاب مراد لیا ہے۔ جسے وہ طلب کیا کرتے تھے۔

لفظ حاجہ کی تحقیق:

الحاجہ (جھگڑنا) (Quarrel, Dispute)

اس جھگڑے کو کہتے ہیں جس میں ہر ایک دوسرے کو اس کی دلیل اور مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن میں

"وَحَاجَّةُ قَوْمُهُ قَالَ: اَتَحَاجُّونِي فِي اللَّهِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 80)
اور ان کی قوم ان سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں کیا بحث کرتے ہو۔

"فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 61)
پھر اگر یہ بیسی کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چکی ہے۔

"لِمَ تُحَاجُّونَ فِي اِبْرَاهِيمَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 65)
تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔

"مَا اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجِبْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ"

(سورۃ آل عمران آیت نمبر 66)

دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں۔

"وَاذْيَتَّحَاجُّونَ فِي النَّارِ" (سورۃ غافر آیت نمبر 47)
اور جب وہ دوزخ میں جھگڑیں گے۔

لفظ حج کا معنی:

حج (Pilgrimage to MAKKAH)

اور حج کے معنی زخم کی کہرائی ناپنا بھی آتے ہیں شاعر نے کہا ہے:

يُحِجُّ مَآمُومَةً فِي قَهْرٍ هَاجِفٍ

وہ سر کے زخم کو سلائی سے ناپتا ہے جس کا قعر نہایت وسیع ہے۔

عند کا استعمال:

(عند) ظرف (Near, with)

عند یہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے اور کبھی

اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عندی کذا اور کبھی کسی شخص کی قرب و منزلت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 169)

بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔

نوٹ: اذا، لقی، حرف ما اور عقل کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2): الآيات 77]

أُولَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُبْسِرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ○
 ”کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے۔“

متن:

أُولَا يَعْلَمُونَ

یعنی هؤلاء المنافقین، أو اللاتمنین، أو کلیہما، أو ایہم والمحر فین.
 أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُبْسِرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ وَمِنْ جَمَلَتِہَا إِسْرَارُہِمُ الْکُفْرِ وَإِعْلَانُہِمُ الْإِيمَانِ
 وإخفاء ما فتح الله علیہم، وإظهار غیرہ، وتحریف الکلم عن مواضعہ ومعانیہ.

ترجمہ:

أُولَا يَعْلَمُونَ

کیا نہیں جانتے یہ منافقین یا لامتن کرنے والے یا دونوں، یعنی منافقین بھی اور ان کو ملامت کرنے والے بھی، یا یہ دونوں اور نیز تیسرا طبقہ تحریف کرنے والوں کا۔

أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُبْسِرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ

ان کی چھپانے کی چیزوں میں سے ایک کفر ہے۔ اور ان کے اظہار کی چیزوں میں سے ایک ایمان ہے اور جو چیزیں اللہ کریم نے ان پر توریت میں واضح فرمائی تھیں، ان کا اخفاء اور ان کے علاوہ دوسری باتوں کا اظہار مراد ہے۔ اور کلمات کو ان کے صحیح استعمال اور ان کے اصلی معانی سے پھیر دینا بھی مراد ہے۔

تحقیق اسرار:

(سر ر) الاسرار (Secret)

کسی بات کو چھپانا یہ اعلان کی ضد ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

”بَسْرًا وَعَلَانِيَةً“ (سورة ابراہیم آیت نمبر 31)

اور پوشیدہ اور ظاہر۔

اور فرمایا: ”وَيَعْلَمُ مَا تُبْسِرُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ“ (سورة التغابن آیت نمبر 4)

جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو معلوم ہے۔

”وَإِسْرَارًا وَقَوْلُكُمْ أَوْ أَجْهَرُ وَإِيَّاهُ“ (سورة الملک آیت نمبر 13)

اور تم (لوگ) بات پوشیدہ کہو یا ظاہر۔

اور اس کا استعمال اعیال و معانی دونوں میں ہوتا ہے السر۔ اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں پوشیدہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں

۴۔

"يَعْلَمُ السِّرَّ وَالْخَفَى" (سورۃ ظہ آیت نمبر 7)

تو وہ تو بھید کو جانتا ہے اور اسے جو اس سے بھی زیادہ چھپا ہے۔

نیز فرمایا:

"أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ" (سورۃ التوبہ آیت نمبر 78)

کہ اللہ ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے۔

سارۃ کا معنی:

سارۃ (مفادہ) کے معنی ہیں کسی بات کو چھپانے کی وصیت کرنا اور تسار القوم کے معنی لوگوں کا باہم ایک دوسرے کو

بات چھپانے کی وصیت کرنے یا باہم سرگوشی کرنے کے ہیں اور آیت۔

"وَأَسْرُوا الْقَدَامَةَ" (سورۃ قیونس آیت نمبر 54)

(بچھتا میں گئے) اور ندامت کو چھپائیں گے۔

تو یہاں اسروا کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی ظاہر کرنا بھی کئے ہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے:

"يَا لَيْتَنَّا نُرَدُّ وَلَا نَكْذِبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا" (سورۃ لانعام آیت نمبر 27)

اور کہیں گے اے کاش ہم پھر (دنیا میں) لوٹا دیے جائیں تاکہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں۔

لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ آیت مذکور میں جس ندامت کے چھپانے کا ذکر ہے اس سے وہ ندامت مراد نہیں ہے جس

کے اظہار کی طرف آیت یا لیتنا میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اسررت الی فلان حدیثا کسی سے پوشیدہ طور پر راز کی بات کہنا۔

چنانچہ قرآن میں:

"وَإِذَا سَرَّ السَّيِّئُ" (سورۃ التحریم آیت نمبر 3)

(اور یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

اور آیت: "تَسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ" (سورۃ المستحسنة آیت نمبر 1)

اور تم ان کی طرف پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں اپنی پوشیدہ دوستی سے آگاہ کرتے ہو۔ اس بنا پر بعض نے یہاں تسرون کے معنی تظہرون کئے

ہیں اور یہی معنی صحیح معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اسرار الی الغیر (کسی سے بھید کی بات کہنا) جس طرح دوسروں سے اٹھا کر مٹھنی

ہے اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو متلزم ہے جس سے وہ بھید کہا جاتا ہے لہذا السررت الی فلان (یعنی دوسرے سے راز کی بات کہنا) میں من وجہ انخاف اور من وجہ اظہار کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیت:

"وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا" (سورۃ نوح آیت نمبر ۹)

(ظاہر) اور پوشیدہ ہر طرح سمجھا تا رہا۔ بھی اس معنی پر محمول ہے۔ اور کنایہ کے طور پر السر کے معنی نکاح (جماع) کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چھپ کر کیا جاتا ہے اور سرخالص چیز کو کہتے ہی جیسے کہا جاتا ہے۔ ہو من سر قومہ: وہ اپنی قوم میں سب سے بہتر ہے اور اسی سے سیر الوادی و سیرازئدہ ہے جس کے معنی وادی کے بہتر حصہ کے ہیں۔

سرة البطن کا معنی:

سرة البطن (Navel)

ناف کا وہ حصہ جو قطع کرنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے اور یہ چونکہ بطن میں مخفی رہتا ہے اس لئے اسے سرة البطن کہتے ہیں اور وہ چیز جو ناف سے قطع کی جاتی ہے اسے سرور کہا جاتا ہے، تھیلی کی لکیروں کو اسرة الراحة کہتے ہیں اسی طرح پیشانی کے خطوط کو اساریر الجبہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مہینہ کی آخری تاریخ جس میں چاند ظاہر ہوتا ہے سرار کہا جاتا ہے۔ السرور قلبی فرحت کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔

"وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر ۱۱)

(تو خدا) ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔

"تَسْرُّ النَّاطِرِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)

کہ دیکھنے والے (دل) کو خوش کر دیتا ہو۔

اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 9)

اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔ اور اہل نار کے متعلق فرمایا:

"إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 13)

یہ اپنے اہل و عیال میں مست رہتا تھا۔ تو اس میں تشبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔ السریر (تخت) وہ جس پر کہ (ٹھاٹھ سے) بیٹھا جاتا ہے یہ سرور سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اسرة اور سر آتی ہے۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"مُتَّكِمِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ" (سورۃ الطور آیت نمبر 20)

تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔

"فِيهَا سُورٌ مَرْفُوعَةٌ" (سورۃ العاشیہ آیت نمبر 13)
وہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے۔

"وَلِيُؤْيِيَهُمْ اٰبَاؤَهُمْ سُرَّرًا عَلَيْهِمْ يَتَّكِبُونَ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 34)
اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنادیئے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔ اور میت کے جنازہ کو اگر سربرالمیت کہا جاتا ہے تو یہ سریر (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک شکون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قیدخانہ سے رہائی پا کر جو رالہی میں خوش و خرم ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

الدنيا سجن المومن:
کہ مومن کو دنیا قیدخانہ معلوم ہوتی ہے۔

لفظ علانیہ کی تعریف:

(علن) العلانیہ (Visible)

ظاہر اور آشکارا، یہ سر کی ضد ہے اور عام طور پر اس کا استعمال معانی یعنی کسی بات ظاہر ہونے پر ہوتا ہے اور اجسام کے متعلق بہت کم آتا ہے علن کذا کے معنی میں فلاں بات ظاہر اور آشکار ہوگئی اور اعلنتہ انا میں نے اسے آشکار کر دیا قرآن میں ہے:

"أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا" (سورۃ نوح آیت نمبر 9)

میں انہیں برملا اور پوشیدہ ہر طرح سمجھا تا رہا۔

"مَا تَكُنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ" (سورۃ القصص آیت نمبر 69)

جو کچھ ان کے سینوں میں مخفی ہے اور جو یہ ظاہر کرتے ہیں علوان الكتاب جس کے معنی کتاب کے عنوان اور سرنامہ کے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ علن سے مشتق ہو اور عنوان سے چونکہ کتاب کے مشمولات ظاہر ہوتے ہیں اس لئے اسے علوان کہہ دیا گیا ہو۔

نوٹ: لفظ علم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): آیات 78]

وَمِنْهُمْ اٰمِيْنُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّا اَمَانِيْنًا وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (78)

"اور ان میں کچھ اُن پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لیا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ زے مان میں ہیں تو خرابی ہے ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ ان کے

غرض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے۔

متن:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ

جہلہ لا يعرفون الكتاب فيطالعوا التوراة، ويتحققوا ما فيها. أو التوراة إلا أمانع استثناء منقطع. والاماني: جمع أمنيّة وهي في الاصل ما يقدره الإنسان في نفسه من منى إذا قدر، ولذلك تطلق على الكذب وعلى ما يتبنى وما يقرأ والمعنى لكن يعتقدون أكاذيب أخذوها تقليداً من المحرفين أو مواعيد فارغة. سمعوا منهم من أن الجنة لا يدخلها إلا من كان هوداً، وأن النار لن تمسهم إلا أياماً معدودة. وقيل إلا ما يقرءون قراءة عارية عن معرفة المعنى وتدبرة من قوله:

تمنّى كتاب الله أوّل ليلته... تمنى داود الزبور على رسل

وهو لا يناسب وصفهم بأنهم أميون.

وَأَنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ

ما هم إلا قوم يظنون لا علم لهم، وقد يطلق الظن بأزاء العلم على كل رأى واعتقاد من غير قاطع، وإن جزم به صاحبه: كاعتقاد المقلد والزائغ عن الحق لشبهة.

ترجمہ:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ

یعنی ایسے جاہل ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے کہ توریت کا مطالعہ کریں اور جو کچھ توریت میں ہے اس کا تحقیقی علم حاصل کریں۔ "الامانی" استثناء منقطع ہے۔ امانی، امنیہ کی جمع ہے۔ امنیہ درحقیقت وہ چیز ہے جس کو انسان اپنے دل و دماغ میں سوچتا ہے، یہ منی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اس سے اندازہ باندھا اسی لئے اس لفظ کا اطلاق کذب پر اور آدمی جو آرزو کرتا ہے، اس پر اور جو کچھ پڑھتا ہے اس پر بھی ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کتاب کا علم تو کچھ بھی نہیں رکھتے، البتہ کچھ جھوٹی اور فرضی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ جن کو انہوں نے تحریف کرنے والوں سے کسی کی تقید میں حاصل کر لیا ہے۔ یا کچھ فرضی وعدوں کا اعتقاد رکھتے ہیں جن کو تحریف کرنے والوں سے سن رکھا ہے کہ جنت میں صرف یہودی ہی داخل ہوں گے۔ اور دوزخ کی آگ ان کو چند ایام کے سوا کبھی نہیں چھوئے گی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ وہ کتاب کو نہیں سمجھتے مگر ہاں قرأت اور تلاوت کر لیتے ہیں۔ جو معنی کی معرفت اور تدریس سے خالی ہے اور یہ مفہوم شاعر کے اس شعر سے لایا گیا ہے،

تَمَّتْ كِتَابَ اللَّهِ أَوَّلَ لَيْلِهِ... تَمَّتْ دَاوُدَ الزُّبُورَ عَلَى رِسْلِ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کی رات کے اول حصہ میں ٹھہر ٹھہر کر اللہ کریم کی کتاب کی قرات کر رہے تھے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام زبور کی قرات کیا کرتے تھے۔
یہ سنی اس وصف سے میل نہیں کھاتے کہ وہ اتنی تھے۔

وَأَن هُمْ إِلَّا يَظُنُونَ

یعنی وہ نہیں ہیں مگر ایسی قوم جس کے پاس صرف ظن ہے، یقین نہیں ہے۔ اور کبھی علم کے مقابلہ میں ظن ہر اس رائے اور اعتقاد پر بولا جاتا ہے جس پر کوئی دلدل قطعی قائم نہیں ہے اگر یہ صاحب ظن اس کا یقین رکھتا ہو، جیسے مقلد کا اعتقاد اور اس شخص کا اعتقاد جو حق سے کسی شبہ کی بنا پر پھرا ہوا ہو۔

لفظاتی کی تحقیق:

الامی۔

وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو، اور نہ کتاب میں سے پڑھ سکتا ہو چنانچہ آیت کریمہ:-

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" (سورة الجمعة آیت نمبر 2)

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے ہیں اور انہیں پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں۔

میں امیوں سے یہی مراد ہے قطرب نے کہا ہے کہ امیہ بمعنی غفلت جہالت کے ہے اور اسی سے امی ہے کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوتی چنانچہ فرمایا:-

"وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ" (سورة البقرة آیت نمبر 78)

اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا خدا کی کتاب سے واقف نہیں ہیں۔

یہاں الامانی کے معنی الا انبتلی علیہم کے ہیں یعنی مگر یہ کو انہیں پڑھ کر سنایا جائے۔

فراء کا نظریہ:

فراء نے کہا ہے کہ امیوں سے مراد ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور آیت کریمہ:-

"الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ"

(سورة الأعراف آیت نمبر 157)

وہ جو غلامی کریں گے اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس تو ریت اور انجیل میں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اُمّی اس امت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو جس طرح کہ عامی اسے کہتے ہیں جو عوام جیسی صفات رکھتا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اُمّی کہنا اس بنا پر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے تھے۔ بلکہ وحی الہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور اللہ کریم کی اس ضمانت پر کہ

"سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى" (سورۃ الاعلٰی آیت نمبر ۵)

ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے۔

اعتماد کرتے تھے یہ صفت آپ کے لئے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ام القریٰ یعنی مکہ کی طرف نسبت ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ:

اُمّی کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بے پڑھے کیا ہے۔

یہ ترجمہ بالکل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد کے مطابق ہے اور یقیناً اُمّی ہونا آپ ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کہ دنیا میں کسی سے پڑھا نہیں اور کتاب وہ لائے جس میں اُولٰئین وَاٰخِرین اور غیبیوں کے علوم ہیں۔

(خازن، سورۃ الاعراف تحت الآیۃ: ۱۵۷، ۱۳۷/۲)

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، شعر،

ایسا اُمّی کس لئے منت کش استاد ہو
کیا کفایت اس کو اَقْرَأْتَ كَالْاَكْرَمِ نہیں

قرآن مجید میں ہے،

"يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْانْجِيلِ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۵۷)

اسے یہ (اہل کتاب) اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

یعنی اپنے پاس تورات اور انجیل میں آپ کی نعت و صفت اور نبوت لکھی ہوئی پاتے ہیں۔

التمنی کی تحقیق:

التمنی۔ (Wish)

کے معنی دل میں کسی خیال کے باندھے اور اس کی تصویر کھینچ لینے کے ہیں پھر کبھی یہ تقدیر محض ظن و تخمین پر مبنی بر حقیقت مگر نام طور پر تمنیٰ کی بنا چونکہ ظن و تخمین پر ہی ہوتی ہے اس لئے اس پر جھوٹ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر طور پر تمنیٰ کا لفظ دل میں غلط آرزو میں قائم کر لینے پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"أَهْلًا لِلنَّاسِ مَا تَمَتَّى" (سورۃ النجم آیت نمبر 24)

کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے۔

"فَتَمَتُّوا الْمَوْتَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 94)

تو موت کی آرزو تو کرو۔

"وَلَا يَسْتَمْتُونَهُ أَبَدًا" (سورۃ الجمعۃ آیت نمبر 7)

اور یہ ہرگز نہیں کریں گے۔

امنیہ کا معنی:

کسی چیز کی تمنا سے جو صورت ذہن میں حاصل ہوتی ہے اسے امنیہ کہا جاتا ہے۔ اور کذب چونکہ کسی غیر واقعی چیز کا تصور کر کے اسے لفظوں میں بیان کر دینے کو کہتے ہیں تو گویا تمنی جھوٹ کا مبداء ہے، لہذا جھوٹ کو تمنی سے تعبیر کرنا بھی صحیح ہے۔

قول عثمان غنی رضی اللہ عنہ:

اسی معنی میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

مَاتَغْنِيَتْ وَلَا مَنَّا اسَلَمَتْ

کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں نہ راگ گیا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے۔

اور امنیہ کی جمع امانی آتی ہے چنانچہ فرمایا:

"وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيًّا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 78)

اور ان میں کچھ اُن پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت۔

مجاہد نے الا امانی کے معنی الا کذب یعنی جھوٹ کئے ہیں اور دوسروں نے امانی سے بے سوچے سمجھے تلاوت کرنا مراد لیا ہے کیونکہ اس قسم کی تلاوت بھی اس منیہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے جس کی بنا تخمینہ پر ہوتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَتَّى أَلْفَى الشَّيْطَانَ فِي أُمْنِيَّتِهِ"

(سورۃ الحج آیت نمبر 52)

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر کبھی یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے

پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔

میں امنیہ کے معنی تلاوت کے ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تمنی ظن و تخمین سے بھی ہوتی ہے۔ اور بنی بر حقیقت بھی۔ اور

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر روح الامین جو وحی لے کر اترتے تھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی تلاوت

کے لئے مبادرت کرتے تھے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آیت،

"لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ" (سورۃ طہ آیت نمبر ۱۱۴)

اور "وَلَا تُخَوِّتْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر ۱۶)

جب بھی نہ سنا جائے گا تم یاد کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔

کے ذریعہ منع فرما دیا گیا۔ الغرض اس وجہ سے آپ کی تلاوت کو تمہنی سے موسوم کیا ہے اور مشنہہ کیا ہے کہ ایسی تلاوت میں

شیطان کا دخل غالب ہو جاتا ہے۔

اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے،

"ان العاجلة من الشيطان"

کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔

منیتی کذا کے معنی فریب دہی سے جھوٹی امید دلانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے شیطان کے قول کی حکایت کرتے

ہوئے فرمایا:

"وَلَا ضَلَّيْنَهُمْ وَلَا مَنِّيْنَهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر ۱۱۹)

اور ان کو گمراہ کرتا اور امید دلاتا رہوں گا۔

ظن کا معنی:

(ظن ن) الظن (Presumption)

اور ظن چونکہ عام طور پر برا ہوتا ہے اس لئے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"وَمَا يَتَّبِعْ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا" (سورۃ یونس آیت نمبر ۳۶)

اور ان میں سے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

نوٹ: حرف لا اور کتب کے معانی بیان ہو چکے ہیں۔

[سورۃ البقرۃ (۲): الآيات 79]

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا

قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ○

متن:

فَوَيْلٌ

ای تحسر و هلك. ومن قال إنه واد أو جبل في جهنم لمعناه: أن فيها موضعاً يتبوأ فيه من جعل له الويل، ولعله سماه بذلك مجازاً. وهو في الاصل مصدر لا فعل له وإنما ساءح الابتداء به نكرة لأنه دعاء.

لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ

یعنی المحرفین، ولعله أراد به ما كتبه من التأويلات الزائفة. بأيديهم تأكيد كقولك: كتبته بيمينی

ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيُشْتَرَوْا بِهِ ثَمناً قليلاً

کی يحصلوا به عرضاً من أعراض الدنيا، فإنه وإن جعل قليل بالنسبة إلى ما استوجبه من العقاب الدائم.

فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ

یعنی المحرف. وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ يريد به الرشي.

ترجمہ:

فَوَيْلٌ

یعنی اظہارِ حسرت اور ہلاکت ہے، اور جس نے یہ کہا کہ "ویل" ایک وادیِ جہنم ہے، یا دوزخ میں ایک پہاڑ ہے، تو اس کی راد یہ ہے کہ دوزخ میں ایک مقام ہے جہاں اس شخص کا ٹھکانہ ہوگا جس کے لئے "ویل" یعنی حسرت و ہلاکت لازم کر دی گئی ہے۔ اور شاید اس جگہ کو اس نام سے مجازاً موسوم کر دیا گیا ہے، اور "ویل" دراصل مصدر ہے، جس کا کوئی فعل نہیں آتا، اور "ویل" کو نکرہ ہونے کے باوجود مبتداء بنانا اس لئے جائز ہے کہ یہ دعا کے موقع پر ہے۔

لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ

یہاں پہ کتاب سے مراد محرف ہے، اور غالباً مقصود وہ گمراہ کن تفسیریں ہیں جو انہوں نے لکھی تھیں،

بأيديهم

یہ تاکید ہے جیسے عرب کا قول "کتبتہ بيمينی" میں بيمينی تاکید ہے۔

لِيُشْتَرَوْا بِهِ ثَمناً قليلاً

تا کہ اس تحریف کے ذریعے اموال دنیا میں سے کچھ مال و متاع حاصل کریں، اسلئے کہ دنیاوی مال و متاع خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اس عذابِ دائم کے مقابلہ میں کم ہے جس کے وہ مستحق ہوئے۔

مما كتبت ايديهم

اس میں "ما کتبت ای دیہم" سے مراد تحریفات اور تحریف شدہ کلام ہے۔ "مما یکسبون" میں "مایکسبون" سے مراد شو تہیں ہیں۔

ویل اور ویس کی تحقیق:

(وی ل) الویل

اصمعی نے کہا ہے کہ ویل برے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور حسرت کے موقع پر ویل اور تحقیر کے لئے ویس اور ترجمہ کے ویل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 79)

ان پر افسوس ہے اس لئے کہ بے اصل باتیں اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

"وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِيْنَ" (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 2)

اور کافروں کے لئے سخت عذاب کی جگہ خرابی ہے۔

"فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 65)

سو لوگ ظالم ہیں ان کی خرابی ہے۔

"وَوَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ" (سورۃ المطففین آیت نمبر 1)

ناپ تول میں کمی کر نیوالا کے لئے خرابی ہے۔

"وَوَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ" (سورۃ الہمزۃ آیت نمبر 1)

ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلیخو ر کی خرابی ہے۔

"يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا" (سورۃ قیس آیت نمبر 52)

ہائے ہماری خرابی کس نے ہمیں سوتے سے جگا دیا۔

"يَا وَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظَالِمِيْنَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 46)

ہائے شامت بیشک ہم ظالم تھے۔

"يَا وَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا طَاغِيْتِيْنَ" (سورۃ القلم آیت نمبر 31)

ہائے شامت ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے۔

الید کا معنی:

(ی دی) الید (Hand)

کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں یہ اصل میں یدنی (ناقص یا ئی) ہے کیونکہ اس کی جمع اید و یدی اور تشنیہ یدیان اور آیت کریمہ:

"فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ" (سورۃ البراہیم آیت نمبر 9)
تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دئے۔

قلت کا مفہوم:

(قل ل) القلة (Shortage)

والکثرة بلحاظ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عظم اور صغر صفات اجسام سے ہیں بعد کثرت و قلت اور عظم و صغر میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ:

"ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 60)

پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔

میں قلیلا سے عرصہ قلیل مراد ہے۔

لفظ کسب کی تحقیق:

(ك س ب) الكسب

اصل میں جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لئے کسی چیز کا قصد کرنے کو کسب کہتے ہیں جیسے کسب مال وغیرہ ایسے کام کے قصد پر بولا جاتا ہے جسے انسان اس خیال پر کرے کہ اس سے نفع حاصل ہوگا لیکن الٹا اس کو نقصان اٹھانا پڑے۔ پس الكسب ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدہ کے لئے کرے اسی لئے یہ کبھی دو مفعولوں کو طرف متعدی ہوتا ہے جیسے کسبت فلانا کذا میں نے فلاں کو اتنا کچھ حاصل کر کے دیا۔ مگر الاکتساب ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے لہذا ہر اکتساب لازم نہیں ہے۔ اور یہ خبز و اختبر و شوی و اشتوی، وطبخ و طبخ کی طرف ہے۔ اور آیت کریمہ:

"أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 267)

جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

قلندری لاہوری حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں:

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

حدیث پاک:

عرض کی گئی: ای الکسب اطیب

کہ کون سا کسب زیادہ پاکیزہ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

عمل الرجل بیدہ

کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا:

"ان طیب ما یکل الرجل من کسبه وان ولده من کسبه"

سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہ ہی جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھا اور اسکی اولاد اس کے کسب سے ہے۔

قرآن میں ہے: "لَا یَقْدِرُونَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 264)

اسی طرح (یہ ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور قرآن میں نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کے متعلق یہ فعل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:

"أَوْ کَسَبَتْ فِی اِیْمَانِہَا خَیْرًا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 158)

یا اپنے ایمان کی حالت میں نیک عمل نہیں کئے ہونگے۔

اور آیت کریمہ: "وَمِنْهُمْ مَّنْ یَقُولُ رَبَّنَا اِنْتَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا

عَذَابَ النَّارِ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوا وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ" ○

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 201-202)

اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔ ایسوں کو ان کی کمائی سے بھاگ ہے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

کے بعد فرمایا: انکے کاموں کا (حصہ) اور اعمال بد کے متعلق فرمایا:

"أَنْ تُبَسَّلَ نَفْسٌ بِمَا کَسَبَتْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 70)

تا کہ قیامت کے دن کوئی شخص اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

"أُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ أُبْسِلُوا بِمَا کَسَبُوا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 70)

یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے۔

نوٹ: کتب، ہذا، عند۔ لفظ اللہ اور ثمن کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2) : آية 80]

وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا النَّارَ إِلَّا أَيَّاماً مَعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ
 أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○
 ”اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرما دو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ
 ہرگز اپنا عہد خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔“

متن:

وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا النَّارَ

المس اتصال الشيء بالبشرة بحيث تتأثر الحاسة به، واللمس كالطلب له ولذلك يقال
 ألمسه فلا أجدّه.

إِلَّا أَيَّاماً مَعْدُودَةً محصورة قليلة، روى أن بعضهم قالوا نعذب بعد أيام عبادة العجل
 أربعين يوماً، وبعضهم قالوا مدة الدنيا سبعة آلاف سنة وإنما نعذب مكان كل ألف
 سنة يوماً

قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا

خبراً أو وعد بما تزعمون. وقرأ ابن كثير وحفص بإظهار الذال. والباقون بإدغامه
 فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ

جواب شرط مقدر أي: إن اتخذتم عند الله عهداً فلن يخلف الله عهداً. وفيه دليل على
 أن الخلف في خبره محال.

أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ

أم معادلة لهزة الاستفهام بمعنى أي الامرين كائن، على سبيل التقرير للعلم
 بوقوع أحدهما، أو منقطعة بمعنى: بل أتقولون، على التقرير والتقريع.

ترجمہ:

وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا النَّارَ

مس کے معنی ہیں کسی چیز کا جلد سے اس قدر متصل ہو جانا کہ قوتِ ماسہ اس سے متاثر ہو جائے۔ یعنی اس اتصال کا اثر
 قبول کر لے۔ اور لمس نام ہے مساس یعنی چھونے کی کوشش کرنے کا۔ اور شاید اسی وجہ سے اس کا اردو ترجمہ ٹولنا ہے۔ چونکہ

مس میں طلب کا مفہوم ہے اور طلب کے لئے مطلوب کا وصول ہونا ضروری نہیں اس لئے بولا جاتا ہے، "المسہ فلا جدہ" میں اس کو ٹوٹتا ہوں لیکن نہیں پاتا۔

إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً

معدودہ کے معنی ہیں معدود اور تھوڑے دن۔ بعض بنی اسرائیل سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کو بس اتنے دن عذاب دیا جائے گا جتنے دن بچھڑا کی پوجا کی یعنی چالیس دن، اور بعض کا کہنا ہے کہ دنیا کی عمر سات ہزار (7000) سال ہے لہذا ہر ہزار سال کی جگہ ہم کو صرف ایک دن عذاب دیا جائے گا اس لحاظ سے ان کے عذاب کے کل سات دن ہوئے۔

قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا

عہد کے معنی یا تو خبر کے ہیں یا وعدے کے، جیسا کہ تم گمان کرتے ہو۔

آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کا تم لوگ دعویٰ کرتے ہو، کیا اس کی اللہ کریم کی طرف سے کوئی خبر ملی ہے یا اس کا اللہ کریم سے تم نے کوئی وعدہ لے رکھا ہے۔

"اتخذتم" میں ہمزہ استفہام کے آجانے سے ہمزہ وصل ساقط ہو گیا ہے۔ ذال کو ابن کثیر اور حفص نے مظہر پڑھا ہے یعنی تاء میں مدغم نہیں کیا ہے، ان دو بزرگوں کے سوا بقیہ تمام قراء نے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے، ادغام کی صورت میں ذال کی آواز نہیں ظاہر ہوگی بلکہ صرف خاء اور تاء کی آواز نکلے گی۔

فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ

فاء فیصمہ ہے، یعنی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے اور وہ بعد والے جملے کا سبب ہے، وہ جملہ محذوف جملہ شرطیہ ہے، اور "لن يخلف الله عهده" اس کی جزاء ہے، نقد یہ عبارت اس طرح ہے،

ان اتخذتم عند الله عهداً فلن يخلف الله عهده

اگر تم نے اللہ کریم سے کوئی عہد لے رکھا ہے تو وہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ "لن" کے معنی سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ اللہ کریم کے وعدے اور اس کی خبر کے خلاف ہونا محال ہے۔

ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون

یہاں پر آم متصل یا منقطع ہے، اگر منقطع ہے تو "بل" اور "لکن" کے معنی میں ہوگا اور ہمزہ سے اس کا کوئی لفظی تعلق نہیں ہوگا۔ البتہ استفہام کے معنی اس میں ملحوظ ہوں گے تو مفہوم ہوگا، بلکہ کیا تم لوگ اللہ کریم پر ایسی باتیں جوڑتے ہو جن کا تم کو علم نہیں ہے؟ اس استفہام کا مقصد ان کو ڈانٹنا بھی ہے اور ان سے اس کا اقرار بھی کروانا ہے کہ وہ لوگ بہتان طرازی کر رہے ہیں۔

اور اگر متصل ہے تو یہ ہمزہ استفہام کا معادل ہے یعنی اس کے جوڑ میں آیا ہے۔ "آم" متصل کا مفہوم احد الامرین کی تعیین

کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ لیکن یہاں اس سے مقصود سوال واستفہام نہیں ہے، کیونکہ مستفہم یعنی اللہ کریم یا نبی کریم ﷺ کو دو میں سے ایک بات کا معنی اور تحقیقنی طور پر علم حاصل ہے، بلکہ مقصود مخاطب سے "احدهما" کا اقرار کرنا ہے یعنی اقرار کرو کہ ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات واقعی ہے۔ کیا تمہارا عہد دینا واقع کے مطابق ہے یا یہ بات واقع کے مطابق ہے کہ تم اللہ کریم پر بہتان طرازی کر رہے ہو۔

لفظ مس اور لمس کی تحقیق:

(مس س) المس (Feel, Touch)

کے معنی چھونا کے ہیں اور لمس کے ہم معنی ہیں لیکن گاہے لمس کسی چیز کی تلاش کرنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز جل بھی جائے۔

اور مس کا لفظ ہر اس تکلیف کے لئے بول دیا جاتا ہے جو انسان تو پہنچے۔ جیسے فرمایا:
 "وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 80)
 اور کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چھو ہی نہیں سکے گی۔

نار کی تعریف:

(نور) نار (Fire, Flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ" (سورۃ الواقعة آیت نمبر 71)

بھلا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔

آگ سے ڈرو:

حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ عزَّ وَّجَلَّ یوں کلام فرمائے گا کہ اُس کے اور اللہ عزَّ وَّجَلَّ کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا، جب وہ بندہ اپنی دائیں جانب نظر ڈالے گا تو اسے وہی کچھ نظر آئے گا جسے اس نے آخرت کے لئے آگے بھیجا تھا اور جب وہ اپنی بائیں جانب نظر ڈالے گا تو اسے وہی نظر آئے گا جسے اس نے آگے بھیجا تھا، پھر جب وہ اپنے سامنے دیکھے گا تو اسے آگ کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا، لہذا آگ سے ڈرو، اگرچہ ایک ہی کھجور کے ذریعے ہو۔

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق۔۔۔ الخ، الحدیث: 1016 بس 507)

لفظ عہد کا مفہوم:

(عہد) العہد (ض) (Promise)

کے معنی ہیں کسی چیز کی وہیم نگہداشت اور خبر گیری کرنا اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عہد کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔

قرآن میں ہے: "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 34) اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔
یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔

"لَا يَنْأَلُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 124) کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔

وعدہ خلافی کرنے والا ملعون:

نبی مکرم، نور مجسم، رسول اکرم، شہنشاہ بنی آدم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: جو کسی مسلمان سے عہد شکنی کرے، اس پر اللہ تعالیٰ فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور اس کا کوئی فرض قبول نہ ہوگا
نقل۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل المدینہ، باب حرم المدینہ، الحدیث ۱۸۷۰، ج ۱، ص ۶۱۶)

خلف کا معنی:

(خلف) (Unfaithfull)

الخلف کے معنی وعدہ شکنی کے میں محاورہ ہے: اس نے مجھ سے وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا۔ قرآن میں ہے۔

"يَمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 77)

کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا۔

"إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 31)

بیشک اللہ خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

نوٹ: بیوم، عد۔ اخذ، ام، قول، اللہ اور علم کا معنی گزر چکا ہے۔

ابو عمر الدکتور محمد رضوان رضا قادری

علی عنہ

بجہد اللہ تعالیٰ عزوجل 12 مئی 2018 کو ترجمہ و شرح مکمل ہوئی۔